پاکیزہ ڈائجسٹ

جولائی 2021

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ 07

سلسلے وار ناول

میرا سارا رنگ اتار دو — افشاں آفریدی 10
میں عشق ہوں — نایاب جیلانی 110
صراطِ عشق — دلشاد نسیم 198

ناولٹ

چاہ کی راہ میں — فرح بھٹو 64
تم میری ہی رہنا — شاہین ملک 164
آپا — غزالہ عزیز 183
جانے درد — عفت گُل اعزاز 226

عورت کہانی

ع عورت ہی پریشر ہم — فرحین اظفر 151

افسانے

اے دلِ ناداں — نزہت جبیں ضیا 39
آبلہ پا — فرحی نعیم 51
نام ہی کافی ہے — عائشہ تنویر 61
خوابِ غفلت سے جاگی ہوں ابھی — ہما علی 85
انکل — شیریں حیدر 93
وہ خوشبو سی — المیس جبار 101
جی لیں زندگی — مریم شہزاد 107
دکھ اوڑھتے نہیں — تسنیم منیر علوی 135
شریعت جرم ہے......؟ — بشریٰ الطاف 143
عید ہم سب کی — عنبرین ابدال 219
شاپنگ — فرحت جبین 244

خصوصی مضامین

شمعِ ہدایت — اختر شجاعت 247
سروے — شائستہ زرّیں 253

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

pklibrary.com

pklibrary.com

مستقل عنوانات

دین کی باتیں	ادارہ 08	منتخب غزلیں	ادارہ 277
گوشۂ ظرافت	ادارہ 257	خوش ذائقہ	شگفتہ یاسمین 278
بہنوں کی محفل	مدیرہ 260	بزمِ پاکیزہ	پاکیزہ بہنیں 280
پاکیزہ ڈائری	آمنہ حماد 270	روحانی مشورے	ادارہ 282
میں اکثر گنگناتی ہوں	صغریٰ زیدی 275	حسن نکھار کے ۱۲ راز	مہ جبیں 284

ہومیو کلینک 286

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313 ,35802552, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مجھے کچھ کہنا ہے.....!

محترم قارئین کرام.....السلام علیکم!

ماہ جولائی 2021ء کا ماہنامہ پاکیزہ آپ کے زیرِ مطالعہ ہے۔

موسم گرما عروج پر ہے۔ ایک طرف قدرت کی عنایات عروج پر ہیں اور دوسری طرف انسانی ناشکری کی انتہا ہے۔ بے شک سال کے تمام موسم مخلوق خدا کے لیے رحمت ہی ہوتے ہیں مگر انسانی ہاتھوں کا ''بے جا'' کمال انہیں زحمت بنا دیتا ہے۔

پانی، بجلی، گیس آج کے انسان کی بنیادی ضروریات ہیں..... قدرت نے تو اپنے خزانوں میں کوئی کمی نہیں رکھی مگر ہم انسانوں نے انہیں محدود ضرور کر دیا ہے۔ سنتے ہیں چند سالوں میں پانی کے ذخائر پر جنگ ہوگی۔ یہ جدید دنیا کی ہوس ہے جو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ہم قدرت کی نعمتوں سے مالا مال ہونے کے باوجود تنگیِ وسائل کا شکار ہیں، اس لیے کہ یہاں اس کی تقسیم بخیل انسانی ہاتھوں میں ہے۔

ہر سال بارشیں برستی ہیں، برف باری ہوتی ہے، گلیشئر پگھلتے ہیں مگر اس کو جمع کرنے میں ہم شاید جان بوجھ کر غفلت برتتے ہیں۔ سیلاب آجاتے ہیں تو فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں، جنگلات اکھڑ جاتے ہیں، مکانات بہہ جاتے ہیں مگر اس تباہی کا ذمے دار کوئی بھی نہیں ہوتا۔

یہ باتیں اس لیے زیرِ قلم لائے ہیں کہ اب پھر مون سون کی آمد ہے اور اب دیکھیں کون سے جدید اور مستحکم انتظامات ہوتے ہیں۔

عالمی وبا کورونا وائرس کے متاثرین میں الحمدللہ کافی کمی آئی ہے۔ یہ اس وجہ سے بھی ممکن ہوا کہ بے شمار احتیاطی تدابیر اختیار کی گئیں بلکہ اب تو یہ احتیاط روز کا معمول بن گئی ہے جو کہ اچھی بات ہے۔ جس صفائی اور محتاط رہن سہن کی ترغیب دینِ اسلام نے چودہ سو سال پہلے دی تھی، وہ آج قابلِ عمل بنائی جا رہی ہے۔

بس اللہ پاک سے یہ دعا ہے کہ اسلام کے پانچویں بڑے رکن حج کی ادائیگی بھی ممکن ہو جائے جو کہ ہر بالغ، عاقل، صاحبِ استطاعت مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

ان شاء اللہ وہ دن بھی جلد آئے گا جب تمام مسلمانانِ عالم اس وبا سے نجات کا سجدۂ شکر حرمِ پاک میں ادا کریں گے، آمین۔

مدیرہ

نزہت اصغر

پھر اگر وہ تمہاری بات قبول نہ کریں۔ تو جان لو کہ سوا اس کے نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ اتارا گیا ہے۔ اور یہ
کہ اس (اللہ) کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ پس کیا تم حکم ماننے والے ہو جاؤ گے۔ (۱۴) جو کوئی دنیا کی زندگانی اور
اسی کی زینت چاہتا ہے ہم اس (دنیا) میں ہی انہیں ان کے اعمال کا پور، اپورا (بدلہ) دے دیں گے۔ اور انہیں اس
میں کم نہ دیا جائے گا (۱۵) یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے (دوزخ) کی آگ کے اور کچھ نہیں
ہے۔ اور جو کچھ انہوں نے اس (دنیا) میں کیا تھا، وہ سب ضائع ہو گیا اور جو کچھ وہ کیا کرتے تھے وہ سب
باطل ہو گیا (۱۶) پس کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہو، اور ایک گواہ
اس کے پیچھے ہی پیچھے آتا ہو جو اسی کا جزو ہو اور اس کے پہلے سے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت
ہو۔ اسی پر تو ایمان لائے ہیں۔ اور گروہوں میں سے جو بھی اس کا منکر ہوگا، پس آگ اس
کا ٹھکانا ہے۔ پھر تم اس سے شک میں نہ رہنا یقیناً یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حق
ہے لیکن بہت لوگ ایمان نہیں لاتے (۱۷) اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ
تعالیٰ پر جھوٹ باندھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے حضور میں پیش کیے
جائیں گے۔ اور گواہ یہ کہیں گے کہ یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کے
برخلاف جھوٹ بولا۔ خبردار ہو! کہ ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ (۱۸) جو
اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں، اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں۔ اور وہ
آخرت کے بھی منکر ہی ہیں (۱۹) یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں (اللہ تعالیٰ کو)
عاجز کرنے والے نہ ہو سکے۔ اور اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا کوئی حمایتی نہ ہوا۔ ان
کا عذاب دُگنا کیا جائے گا۔ وہ نہ سن ہی سکتے تھے اور نہ وہ دیکھ ہی سکتے تھے
(۲۰) یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے آپ اپنا نقصان کیا۔ اور جو، جو کچھ افترا، وہ
کیا کرتے تھے وہ سب ان سے جاتا رہا (۲۱) بلاشک آخرت میں وہی سب
سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔ (۲۲) یقیناً وہ لوگ جو ایمان
لا چکے، اور انہوں نے نیک عمل کیے اور اپنے پروردگار کی طرف جھک گئے۔ وہی
بہشت والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۲۳) ان دونوں گواہوں کی
مثال اندھے اور بہرے اور دیکھنے والے اور سننے والے کی سی ہے۔ کیا دونوں مثال
میں برابر ہیں۔ پس کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ (۲۴) اور بے شک ہم نے نوح کو
اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس نے ان سے کہا) یقیناً میں تمہارے لیے صاف، صاف
ڈرانے والا ہوں۔ (۲۵) کہ تم سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کی عبادت نہ کرو۔ میں تم پر ایک
دردناک دن کے عذاب سے یقیناً خوف کھاتا ہوں۔ (۲۶) پھر ان سرداروں نے جو اس کی قوم میں
سے کافر ہو گئے تھے کہا کہ ہم نہیں دیکھتے ہیں تمہیں مگر اپنے جیسا ہی ایک آدمی۔ اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تمہاری
پیروی کسی نے بھی نہیں کی سوائے ان لوگوں کے جو ہم میں سے ظاہر بظاہر رذیل ہیں۔ اور ہم نہیں دیکھتے کہ تمہیں ہم
پر کوئی فضیلت ہے بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔ (۲۷)

(سورۃ ھود ۱۱ پارہ ۱۲ آیات ۱۴ تا ۲۷)

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

سَیِّدُنَا خَاتِمُ الْاَنْبِیَآءِ ﷺ

سید کونین، ختم المرسلین افضل الانبیا رحمت العالمین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے۔ جس کے معنی و مفہوم..... آخری نبی کے ہیں۔

1۔ القرآن: ا۔ ترجمہ: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ خدا کے پیغمبر اور آخری نبی ہیں اور خدا ہر چیز سے واقف ہے۔

(سورۂ احزاب آیت 40)

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اس امت پر بہت بڑا انعام ہے کہ اس نے اس امت کا دین کامل کر دیا ہے کہ اب اسے کسی اور دین کی ضرورت نہیں رہی اور نہ ہی کسی نبی کی۔ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبین بنایا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن وانس سب کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

2۔ الحدیث: حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری مثال گزشتہ انبیا کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے کسی نے ایک بہت خوب صورت مکان بنایا اور اس کو خوب آراستہ کیا لیکن ایک گوشے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ آ کر اس مکان کو دیکھنے لگے اور بولے یہاں اینٹ کیوں نہیں رکھی گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا پس میں وہی اینٹ ہوں اور خاتم الانبیا ہوں۔

(بخاری و ابوداؤد)

3۔ الرائے: بکسی یہودی، بدھ یا عیسائی نے حین حیات آج تک اپنے مذہب کو اپنی جیتی جاگتی آنکھوں کے سامنے پنپتے دیکھا ہے نہ معجزانہ طور پر اتنی تیزی سے پھیلتے ہوئے، کسی دینی پیشوا کو بھی اس قدر عظیم کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی مرضی شاملِ حال تھی۔ وہ اس بات کو تسلیم کرانا چاہتا تھا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبین ہیں اور اسلام اس کے اتارے ہوئے ادیان میں آخری ہے۔

(آر۔ وی۔ سی۔ باڈلے۔ الرسول)

4۔ الفضائل: جو کوئی اس بات کا خواہشمند ہے کہ کا خاتمہ بالخیر ہو تو وہ ہر نماز کے بعد 200 مرتبہ اس اسم پاک یا خاتم النبیا کو پڑھ لے۔

(قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس)

bkhoraty.com

یہ دنیا دار العمل ہے، جہاں انسان کے دو ہی امتحان ہیں، ایک شکر کا دوسرے صبر کا مگر جب حضرتِ انسان حسد یا ہوس کی خاطر تقدیر سے لڑنے کی ٹھان لے تو پھر اس کے اپنے فیصلے ہی اس کی آزمائش بن جاتے ہیں۔ جو آنکھوں اوٹ ہے چہرہ اسی کو دیکھ کر جینا یہ سوچا تھا کہ آساں ہے مگر آساں نہیں ہوتا نہ بہلا وا نہ سمجھوتا، جدائی سی جدائی ہے ادا سوچو تو خوشبو کا سفر آساں نہیں ہوتا محبت کے انوکھے روپ سنوارتی ایک حسین تحریر...

حادثوں میں گزری ہے راس بس تباہی ہے
زندگی کی چاہت میں زندگی گنوائی ہے
خواب اب نہیں میرے ، نیند تک پرائی ہے
عارضی محبت تھی مستقل نبھائی ہے

امیدوں، جذبوں، فیصلوں اور احساسِ جرم پر مبنی کچھ ایسے کرداروں کی کہانی جو دل سے دیکھتے، دل سے سنتے اور دل سے ہی سوچتے ہیں

میرا سارا زنگ اتار دو

سلسلے وار ناول

افشاں آفریدی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیرازی ولا میں یتیم مظفر اور سائرہ کی بیٹی ردا کی منگنی اس کی مرضی سے آصف کے ساتھ ہوتی ہے جس میں یو ایس اے سے تین سال بعد واپس آ کر مظفر صاحب کا یتیم بھتیجا عکرمہ بھی شریک ہوتا ہے۔ دُرِ مکنون، سائرہ بیگم کی بھانجی تھی جس کی ذمے داری مظفر احمد نے اس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد اٹھائی تھی۔ مظفر صاحب نے اپنی نئی ول بنوائی تھی وہ لے کر عکرمہ نکلتا ہے تو زاویار کا شیری کے ساتھ رویہ دیکھ کر سوچتا ہے کہ کوئی عورتوں کے ساتھ اس طرح بھی برتاؤ کرتا ہے۔ عکرمہ کو زاویار سے مل کر یاد آجاتا ہے کہ اس نے صفدر صاحب کے آفس کے باہر اسے دیکھا تھا اور لڑکی سے اس کا خراب برتاؤ بھی یاد آجاتا ہے زاویار کو دیکھ کر دُرِ مکنون بے ہوش ہو جاتی ہے۔ یعنی، درمکنون سے ملنے آتی ہے اور اس کا حوصلہ بڑھاتی ہے، عکرمہ کو یہ جان کر شاک لگتا ہے کہ دُرِ مکنون کے خوف اور وحشت کی وجہ اظہار بھائی ہیں۔ سائرہ بیگم، دُرِ مکنون کو بتاتی ہیں کہ زاویار نے رشتے سے انکار کر دیا ہے اور وہ اس کا رشتہ جلد از جلد کرنا چاہتی ہیں۔ زاویار کا فون آتا ہے اور وہ اس سے معافی مانگتا ہے تو دُرِ مکنون کچھ کہہ نہیں پاتی رونے لگتی ہے عکرمہ جو گاڑی کی چابی بھول گیا تھا وہ درمکنون کو روتا دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے اور اس سے فون لے لیتا ہے لیکن دوسری طرف زاویار کی موجودگی اس کے لیے حیران کن تھی۔ رخصتی کے بعد آصف اپنی پھوپو کو ائرپورٹ چھوڑنے جاتا ہے تو واپسی پر ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ آصف کا آپریشن تھا تو سب اسپتال میں تھے اظہار صاحب کو اپنی فیملی کے ساتھ واپس جانا تھا عکرمہ ٹکٹ لے کر آتا ہے تو اظہار اسپتال میں نہیں تھے، وہ پریشان ہو جاتا ہے اور زوہا کے ساتھ گھر آجاتا ہے، سیڑھیوں پر دُرِ مکنون کا دوپٹا پڑا دیکھ کر وہ دادی کے کمرے کا دروازہ بجا ڈالتا ہے۔ ماسٹر کی سے جب وہ لوگ دادی کا کمرا کھولتے ہیں تو دہشت زدہ رہ جاتے ہیں کیونکہ دُرِ مکنون کمرے کے انتہائی سرے پر دیوار کے قریب اوندھے منہ پڑی تھی۔ عکرمہ جب اسپتال سے گھر آتا ہے تو واچ مین اسے اظہار صاحب کا گولڈ پلیٹڈ پسٹل کی شکل کا لائٹر لا کر دیتا ہے کہ کل گیٹ کے پاس گرا ہوا تھا۔ اس کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ دادی کہتی ہیں کہ جب دُرِ مکنون صحت یاب ہو کر آئے گی تو جشن صحت منائیں گے اور اسی تقریب میں، میں اسے اپنے پوتے سے منسوب کر دوں گی۔ مظفر صاحب کے پوچھنے پر دادی سیف کا نام لیتی ہیں تو مظفر صاحب کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہو سکتا کیونکہ دُرِ مکنون ان کی اور سائرہ شیرازی کی گمشدہ بیٹی ہے۔ عکرمہ بھی یہ بات سن لیتا ہے۔ جب سے اسے درمکنون سے اپنے اور اس کے رشتے کا پتا چلا تھا وہ اور بھی زیادہ ذمے دار ہو گیا تھا کہ وہ اس کی سگی چچا زاد تھی۔ عکرمہ، دادی اور مظفر صاحب کو بتا دیتا ہے کہ درمکنون اس کا انتخاب ہے۔ سائرہ بیگم، عکرمہ کے درمکنون سے شادی کے فیصلے پر بہت سیخ پا ہوتی ہیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ردا کو آصف سے طلاق دلوا کر عکرمہ سے شادی کر دیں۔ دادی نے زوہا کو بلا کر دُرِ مکنون تک عکرمہ کا پرپوزل پہنچوایا تو درمکنون انکار کر دیتی ہے۔ عکرمہ، درمکنون سے بات کر کے اسے اس رشتے پر کنونس کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ سوچتی ہے کہ اس کا انکار بہتر ہے۔ طاہرہ آنٹی بھی دُرِ مکنون کو سمجھاتی ہیں تو وہ عکرمہ سے رشتے کے لیے ہاں کر دیتی ہے۔ عکرمہ کا بھائی عبید آیا تھا تو عکرمہ کی شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ زاویار کا فون آتا ہے اور وہ درمکنون سے معافی مانگتا ہے تو دُرِ مکنون، عکرمہ کو اپنے اور زاویار کے بارے میں بتاتی ہے۔ صوفیہ (درمکنون کی ماں) مکرم صاحب کی چھوٹی بیٹی تھی جو ان کی دوسری بیوی سے تھی ان کی پہلی بیوی سے سات بیٹیاں ہوئیں۔ جن میں دو پیدا ہوتے ہی مر گئیں۔ ان کو اولاد نرینہ کی خواہش نے دوسری شادی پر مجبور کیا لیکن دوسری بیوی سے بھی بیٹی ہوئی تو مجبوراً دل کو سمجھا لیا۔ چار بیٹیوں کی شادی کے بعد ان کی (پہلی بیوی کی) سائرہ اور صوفیہ ہی رہ گئی تھیں۔ شادی کے لیے جب زاہد علی نے اپنی والدہ کو ان کے گھر رشتے کے لیے بھیجا جو اس کالونی میں نئے، نئے شفٹ ہوئے تھے۔ زاہد علی کی والدہ نے جب مکرم صاحب کی بیٹیوں کو دیکھا تو سوچا کہ زاہد علی نے سائرہ کو ہی پسند کیا ہوگا اور ان کے لیے رشتہ ڈال دیا جو قبول ہو گیا۔ شادی سے ایک ہفتہ پہلے جب وہ سب سے چھپ کر اپنے دوست مظفر کے ساتھ ان کے گھر گئے تو دلہن کو دیکھ کر حیران ہو گئے انہوں نے صوفیہ کو پسند کیا تھا۔ انہوں نے شادی سے انکار کیا تو مظفر کی والدہ نے ان کے لیے سائرہ کا رشتہ دیا جو قبول کر لیا گیا لیکن سائرہ کے دل سے یہ بات نہ نکلی۔ سائرہ کی لگاتار چار بیٹیاں ہوئیں جن میں سے ایک پیدائش کے فوراً بعد انتقال کر گئی اب اتنے سال بعد صوفیہ اور سائرہ دونوں امید سے ہو گئیں۔ صوفیہ کے ساتھ کچھ مسائل تھے لیکن اس بار وہ خوش تھیں کہ خدا نے ان کی گود ہری کی لیکن جب ان کے مردہ بچے نے جنم لیا تو مظفر نے اپنی بیٹی (دُرِ مکنون) صوفیہ اور زاہد علی کی گود میں ڈال دی۔ اس بات سے صرف زاہد علی اور مظفر ہی باخبر تھے۔ درمکنون اپنی دوست صباحت کی منگنی کی شاپنگ کے لیے جاتی ہے تو ٹیکسی خراب ہو جاتی ہے تو ٹیکسی والا اسے راستے میں ہی اتار دیتا ہے۔ وہاں سے زاویار کا گزر ہوتا ہے وہ اس کے ساتھ جاتی ہے وہ راستے میں

اسے پرپوز کرتا ہے..... ایک جگہ زاویار کو لنڈ ڈرنک لینے کے لیے رکنا ہے ان کے پیچھے کچھ بدمعاش لگ جاتے ہیں جو اسلحے کے زور پر درمکنون کو اغوا کر لیتے ہیں اور زاویار موت کے خوف سے اسے ان لوگوں کے پاس چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ عبید اور سدرہ بچوں سمیت کراچی آ گئے تھے۔ دُرِمکنون، طاہرہ کے ساتھ ایک کاؤنسلنگ نشست میں جا رہی تھی۔ طاہرہ، دُرِمکنون کو کہتی ہیں کہ قرآن کی ہر آیت ہمیں وعظ و نصیحت کرتی ہے اگر ہم سننا چاہیں تو..... آصف گھر چھوڑ کر کسی کو بھی بتائے بغیر کہیں چلا گیا تھا اور اس سب کی ذمے دار سائرہ بیگم، درمکنون کو ٹھہراتی ہیں۔ عکرمہ، ردا کو تسلی دیتا ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آصف کے سامان میں سے ایک ٹریولنگ ایجنسی کا بل نکلتا ہے جس سے ان لوگوں کو یہ پتا چل جاتا ہے کہ وہ لندن گیا ہے۔ دادی کی باتوں سے اسے سائرہ شیرازی کی نفرت اور عناد کی صحیح وجہ معلوم ہوئی۔ سائرہ بیگم چاہتی ہیں کہ عکرمہ اور دُرِمکنون کی شادی ابھی نہ ہو لیکن کوئی بھی شادی ملتوی کرنے کے حق میں نہیں ہوتا۔ آصف کا پتا چل آتا ہے، ردا کے پاس کہ عکرمہ اور درمکنون کی شادی انجوائے کرنا۔ عکرمہ، ردا کو یقین دلاتا ہے کہ وہ جلد آصف کو ڈھونڈ کر لائے گا۔ سائرہ بیگم، افروزہ سے بات کرتے ہوئے درمکنون کو نانے کے لیے کہتی ہیں کہ اگر صوفیہ آج ہوتی تو میں اس سے عکرمہ کو مانگ لیتی..... لیکن اب کسی سے نہیں کہہ سکتی۔ یہ بات سن کر دُرِمکنون، عکرمہ سے بات کرنے جاتی ہے مگر کر نہیں پاتی۔ سائرہ بیگم، دادی کو بتاتی ہیں کہ آصف نے ردا کو ایک طلاق بھیج دی ہے اور دُرِمکنون سے کہتی ہیں کہ جب تم یہاں آئی تھیں تو ہر فرد نے تمہیں خوش کرنے کے لیے بہت کچھ کیا، آج تمہیں اس مشکل وقت میں ردا کا خیال کرنا ہے۔ ان کی باتوں کے زیر اثر دُرِمکنون خواب میں بھی دیکھتی ہے میمی خالہ کے مطالبے پر ماما انہیں مایوس نہیں کرتیں، وہ چونک کر اٹھ جاتی ہے۔ طاہرہ آنٹی کی ہدایت پر وہ اور عکرمہ درس لے رہے تھے۔ نکاح کے بعد سب باہر چلے جاتے ہیں تو سائرہ بیگم، دُرِمکنون سے کہتی ہیں کہ اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں..... عینی کا فون آتا ہے تو عکرمہ، درمکنون کی اس سے بات کرواتا ہے، عینی اسے بتاتی ہے زاویار کا نکاح ہو رہا ہے، شیری سے۔ عکرمہ، مظفر صاحب کو یقین دلاتا ہے کہ دُرِمکنون کو خوش رکھے گا۔ عکرمہ، درمکنون کو فلاورز کا بوکے دیتا ہے اور گفٹ دیتا ہے تو دُرِمکنون گفٹ کے بجائے ایک وعدہ لیتی ہے کہ وہ دوسری شادی کرے گا اور وہ بھی بہت جلد۔ عکرمہ کہتا ہے کہ میں آپ کو رشتہ نبھانے کے لیے فورس نہیں کروں گا لیکن بدلے میں آپ مجھ سے دوبارہ یہ مطالبہ نہیں کریں گی۔ سائرہ بیگم کی طبیعت (جان بوجھ کر) اسی رات خراب ہو جاتی ہے آصف نے دوسری طلاق بھیجی تھی وہ سب سائرہ بیگم کے لیے پریشان ہوتے ہیں اور ان کو اسپتال لے جاتے ہیں تو عکرمہ اور درمکنون بھی جاتے ہیں۔ عکرمہ، دُرِمکنون سے کہتا ہے کہ بھرم رکھنے میں میرا ساتھ دیں۔ اظہار صاحب کے آنے کا سن کر درمکنون پریشان ہوتی ہے تو عکرمہ اس کی ہمت بندھاتا ہے اور اسے سب سے ملانے لے کر آتا ہے۔ اور اظہار صاحب کو ان کا لائٹر دیتا ہے کہ وہ شیرازی ولا کے باہر گرا ملا تھا جو گاڑی نے دیا یہ سن کر زارا بہت حیران ہوتی ہے۔ عکرمہ، درمکنون کو عمرے کے ٹکٹ دیتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ ردا کا گھر ٹوٹ رہا ہے تو وہ اسے اپنا لے کہ یہی دادی اور یہی کی خواہش تھی۔ عکرمہ اسے تنبیہ کرتا ہے کہ آئندہ یہ نہ سنے اور وہ سوچتا ہے کہ یہ اختراع اس کے ذہن میں کس نے ڈالی۔ عکرمہ، دُرِمکنون سے کہتا ہے کہ اگر ردا سے شادی کی شرط ہی یہ ہو کہ وہ درمکنون کو چھوڑ دے تو.....؟ درمکنون یہ سن کر چپ ہو جاتی ہے۔ ردا، درمکنون سے کہتی ہے کہ عمرے پر جائیں تو میرے لیے بھی دعا کرنا۔ عکرمہ، درمکنون سے کہتا ہے کہ وہ مظفر شیرازی کو پاپا کہا کرے۔ سائرہ بیگم، درمکنون کو باور کراتی ہیں کہ عکرمہ اپنے فیملی پریشر کو زیادہ نہیں سہہ سکے گا اور وہ اپنے کمفرٹ زون میں زیادہ دن نہیں رہ سکے گی۔ درمکنون سوتے میں ڈر جاتی ہے تو عکرمہ خود اسٹڈی میں چلا جاتا ہے..... اور اسے کہتا ہے کہ وہ دروازہ لاک کر لے..... عکرمہ، درمکنون کے خوفزدہ ہونے سے پریشان ہو جاتا ہے۔ دُرِمکنون، عکرمہ سے پوچھتی ہے کہ آپ کو امید ہے کہ ہماری زندگی کبھی نارمل ہو گی تو وہ کہتا ہے کہ امید نہیں یقین ہے۔ جلال انصاری (آغا جان)، شہریار کو کہتے ہیں کہ وہ زاویار کو کال کر لیں۔ عاصمہ، زاویار کے باپ شہریار سے طلاق لے چکی تھیں۔ میمونہ بیگم، شہرین کو بتاتی ہیں کہ آغا جان چاہتے ہیں کہ خولہ کی یا شہرین کی شادی زاویار سے ہو جائے۔ تین سال بعد آغا جان، زاویار کے سامنے تھے اور ان کے انداز بھی خاصے بدل گئے تھے۔ آغا جان، زاویار سے کہتے ہیں کہ گزرے دنوں کو بھول جاؤ اور اپنا دل صاف کر لو..... لیکن وہ کہتا ہے کہ کچھ نقصان ناقابلِ تلافی ہوتے ہیں۔ عاصمہ، زاویار کو سمجھاتی ہیں کہ آغا جان کے لیے جو کدورت اس کے دل میں ہے وہ نکال دے لیکن زاویار کہتا ہے کہ وہ یہ نہیں کر سکتا۔ عاصمہ، زاویار سے وعدہ لیتی ہیں کہ وہ ان کے اور اپنے پاپا کے کیے کی سزا خود کو نہیں دے گا تو زاویار کوشش کرنے کا کہتا ہے۔ آغا جان، شہرین کے ساتھ زوی سے ملنے آتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ زاویار شادی کر لے تو وہ کہتا ہے کہ میرے پاس آپ کے سوال کے جواب میں نہ کے سوا کچھ نہیں۔ زاویار اور اس کے دوستوں نے آج ایک اغوا شدہ لڑکی (کلثوم) کو

بازیاب کرایا تھا اس کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا تھا مگر اس کے گھر والے اسے قبول نہیں کررہے تھے۔ زاویار، کلثوم کو یونیورسٹی کے گرلز ہاسٹل میں چھوڑتا ہے۔ نازیہ، عاصمہ کو بتاتی ہیں کہ دُرِ مکنون کی شادی عکرمہ سے ہورہی ہے تو زاویار بہت اپ سیٹ ہوجاتا ہے۔ سرفراز، زاویار کو بتاتا ہے کہ بابر زمان کا پتا چل گیا ہے۔ تین سال پہلے اس کے باپ نے ایک لڑکی (دُرِ مکنون) کے اس کی نجی جیل سے بازیاب ہونے پر اس پر کیس ہونے کی وجہ سے شوکت زمان نے باہر بھیج دیا تھا اور اب وہ چند ہفتوں میں لاہور آنے والا ہے۔ زاویار لاہور جانے کا ارادہ باندھتا ہے تو سرفراز نے اسے تنبیہ کی۔ زاویار فون کرکے آغا جان سے دو شرطیں رکھتا ہے کہ اگر وہ اس کو اپنے کچھ کانٹیکٹس اور کیش دیں گے اور فیملی کو اس بارے میں نہیں بتائیں گے تو وہ لاہور آنے کے لیے تیار ہے اس پر آغا جان شیری سے شادی کا کہتے ہیں۔ زاویار، عاصمہ، مہران اور مومنہ کو بتاتا ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ابروڈ جانا چاہتا ہے اور اس سے پہلے وہ لاہور جائے گا کیونکہ پاپا اور آغا جان بہت بلارہے ہیں۔ عاصمہ اسے جانے کی اجازت تو دیتی ہیں لیکن سوچتی ہیں کہ نہ جانے کیا سوچا ہے زاویار نے اپنے دل میں...... سرفراز، زاویار کو تنبیہ کرتا ہے کہ بابر زمان اور شوکت زمان بارسوخ اور خطرناک لوگ ہیں وہ کسی بھی طرح قانون شکنی نہ کرے۔ زاویار، سرفراز سے کہتا ہے کہ اس کی خالہ میرج بیورو چلاتی ہیں وہ کلثوم کے لیے کسی رشتے کی بات کرے گا۔ زاویار کا لاہور میں استقبال اس کی توقع سے بڑھ کر ہوا تھا۔ آغا جان، زاویار سے کہتے ہیں کہ گناہ کا سرزد ہوجانا بشریت ہے اور تائب ہوجانا انسان کو ولیوں کے درجے تک لے جاتا ہے۔ آغا جان کی اچانک طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔ زاویار، آغا جان سے ملنے جاتا ہے تو وہ اس سے شہرین سے شادی کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ زاویار کہتا ہے کہ آپ ٹھیک ہوجائیں تو میں کسی بات سے انکار نہیں کروں گا۔ سب زاویار کے ہاں کہنے سے خوش ہوتے ہیں تو شیری کہتی ہے کہ میری رضامندی کی کوئی اہمیت نہیں۔ زاویار کہتا ہے کہ میں آغا جان کے لیے اس فیصلے پر راضی ہوں اگر تم راضی نہیں ہو تو تم انکار کردو۔ ابا (کامران صاحب) شیری کو بلاکر کہتے ہیں کہ ہم اس رشتے پر راضی ہیں اس لیے تم سے نہیں پوچھا لیکن تمہارا جو بھی فیصلہ ہوگا وہ ہمیں قبول ہے تو شیری کچھ کہہ نہیں پاتی اس کے سر جھکانے پر کامران صاحب اسے دعائیں دیتے کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ زاویار نے دُرِ مکنون کو جو رنگ دی تھی اور اس نے واپس کردی تھی وہی رنگ وہ شیری کو دیتا ہے، وہ اسے بہت پسند آتی ہے۔ خواب میں دُرِ مکنون کو روتا دیکھ کر زاویار اٹھ جاتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ آج وہ شیری کے سامنے عیاں ہوگیا ہے۔ سرفراز، زاویار کو مبارک باد دینے آتا ہے اور بتاتا ہے بابر زمان اگلے ہفتے نہیں اگلے مہینے آرہا ہے۔ وہ کلثوم کا خط زاویار کو دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی خالہ نے اس کا رشتہ طے کردیا ہے۔ کلثوم کا خط پڑھ کر زاویار کو ایک دفعہ پھر دُرِ مکنون کا خیال آتا ہے۔ ایک دم شہرین کمرے میں داخل ہوتی ہے تو وہ اسے چائنیز چلنے کا کہتا ہے۔ شیری، زاویار کو ٹرنکولائزر لیتے دیکھ کر حیران ہوئی ہے۔ رات میں پھر زاویار خواب کی وجہ سے جاگتا ہے اور شیری سے کچھ کہے بغیر کمرے سے چلا جاتا ہے تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر نکل کر دیکھتی ہے تو زاویار کی بائیک نہیں تھی وہ بہت پریشان ہوتی ہے، زاویار آنے کے بعد اسے یقین دلاتا ہے کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ مولا بخش، زاویار کو ملنے بلاتا ہے وہ شیری کو لے کر جاتا ہے تو عاصمہ اور مہران کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ عاصمہ، آغا جان سے کہتی ہیں کہ ان کے اس فیصلے سے وہ بہت خوش ہیں۔ شیری، زاویار سے کہتی ہے کہ وہ کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھائے پھر زاویار اسے پوری کہانی سناتا ہے۔ شیری، دُرِ مکنون کے ساتھ ہوئے ظلم پر غمزدہ ہوکر اللہ سے اور غائبانہ دُرِ مکنون سے بھی زاویار کے لیے معافی مانگتی ہے۔ سرفراز، ندیم سے زاویار کی پلاننگ کے بارے میں دریافت کرتا ہے تو وہ لاعلمی کا اظہار کرتا ہے۔ سرفراز، کلثوم سے کہتا ہے کہ وہ زاویار کو اپنی شادی پر انوائٹ کرے اور فون کرکے اصرار کرے۔ نتاشا، (سرفراز کی بیوی) زاویار کے معاملات میں انٹرفیئر کرنے کی وجہ پوچھتی ہے تو سرفراز دُرِ مکنون اور زاویار کے بارے میں پوری بات بتاکر کہتا ہے کہ میں اسے اپنے بھائی علی کی طرح سمجھتا ہوں اور دوبارہ علی کو کھونا نہیں چاہتا۔ شیری، زاویار سے کہتی ہے کہ دُرِ مکنون سے مل کر معافی مانگ لو...... کلثوم فون کرتی ہے تو زاویار انکار نہیں کرپاتا۔ آغا جان، زاویار اور شیری کو کراچی جانے کا کہتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ عاصمہ نے ایک ریسپشن رکھا ہے۔

..................اب آگے پڑھیے

قسط نمبر 28

”یہ کچھ کارڈز تمہارے اور زوی کے لیے ہیں۔ تم جسے بھی انوائٹ کرنا چاہو۔“ ائرپورٹ سے گھر آنے کے دو گھنٹے بعد ہی عاصمہ ان دونوں کو لے کر شاپنگ پر نکل گئی تھیں۔ اب واپسی پر رات کے کھانے کے بعد چائے کے مگ تھامے وہ دونوں لاؤنج میں آکر بیٹھیں تو عاصمہ نے کچھ کارڈز اس کی طرف بڑھائے۔

''اوو۔ تھینک یو مامی۔ ویسے مجھے تو صرف دو ہی کارڈز چاہیے ہیں۔ ایک نیلو کے لیے اور ایک..... ایک میری بہت پیاری سی دوست کے لیے۔'' خوشی سے کہتے، کہتے اس نے دُرِ مکنون کے نام کو ہونٹوں پر آنے سے روک کر بات مکمل کی۔

''اچھی بات ہے۔ ویسے کارڈ بانٹنے کا وقت تو ہے نہیں۔ تم سوشل نیٹ ورک سے فائدہ اٹھا لو۔ یہی بہتر ہے۔'' عاصمہ نے مشورہ دیا۔

''ہوں نیلو کو تو واٹس ایپ پر بھیج دوں گی لیکن دوسری دوست کو جا کر منانا پڑے گا مجھے۔ وہ ایسے آنے والی نہیں۔''

''کیوں؟ کیا کوئی ناراضی ہے تم دونوں میں؟'' عاصمہ نے دلچسپی سے سوال کیا تو وہ ایک گہری مضمحل سانس بھر کر انہیں دیکھنے لگی۔

''جی بس ایسا ہی سمجھیں۔ دعا کریں مامی کہ وہ من جائے۔ راضی ہو جائے۔ معاف کر دے۔ اللہ اس کا ظرف وسیع کر دے۔'' نظر چرا کر کہتی شہرین عاصمہ کو متعجب کر گئی۔ اتنی سنجیدگی اور رنجیدگی..... وہ بھی شہرین کے لہجے میں۔ انہیں واقعی حیرت ہوئی۔

''ایسی بھی کیا بات ہو گئی ہے شیری۔ کوئی بھلا تم جیسی پیاری لڑکی سے بھی خفا ہو سکتا ہے اور جو ایسا ہے بھی تو مجھے ساتھ لے چلنا۔ دیکھنا کیسے راضی کرتی ہوں اسے۔''

''ارے نہیں مامی۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی۔ خیر آپ بتائیے کس، کس کو انوائٹ کیا ہے آپ نے ریسپشن پر۔'' اس نے یک دم ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر گویا بات ہی ختم کی اور نیا موضوع چھیڑ دیا۔ جس کے جواب میں عاصمہ اسے کچھ تفصیلات بتانے لگیں۔

''اور لاہور سے کون، کون مدعو ہے؟''

''وہاں سے میرے چند رشتے دار ہیں اور تمہارے سب گھر والے۔''

''شہریار ماموں بھی؟'' شہرین نے دبے، دبے لہجے میں پوچھا تو عاصمہ نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا اور بردباری سے مسکرا دیں۔

''آف کورس وہ بھی۔ آخر کو وہ زوی کے باپ ہیں۔ ان کا حق ہے کہ اپنے بیٹے کی خوشی میں شریک ہوں۔''

''بہت باظرف خاتون ہیں آپ! مامی..... سچ میں..... ایک بیوی بننے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ آپ کس تکلیف سے گزری ہوں گی۔ شہریار ماموں نے دوسری شادی کر کے بہت برا کیا آپ کے ساتھ۔'' اس کا انداز ہمدردی بھرا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں شیری۔ عمر کے اس حصے میں پہنچ کر اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ زندگی میں کوئی بات بھی بڑی بات نہیں ہوتی۔ بس ہماری ناسمجھی اور بے صبری اسے بڑا بنا دیتی ہے۔'' شہرین کی بات کے جواب میں وہ سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ ''رہ گئی دوسری شادی کی بات تو دوسری شادی کرنا کوئی جرم ہے نہ ہی کوئی غلطی ہے۔ شرع اجازت دیتی ہے مرد کو ہاں مگر اس کے لیے دھوکا نہیں دینا چاہیے۔''

''تو کیا آپ کو ماموں کی دوسری شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا؟ اگر ایسا تھا تو پھر آپ نے انہیں کیوں چھوڑا۔''

''میں نے شہریار کی دوسری شادی کے سبب نہیں بلکہ ان کے مساوات نہ کرنے کی وجہ سے انہیں چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا شیری۔'' شہرین کے کند چھری جیسے کھرے استفسار پر انہوں نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور جب بولیں تو ان کا لہجہ دھیما اور گہرا تھا۔ ''میں جانتی تھی کہ وہ مجھ میں اور صبا میں کبھی مساوات نہیں کر سکیں گے۔ وہ اسے دل سے چاہتے تھے، ہماری شادی سے پہلے ہی بستی تھی وہ ان کے دل میں۔ آغا جان کی خاطر انہوں نے مجھے اپنایا

اور یہی شکوہ تھا مجھے ان سے۔ ان کے دل اور نگاہ میں میری کوئی جگہ اور وقعت نہیں تھی۔ تمہیں پتا ہے شہرین! ایک عورت جس مرد کو پہلی بار اپنا دل اور اپنا آپ سونپتی ہے اس سے خود بخود امیدیں وابستہ ہو جاتی ہیں۔'' وہ بات کرتے، کرتے جیسے ماضی میں سفر کرنے لگی تھیں۔

لاؤنج میں داخل ہوتے زاویار کے قدموں کو شہرین کے سوال اور ماں کے جواب نے جام کر دیا۔ وہ بے اختیاری میں دروازے پر ہی رک کر ان دونوں کو سننے گیا۔

''شہریار میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد تھے، میرے شوہر تھے۔ میری ساری توجہ، وفا اور محبت کا مرکز تھے۔ مگر جواب میں مجھے کیا ملا..... محض دھوکا..... پہلے دن سے ہی ان کا رویہ ان کی زندگی میں میری جگہ کا تعین کر گیا تھا پھر بھی میں نے آٹھ سال گزارے ان کے ساتھ۔ زوی کا ہماری زندگی میں آنا میرے لیے امید کی کرن تھا مگر جب شہریار نے مجھ سے وعدے کے باوجود سب سے چھپ کر صبا سے نکاح کر لیا تو میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں نے پھر بھی کوشش کی وہ ہم دونوں کے درمیان برابری کا رویہ رکھیں مگر نہ ان سے مساوات ہو سکی اور نہ مجھ سے صبر۔ اور یوں یہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ مگر ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ قیامت کے روز شہریار ایسی حالت میں آئیں کہ مساوات نہ کرنے کی پاداش میں ان کا آدھا جسم مفلوج ہو۔'' وہ اپنی بات متانت سے ختم کر کے خاموش ہو گئیں۔ شہرین کے لیے یہ انکشافات بہت حیران کُن اور نئے تھے۔ انصاری ہاؤس میں یہ وہ واحد موضوع تھا جس پر بات کرنا سخت ممنوع تھا۔

''اوہ..... مجھے یہ سب نہیں پتا تھا۔ میں تو ہمیشہ یہی سمجھتی رہی کہ آپ نے صبا مامی کی وجہ سے ماموں سے علیحدگی اختیار کی۔''

''صبا ہماری ڈائیورس کی بنیادی وجہ نہیں محض ایک محرک تھی شیری۔ اصل بات تو یہ تھی کہ میری نسوانی انا اور جو جیسا ہے اسے ویسا قبول نہ کرنے کی عادت نے مجھے کمپرومائز نہ کرنے دیا۔'' وہ سچائی سے اعتراف کر گئیں۔

''اور زوی؟ اسے آپ نے کیوں چھوڑ دیا۔''

''شہریار نے مجھے اس شرط پر طلاق دی تھی کہ میں زوی کو ساتھ لے کر نہیں جاؤں گی اور نہ ہی اس کی کسٹڈی کے لیے کوئی قانونی مدد لوں گی۔ وہ اور میں جانتے تھے کہ آغا جان، زوی کے بغیر نہیں رہ سکیں گے، وہ ان کے خاندان کا اکلوتا وارث تھا۔ اور پھر ان دنوں جو میرے حالات تھے، میں زوی کو وہ زندگی نہیں دے سکتی تھی جو وہ ڈیزرو کرتا تھا۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ نازیہ بھی شادی شدہ تھی اور جوائنٹ فیملی میں رہتی تھی گویا اس کی سسرال میں میری کوئی جگہ نہیں تھی۔ ترکے میں چھوڑے ابا کے آبائی مکان کے علاوہ ہم دونوں بہنوں کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ بس پھر میں نے نازیہ کے مشورے سے اسی مکان میں ایک چھوٹا سا ٹیوشن سینٹر کھولا اور دھیرے، دھیرے گزر بسر کرنے لگی۔ ایسے میں، میں اپنے بیٹے کو کس طرح تکلیف میں مبتلا کرتی۔ میں عورت ہونے کے ساتھ، ساتھ ایک ماں بھی تھی شہرین۔ اگر اسے حاصل کرنے کی ضد کرتی تو شاید اس کا مستقبل برباد کر ڈالتی۔'' وہ سادہ لہجے میں جواب دینے لگیں۔ انداز ایسا تھا جیسے اپنے اس فیصلے پر انہیں کوئی پچھتاوا نہیں ہو۔

''کیا زوی کو کبھی پتا چلا اس بات کا؟ آپ کی اس قربانی کا؟'' شہرین بہت متاثر ہوئی تھی یہ سب جان کر۔

''پتا نہیں۔ یوں بھی اس سے کیا فرق پڑتا شیری۔''

''فرق پڑتا مامی۔ آپ کو نہ سہی زوی کو ضرور فرق پڑتا۔ وہ آپ سے، اپنے آپ سے ایسے ناراض نہ ہوتا۔ اپنی ماں کا اچھا تصور اس کی شخصیت کو مضبوط بناتا، اعتماد عطا کرتا۔ آپ کو اسے یہ سب بتانا چاہیے تھا مامی۔''

''اسے شہریار کے ساتھ رہنا تھا شیری۔ میں اپنی مظلومیت کی داستان سنا کر اسے اپنے والد اور خاندان سے

متنفر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ اس کے فیوچر کے لیے بھی اچھا نہیں رہتا۔ اس لیے اسے ان سب باتوں سے دور رکھا۔ مجھے اپنے کیے پر نہ پہلے کوئی ملال تھا نہ اب ہے۔ زوی سیٹ ہے، اس کا فیوچر سیکیورڈ ہے، تم جیسی پیاری لڑکی اس کی لائف پارٹنر ہے، میرے لیے یہ سب بہت ہے۔ رہ گئی میں...... تو اب وہ مجھ سے بھی خفا نہیں ہے۔ اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے۔'' عاصمہ کس قدر مطمئن تھیں۔ شہرین نے انہیں مرعوبیت سے دیکھا۔

''مگر کیا آپ شہریار ماموں کو دل سے معاف کرسکیں؟''

''میں جس روز انصاری ہاؤس سے نکلی تھی، اسی دن میں نے اپنے ساتھ ہونے والے ان حادثات کو دل سے بھلانے کا تہیہ کرلیا تھا۔ اگر کوئی میرا قصوروار تھا تو اسے بھی معاف کردیا تھا۔ بس ایک زوی کی یاد تھی جو دل سے نہیں نکلتی تھی۔ مگر دیکھو آج میرے اللہ نے اسے بھی مجھ سے ملا دیا اور کیا چاہیے مجھے۔ زندگی میں جو نہیں ملا اس کے دکھ میں مبتلا ہونے کے بجائے جو کچھ حاصل ہے اگر اس پر شکر گزاری اختیار کی جائے تو زندگی آسان ہی نہیں بلکہ حسین لگنے لگتی ہے۔''

''واقعی بہت باظرف عورت ہیں آپ۔ اُف میں کتنی لکی ہوں کہ آپ جیسی عورت میری مامی! میری ساس ہیں۔'' سنجیدگی سے کہتے، کہتے یک دم وہ شوخی سے کہہ کر عاصمہ کے گلے لگی تو وہ خوش دلی سے ہنس پڑیں۔

''بہت بڑی ڈراما کوئین ہو تم۔'' وہ بھی ہنس دی تھیں۔ دروازے کی آڑ میں رک کے کھڑے زاویار نے محبت اور مرعوبیت سے ماں کو دیکھا جس سے بحیثیت اولاد فطری محبت رکھنے کے باوجود وہ آج تک انہیں اپنے دل میں وہ مقام نہیں دے پایا تھا جس کی وہ حق دار تھیں۔ مگر ابھی چند لمحوں پہلے علم میں آنے والے انکشافات نے اس کی سوچ میں شگاف پیدا کردیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بہت کچھ سوچتا پلٹ گیا تھا۔

''زندگی میں جو نہیں ملا اس کے دکھ میں مبتلا ہونے کے بجائے جو کچھ حاصل ہے اگر اس پر شکر گزاری اختیار کی جائے تو زندگی آسان ہی نہیں بلکہ حسین بھی لگنے لگتی ہے۔''

عاصمہ کی زبان سے نکلے ان الفاظ کی بازگشت نے اس کے ذہن کو گرفت میں لے لیا تھا۔

☆☆☆

آج کتنے دنوں کے بعد لنچ ٹیبل پر عکرمہ نہیں تھا۔ مزید دو ہفتے کی چھٹیاں اس نے عمرے کے لیے لے رکھی تھیں اس لیے آج سے جوائن کرنا ضروری تھا۔ کل رات کے واقعے کے باوجود صبح عکرمہ کا رویہ بہت دوستانہ تھا جس نے اس کے احساسِ شرمندگی کو بہت حد تک کم کردیا تھا مگر اس کا دل پھر بھی اداس تھا۔ عکرمہ کے جانے کے بعد سے تو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے پاس کرنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔ پہلی بار اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے گھر ویران ہوگیا ہو۔ ایک شخص کی کمی جیسے سب کی موجودگی پر بھاری تھی۔

''ٹھیک سے کھانا کھاؤ دُرِّی۔ تمہارا دھیان کدھر ہے۔'' اسے پلیٹ میں پڑے چاولوں میں چمچہ گھماتے دیکھ کر سدرہ نے ٹوکا تھا۔

''عکرمہ بھائی کی طرف ہوگا دھیان...... اور کہاں ہوتا ہے۔'' سیف نے شوخی سے فقرہ کسا تو سب ہی مسکرا دیے۔

''فکر مت کرو شام تک آجائے گا عکرمہ۔ رات کا کھانا اس کے ساتھ ہی کھانا۔ فی الحال تو ہم سب کا تھوڑا بہت ساتھ ہی دے دیں محترمہ یا بالکل ہی بھوک اڑ گئی ہے۔'' سیف کے بعد اب سدرہ نے بھی شوخی سے اسے چھیڑا۔

''یہ تو ہے...... شوہر پاس نہ ہو تو عورت کی بھوک ایسے ہی اڑ جاتی ہے۔'' دادی بے ساختہ بولی تھیں۔ بات اتفاقاً کچھ ایسی تھی کہ خاموشی سے کھانا کھاتی ردا کے دل کو جا لگی۔ گو کہ دادی کی زبان سے یہ فقرہ بلا ارادہ نکلا تھا مگر ردا کا چہرہ یکلخت سرخ پڑ گیا۔ یک دم وہ اٹھی اور کھانا ادھورا چھوڑ کر تیز تیز قدموں سے چلتی کمرے سے نکل گئی۔ سائرہ اور دادی ارے، ارے کرتی رہ گئیں مگر وہ نہ رکی۔

pklibrary.com

''کیا ضروری تھا کہ میری بچی کا دل اس طرح دکھایا جاتا۔'' اس کے جاتے ہی سائرہ تلملا کر ان سب کی طرف پلٹی تھیں۔ پھر غصے سے سیف کو گھورا۔ ''اور تم..... تم خاموش نہیں رہ سکتے۔ تم بھائی ہو ردا کے کم از کم تم کو تو اس کے دکھ کی فکر ہونی چاہیے۔ اوروں کی خوشی میں ہر وقت کھی، کھی کرتے رہنا بس۔'' بظاہر سیف اور در پردہ اور سب کو سخت سست سنا کر سائرہ بھی ڈائننگ روم چھوڑ گئیں تو دُرِ مکنون نے مضمحل انداز میں دادی کی طرف دیکھا۔ جو خود بھی افسردہ ہو گئی تھیں۔ سدرہ کو ماں، بیٹی کی یہ حرکت حیران کر گئی تھی۔ تاہم اس وقت کچھ کہنا اسے درست نہیں لگا۔

''آپ کھانا کھائیں دادی۔ میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔'' وہ اٹھی تو دُرِ مکنون بھی اس کی تقلید میں چلی آئی۔ ردا اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے خود کو ایک بار پھر قید کر چکی تھی۔ اور باہر کھڑی سائرہ اسے پکار رہی تھیں۔

''کیا بات ہے چچی جان۔ ردا کو کیا ہوا ہے؟ سیف تو بس دُرّی کو چھیڑ رہا تھا۔ میرا اور دادی کا مقصد بھی ردا کا دل دکھانا نہیں تھا۔'' سدرہ بند دروازے کی طرف دیکھ کر فکر مندی سے پوچھتے ہوئے صفائی دینے لگی تھی۔

''پتا ہے مجھے کوئی اسے کچھ نہیں کہہ رہا تھا مگر جن حالات سے وہ گزر رہی ہے، اس نے بہت حساس بنا دیا ہے اسے۔'' سائرہ کہنے کو تو بہت کچھ کہہ سکتی تھیں مگر گھر کی بہو کے سامنے وہ بھی جو دو دن کی مہمان تھی انہوں نے اس قصے کو لپیٹنا ہی بہتر جانا۔ تاہم ان کی جلتی نگاہ نے دُرِ مکنون کا دل خاک کر ڈالا تھا۔

''جی وہ تو ہے۔'' سدرہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ ''چلیں آپ تو چل کر کھانا کھائیں۔ ردا کو میں بلا کر لاتی ہوں۔'' سائرہ کو بصد اصرار ڈائننگ میں بھیج کر سدرہ نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا تو اسے باہر آتے ہی بنی۔ روئے، روئے چہرے اور متورم آنکھوں والی ردا نے دُرِ مکنون کے تاسف کو کچھ اور بھی بڑھایا تھا۔ بھوک تو ویسے ہی نہیں تھی اب تو دل اور بھی اچاٹ ہو گیا تھا۔ مگر وہ ان دونوں کے ساتھ خاموشی سے کھانے کی ٹیبل پر آ گئی تھی۔

''دُرّی بیٹا! شام کو عکرمہ کی پسند کی کوئی خاص ڈش بنا لو۔ مگر کام ذرا جلدی ختم کر لینا۔ اس کے آنے سے پہلے اچھی طرح تیار بھی ہونا ہے تمہیں۔'' کھانا کھا کر وہ دونوں اوپر آئیں تو دادی نے اسے ہدایت دی۔ جواباً وہ سر ہلا کر کچن میں جا گھسی۔ اس وقت یوں بھی وہ خود کو مصروف کرنا چاہ رہی تھی۔ یہ کام تو ویسے بھی اس کا من پسند تھا۔

کوفتے کے ساتھ بگھارے چاول عکرمہ کو بہت پسند تھے اس نے وہی بنانے کا ارادہ کیا اور سامان فریج سے نکال کر کام میں لگ گئی اور یوں کام کرتے وقت گزرنے کا پتا بھی نہ چلا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو شام کے چار بجنے کو تھے۔ اب دادی کا دوسرا حکم ماننے کا وقت تھا۔ اس نے کمرے میں آ کر ہلکے سبز رنگ کا سوٹ نکالا جس کی تراش خراش بہت خوب صورت تھی۔ اپنے اور عکرمہ کے کپڑے پریس کر کے شاور لیا اور ہلکا پھلکا میک اپ کر کے باہر چلی آئی۔ مگر یہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی ردا کے آنسو اور کل رات کے خواب کی طرف سے وہ اپنا دھیان ہٹانے میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

عکرمہ کی واپسی سے کچھ دیر پہلے عبید اور مظفر صاحب بھی لوٹ آئے تھے۔ چائے خاصے خوشگوار ماحول میں پی گئی۔ عکرمہ نے نک سک سے سجی سنوری دُرِ مکنون کو دیکھا جس کے چہرے پر عکرمہ کی ستائشی نگاہوں نے ایک ناگفتہ بہ تاثر بیدار کر دیا تھا۔

''جاؤ بیٹا، عکرمہ صبح کا گیا اب لوٹا ہے۔ جا کر اسے کپڑے وغیرہ نکال دو۔'' عکرمہ چائے پی کر فریش ہونے اوپر چلا گیا تو دادی نے اسے نرمی سے مخاطب کر کے کہا تو وہ جی اچھا کہہ کر اٹھ گئی۔ اس بات کا خیال اسے خود ہونا چاہیے تھا، دل میں شرمندگی سی ہوئی جو اس کے شفاف چہرے سے عیاں بھی ہو گئی۔

''کم آن، سیکھ لو گی آہستہ آہستہ۔ ابھی نئی، نئی بیوی بنی ہو اس لیے کچھ باتیں سکھانی پڑ رہی ہیں تمہیں۔'' سدرہ نے شوخی سے کہا تو وہ جھینپ سی گئی۔

وہ کمرے میں آئی تو عکرمہ وضو کر کے واش روم سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کے پریس کیے ہوئے سفید شلوار سوٹ میں ملبوس آستینیں فولڈ کرتا وہ فریش لگ رہا تھا۔ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر مسکرایا۔

''how was your day سب ٹھیک رہا۔'' وہ پوچھ رہا تھا۔ جواباً اس نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

''تو کیا کیا پورا دن؟'' وہ پُرسکون انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کچھ خاص نہیں۔ دادی نے آپ کی پسند کا کھانا بنانے کو کہا تھا۔ اس لیے آج کوکنگ کی۔'' وہ سادگی سے بتانے لگی۔

''اور یہ سب اہتمام دادی کے کہنے پر کیا یا اپنے دل کی رضا سے؟'' اس کا سجا سنورا سراپا تعریفی نگاہوں میں دوڑاتے ہوئے عکرمہ نے گہرے لہجے میں سوال کیا تو وہ نظر چرا گئی۔ ''اینی وے، بہت اچھی لگ رہی ہیں۔'' اس کی خاموشی پر وہ متبسم سا کہہ گیا تھا۔

''اور آپ کا دن کیسا گزرا؟'' خود پر سے عکرمہ کی توجہ ہٹانے کے لیے اور کچھ نہ سوجھا تو اس سے سوال کر ڈالا۔

''بس ٹھیک تھا۔ میں نے بہت مس کیا آپ کو۔ گزرے چند دنوں میں آپ کا عادی ہو گیا ہوں میں۔'' اس کے سوال کے جواب میں وہ ایک بار پھر اس کو ہی موضوع بنا گیا تھا۔ وہ کیا کہتی نروس ہو کر ہونٹ کاٹنے لگی۔

''اینی وے۔ عصر کی نماز پڑھ لی ہے آپ نے یا میرے ساتھ جماعت کریں گی؟'' وہ اسے مزید پزل نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اٹھتے ہوئے مسکرا کر سوال کیا۔

''نہیں ابھی نہیں پڑھی۔ میں آپ کا ہی انتظار کر رہی تھی۔''

''زہے نصیب۔'' دُرِ مکنون کے کہنے پر بے ساختہ جواب آیا تھا۔ انداز ایسا تھا کہ دُرِ مکنون چاہ کر بھی اپنی مسکراہٹ کو لبوں پر پھیلنے سے روک نہ سکی۔ عکرمہ نے چند سیکنڈز کے لیے اسے دلچسپی سے دیکھا اور اگلے لمحے اس نے یہ حسین منظر اپنے سیل فون میں قید کر لیا تھا۔

☆☆☆

اگلا دن اتوار تھا۔ کچھ کل کی تھکن بھی تھی وہ دونوں دیر سے سو کر اٹھے۔ عاصمہ نے ان کے لیے نیا کمرا سیٹ کیا تھا۔ فرنیچر سے لے کر ڈیکور تک سب کچھ بہت خوب صورت تھا۔ شہرین کے ساتھ ساتھ زاویار بھی نہ صرف حیران تھا بلکہ احساسِ تفاخر نے اسے مغلوب کر دیا تھا۔ عاصمہ کے ایک، ایک عمل سے ان کی محبت جھلک رہی تھی۔ یہ احساس کے سب کے لیے وہ کس قدر اہم ہے دل پر چھائی کثافت کو کم کرتا جا رہا تھا۔ دس بجے وہ سو کر اٹھے تو پتا چلا مومنہ آئی ہوئی ہے مع پوری چنے کے ناشتے کے۔ وہ دونوں ناشتے ٹیبل پر آئے تو ناشتا شروع ہوا۔ گو کہ زاویار کو اس قدر بہوی ناشتے کی عادت نہیں تھی مگر خلافِ مزاج وہ خاموش رہا۔ ناشتے کے بعد وہ سب اپنے، اپنے چائے کے مگ اٹھا کر لاؤنج میں آ کر بیٹھے تو مومنہ نے دو بڑے شاپرز شہرین کے سامنے لا رکھے۔

''یہ کچھ آؤٹ فٹس میں نے آپ کے لیے تھے بھابی۔'' مومنہ نے بڑے اخلاق سے کہا تو وہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔

''اُف۔ تمہیں اس قدر تکلف کرنے کی کیا ضرورت تھی مومنہ۔'' زاویار کی طرف ''اب کیا کروں'' والی نظروں سے دیکھ کر اس نے مومنہ کو مخاطب کیا تھا۔

''لو اس میں تکلف کی کیا بات ہے۔ اس گھر کی سب سے بڑی بہو ہیں آپ۔ بہت حق بنتا ہے آپ کا۔'' مومنہ کے انداز میں محبت اور اخلاص تھا۔ زاویار نے اخبار اٹھاتے ہوئے بہن کو محبت سے دیکھا۔ ''اچھا اب آپ کھول کر تو دیکھیں کہ میری چوائس کیسی ہے۔'' اس نے اصرار کیا تو شہرین کو شاپرز کھولتے ہی بنی۔ جن میں نہایت نفیس رنگوں کے خوب صورت پارٹی ویئرز تھے۔

''یہ سب آوٹ فٹس بہت پیارے ہیں مومنہ۔ تھینک یو سو مچ۔'' اس نے مروتاً نہیں واقعتاً دل سے کہا تھا۔ اسے مومنہ کا انتخاب واقعی بہت پسند آیا تھا۔

''شکر ہے کہ آپ کو پسند آ گئے۔ چاہتی تو میں یہی تھی کہ آپ کی پسند سے جا کر لوں... مگر یہ بھی پتا تھا کہ آپ کے پاس وقت ہی کہاں ہوگا کہ ٹیلرز کے چکر لگاتی رہیں۔ اس لیے کچھ چیزیں میں نے اور ماما نے لے لی ہیں باقی آپ زوی بھائی کے ساتھ جا کر اپنی چوائس سے خرید لیجیے گا۔''

''ضرور کیوں نہیں۔'' وہ خوشدلی سے بولی تھی پھر زاویار کی طرف رخ موڑا۔ ''کل چلیں زوی؟''

''اتنا کچھ تو ہے تمہارے پاس۔ کل بھی اچھی خاصی شاپنگ کی ہے۔ کیا کرو گی اتنی چیزوں کا؟'' زاویار نے حیرت بھری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

''تم ہمیشہ ایسے ہی بورنگ رہنا۔ جبکہ مجھے تو اتنا مزہ آ رہا ہے۔ اب لگ رہا ہے کہ میری شادی ہو رہی ہے۔ ورنہ جس طرح تم نے دو گھنٹے کے نوٹس پر ہمارا نکاح ارینج کرایا تھا۔ اتنے کم وقت اور اس قدر کم تیاری میں تو کوئی اپنی برتھ ڈے بھی سیلیبریٹ نہیں کرتا ہوگا۔'' اس کے غیر واضح انکار پر وہ خفگی سے بولی تھی۔

''تمہیں پتا ہے مومنہ میرے نکاح پر میرا ڈریس صنوبر خالہ نے خریدا تھا۔''

''کیوں؟ آپ کیا کر رہی تھیں اس وقت۔'' مومنہ نے دلچسپی سے سوال کیا۔

''میں اس وقت یہ سوچنے میں مصروف تھی کہ تمہارے اس افلاطون بھائی سے شادی کروں یا نہیں۔'' جواباً وہ مزے سے بولی تو مومنہ سمیت عاصمہ بھی ہنس پڑیں۔

''زوی کو تو تم رہنے دو شیری۔ اسے کیا معلوم کہ آنے والے دنوں میں تمہیں ان کپڑوں کی کتنی ضرورت پڑنے والی ہے، اب آئے دن تم لوگ انوائٹڈ ہو گے۔ مجھے تو ابھی سے کالز آنے لگی ہیں۔ سب سے پہلی دعوت تو نازیہ کی طرف سے ہے۔ ریسیپشن کے اگلے ہی روز بلا لیا اس نے۔''

''ویٹس گریٹ۔ خوب مزہ رہے گا۔ کلثوم کی شادی پر بھی جانا ہے ہمیں۔'' وہ واقعی خوشی سے جھومی تھی۔

''میرے فرینڈز نے بھی مل کر ڈنر دینا ہے آپ دونوں کو۔ ون اور وقت آپ لوگ بتا دیجیے گا۔'' اس دوران مہران بھی آ گیا تھا۔ اس نے بھی باتوں میں حصہ لیا۔

''بالکل کیوں نہیں... ہم ضرور جائیں گے۔''

''اپنے سرتاج سے بھی پوچھ لیں بھابی۔ موصوف خاصے تنہائی پسند بلکہ آدم بیزار واقع ہوئے ہیں۔'' مہران نے زاویار کی طرف شرارت سے دیکھ کر شہرین سے کہا تھا۔

''یہ کمٹمنٹ ہم دونوں کی طرف سے سمجھو برادر۔ کیوں زوی؟'' شہرین شگفتگی سے بولی تھی۔ ساتھ، ساتھ اسے بھی باتوں میں گھسیٹا۔

زاویار نے بہ نظرِ غور شہرین کو دیکھا۔ وہ بہت خوش لگ رہی تھی۔ وہ شہرین جو نکاح کے بعد بہت سنجیدہ اور اداس لگتی تھی وہ کہیں جا چھپی تھی جیسے۔ یہ تو وہ شہرین تھی جسے وہ بچپن سے جانتا تھا..... ہنس مکھ اور زندہ دل۔ چھوٹی، چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانے والی۔

''بہت زیادہ کمٹ منٹس مت کر لینا شیری۔ ہمیں واپس لاہور بھی جانا ہے۔'' وہ کوئی سخت جواب نہیں دے سکا نرمی سے بولا۔

''کیوں لاہور کیوں؟ اب سے ہم یہیں رہیں گے کراچی میں۔''

''لو آپ کراچی کی بات کر رہی ہیں جبکہ بھائی تو پاکستان ہی چھوڑ کر جانے والے ہیں۔'' شہرین کے کہنے پر

مومنہ نے شاکی نظروں سے زاویار کو دیکھ کر کہا تو شہرین نے حیرت سے اس کی طرف رخ موڑا۔
''یہ میں کیا سن رہی ہوں زوی؟''
''کیوں بھائی آپ نے بھابی کو نہیں بتایا کہ آپ further studies کے لیے US جانے کا پلان بنائے بیٹھے ہیں؟'' زاویار کے بولنے سے پہلے ہی مہران نے اسے مخاطب کرلیا تھا۔
''اوہ نو زوی۔ تم مجھے اپنی اتنی کوالی فکیشن کے ساتھ بھی قبول ہو۔ مگر پلیز مزید پڑھنے پڑھانے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں۔ ایگزامز کے دنوں میں تم کس قدر خونخوار ہو جاتے تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' شہرین نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تو وہ اس کے غیر سنجیدہ انداز پر سر نفی میں ہلاتا وہاں سے اٹھ کر کمرے میں آبیٹھا۔
''زوی! مجھے آج ماما کی طرف جانا ہے۔ نیلی کی طرف بھی چکر لگانے کا سوچ رہی ہوں۔'' کوئی آدھے گھنٹے بعد وہ پھر حاضر تھی۔
مومنہ چائے بنانے کچن میں چلی گئی اور عاصمہ فون کال آنے پر مصروف ہوگئیں تو وہ بھی اس کے پاس اٹھ آئی۔
''او کے چلی جانا۔ میں تمہیں ڈراپ کردوں گا۔'' وہ اخبار پڑھنے میں منہمک تھا۔
''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ مومنہ مجھے ماما کے گھر تک کی رائڈ دے گی۔ وہیں سے اپنی کار لے کر میں انویٹیشن دینے بھی چلی جاؤں گی۔ تمہیں تو یوں بھی مہران کے ساتھ جا کر اپنی ادھوری شاپنگ مکمل کرنی ہے اور پھر سرفراز وغیرہ کی طرف بھی جانا ہے۔'' دل ہی دل میں وہ شیرازی ولا جانے کا ارادہ باندھ چکی تھی۔ اس لیے اسے سہولت سے انکار کرتے ہوئے کہا تو زاویار نے ہوں کہہ کر خاموشی اختیار کرلی۔
''مومنہ نے واقعی بہت تکلف کیا زوی۔ دیکھا تم نے کتنے پیارے ڈریسز ہیں۔'' ایک، ایک جوڑا خود سے لگا کر آئینے میں دیکھتے ہوئے وہ اسے مخاطب کیے ہوئے تھی۔
''ہوں۔ واقعی سب بہت اچھے ہیں۔'' اس نے اخبار تہ کر ایک طرف رکھ کر توجہ اس کی طرف مرکوز کی۔
''کون سا والا آؤٹ فٹ سب سے خوب صورت ہے۔ یہ بتاؤ، میں آج وہی پہنوں گی۔'' اس نے سب جوڑوں کے ہینگرز اٹھا کر اس کے سامنے کیے تو وہ کچھ دیر اس پر نظریں جمائے رہا اور پھر اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔ شہرین کچھ نروس سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔
''جو آؤٹ فٹ تم پہن لوگی وہ ہی خوب صورت ہو جائے گا شیری۔ چیزیں نہیں انہیں استعمال کرنے والا خوب صورت ہوتا ہے۔'' گہری نظریں اور بھاری لہجہ۔ شہرین نے استعجاب سے اسے دیکھا۔ یہ شاعری اور زاویار انصاری..... حیرت بجا تھی۔
''خیریت یہ تم شاعری کب سے کرنے لگے زوی!'' درحقیقت وہ نروس ہوگئی تھی اس لیے قصداً اس کی بات کو مذاق میں اڑانا چاہا۔
''یہ شاعری نہیں۔ تعریف ہے تمہاری۔'' اس کے ہاتھ سے کپڑے لے کر ایک طرف ڈالتے ہوئے زاویار نے اس کا رخ اپنی جانب موڑا تو وہ سٹپٹا گئی۔ اس قدر التفات کی وہ عادی تھی اور نہ ہی زاویار سے اس کی توقع تھی۔
''آئندہ سے کوشش ہوگی کہ تمہاری شان میں قصیدہ نہ سہی، زبان سے تعریفی جملے ضرور ادا کرسکوں۔''
''اوہ کم آن زوی۔ کل میں نے صرف مذاق کیا تھا، ٹرسٹ می، وہ کوئی شکوہ نہیں تھا۔'' وہ سچ مچ شرمندہ ہوگئی تھی۔ صفائی دینے کی کوشش کی۔ مگر زاویار نے نفی میں سر ہلا کر اسے خاموش کرادیا۔
''تم نے وہی کہا جو تمہارے دل میں تھا شیری۔ مجھے اندازہ ہے کہ بحیثیت بیوی تم مجھ سے بہت کچھ expect کرتی ہو اور ڈیزرو بھی۔ کوشش کروں گا کہ نیکسٹ ٹائم تمہیں شکایت نہ ہو۔'' نرم لہجے میں خوب

صورت عہد باندھتا زاویار انصاری اسے یک دم بہت اپنا سا لگا۔

''کیا ہو گیا ہے زوی۔ اب تم مجھے پزل کر رہے ہو۔''

''پزل کا تو پتا نہیں۔ ہاں مگر بلش کر رہی ہو تم اور یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ بلش کرتے ہوئے واقعی تم بہت خوب صورت لگتی ہو..... بلکہ.....''

''اُفوہ اللہ کے بندے بس بھی کرو۔'' یک دم زاویار کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید بولنے سے روکتے ہوئے وہ جھینپ کر ہنس دی تھی۔ بہت کھلی کھلی ہنسی تھی اس کی۔ زاویار نے اس کے خوشی اور حیا سے گلابی پڑتے چہرے کو دیکھا تو ہلکے سے مسکرا دیا۔

''اے میرے مالک! میرے لیے اس رشتے کو نبھانا شاید بہت سہل نہ ہو، میں کوشش کر رہا ہوں۔ تو بھی میری مدد فرما۔''

☆☆☆

''لو دیکھو دُرّی بیٹا تم سے ملنے کون آیا ہے۔'' اصغری کے بلا کر لانے پر جس وقت وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی، دادی کی خوشگوار آواز نے اس کا استقبال کیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آج شیرازی ولا میں مہمان بن کر آنے والی شخصیت شہرین انصاری کی ہوگی۔ لمحے بھر کے لیے اس کے قدم لڑکھڑا سے گئے۔

اس نے گھبرا کر وسیع ڈرائنگ روم کے کونے، کونے میں اضطراری نگاہ دوڑائی مگر وہاں کوئی نہیں تھا گویا شہرین اکیلی آئی تھی۔ اس نے رکی ہوئی سانس بحال کی اور غائب دماغی سے مسکراتی سج، سج قدم اٹھاتی ان دونوں کے پاس چلی آئی۔

''السلام علیکم آپی۔ کیسی ہیں آپ؟''

''وعلیکم السلام۔ بہت، بہت مبارک ہو دُرّی۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔'' شہرین نے اٹھ کر محبت سے اسے گلے لگا کر شوخی سے دعا دی تو دادی کے منہ سے بے ساختہ آمین کے الفاظ ادا ہوئے۔ جس پر شہرین نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا تو وہ نظر چرا گئی۔ ''میں بالکل خیریت سے ہوں اور تمہاری خیریت نیک مطلوب ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں الحمدللہ۔'' وہ بردباری سے مسکرا کر بولی۔ درحقیقت شہرین کی اچانک آمد اس کے حواس لے اڑی تھی۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسا ردِعمل دے۔ اب وہ محض شہرین نہیں تھی، اس کے مجرم کی بیوی تھی۔ ''آپ یہاں کیسے؟ آئی مین آپ کراچی کب آئیں۔''

''دیکھ لو تمہاری محبت کھینچ لائی مجھے یہاں اور ایک تم ہو کہ تم نے جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا مجھے۔'' خوشگوار لہجے میں بولتی شہرین نے شکوہ کیا تو وہ نادم ہو گئی۔

''چلو تم دونوں بیٹھ کر گلے شکوے کرو، میں جب تک چائے بنوا لوں۔'' دادی ان دونوں کو شفقت سے دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئیں تو شہرین نے فوراً سر ہلایا۔

''آپ فکر نہ کریں دادی۔ آج تو اس سے دو، دو ہاتھ کر کے ہی جاؤں گی۔'' بظاہر اس کے شوخی سے کہے گئے فقرے میں کچھ پنہاں تھا۔ دُرِمکنون نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

''ڈونٹ وری، میں بس تم سے ملنے آئی تھی اور یہ کچھ گفٹس ہیں تمہارے لیے.....'' دادی کے مسکرا کر جانے پر شہرین نے کچھ گفٹس اور ایک خوب صورت بکے اس کی طرف بڑھائے۔

''ان سب کی کیا ضرورت تھی آپی۔'' وہ ہچکچا سی گئی۔ زاویار کی کمائی سے لیے گئے یہ تحائف قبول کرنا بہت مشکل تھا اس کے لیے۔

''ضرورت نہیں، یہ میری محبت ہے اسٹوپڈ لڑکی۔'' شہرین نے اسے مصنوعی غصے سے آنکھیں دکھائیں تو وہ

عید اور بیوٹی پارلر .... تسنیم ماپارا

قصہ کچھ یوں ہے کہ ہمیں پسند نہیں کہ رمضان المبارک میں ہم مارکیٹوں میلوں ٹھیلوں کی جگہوں کو اپنا دیدار کروائیں نہ ہی ان کے دیدار کی خواہش ہمیں ہوتی ہے لیکن بس ایک وقت ایسا آ ہی جاتا ہے جب ہمیں لامحالہ اپنی خوب صورتی اجاگر کرتے بیوٹی پارلر کے درشن لازمی کرنے پڑتے ہیں۔ پچھلے وقتوں میں گلیوں میں آوازیں گونجا کرتی تھیں۔

''بھانڈے قلعی کرالو...... پرانے نوے کرالو۔''

تو بس ہمیں بھی اپنے پرانے بوتھے کو اجلوانے، چمکانے اس در پر ڈیوٹی لگوانے آنا ہی پڑا۔ پھر نہ پوچھیے...... وہاں کی رونق کی داستان، ایک جہانِ رنگ و بو جہاں بھانت، بھانت کے چہرے۔ ہر کوئی مہکنے چمکنے کو تیار ادھر سے اُدھر ایک ہاہا کاری مچی ہوئی تھی۔ کچھ داستان تو چھپی رہے تو یہی بہتر ہے ورنہ بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی۔ ''خیر خدا، خدا کر کے ہماری باری آئی تو ہمیں ایک نشست پر بٹھا دیا گیا۔ جہاں بولنا چالنا ہلنا جلنا سب منع ہے کی ہدایت دی گئی۔ پھر وہ دھلائی، شلائی ہوئی کئی، کئی اقسام کی فیس کریم، پیچ کا آزادانہ استعمال ہوا اس معصوم سے چہرے پر...... مانو رندے کی زد پر آ گیا ہو...... جھاڑ پونچھ، اٹھا پٹخ حواس ہی جواب دے گئے۔ نازک سی گردن تو کئی بار شکنجے میں جکڑی گئی کہ اف اللہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے والا حال تھا۔ من ہی من میں سوچ رہی تھی کہ اب شمیم آرا الگ سے مختلف رانی جیسا حسن پھوٹ پڑے گا۔ یہ تصور ہی دل خوش کن تھا خیر...... ایک لمبی مسافت کے بعد ایک آواز آئی۔ ماشاءاللہ آپ کا چہرہ تو خوب نکھر گیا۔ ہم نے بھی اپنی چندی آنکھوں کو بمشکل کھول کر سوچا۔ ''کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ نکھار دیکھ......'' شاعرِ مشرق سے معذرت کے ساتھ...... بس جب کاؤنٹر پر آئے تو جھاڑ پونچھ سے رندے مانجھے کے لیے ٹھیک ٹھاک جیب بھی اُدھڑی۔ خیر خوشی، خوشی گھر تشریف لائے آنکھوں میں اشتیاق بھر کر میاں جی کو دیکھا تھوڑا سا شرمائے اور پھر دل کڑا کر کے پوچھنا پڑا کہ ہم کیسے دکھ رہے ہیں (دکھ تو اس بات کا تھا اس قدر خوب صورت چہرہ دیکھ کر خود پہلے ہی سبحان اللہ کہہ دیتے تو پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آتی) ایک اچٹتی نظر ڈالی اور شکر ہے اتنا کہا۔ آپ پہلے بھی اچھی ہی دکھتی تھیں سو ویسی ہی اب بھی —— چلو پیسے وصول ہی لگے کہ پارلر یاترا کام تو آئی۔ ویسے بھی بننا، سنورنا ہمارا حق بھی تو ہے۔ کیوں ٹھیک کہا ناں——!

ہار گئی۔ ''اب ہر کوئی تمہاری طرح بے مروت تو ہونے سے رہا۔''

''آئی ایم سوری آپی۔ مجھے واقعی خیال نہیں رہا کہ آپ کو کال کرتی۔ شکریہ آپ کا کہ آپ نے پھر بھی یاد رکھا مجھے۔'' وہ واقعتاً نادم ہو گئی تھی۔ مرونا کے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''تمہیں بھولتی تو یاد کرنے کی نوبت آتی دُرّی۔'' شہرین یک دم سنجیدگی سے بولی تو وہ متعجب سی اسے دیکھنے لگی۔ ''زوی سے شادی کے بعد تو تمہیں بھولنا ویسے بھی ناممکن ہو گیا ہے۔'' بہت کچھ کہتا سنتا لہجہ تھا شہرین کا، اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

''آ...... آ آپ چائے پییں گی آپی؟'' وہ یک دم اٹھ کھڑی ہوئی تھی بوکھلا کر اس سے استفسار کیا۔

''صرف چائے ہی نہیں، میں تو آج تمہارے ساتھ کھانا بھی کھا کر جاؤں گی۔ مگر یہاں ایسے فارمل ماحول میں نہیں۔ تمہارے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں کیا خیال ہے۔'' شہرین نے سر جھٹک کر یک دم ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو وہ دل ہی دل میں فکر مند ہو گئی۔ تاہم اس نے بمشکل خود کو مسکرانے پر مجبور کرتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

''کیوں نہیں۔ آیئے۔'' پھیکے پن سے مسکراتی وہ اسے لے کر ڈرائنگ روم سے نکل آئی۔ لاؤنج میں سائرہ، اصغری سے ڈسٹنگ کروا رہی تھیں۔ شہرین سے بہت پیار سے ملیں البتہ رسٹ کلر کے سوٹ میں جگمگاتی دُرِ مکنون کے حصے میں حسبِ سابق ان کی ناراض نظریں ہی تھیں۔ وہ افسردگی سے نظر چراتی شہرین کو لے کر اوپر آئی تو سامنے لاؤنج میں بیٹھے عکرمہ کو دیکھ کر شہرین وہیں رک گئی۔

''السلام علیکم عکرمہ! کیا حال ہیں آپ کے۔'' اس کی چہکتی آواز نے ٹی وی پر چلنے والے کرنٹ افیئر کے شو میں محو عکرمہ کو متوجہ کیا تو وہ کچھ حیرت اور اخلاق کے تحت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''وعلیکم السلام۔ جی الحمدللہ۔ اللہ کا بڑا احسان ہے۔'' ایک نظر ساتھ کھڑی دُرِ مکنون کے سفید پڑتے چہرے پر ڈالتے ہوئے وہ مروت سے بولا تھا۔

''وہ تو ہے۔ دُرِ مکنون جیسا چھپا ہوا موتی ہاتھ آنا اللہ کا احسان نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ واقعی ایک لکی انسان ہیں۔'' عکرمہ کے جواب پر وہ شوخی سے ساتھ کھڑی دُرِ مکنون کے کندھے پر بازو پھیلاتے ہوئے بولی تو عکرمہ کھل کر ہنس پڑا۔

''بلاشبہ۔ اس میں تو کوئی دو رائے نہیں۔ بائی دوے آپ سنائیے، آپ کیسی ہیں؟''

''الحمدللہ۔ ہم سب بھی ٹھیک ہیں۔ میں آج خاص طور پر آپ لوگوں کو مبارک باد دینے آئی ہوں۔ اللہ آپ دونوں کو سدا خوش و آباد رکھے۔ کبھی کوئی دکھ آپ دونوں کو چھو بھی نہ پائے۔'' خلوص سے دعا دیتی شہرین کی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے جھلملا گئی تھیں۔

''آمین، تھینک یو۔ آپ کو بھی شادی کی بہت مبارک ہو، زارا سے علم ہوا تھا آپ کے بارے میں۔'' عکرمہ واقعی متاثر ہوا تھا۔

''تھینکس۔'' شہرین مسکرادی۔ ''ان فیکٹ آغا جان کی سیریس کنڈیشن کی وجہ سے بہت جلدی میں نکاح ارینج ہوا تھا ہمارا۔ اتفاق سے آپ کی اور ہماری شادیاں ایک ہی دن تھیں۔ اسی لیے عینی اور میں شرکت کے لیے کراچی نہیں آسکے حالانکہ عینی نے بہت کوشش بھی کی۔ اینی وے آج میں آپ لوگوں کو انوائٹ کرنے آئی ہوں۔ ان فیکٹ زاویار کی ماما اگلے ہفتے ہمارا ولیمہ ریسیپشن دے رہی ہیں۔ and you guys are cordially invited۔'' شولڈر بیگ سے کارڈ برآمد کرتے ہوئے شہرین نے قصداً دُرِ مکنون کے چہرے پر طائرانہ نظر ڈالی جو یک دم سرخ پڑ گیا تھا۔

''کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ آپ دونوں کو ہر صورت آنا ہوگا۔'' عکرمہ کی خاموش نظروں کو دُرِ مکنون کے چہرے پر مرتکز ہوتا دیکھ کر شہرین نے ان دونوں کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اصرار کیا تو عکرمہ نے بردباری سے مسکراتے ہوئے کارڈ اس کے ہاتھ سے تھام لیا۔

''میں دیکھتا ہوں اگر اس دن کوئی اور مصروفیت نہ ہوئی تو۔'' صاف انکار کرنا اس کی مروت کے خلاف تھا۔

''بہرحال آپ بیٹھیے تو۔ دُرِ مکنون آپ اپنی مہمان کی کوئی خاطر تواضع نہیں کریں گی کیا؟'' اس نے خاموش کھڑی درمکنون کو متوجہ کیا تو وہ بمشکل مسکرا سکی۔

''جی۔ دادی نے چائے بنوائی ہے۔ اصغری لاتی ہوگی۔''

''چلو چائے کے آنے تک ہم خوش گپیاں ہی کر لیتے ہیں۔'' شہرین نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ سر ہلا کر اس کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھی اور دو قدم آگے بڑھ کر اس نے مڑ کر عکرمہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا خوف تیرتا نظر آرہا تھا۔ جواباً عکرمہ نے اسے ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' والی نظروں سے دیکھا تو وہ گہری سانس بھر کر شہرین کی معیت میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ جہاں داخل ہوتے ہی شہرین کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''ماشاءاللہ، تم نے اپنا بیڈروم تو بہت اچھا سیٹ کیا ہے دُرّی۔'' وہ دیوار پر لگی عکرمہ اور دُرِ مکنون کی فریم شدہ تصویر کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی جو کل ہی سدرہ نے انلارج کرا کر لگائی تھی۔

''شکریہ آپی۔''

''ماشاءاللہ بہت خوب صورت جوڑی ہے تم دونوں کی۔ واقعی اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے ہماری بہتری کے لیے کرتا ہے۔ تم عکرمہ شیرازی کے علاوہ شاید کسی اور کے ساتھ اتنی حسین لگ ہی نہیں سکتی تھیں۔'' شہرین مرعوب تھی ستائشی لہجے میں بولی تو وہ اس کے آخری فقرے پر چونکی۔ جس نے اس کی دھڑکن کو تیز کر دیا تھا۔

''دادی بتا رہی تھیں کہ تم دونوں عمرے پر جا رہے ہو۔'' شہرین نے یک دم موضوع بدلا تو وہ بمشکل خود کو اس

کی طرف متوجہ کر سکی۔

''جی ان شاء اللہ!''

''اللہ تم دونوں سے اس نیکی کو قبول کرے، آمین۔'' خلوص سے دعا دیتی شہرین کی غیر مربوط باتوں سے زیادہ اس کے چہرے کا تاثر اسے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کہنا کچھ چاہ رہی ہے اور کہہ کچھ اور رہی ہے۔ ''بیت اللہ جا کر ایک دعا میرے کہنے پر بھی کرو گی دُرّی؟'' شہرین نے گہری سانس بھر کر ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور جب بولی تو اس کا جملہ ہی نہیں لہجہ بھی سوالیہ تھا۔

''جی آپی۔ ان شاء اللہ۔ آپ کہیے، کیا دعا کرنی ہے۔'' دُرِمکنون کا لہجہ بہت مدھم تھا۔

''دعا کرنا دری! کہ وہ لڑکی زوی کو معاف کر دے جس کا وہ گناہ گار ہے۔ اسے دُرِمکنون شیرازی معاف کر دے جس کے دل و زندگی کو زاویار انصاری نے اجاڑ ڈالا۔ کیا یہ دعا مانگ سکو گی دُرّی؟'' سوال تھا یا کوئی سحر جس نے اسے پتھر کر ڈالا تھا۔ وہ بنا پلک جھپکے شہرین کو دیکھنے لگی تھی، جس کی آنکھوں میں دھیرے، دھیرے آنسو جمع ہونے لگے تھے۔ اسے اپنی دھڑکن سست پڑتی محسوس ہونے لگی، ساعت پر جیسے اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

''کیا اس شخص کے لیے دعا مانگ سکو گی دری جو تمہارا مجرم ہے، میں جانتی ہوں کہ تمہیں سینے سے دل نکال کر دینے کو کہہ رہی ہوں مگر بتاؤ کیا کر سکو گی ایسا؟ اس زاویار کو اس کا گناہ بخش دو گی جو لحہ، لحہ احساسِ جرم کی آگ میں جل رہا ہے۔ زندہ ہے مگر زندگی سے کوسوں دور ہے۔ جو راتوں کو ٹرنکولائزر کی مرہونِ منت چند گھنٹوں کی نیند لیتا اور خواب میں تم سے معافی کی بھیک مانگتا ہے تڑپتا ہے۔ کسی چھوٹے بچے کی طرح پھوٹ، پھوٹ کر روتا ہے اور اپنی ہی سسکیوں کی وجہ سے جاگ اٹھتا ہے۔ یقین جانو اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا دُرّی۔'' دُرِمکنون کے چہرے پر اذیت اور دکھ کے رنگ بکھرتے دیکھ کر شہرین نے بے اختیار صفائی دی۔

''وہ سب کچھ جو اس کے اور تمہارے درمیان گزرا اس کے بارے میں تو شاید وہ خود سے بھی کچھ نہیں کہتا مگر اس کا لاشعور اس کے بس میں نہیں۔ تم کو برباد کر کے آباد وہ بھی نہیں رہا ہے دُرّی۔'' کہتے، کہتے شہرین بے اختیار رو پڑی تھی۔ دُرِمکنون کا، کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والا حال تھا۔

وہ ایک ٹک شہرین کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے کئی سال پہلے کی فلم چلنے لگی، جب وہ کسی بے بس پرندے کی طرح اس درندے کی گرفت میں پھڑ پھڑا رہی تھی، فائر کی آواز اور زاویار کے پلٹ کر بھاگنے کی دھم دھم۔ اس کی اپنی چیخیں جیسے اب بھی اس کی کانوں میں گونج رہی تھیں۔

''سالوں سے خود کو سزا دے رہا ہے وہ۔ خود پر ہر خوشی حرام کر رکھی ہے اس نے، اپنے ہر رشتے سے خود کو کاٹ کر الگ کر لیا اس نے، اپنی بہترین ڈگری کو چھوڑ کر سالوں سے ایک چھوٹی سی کمپنی میں صرف اس لیے جاب کرتا رہا کہ سرفراز کے ساتھ اس کی این جی او کے ذریعے اغوا شدہ انسانوں کو بازیاب کرا سکے۔ کبھی اپنی جان بچانے کی خاطر تمہیں اکیلا چھوڑ آیا تھا وہ۔ آج اسی جان کی اسے کوئی پروا نہیں۔ خطرناک سے خطرناک مشن پر بے جگری سے لڑتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اب وہ جینا ہی نہیں چاہتا۔ اب بھی اگر آغا جان کی زندگی بچانے کے لیے اس پر پریشر نہ ہوتا تو وہ مجھ سے شادی بھی نہیں کرتا۔ سچ تو یہ ہے دُرّی! کہ تمہاری جگہ وہ کبھی کسی کو نہیں دے سکے گا، کسی کو بھی نہیں۔''

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے شہرین یک دم پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ دُرِمکنون کا دل آگ پر رکھے کاغذ کی طرح خاک ہونے لگا، جل کر راکھ بننے لگا۔

''میں جانتی ہوں کہ ان سب باتوں سے تم کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زوی کے دکھی ہونے سے تمہارے دکھوں میں کمی نہیں ہوگی لیکن اگر تم اسے معاف کر دو تو شاید وہ دوبارہ جینے لگے۔'' شہرین کے لہجے میں منت تھی۔ عاجزی

تھی۔ دُرِمکنون نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا تو اس نے آگے بڑھ کر دُرِمکنون کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا۔

''دل پر ہاتھ رکھ کر کہنا دُرّی اگر اس وقت وہ ظالم لوگ زوی کے بجائے تمہیں اپنی جان اور عزت بچانے کا آپشن دیتے تو کیا تم زوی کے لیے جان دے دیتیں، اپنا آپ نچھاور کر دیتیں اس پر؟'' شہرین کا سوال تھا کہ گرم پانی کا چھینٹا، وہ جیسے ٹوٹ کر ہوش میں آئی۔ شہرین نے اسے جیسے زمین پر لا پٹخا تھا۔

''ایسی قربانی تو خونی یا قانونی رشتے بھی نہیں دے پاتے جبکہ تم اور زوی تو.....'' وہ نہ جانے کیا کہتے، کہتے رکی تھی۔

انسان اپنے پیاروں کو موت کے منہ سے نکالنے کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہے مگر جنہیں وہ اپنی جان کی خاطر داؤ پر لگا دے وہ پھر عزیز تو نہ ہوئے۔ تو گویا وہ زاویار انصاری کو عزیز نہیں تھی۔ یقیناً نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو جان سے زیادہ نہیں تھی۔

''پلیز مجھے غلط مت سمجھنا دُرّی، ایسا نہیں ہے کہ مجھے تمہارا دکھ نہیں۔ مگر اسے جس حال میں، میں دیکھ رہی ہوں وہ میں بتا نہیں سکتی۔ یقین کرو وہ کسی سزا سے کم نہیں۔ تمہاری کوئی بددعا رائگاں نہیں گئی دُرّی۔ میں آج تم سے زاویار کے سکھ کی بھیک مانگتی ہوں۔ جب تک تم اسے معاف نہیں کرو گی وہ خود کو اسی طرح سزا دیتا رہے گا۔ پلیز دُرِمکنون تمہیں تمہارے رحم کا واسطہ معاف کر دو اسے۔'' یک دم شہرین نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

''آپی پلیز۔ مت کریں ایسا۔'' پتھر کو جیسے کسی جادو نے ایک بار پھر زندہ کر دیا تھا۔ دُرِمکنون اس کے دونوں ہاتھ پر ماتھا ٹکا کر رو پڑی۔

''میں اب اپنی درخواست تمہاری عدالت میں چھوڑے جا رہی ہوں دُرّی۔ تم اگر ریسیپشن میں آ گئیں تو میں سمجھ لوں گی کہ تم نے میرا مان رکھ لیا، ورنہ.....'' ایک سسکی شہرین نے لبوں پر روکی تھی اور اس سے پہلے کہ دُرِمکنون کچھ کہہ پاتی وہ نرمی سے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا کر برق رفتاری سے کمرا چھوڑ گئی تھی۔ اور پیچھے دُرِمکنون ناگفتہ بہ احساس میں گھری کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

''کہاں تھیں تم۔ میں تمہیں کب سے کال کر رہا ہوں؟'' عاصمہ لاج کے پورٹیکو میں کار روک کر وہ جونہی اتری زاویار کے غصے اور فکر سے لبریز لہجے نے اس کا استقبال کیا۔

''ریلیکس زوی کیا ہو گیا ہے؟'' اس کا اطمینان قابلِ رشک تھا۔

''کیا مطلب کیا ہو گیا ہے۔ وقت دیکھا ہے تم نے۔ دوپہر کی نکلی تم رات نو بجے واپس آ رہی ہو۔ فون تمہارا بند..... اتا پتا تمہارا نہیں۔ کچھ اندازہ ہے کتنا پریشان تھا میں۔'' شہرین کے پُرسکون انداز کے برعکس وہ بری طرح برس پڑا تھا۔

''تم میرے لیے فکر کر رہے تھے زوی؟'' معصومیت کی اداکاری کرتے ہوئے اس نے آنکھیں پٹپٹائیں تو وہ اور جھنجلا گیا۔

''اسٹاپ اٹ شیری۔ میں پوچھ رہا ہوں کہاں تھیں تم اتنی دیر سے؟'' اس پر گویا قطعاً اثر نہیں ہوا۔

''افوہ۔ بتایا تو تھا کہ انویٹیشن کارڈ دینے جاؤں گی نیلی کو.....'' ٹھنک کر لاابالی پن سے جواب دیا

''کون نیلی؟''

''وہی فرنچ کلاس والی۔ اسی نے تو مجھے مشورہ دیا کہ میں ٹائیک وانڈو سیکھوں۔ مگر آغا جان کی وجہ سے ممانے منع کر دیا تھا مجھے۔ لیکن اب میں ضرور سیکھوں گی۔ کیا خیال ہے؟''

''کوئی ضرورت نہیں اس فضول کام میں پڑنے کی۔'' وہ سخت تلملایا اس بے وقت کی راگنی پر۔
''کوئی فضول کام نہیں ہے یہ۔ زبردست ایڈونچر ہے اس میں۔ مگر تم بھی ناں ہمیشہ کے بورنگ ہو زوی۔ ایڈونچر کی کوئی اسپرٹ ہی نہیں ہے تم میں۔'' اس کے سنجیدہ جواب پر شہرین نے فلسفہ جھاڑا تو وہ تمکمیں نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
''نیلی کے گھر اتنی دیر کیوں لگی تمہیں۔ میمونہ پھوپی الگ پریشان تھیں۔'' اس کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔
''ارے بھئی واپسی میں تمہارے لیے گفٹ لینے چلی گئی۔ اس لیے دیر ہوگئی۔''
''گفٹ؟ اور میرے لیے؟ کس نے کہا تھا تمہیں اس مشقت میں پڑنے کو۔'' اس کے رسانیت سے وضاحت دینے سے زاویار کا پارہ مزید چڑھ گیا تھا۔ آج کئی دن بعد اسے زاویار میں شادی سے پہلے والے زاویار کی جھلک نظر آئی۔
''کیوں، کیا کسی اپنے کو گفٹ دینا مشقت کا کام ہے۔ تمہیں تو کبھی خیال آیا نہیں کہ میرے لیے اپنی پسند سے کچھ لاؤ۔ اس پر طرّہ یہ کہ مجھ پر ہی خفا بھی ہو رہے ہو۔'' اس کے غصے کے جواب میں شہرین نے الٹا اسے ہی سنا دی تھیں۔ جس پر وہ جز بز سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ مگر کچھ تھا شہرین کی آنکھوں میں جس نے اسے ٹھٹکا دیا تھا۔
''میرے لیے گفٹ لینے گئی تھیں؟ کہاں ہے گفٹ؟'' اس کی بات کو مکمل طور پر نظر انداز کیے وہ سخت تیوروں سمیت پوچھ رہا تھا۔
''سرپرائز ہے زوی۔ بہت نایاب تحفہ ہے۔ اتنی آسانی سے بھلا کیسے ہاتھ آتا۔ سمجھو ریکویسٹ کر کے آئی ہوں۔ امید ہے ہمارے ریسپشن والے دن مل جائے گا تمہیں۔'' بھیگی آنکھوں سے مسکراتی شہرین اسے لاجواب کرتی اس کے دائیں جانب سے نکلتی چلی گئی تو وہ چاہ کر بھی مزید باز پرس نہیں کر سکا۔
''اسے کہتے ہیں اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ زوی بھائی جب ہمیں بنا بتائے غائب ہو جاتے تھے تو ذرا فکر نہیں ہوتی تھی ان کو، اب شیری بھابی کو چند گھنٹے دیر کیا ہوئی جان نکل گئی موصوف کی۔ اچھا ہے، صحیح کا pay back time آیا ہے ان پر۔'' کچن کی کھڑکی سے پورٹیکو میں ہونے والی ان دونوں کی دلچسپ گفتگو عاصمہ اور مومنہ کو سننے کو ملی تو مومنہ مزے سے بولی۔ عاصمہ بھی مسکرا دیں۔
''بس کرو۔ اب زوی سے نہ کچھ کہہ دینا۔ ویسے ہی ابھی غصے میں ہے وہ۔''
''جی پتا ہے مجھے۔ میرا دماغ خراب ہے کہ اپنی شامت بلاؤں۔ ہاں لیکن شیری بھابی سے ضرور پوچھوں گی کہ انہوں نے کیا گفٹ لیا بھائی کے لیے۔'' مومنہ کو تجسس ہو رہا تھا۔
''کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ان میاں بیوی کی آپس کی بات ہے۔ اور کیا معلوم شیری مذاق کر رہی ہو۔ اس کی شوخ طبیعت کا تو پتا ہی ہے تمہیں۔'' عاصمہ نے بیٹی کو تنبیہہ کی تو وہ ہوں کہہ کر سر ہلا گئی۔ ''اچھا تم ان سب باتوں کو چھوڑو اور ان سب کو کھانے کے لیے بلا کر لاؤ۔ میں اتنے میں ٹیبل سیٹ کرتی ہوں۔'' انہوں نے بیٹی کو کام بتایا اور مسکرا کر سالن ڈونگے میں نکالنے لگیں۔

☆☆☆

شہرین اس کے دل و دماغ میں جنگ چھیڑ کر کب کی جا چکی تھی مگر اس کے لیے وقت جیسے وہیں ٹھہر گیا تھا۔ آنسو بہہ، بہہ کر خشک ہو چکے تھے مگر وہ کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکی۔ نہ جانے شہرین صحیح تھی یا اس کا دل جو زاویار انصاری کو آج تک معاف نہیں کر سکا تھا۔ شام میں وہ دونوں عکرمہ کے کولیگز کی طرف سے جم خانہ میں مدعو تھے۔ غائب دماغی سے تیار ہو کر وہ اس کے ساتھ چلی گئی مگر دل قطعاً نہیں لگا۔ واپسی پر بھی اسے دبیز خاموشی نے گھیرا ہوا تھا جو گھر پہنچ کر بالآخر ٹوٹی۔
حسبِ معمول دادی اور مظفر صاحب کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر جب وہ دونوں اپنے کمرے میں آئے تو عکرمہ

نے اس سے اس کی خاموشی کا سبب پوچھ ہی لیا۔

''کسی کو دکھ، اذیت، رنج سے دوچار کرنے کی تلافی کیا محض دکھی ہو جانا ہے؟ کیا اعتبار کے قاتل کا احساسِ جرم میں گرفتار ہو جانا کافی ہوتا ہے؟ خواب دکھا کر انہیں پاش، پاش کرنے والے کو کیا یونہی معاف کر دینا چاہیے محض اس لیے کہ اب وہ پشیمان ہے۔'' شہرین کے ساتھ ہونے والی گفتگو عکرمہ کو سنانے کے بعد اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر سامنے بیٹھے عکرمہ سے سوال کیا تھا۔

''قصاص لے کر تو قاتل کو بھی معاف کر دیا جاتا ہے دُرِ مکنون۔ آپ کی عدالت میں معافی یا اپیل کی کیا کوئی گنجائش نہیں؟'' چند لمحوں کے توقف کے بعد عکرمہ نے گہری سانس بھر کر جواب میں سوال کر ڈالا تو اس کی آنکھوں میں یک دم تیکھا پن در آیا۔

''آپ پر بیتی ہوتی تب میں پوچھتی کہ کیا ایسا شخص معافی کے لائق ہے؟''

''خود پر بیتی محسوس کر رہا ہوں تبھی کہا ہے۔''

''محض محسوس کرنے اور سہنے میں بڑا فرق ہوتا ہے مگر آپ نہیں سمجھیں گے۔'' غصے سے کہتی وہ اٹھ کر جانے لگی تھی کہ ایک جھٹکے سے رکی۔ اس کا ہاتھ عکرمہ کے ہاتھ میں تھا۔

''پلیز بیٹھیے۔'' اس نے بہت نرم لہجے میں جیسے درخواست کی تو وہ روٹھی، روٹھی سی صوفے پر ٹک گئی۔ ''آپ اسے معاف کر دیں دُرِ مکنون۔ بس یہی ایک طریقہ ہے جس سے آپ دونوں کو دلی اطمینان مل جائے گا۔ آپ کی جگہ خود کو رکھ کر سوچتا ہوں تو دل چاہتا ہے کہ زاویار کی گردن اڑا دوں مگر جب اس کی جگہ خود کو رکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ بے بس تھا۔ خود کو بچاتا یا آپ کو۔ آپ کو بچانے کی کوشش کرتا تو بھی ایسا نہ کر پاتا۔ سو اس نے خود کو چن لیا۔'' گہری سانس لے کر اس نے کہا تو لہجہ بہت مدھم تھا۔

''اور آپ کے نزدیک یہ جرم درگزر کیے جانے کے قابل ہے؟'' دُرِ مکنون کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

''ہمیں لوگوں سے زیادہ ان سے وابستہ ہماری توقعات دکھ دیتی ہیں۔ آپ کو نہیں لگتا کہ آپ نے ایک غلط شخص سے توقع رکھی؟'' دُرِ مکنون کے دکھ سے پوچھنے پر وہ رسانیت سے بولا تو وہ ششدر سی اسے دیکھنے لگی۔

''آپ کا مطلب غلطی میری تھی؟'' بے یقینی سے سوال کیا تھا۔

''میں نے یہ نہیں کہا۔'' جواباً وہ تحمل سے گویا ہوا۔ ''میرے کہنے کا مطلب محض یہ ہے کہ وہ مذہب اور قانون کی رو سے آپ کی محافظت کا ذمے دار نہیں تھا۔ سوال یہ نہیں کہ آپ کا اعتبار کس نے توڑا، سوال یہ ہے کہ کیا آپ کو بھروسا کرنا چاہیے تھا؟'' کڑوا سچ اور وہ بھی ایسے شخص کے منہ سے سننا جسے راقم تقدیر نے اس کا جیون ساتھی بنایا تھا۔

دُرِ مکنون کی آنکھوں میں اور چہرے پر سرخی اتر آئی۔

''معاف کرنے سے بڑا کوئی صدقہ نہیں ہے۔ جو کچھ گزر گیا، اب نہ وہ آپ کے بس میں ہے نہ کسی اور کے۔ کبھی کسی کو آپ پر ترس نہیں آیا تھا۔ اور آج آپ نے اپنا دل پتھر کر لیا ہے۔ پھر کیا فرق ہے آپ میں اور دوسروں میں؟'' وہ نرم لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''میرے پاس reasons ہیں دل کو پتھر کرنے کے۔'' آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے تھے۔

''درست کہا آپ نے۔ مگر ایک بات سچ، سچ بتائیے، کیا آپ دروازے پر آئے سائل کو خالی ہاتھ لوٹانے کا حوصلہ رکھتی ہیں؟ کر سکیں گی شہرین کو مایوس؟'' عکرمہ نے ایک اور کڑا سوال کر ڈالا تھا۔ وہ لاجواب ہو کر لب بھینچے اسے دیکھنے لگی۔

''آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ ہماری زندگی میں رونما ہونے والے حادثے کبھی تو ہمارے لیے ایک wake up call ہوتے ہیں اور کبھی ہمارے ظرف کی آزمائش۔ غصے کو پی جانا اور اللہ کی خاطر اپنے مجرم کو

معاف کر دینے والے محسنین سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ محبت کرتا ہے، اسے بخش دیتا ہے۔ گویا ایک طرف صبر اور درگزر کے ذریعے کمائی جانے والی آخرت ہے تو دوسری طرف آپ کے اندر پلتی برسوں کی نفرت اور غصہ جو محض اس دنیا میں ہی رہ جائے گا۔ چاہیں تو آخرت چن لیں یا پھر دنیا۔ the choice is yours۔"

شہرین کا دیا ہوا انویٹیشن کارڈ ڈریسنگ ٹیبل پر اس کے سامنے رکھ کر عکرمہ اس پر سوچ کا ایک نیا در وا کرتے ہوئے کمرا چھوڑ گیا تو وہ ایک بار پھر اکیلی رہ گئی۔ مگر اس بار وہ پہلے کی طرح سوچ نہیں پا رہی تھی۔ عکرمہ اور شہرین کی باتوں نے زاویار انصاری کے لیے اس کے آئینہ دل پر جمی نفرت کی گرد کو کسی حد تک دھندلا دیا تھا۔

"یا اللہ مجھے صحیح راستہ دکھا۔" جب کچھ سمجھ نہیں آیا تو وہ سجدے میں گر کر مناجات کرنے لگی۔

☆☆☆

جارجٹ کی سرخ ساڑی کے ساتھ پوری آستینوں والے بلیک بلاؤز میں ملبوس بالوں کا خوب صورت اونچا سا جوڑا بنائے، نفیس میک اپ اور نازک جیولری پہنے شہرین، کلثوم کی شادی میں جانے کے لیے مکمل تیار تھی۔ پرفیوم خود پر اسپرے کرتے ہوئے وہ خود کو تنقیدی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ زاویار اندر داخل ہوا۔

"اور کتنی دیر ہے شیری۔ اب تو نازیہ خالہ بھی پہنچ چکی ہیں۔ تمہیں چلنا ہے یا ....." وہ کوئی تیسری بار اسے بلانے آیا تھا مگر اس بار جملہ مکمل نہیں کر سکا۔ ہمہ وقت بالوں کو کھلا رکھنے یا پونی جھلانے والی شہرین کے برعکس یہ کوئی اور ہی شخصیت تھی۔ وہ واقعی اس وقت ہوش ربا لگ رہی تھی۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" اس کے کمرے میں داخل ہونے پر وہ زاویار کی طرف مڑی تو اس کی پُرشوق نظریں خود پر مرکوز دیکھ کر کھل سی گئی۔ ناز سے سوال کیا۔

"gorgeous" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تو شہرین کا چہرہ یک دم لو دینے لگا۔

"تھینک یو۔" ہمیشہ کی پُراعتماد شہرین اس لمحے محجوب سی ہو گئی۔

"تھینک یو کی کیا بات ہے۔ میں نے وہ ہی کہا جو تم اس وقت لگ رہی ہو۔" زاویار درحقیقت مرعوب ہوا تھا۔

"مجھے پتا نہیں تھا کہ تم واقعی اتنی خوب صورت ہو۔"

"دیکھ لو کتنے لکی ہو تم۔" وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی تو وہ بھی مسکرا دیا۔ "اب اس بات پر ایک سیلفی تو بنتی ہے پارٹنر۔" اس سے پہلے کہ وہ منع کرتا یک دم شہرین نے اس کے کندھے پر سر رکھ کر سیلفی لے لی تھی۔ معلوم تھا کہ ذرا بھی دیر کی تو وہ منع کر دے گا۔ سخت چڑتھی اسے سیلفی بنانے سے۔

"تم کب بڑی ہو گی شہرین؟" ہلکی سی خفگی سے اس نے پوچھا تھا۔

"جب تم بوڑھے ہو جاؤ گے۔" پٹ جواب آیا تھا۔ مسکرا کر اسے چڑانے والی نظروں سے دیکھتی وہ باہر کی جانب قدم بڑھا گئی تو وہ بھی سر نفی میں ہلاتا اس کے عقب میں متوازن قدم اٹھاتا چلا آیا۔

کلثوم کی شادی کا فنکشن سادہ مگر بہت اچھا تھا۔ سارا انتظام سرفراز اور اس کے ساتھیوں نے مل کر کیا تھا۔ ان دونوں کو آتا دیکھ کر کلثوم اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے استقبال کے لیے اسٹیج سے نیچے آئی تھی۔ اس کے والدین اور بہن بھائی سب بہت مشکر تھے۔ سرفراز بھی موجود تھا۔

"بہت، بہت مبارک ہو کلثوم۔" گلے اور ایک لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے شہرین نے اسے خلوص سے مبارک باد دی۔

"ان سب کی کیا ضرورت تھی شہرین۔ یقین کیجیے میرے لیے تو آپ کا آنا ہی کسی قیمتی تحفے سے کم نہیں ہے۔"

"وہ ہی تو..... میں نے بھی زوی سے یہی کہا تھا کہ کلثوم کے لیے تو میرا جانا ہی کافی ہو گا۔ مگر یہ مانا ہی نہیں۔ کہنے لگا رسم دنیا اور دستور بھی تو فالو کرنے ہوتے ہیں۔" جواباً شہرین نے کچھ ایسی بے ساختگی بھری شوخی سے کہا کہ

کلثوم نے ایک سیکنڈ کے لیے اسے حیرت سے دیکھا تھا اور پھر یک دم کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔
''ماشاءاللہ تھنی دلچسپ شخصیت ہے آپ کی۔'' کلثوم کو وہ بہت اچھی لگی۔ ''زاویار صاحب نے صحیح کہا تھا آپ واقعی بہت اچھی ہیں۔ بہت خوش نصیب ہیں زاویار صاحب۔'' طبقاتی فرق کے باوجود شہرین جس ملنساری اور دوستانہ انداز میں اس سے ملی، اس نے کلثوم کا دل بڑھا دیا تھا۔ زاویار کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے توصیفی انداز میں کہا۔
''بلاشبہ اس میں تو کوئی دو رائے نہیں۔'' اس بار جواب سرفراز کی طرف سے آیا۔
شہرین نے اسے شوخی بھری فخریہ نظروں سے دیکھا اور بے اختیار بولی ''سن لو۔'' انداز ایسا تھا کہ سرفراز اور کلثوم سمیت زاویار بھی خود کو مسکرانے سے نہ روک سکا۔ اور اس حسین منظر کو وہاں موجود فوٹو گرافر نے کیمرے میں قید کرلیا۔
''کیا بات ہے شیری! جب سے تم نیلی سے مل کر آئی ہو، بہت خوش ہو۔ ایسا کیا کہہ دیا ہے اس نے تم سے؟''
واپسی پر شہرین خوشگوار انداز میں باتیں کررہی تھی کہ اسے خاموشی سے سنتے زاویار نے یک دم استفسار کیا۔
شہرین کی برق رفتاری سے چلتی زبان کو یک دم بریک لگا۔ دُرِمکنون کا خیال ذہن کے پردے پر سرسرایا تو وہ ترچھی نظر سے اسے دیکھنے لگی۔
''جب تم میری دوست سے ملو گے تب خود پتا چل جائے گا۔ وہ ہے ہی ایسی کہ اس سے مل کر دل خوش ہوجائے گا تمہارا۔''
''ایک غیر عورت سے مل کر تمہارے شوہر کا دل خوش ہو، یہ بات تمہارے نزدیک باعثِ مسرت ہے؟''
زاویار کے سنجیدہ لہجے میں حیرت تھی جس پر شہرین کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔
''لو بھلا وہ غیر کب ہے؟ بہت پیاری ہے وہ مجھے۔ تم دیکھنا جب وہ آئے گی تو جیسے چراغوں میں روشنی اتر آئے گی۔'' شہرین کا لہجہ گہرا تھا۔ مگر چہرے پر غیر سنجیدگی تھی۔ زاویار نے اسے ایک نظر دیکھا اور پھر سر نفی میں جھٹک کر ڈرائیو کرنے لگا۔

☆☆☆

صبح کی فلائٹ سے عبید، سدرہ اور بچے سڈنی لوٹ گئے تو جیسے شیرازی ولاز میں سناٹا سا چھا گیا۔ اور سناٹا تو دُرِمکنون کے اندر بھی دور تک بچھ گیا تھا۔ شہرین کا آنا اور عبید بھائی کی فیملی کا واپس چلے جانا دو ایسے عوامل تھے جنہیں وہ چاہ کر بھی ذہن سے جھٹک نہیں پارہی تھی۔ خاص طور پر جانے سے پہلے سدرہ نے جو الفاظ کہے وہ اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کررہے تھے۔
فلائٹ سے کچھ گھنٹے پہلے حسبِ معمول ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ شام کو معاذ ان کے کمرے میں اپنا ویڈیو گیم بھول گیا تھا۔ صبح، صبح کسی کے کمرے میں دستک دینا گو کہ سدرہ کو سخت ناگوار محسوس ہورہا تھا مگر گیم لینا بھی ضروری تھا۔ نہیں تو راستے بھر معاذ اس کا سر کھاتا۔ لہٰذا اسے چار و ناچار دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ دُرِمکنون واش روم میں فجر کے لیے وضو کررہی تھی۔ اسے لگا جیسے ملحقہ کمرے سے عکرمہ نے دستک دی ہے۔ اس لیے وہیں سے ''آجایئے'' کہہ کر وضو مکمل کیا۔ باہر نکلی تو سدرہ کو ہاتھ میں وڈیو گیم تھامے کمرے کے دروازے کے پاس کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔
جو کچھ فکرمندی سے کبھی اسے دیکھتی اور کبھی ملحقہ کمرے کے دروازے کو جس کے اوپر کھینچا کرٹن اب ہٹا دیا گیا تھا۔ سدرہ نے دیکھا کہ بستر کی چادر صرف داہنے طرف سے شکن آلود تھی۔ جو اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ اس بیڈ کو صرف ایک ہی فرد نے استعمال کیا ہے۔
''عکرمہ کہاں ہے دُرِی؟'' گہری سوچ سمیت سدرہ اس کے قریب چلی آئی تھی جس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھرنا شروع ہوگئی تھیں۔ جواباً اس نے مجرمانہ انداز میں سر جھکا لیا تھا۔ کیا بتاتی اسے کہ عکرمہ اس کی....

بے اعتباری کی وجہ سے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔'' جو میں سوچ رہی ہوں کیا وہ سچ ہے دُرّی؟'' اس کی خاموشی پر سدرہ نے پریشانی سے سوال کیا تو وہ لب بھینچ کر اسے دیکھنے لگی۔

'' کوئی وجہ اتنی بڑی نہیں ہو سکتی دُرّی کہ تم دونوں اپنے روم الگ کر لو۔ پلیز اپنے معاملات کو بیٹھ کر بات چیت کے ذریعے حل کرو۔ ابھی تمہاری شادی کو وقت ہی کتنا ہوا ہے کہ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے۔'' سدرہ نہ صرف حیران تھی بلکہ تردد اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ ''دُرِّمکنون! پلیز مجھے سچ بتاؤ کیا اس دوری کی وجہ عکرمہ کا کوئی رویّہ ہے، کیا اس نے ہرٹ کیا ہے تمہیں؟ یقین کرو اگر غلطی اس کی ہوئی تو میں اس کے کان کھینچوں گی۔'' سدرہ کو واقعتاً یہ سب جان کر دکھ پہنچا تھا۔

''نہیں بھابی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' جھوٹ بولنے کا ہنر وہ کب کا بھول چکی تھی۔ اور سچ کہنے کا یارا نہیں تھا۔ ''بس یونہی ذرا سی خفگی ہے۔''

''اس ذرا سی خفگی کو مزید بڑھنے مت دینا دُرّی۔ میاں بیوی کا آپس میں یوں فاصلے پیدا کرنا بہت آسان ہوتا ہے مگر یقین کرو، جب ان کو سمیٹنا پڑے تو اپنی انا پر پاؤں رکھنا بہت تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ خیال رہے، کبھی، کبھی ہاتھوں سے لگائی گرہیں دانتوں سے کھولنا پڑتی ہیں۔'' سدرہ کا ناصحانہ انداز اپنائیت بھرا تھا۔ ''وعدہ کرو کہ تم اس نوبت کو آنے نہیں دو گی۔ اور عکرمہ کو منا لو گی۔ اپنی زندگی کے ان خوب صورت دنوں کو اس طرح ضائع مت کرو لڑکی۔ گزرتا وقت کبھی پلٹ کر نہیں آتا۔'' اس کے جھکے سر کو تھپکتے ہوئے وہ بولی تو دُرِّمکنون بمشکل سر ہلا سکی۔

''اگر تم کہو تو میں بات کروں عکرمہ سے؟''

''نہیں پلیز۔'' اس نے گھبرا کر ملحقہ کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ کر بے اختیار سدرہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ''اس کی کوئی ضرورت نہیں بھابی۔ میری آپ سے ریکوئسٹ ہے کہ آپ کسی سے بھی کچھ نہیں کہیں گی۔ پلیز وعدہ کریں مجھ سے۔''

''اوکے مگر تم بھی وعدہ کرو کہ ان فاصلوں کو سمیٹ لو گی۔ آئی سمجھ میں۔'' اس کی غیر ہوتی حالت کے پیشِ نظر سدرہ کو وعدہ کرتے ہی بنی۔ جواباً اس نے ایک بار پھر سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ سدرہ تو چلی گئی تھی مگر اس کی الجھنوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

پورا دن وہ خود میں گم رہی۔ بولتی تو وہ ویسے بھی کم تھی اب تو جیسے زبان پر تالا ہی لگ گیا تھا۔ رات جب عکرمہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ خلافِ معمول ایک بار پھر صوفے پر لیٹی سر منہ لپیٹ کر سو چکی تھی۔ وہ کچھ حیرت سے اسے دیکھتا ملحقہ کمرے کے دروازے کو کھولنے لگا تو پتا چلا کہ وہ مقفل ہے اور اس کی چابی جو کی ہول میں لگی رہتی تھی وہ بھی غائب تھی۔ گویا دُرِّمکنون نے قصداً اس کمرے کو مقفل کیا تھا اور وہ نہیں چاہتی کہ عکرمہ دوسرے کمرے میں جائے۔

''نہ جانے اب اس بیوقوف لڑکی نے کیا ٹھان لی ہے۔'' گہری سانس بھر کر بیڈ پر لیٹتے ہوئے اس نے سوچا اور پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

''پیاری دُرّی! آج کی تقریب میں تمہارا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ امید ہے تم میرا مان رکھ سکو گی۔'' عکرمہ صبح انسٹی ٹیوٹ کے لیے نکلنے لگا تھا کہ سیل فون پر آنے والے شہرین کے میسج نے توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی۔ جسے اس نے خاموشی سے دُرِّمکنون کے سامنے لا رکھا۔

عکرمہ کے لاکھ کہنے پر بھی وہ اپنا سیل فون استعمال نہیں کرتی تھی نہ ہی اس کا نمبر کسی کو دے رکھا تھا۔ لہٰذا عینی اور شہرین کے پیغامات عکرمہ کے فون پر ہی آتے تھے۔ پیغام پڑھ کر اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے سر کو جھکا لیا تھا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی آپ کے پاس سوچنے کے لیے کئی گھنٹے ہیں۔ اپنے دل سے مشورہ کر لیں، دماغ سے رائے لے لیں۔ امید ہے کہ کوئی نہ کوئی فیصلہ بالآخر آپ کر ہی لیں گی۔''

''یہ سب بہت تکلیف دہ ہوگا میرے لیے۔'' حوصلہ افزا مسکراہٹ بکھیرتے عکرمہ نے بردباری سے کہا تو وہ بیچارگی سے فقط اتنا ہی کہہ سکی۔

''جانتا ہوں۔ مگر کچھ زخموں کا علاج جراحی ہی ہوتا ہے۔ بقول فیض احمد فیض۔

تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا..... تیرے سوا..... تیرے سوا.....!''

گہرے سنجیدہ لہجے میں کہہ کر وہ باہر کی جانب قدم بڑھا گیا تو وہ سست قدموں سے چلتی واپس کمرے میں آبیٹھی۔

''کیا کروں یا اللہ۔ اس دل کو کیسے راضی کروں؟ وہ جس نے زندگی کا سب سے بڑا غم دیا اس کی خوشی میں کیسے شرکت کروں۔'' وہ سوچنے لگی۔

''وہ مذہب اور قانون کی رو سے آپ کی محافظت کا ذمے دار نہیں تھا۔ سوال یہ نہیں کہ آپ کا اعتبار کس نے توڑا، سوال یہ ہے کہ کیا آپ کو بھروسا کرنا چاہیے تھا؟'' حسب سابق وہ خود ترسی میں گھری سوچ جا رہی تھی کہ اچانک عکرمہ کے الفاظ حافظے کے پردے پر ابھرے اور وہ تھم سی گئی۔

''دل پر ہاتھ رکھ کر کہنا ڈری اگر اس وقت وہ ظالم لوگ زوی کے بجائے تمہیں اپنی جان اور عزت بچانے کا آپشن دیتے تو کیا تم زوی کے لیے جان دے دیتیں، اپنا آپ نچھاور کر دیتیں اس پر؟'' شہرین کا کڑا سوال تبھی اس کے حافظے سے جھانکنے لگا تھا۔

''تو کیا واقعی زاویار انصاری قابل معافی ہے؟ کیا مجھے شیری آپی کا مان رکھنا چاہیے۔'' وہ خود سے سوال کرنے لگی تھی اور جب کچھ نہ سمجھ میں آیا تو اس نے مصلی بچھا کر دو رکعت نفل ادا کیے اور دراز میں رکھا دعاؤں والا کتابچہ نکال کر دعائے استخارہ پڑھنے لگی۔

''اے اللہ! بے شک میں تجھ سے تیرے علم کی بدولت خیر طلب کرتی ہوں اور تیری قدرت کی بدولت تجھ سے طاقت مانگتی ہوں اور تیرے فضل عظیم کی طلبگار ہوں کہ بے شک تو ہی قدرت رکھتا ہے اور مجھے کوئی قدرت نہیں۔ علم تجھ ہی کو ہے اور میں کچھ نہیں جانتی اور تو تمام پوشیدہ باتوں کو جاننے والا ہے۔ اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام (جس کے لیے میں استخارہ کر رہی ہوں) میرے دین، معاش اور میرے کام کے انجام کے اعتبار سے میرے لیے بہتر ہے تو اسے میرے لیے مقدر کر دے۔ پھر اس میں مجھے برکت عطا کر اور اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے دین، معاش اور میرے کام کے اعتبار سے برا ہے تو اسے مجھ سے دور کر دے اور مجھے بھی اس سے ہٹا دے۔ پھر میرے لیے خیر مقدر فرما دے، جہاں بھی وہ ہو اور اس پر میرے دل کو مطمئن کر دے۔'' صحیح بخاری 1162 (ترجمہ دعائے استخارہ)

☆☆☆

بخت کے تخت سے یکلخت اتارا ہوا شخص
تم نے دیکھا ہے کبھی جیت کے ہارا ہوا شخص
کب کسی قرب کی جنت کا تمنائی ہے
یہ تیرے ہجر کے دوزخ سے گزارا ہوا شخص
بعد مدت کے وہی خواب ہے پھر آنکھوں میں

دُرِمکنون کا سامنا اور وہ بھی آج کے دن جب وہ دلہن بنی ستاروں کی طرح چمکتی دمکتی شہرین کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت وہ دونوں اسٹیج پر اکیلے موجود تھے جہاں اب صرف دونوں کی تصاویر بنائی جارہی تھیں۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں گزرے پانچ سال اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے۔ کئی ماہ وسال پہلے اس کا دل دُرِمکنون کے لیے دھڑکا تھا اور آج ایک بار پھر دل کی دھڑکن نے اپنی رفتار بھولی تھی۔ مگر کچھ تھا جو مختلف تھا۔ اس بار اسے دُرِمکنون خود سے بہت دور نظر آئی۔

وہ جسے دیکھ کر کبھی دل میں اپنائیت کا گہرا احساس جاگزیں ہوتا تھا، وہ اس بار مفقود تھا۔ یہ وہ دُرِمکنون زاہد علی تو نہیں تھی، جسے وہ چاہتا تھا، جسے وہ جانتا تھا، یہ تو دُرِمکنون شیرازی تھی، عکرمہ شیرازی کی شریکِ حیات، ایک محصنہ، نکاح کے محفوظ قلعے میں محصور ایک ایسی عورت جس کو اپنے تصور میں لانا بھی اس کے لیے ممنوع ہو چکا تھا۔

محبت کے پُرحدت احساس کی جگہ تعظیم نے لی تو وہ نامحسوس انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ درحقیقت وہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ وہ اسے دیکھ کر حیران زیادہ ہوا ہے یا متفکر۔

دُرِمکنون اس وقت دراز قد عکرمہ کے پہلو میں چلتی ریسیپشن ہال میں داخل ہو رہی تھی۔ زاویار کو نہیں معلوم کس چیز نے بروقت استقبالیہ کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ اور پھر اس کی نگاہیں جیسے اس جوڑے پر جم سی گئیں۔ دراز قد عکرمہ اس کی طرف جھکا کچھ کہہ رہا تھا، جو اس وقت ہنی کلر کے نفیس و نازک کام والے اسٹائلش سوٹ میں ملبوس بہت جاذب نظر لگ رہی تھی۔

''حوصلہ رکھیں۔ میں ہوں آپ کے ساتھ۔'' ہال کے اندر داخل ہوتے ہی دُرِمکنون کے قدم رگوں میں دوڑتے بھاگتے خون کی طرح سست پڑے تو بظاہر سامنے کی سمت میں دیکھتے عکرمہ نے اس کا یخ پڑتا ہاتھ تھام کر حوصلہ دیا تھا۔

''مجھ میں کسی کو بھی فیس کرنے کی ہمت نہیں۔'' یہاں تک بھی وہ نہ جانے کیسے آگئی تھی۔ اور اب جبکہ دو ہاتھ لب بام رہ گئے تھے، حوصلے کی طنابیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ رہی تھیں۔ لرزتے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ... بے دھیانی میں عکرمہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما۔

''آپ یہاں شہرین کی اور اپنی دوست عینی کے بھائی کی خوشی میں شریک ہونے آئی ہیں۔ کسی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہونے کے لیے نہیں۔ ٹیک اٹ ایزی۔'' مشکل سے مشکل وقت میں اس مہربان شخص کا ساتھ اسے زندگی کی خوب صورتی اور مثبت پہلو کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس وقت بھی عکرمہ کا دھیمے پن سے مسکرا کر کہنا اس کی ہمت کو بڑھانے کا سبب بنا۔

''آپ کو امید ہے کہ میرے یہاں آنے سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا؟''

''امید نہیں یقین ہے۔ سب کچھ نہ سہی، کچھ نہ کچھ ضرور بہتر ہوگا۔'' وہ عکرمہ ہی کیا جو کسی منفی سوچ کو خود پر حاوی ہونے دے۔ ''بی پازیٹو۔ چلیے چل کر شہرین کو وش کریں۔'' دھیمی آواز میں جواباً اس نے کہا تھا۔

''ہائے دُرِی۔'' اور ابھی وہ عکرمہ کی بات پر ہمت مجتمع کر کے آگے بڑھنے ہی لگی تھی۔ ایک خوشگوار چیخ نے ان دونوں کو آواز کی سمت میں دیکھنے پر مجبور کیا۔ عینی اسے دور سے پکار رہی تھی اور پھر ذرا دیر میں تیز، تیز قدموں سے چلتی اس کے گلے آلگی تھی۔ ''اُف میرے اللہ۔ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ تم یہاں کیسے بے مروت لڑکی، جب میں نے تم سے ملنے کی سب امیدیں توڑ ڈالیں تم نے اچانک آکر مجھے خوشی سے پاگل کر دیا ہے۔'' اسے خود سے الگ کر کے عینی اسے بے انتہا خوشی اور حد درجے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

''تمہیں شیری آپی نے بلایا تھا؟ اُف کس قدر زبردست سرپرائز دیا ہے تم نے یہاں آکر۔ اوہ میری سب

سے پیاری دوست تمہارے بغیر میری یہ خوشی تھی ادھوری تھی، کیا بتاؤں۔'' عینی خوشی سے بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔
دُرِمکنون اس درجے عزت افزائی پر نظر جھکا گئی۔
''اوہ السلام علیکم عکرمہ بھائی۔ سوری میں نے تو آپ کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ کیسے ہیں آپ؟'' عینی کے حواس ذرا بحال ہوئے تو ساتھ کھڑے عکرمہ کو سلام کرنے کا خیال آیا۔
''الحمدللہ۔ کرم ہے اللہ کا۔ آپ سنائیے۔''
''اُف کیا سناؤں۔ زوی بھائی کی شادی سے زیادہ تو آپ لوگوں کی آمد نے دل خوش کر دیا ہے۔ ویسے ماشااللہ ..... آپ دونوں ایک ساتھ کتنے زبردست لگ رہے ہیں۔'' عینی حسبِ عادت نان اسٹاپ بول رہی تھی۔ ساتھ ہی ذرا غور سے دونوں کو دیکھا تو بے ساختہ تعریف کی۔
''شکریہ۔ حسنِ نظر ہے آپ کا۔'' وہ بردباری سے کہہ گیا تھا۔
''یہ میرا حسنِ نظر نہیں ان موصوفہ کا حسنِ جہاں سوز ہے، اس پر آپ کی ڈیشنگ پرسینیلیٹی۔ بڑی خوب جوڑی بنائی ہے اللہ تعالیٰ نے۔ مگر میرے بھائی کا کپل بھی بہت شاندار ہے۔'' عینی کو ان دونوں کی توصیف میں رطب اللسان ہوتے ہوئے اپنے بھائی کا بروقت خیال آیا۔
''بلاشبہ۔ اللہ کا ہر فیصلہ اپنی جگہ پرفیکٹ اور خوب صورت ہوتا ہے۔'' دُرِمکنون اب بھی خاموش رہی تھی۔ عکرمہ نے متوازن لہجے میں تعریف کی تو دُرِمکنون نے ایک نظر عکرمہ پر ڈال کر فاصلے سے بنے اسٹیج کی طرف اٹھائی۔ اس دوران شہرین کی نظر بھی ان پر پڑ گئی تھی۔ زاویار کے اس طرح اچانک کھڑے ہو جانے پر اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تھا اس نے۔
''بالکل، جیسے آپ کی اور دُرّی کی جوڑی اور جیسے شیری آپی اور زوی بھائی کا کپل۔'' عینی نے سرخوشی سے سر ہلا کر تائید کی تھی۔ اور انہیں لے کر آگے بڑھی۔
''زوی! دیکھا تم نے، دُرّی آ گئی۔ مجھے یقین تھا وہ میرا مان ضرور رکھے گی۔'' خوشی اور بے یقینی سے شہرین کی آواز کانپ سی گئی۔ زاویار کا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے وہ بے ساختہ بولی۔
''کیا تم نے انہیں بلایا تھا......؟'' زاویار نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔
''ہاں یہی تو ہے میرا وہ گفٹ جس کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ اور یہی ہے میری وہ دوست جس کا آنا اس بات کی تائید ہے کہ اس نے تمہیں معاف کیا، ہے ناں یہ تمہارے لیے باعثِ خوشی؟'' ہلکی آواز میں کہتی شہرین اسے محبت اور امید سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کیا کہتا، شہرین اور دُرِمکنون دونوں نے اسے حیرت سے گنگ کر دیا تھا۔
اس سے پہلے کہ وہ عینی کی معیت میں اسٹیج تک آتی شہرین خود اتر کر اس پاس آئی تو وہ اس درجے قدر افزائی پر شرمندہ ہونے لگی۔
''بہت مبارک ہو شیری آپی۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔'' تازہ پھولوں کا گلدستہ اور گفٹ شہرین کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے خلوص سے دعا دی تو شہرین نے فرطِ جذبات سے اسے گلے لگا لیا۔
''تم آ گئی ہو، دعا دے رہی ہو تو یقین ہے کہ اب ان شاء اللہ ہم واقعی خوش رہیں گے۔'' شہرین کی سرگوشی سماعت کا حصہ بنی تو اس نے دل میں سکون اترتا محسوس کیا۔ بے اختیار نظر شہرین کے عقب میں اسٹیج کے پہلے اسٹیپ پر رکے کھڑے زاویار کی طرف اٹھی۔ جو حیرت اور شکر گزاری کے ملے جلے احساسات چہرے پر سجائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
نہ دُرِمکنون نے کہا کہ میں نے تمہیں معاف کیا زاویار انصاری اور نہ زاویار کو معافی طلب کرنے کے لیے لب کشائی کی ضرورت پڑی۔ سب ان کہے الفاظ گویا ان دونوں کی آنکھوں میں تحریر تھے۔ جن میں ہلکی سی نمی

اتری تو دونوں نے رخ پھیر لیا۔
پھر وہاں عینی کی فیملی کا ہر شخص اس سے بہت پیار سے ملا، سب نے مبارک باد، تعریف اور خلوص سے نوازا تو اس کا دل کھل سا گیا۔ خاص طور پر آغا جان جن سے وہ ہمیشہ گھبراتی تھی، عکرمہ اور اس سے بہت شفقت سے ملے۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر انہوں نے ایک بھاری رقم اس کے ہاتھ پر رکھنا چاہی تو اس نے سٹپٹا کر ہاتھ پیچھے کر لیا۔
''نہیں پلیز۔''
''رکھ لو بیٹا۔ تم ہمارے لیے عینی جیسی ہو۔ بیٹیاں باپ کے یہاں سے خالی ہاتھ جاتی اچھی نہیں لگتیں۔ ہم پر بہت حق ہے تمہارا۔ تم رکھ لو گی تو مجھے خوشی ہوگی۔'' آغا جان کے لہجے میں شفقت بھرے اصرار کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔ دُرِ مکنون بہت متاثر ہوئی اور بے اختیار عکرمہ کی طرف دیکھا۔
''اسے منع مت کیجیے گا بیٹا۔ یہ بچی مجھے بہت عزیز ہے۔'' اس سے پہلے کہ عکرمہ کچھ کہتا یا اسے کوئی اشارہ کرتا، آغا جان نے اسے مخاطب کر کے ان دونوں کے لیے انکار کی سب راہیں مسدود کر ڈالیں تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر رہ گیا۔ اب کہنے سننے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔
''شاباش۔ تم جیسی فرمانبردار بیٹی سے مجھے یہی امید تھی کہ تم اپنے آغا جان کا مان رکھو گی۔ سدا خوش و آباد رہو۔'' آغا جان کا دعائیہ لہجہ اس کا مان بڑھا گیا۔

☆☆☆

''کیا آپ خفا ہیں؟'' شہرین کے استقبالیے سے واپسی پر عکرمہ لباس تبدیل کر کے واش روم سے نکلا تو ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی دُرِ مکنون نے بے ساختہ پوچھا۔ عکرمہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ آئینے

قارئینِ بیرونِ ملک متوجہ ہوں!

محکمہ ڈاک نے دوسری مرتبہ بیرون ملک ڈاک خرچ پر
تقریباً 200 سے 250 فیصد اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے
ہم بحالت مجبوری بیرون ملک ڈاک خرچ میں اضافہ کر رہے ہیں۔

جو کہ اس ماہ نومبر 2020 سے لاگو ہوگا جس کی
تفصیل تمام رسائل میں فراہم کر دی گئی ہے۔

سرکولیشن منیجر
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

میں اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ چہرے سے فکرمندی جھلک رہی تھی۔ تقریب سے واپس آ کر اس نے حجاب اتار دیا تھا اور اب بالوں میں سست روی سے برش پھیرتی وہ اس کی طرف متوجہ تھی۔

''نہیں تو۔ ایسا کیوں لگا آپ کو؟'' الماری سے ہینگر نکال کر کوٹ ٹانگتے ہوئے عکرمہ نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

''واپسی پر گاڑی میں آپ بہت خاموش تھے اور اب گھر آ کر بھی چپ، چپ ہیں۔''

''I'm really honoured تو گویا ہماری مسز ہمیں نوٹ بھی کرتی ہیں۔ میں ناحق بے نیاز سمجھتا رہا آپ کو۔'' دُرِ مکنون کے سادگی سے کہنے پر ایک گہری مسکراہٹ نے عکرمہ کے لبوں کا احاطہ کیا۔

''آپ ہر بار مجھے لاجواب کیوں کرتے ہیں۔'' بہت بیچارگی سے پوچھا تھا اس نے۔

''میں نہیں کرتا۔ آپ ہیں ہی لاجواب۔'' عکرمہ بے ساختہ جواباً بولا تو دُرِ مکنون کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی جس نے عکرمہ کی مسکراہٹ کو مزید گہرا کیا۔ ''ریلیکس رہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ محض شک ہے آپ کا۔ نوٹ کریں روز بروز ٹیپکل بیوی بنتی جا رہی ہیں۔ اب دیکھیے شک بھی کرنے لگی ہیں۔''

عکرمہ کے غیر سنجیدہ انداز پر اس نے بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔ عکرمہ کو اس کی آنکھوں میں گہرا تاسف نظر آیا۔

''آپ چاہے کچھ بھی کہیں۔ میں جانتی ہوں آج میرے ساتھ وہاں جانا یقیناً آپ کے لیے بہت آکورڈ رہا ہوگا مگر پھر بھی آپ نے میری خاطر خود پر جبر کیا..... ہمیشہ کی طرح آج بھی میں تکلیف کا باعث بنی آپ کے لیے۔''

''ہم لائف پارٹنرز ہیں دُرِ مکنون۔ دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔ ہر اچھے برے وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ دینا فرض ہے ہمارا۔ پھر چاہے وہ ہمیں گراں گزرے۔''

''تو گویا میرا اندازہ صحیح تھا۔ آپ کو وہاں جانا واقعی برا لگا۔''

''یہ میٹر نہیں کرتا کہ مجھے کیا اچھا برا لگا، اہم بات یہ ہے کہ آپ کے کیے وہاں جانا کیسا رہا، سالوں سے آپ کی ذات میں پلتے غم و غصے میں کچھ کمی آئی؟ کیا آپ نے خود کو بہتر محسوس کیا؟'' اس کے تجزیے کے جواب میں عکرمہ نے سوال کر ڈالے تو وہ ذرا کی ذرا رک کر سوچنے لگی اور جب بولی تو لہجے میں اعتماد تھا۔

''ہاں یہ سچ ہے کہ سالوں سے میں جس غم و غصے کی آگ میں جل رہی تھی، اس سے جیسے نجات سی مل گئی۔ آپ نے صحیح کہا تھا معاف کر دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔'' بہت سادہ سا انداز تھا اس کا۔ دل کی بات کرتے ہوئے اس کے لہجے کی شفافیت عکرمہ پر واضح تھی۔

''اپنے استاد کی بات مانے میں ہی بھلائی ہوتی ہے محترمہ شاگردہ۔ یوں بھی غم و غصہ انسان کی مثبت سوچ کو بھی منفی کر دیتا ہے۔ ایک نقصان تو ہمارا وہ ہے جو دوسرے کرتے ہیں اور ایک ہم خود کر لیتے ہیں پچھتاوؤں میں گھرے رہ کر۔ negative emotions سے انسان کی صحت بھی خراب ہوتی ہے اور مزاج بھی۔'' عکرمہ نے ظریفانہ انداز میں کہا تو وہ سراثبات میں ہلا گئی۔ ''اینی وے شہرین آپی کے جانے سے خوش تھیں۔'' بیڈ پر اپنی والی سائڈ پر بیٹھتے ہوئے عکرمہ نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر اسے دیکھا تھا۔

''میں بھی شہرین آپی کے لیے خوش ہوں۔ ان کا کوئی قصور نہیں تھا کہ انہیں سزا ملتی۔ میری دلی دعا ہے کہ وہ شخص آپی کو خوش رکھ سکے۔ ان کا حق ہے کہ انہیں خوش رکھا جائے۔'' وہ بولتے ہوئے بیڈ کی دوسری جانب عکرمہ کی متضاد سمت میں آ بیٹھی تھی۔

''ہر بیوی کا حق ہوتا ہے کہ اس کا شوہر اسے خوش رکھے۔ پھر اگر میں نے ایسا کیا تو آپ کو کیوں لگتا ہے کہ آج میں نے آکورڈ محسوس کیا ہوگا؟'' ایک بار پھر عکرمہ نے اسے لاجواب کر دیا تھا، وہ چپ سی رہ گئی۔

''کسی مفکر کا قول ہے کہ آپ ماضی میں واپس جا کر واقعات اور حالات کے آغاز کو نہیں بدل سکتے مگر وقت کی جس

اکائی میں آپ موجود ہیں اس میں نئی ابتدا کر کے اپنے آنے والے مستقبل کو ضرور تبدیل کر سکتے ہیں۔" آپ کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ گزرے وقت کو مٹھی میں جکڑ رکھا تھا آپ نے۔ مجھے خوشی ہے کہ آج وہ مٹھی کھول دی آپ نے۔"

"پتا نہیں میں نے گزرے وقت کو جکڑ رکھا تھا یا وقت نے مجھے۔ بس آج وہ کیا جو آپ نے کہا۔" بے خیالی میں مٹھی کو کھول بند کرتی وہ خود میں گم سی کہہ گئی۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنے سب سے بڑے مونس وغمگسار کے سامنے دل ہلکا کر رہی ہو۔ عکرمہ نے محسوس کیا کہ وہ پہلے سے بہت بدل گئی تھی، بدل رہی تھی۔ اس کے انداز میں پہلے کی طرح کتراپن نہیں تھا۔ بظاہر ان دونوں کے درمیان بہت فاصلے ہو کر بھی نہ نظر آنے والی نزدیکی تھی۔

"ہوں۔ فرمانبردار تو واقعی ہیں آپ۔ ان شاء اللہ جس دروازے سے چاہیں گی جنت میں داخل ہوں گی۔"

عکرمہ کی بات پر اس نے اپنے خیالات سے نکل کر سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ جو کچھ روز پہلے درس میں سنی اس حدیث کے حوالے سے بات کر رہا تھا جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ

"وہ عورت جو پانچوں وقت کی نماز پڑھتی رہی، رمضان کے روزے رکھتی رہی، پاک دامن رہی اور شوہر کی فرمانبردار رہی تو اس کو اختیار ہوگا کہ جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔" (مشکوۃ شریف)

جواباً وہ جھینپ کر مسکرا دی اور دل ہی دل میں ان شاء اللہ کہا۔

"شاباش ایسے ہی ہنستی مسکراتی رہا کریں مسز۔ اچھی لگتی ہیں۔" وہ برملا بولا تو وہ مزید جھینپ گئی مگر اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کوئی کچھ کہتا عکرمہ کے سیل پر آنے والی سدرہ کی کال نے دونوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ وڈیو کال تھی۔ رابطہ بحال ہوتے ہی کیمرا آن ہو گیا تھا۔

"فلائٹ کیسی رہی؟" سلام دعا کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

"اچھی رہی۔ سب ٹھیک تھا۔ بس عبید کو travel sickness کی وجہ سے ہر بار کی طرح اس بار بھی پریشانی رہی۔ اینی وے یہ بتاؤ دُرّی کہاں ہے۔ تم کیا اپنے روم میں ہو؟" سدرہ نے بے توجہی سے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنا سوال داغ دیا تھا، ساتھ ساتھ وہ عکرمہ کے گرد موجود چیزوں کو بھی نگاہ کی گرفت میں لا رہی تھی۔ اس کے عقب میں بیڈ کراؤن واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔

"جی میں اپنے روم میں ہی ہوں اور یہ رہیں میری مسز۔ لیجیے بات کریں۔" اگلے لمحے عکرمہ نے فون اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ سدرہ کے ان سوالات کا پس منظر کیا ہے اس لیے کچھ گھبرا کر فون اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ جبکہ دوسری طرف سدرہ نے ان دونوں کے کمرے میں موجود ہونے پر سکون کی سانس لی تھی۔

"السلام علیکم بھابی!"

"وعلیکم السلام۔ شاباش لڑکی۔ مجھے تم سے اسی دانش مندی کی امید تھی۔ بلکہ یقین تھا کہ تم کبھی ہاتھوں سے لگائی گرہیں دانتوں سے کھولنا پسند نہیں کرو گی۔" اس کے سلام کے جواب کے ساتھ چھوٹتے ہی سدرہ نے دھیمی آواز میں کہا تو اس نے بے اختیار عکرمہ کی طرف دیکھا تھا مگر وہ اس وقت ٹیبل کلاک پر کل صبح کے لیے الارم سیٹ کرنے میں مصروف تھا۔

اس نے گہری سانس بھری اور سادگی سے مسکرا دی۔

☆☆☆

"یا اللہ تیرا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ تو نے شہرین کے ذریعے دُرِّ مکنون کے دل کو نرم کیا۔ اور اسے حوصلہ عطا کیا کہ وہ مجھے معاف کر سکے۔ مگر نہ جانے کیوں یوں لگتا ہے جیسے میرے دل پر دھرا بوجھ کچھ اور بڑھ گیا ہے۔ میں تو پہلے ہی اس مظلوم لڑکی کا قرضدار تھا اور اب تو جیسے اس نے مجھے خرید ہی لیا ہے۔" سجدے میں مناجات کرتے زاویار انصاری کا دل بھی اپنے رب کے حضور جھکا ہوا تھا۔ اور آنکھوں میں تشکر کی نمی تھی۔ "مگر میں اس کے مجرم کو

ایسے نہیں جانے دے سکتا۔ اس کی تلاش اور اسے کیفرِ کردار تک پہنچانے میں میری مدد فرما۔ میری ذات پر دھرے دُرِ مکنون کے قرض کو اتارنے کے لیے مجھے مضبوطی عطا کر اے میرے مالک۔''

ریسپشن ہال سے گھر آ کر اس نے شہرین کو عاصمہ کے میکے کی طرف کے مہمانوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف پایا تو اپنے کمرے میں آ گیا۔ گزرے ساڑھے تین سال سے جس دن کا اس نے انتظار کیا تھا وہ یوں اچانک اس کی زندگی میں چلا آئے گا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ دُرِ مکنون نے نہ صرف اسے معاف کر دیا تھا بلکہ وہ اس کی خوشی میں شرکت کے لیے بھی آئی یہ سب جیسے کوئی خواب ہی تھا اس کے لیے..... نماز کے بعد وہ .... بے اختیار سجدے میں جھک گیا اور اپنے مالکِ حقیقی سے مناجات کرتے ہوئے اسے علم ہی نہیں ہو سکا کہ شہرین بنا آہٹ کمرے میں چلی آئی ہے۔

''اتنا لمبا سجدہ۔'' اس نے کسی گہری سوچ سمیت سجدے سے سر اٹھایا تو شہرین کے حیرانی سے بول پڑنے پر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہوں۔ بس شکر ادا کر رہا تھا اللہ کا۔''

''ہوں۔ شکر کرنا تو بنتا ہے تمہارا۔ ویسے خوش قسمت بہت ہو تم۔ اب دیکھو ناں بیوی کتنی زبردست ملی ہے تمہیں۔ ساری عمر بھی سجدے میں گرے رہو گے تو بھی شکر ادا نہیں ہو سکے گا۔'' اس کے سنجیدہ جواب پر شہرین کے منہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

کچھ تو بات ہی غیر متوقع تھی اس پر مستزاد شہرین کا بے فکرا انداز، زاویار انصاری اپنی بے ساختہ ہنسی نہ روک سکا۔ آج کتنے سالوں کے بعد وہ کھل کر ہنسا تھا۔ شہرین حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''اُف، تم ہنستے ہوئے کتنے اچھے لگتے ہو زوی۔ تمہاری ہنسی کتنی خوب صورت ہے۔'' ایک عجیب سے بھول پن اور جذب سے وہ کہہ اٹھی تھی۔

''ہمم۔ پھر تو تم بھی لکی ہو ئیں۔'' شہرین کے اس طرح محبت پاش نظروں سے دیکھنے پر وہ ہنسی روک کر مسکرا دیا تھا۔

''ہاں کہہ سکتے ہو۔ مگر تم زیادہ لکی ہو۔ دیکھا نہیں آج سب لوگ کتنی تعریف کر رہے تھے کہ برائڈ کتنی خوب صورت ہے۔'' گردن اکڑا کر ایک ادائے ناز سے کہتی وہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''میرا خیال ہے وہ کپل کی تعریف کر رہے تھے۔'' مصلیٰ لپیٹتے ہوئے زاویار بظاہر سنجیدگی سے کہہ گیا تھا۔ مگر انداز سراسر چھیڑنے والا تھا۔ شہرین نے مڑ کر خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔ کیا یہ واقعی زاویار انصاری ہے۔

''ایک ہی بات ہے۔ کپل بھی تو میری وجہ سے خوب صورت ہے۔'' اس کی چھیڑ شہرین کو مزہ دے گئی تھی۔

''کپل بھی اور زندگی بھی۔'' جواباً وہ سنجیدگی سے کہتا اس کے نزدیک آ رکا۔

''شیری! میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں تمہارا شکریہ ادا کر سکوں۔ اللہ کے بعد ایک تم ہی ہو جس نے مجھے اس guilt (احساسِ جرم) سے نجات دلائی۔ آج کئی سالوں بعد کھل کر سانس لی ہے میں نے۔ دل سے ہنسا ہوں۔ جانتی ہو آج اپنی ہنسی کی آواز میرے اپنے کانوں کو اجنبی لگی۔ میں ہنسنا تو کیا اپنی ہنسی کی آواز تک بھول چکا تھا۔'' گہرے لہجے اور بھاری آواز سے بولتے زاویار نے اس کے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

''تم واقعی کوئی ساحرہ ہو۔ پہلے میرے دل کو مسخر کیا اور پھر دُرِ مکنون کے دل کو بھی۔''

''دیکھ لو۔ ایسے ہی تو نہیں تم کو لکی کہا۔'' جواباً وہ شوخی سے بولی تو زاویار ایک بار پھر ہنس پڑا۔

''ہوں۔ ماننا پڑے گا۔''

(آخری قسط ان شاء اللہ اگست کے شمارے میں ملاحظہ کریں)

اے دلِ ناداں

نزہت جبیں ضیا

''آپا، آپا..... جلدی سے باہر آؤ، دیکھو تو صداقت انکل کے ہاں کتنی نگڑی بچھیا آئی ہے۔''

سات سالہ سرمد چیختا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔اس کی یہ ڈیوٹی تھی، محلے میں جس کے ہاں قربانی کا جانور آتا وہ بھاگ کر پہلے زرینہ کو بتانے آجاتا۔

''احمد کے ہاں مریل بکرا آیا ہے، اسلم چاچا کے پاس تو اللہ معاف کرے ایتھوپیا کی گائے آئی ہے، بلقیس خالہ کے ہاں جو بکرا آیا ہے اس کی ٹانگ پر زخم ہے۔'' یہ ساری اطلاعات وہ زرینہ کو ضرور دیتا اور زرینہ بھی فوراً بھاگ کر جاتی اور اس کی بات سے اتفاق کرتی۔اب بھی وہ صداقت انکل کی نگڑی بچھیا کی اطلاع لے کر آیا تھا مگر..... مگر..... اب زرینہ کو دیکھ،

دیکھ کر زور سے ہنستے ہوتے چلانے لگا۔

''آپا بھوت..... آپا بھوت..... آپا تم بھی کلثوم خالہ کی پچھلے سال والی کالی بیل کی طرح لگ رہی ہو جس پر سفید، سفید دھبے پڑے تھے۔'' چہرے، گردن اور ہاتھوں پر سفید کریم تھپی ہوئی دیکھ کر سرمد اس کا مذاق اڑانے لگا۔

''چپ..... چپ کر اماں آجائیں گی۔'' زرینہ کریم لگاتے، لگاتے رک کر اسے چپ کرانے لگی۔

''سچ آپا! اگر کوئی چھوٹا بچہ دیکھ لے گا ناں تو ڈر جائے گا ایمان سے۔'' وہ بدستور زور، زور سے ہنس رہا تھا۔

''چپ کر پاگل.....'' زرینہ اس کو مارنے کو پیچھے دوڑی وہ باہر کی جانب بھاگا۔ وہ تو نکل گیا اسی لمحے ساجدہ کمرے میں داخل ہوئی اور زرینہ اس سے بری طرح ٹکرا گئی۔

''ہائے، ہائے میں مری۔'' چھوٹے قد والی ساجدہ کے منہ پر زرینہ کا ہاتھ لگا تھا۔

''ارے کم بخت کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟'' ذرا سنبھل کر ساجدہ نے اس کو غور سے دیکھا۔

''کہاں کدکڑے لگاتی پھر رہی ہے..... بھتنی کہیں کی..... ہائے توڑ ڈالا میرا کلا۔'' وہ کلا پکڑ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

زرینہ کی نظر دروازے کے باہر کھڑے زور، زور سے ہنستے سرمد پر پڑی تو اس کو غصہ آ گیا۔

''ابھی بتاتی ہوں تجھے۔'' زرینہ پھر اس کی طرف لپکی۔

''اماں یہ تمہاری وجہ سے ہی ہوا ہے، کیا ضرورت تھی تمہیں اس وقت کمرے میں آنے کی اور اس بدتمیز کو بھاگنے کی۔'' الٹا اماں کو سنا دیا۔

''چپ کر چڑیل تجھے دیکھ کر تو میں بھی ڈر گئی، وہ تو بچہ ہے، کیا لگا رکھا ہے منہ پر سانولے منہ پر سفیدہ مل رکھا ہے جیسے چھچھوندر نے بالائی میں منہ مار دیا ہو۔'' اماں کی مثال پر وہ بری طرح جل گئی اور منہ بناتی سرمد کو مکا دکھاتی نلکے کی طرف منہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ سرمد اتنی دیر میں دوبارہ گھر سے باہر نکل چکا تھا۔

''اتنی بڑی ہو گئی لوتھا کی لوتھا، مجال ہے جو ڈھنگ کا کوئی کام بھی کر لے کتنی بار سمجھایا ہے کہ اب بڑی ہو گئی ہو یوں اڑی، اڑی نہ پھرا کرنک کر بیٹھا کر مگر مجال ہے جو تیرے کان پر جوں رینگے، لوگ تو یہی کہیں گے ناں کہ اماں نے کچھ نہ سکھایا سوتیلی کا طعنہ تو مجھے ہی ملنے والا ہے مگر تو سمجھے جب ناں، چل اِدھر آ میرے ساتھ بیٹھ کر سبزی بنا۔'' سبزی کا شاپر پلنگ پر رکھتے ہوئے ساجدہ نے دل کی بھڑاس بھی نکالی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر تولیے سے منہ پونچھتی ہوئی پلنگ پر آ بیٹھی۔

''اماں روز، روز آلو، آلو کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تم کو؟'' آلو دیکھ کر زرینہ کا منہ بن گیا۔ ''آلو کھا، کھا کر خود تو آلو سی بن گئی ہو اب ہمیں بھی بنا دو گی۔'' آلو چھیلتے ہوئے اس نے ساجدہ کے گول مٹول وجود کو مذاق کا نشانہ بنایا۔

''چپ کر بدتمیز..... جلدی سے آلو ابالنے کے لیے چڑھا دے تیرا ابا بول کر گیا تھا آلو کے پراٹھے بنانے کا۔'' زرینہ کو ہنستا دیکھ کر ساجدہ چلبلا کر بولی۔

''دل کام میں بھی لگا لیا کر کبھی، ہر وقت بناؤ سنگار میں لگی رہتی ہے، یہ سب کام نہیں آئے گا آگے چل کر۔''

''ارے اماں، یہ شکل ہی تو کام دکھاتی ہے۔'' آلو دھوتے، دھوتے وہ دل ہی دل میں بولی۔ اپنی شکل کو اچھا بنانے اور رنگ گورا کرنے کے لیے نت نئے تجربات کرتی رہتی تھی اور یہ ساری چیزیں اس کی سہیلی صبوحی فراہم کرتی تھی۔ سستے قسم کے پاؤڈر، ٹھیلوں پر بکنے والی ہری لپ اسٹک اور رنگ گورا کرنے والی ٹٹی، ٹٹی کریمیں ابھی تین دن پہلے تو صبوحی اسے یہ سب دے کر گئی تھی اس گارنٹی کے ساتھ کہ ایک ہفتے میں جلد نکھر جائے گی ساتھ ہی گوری رنگت ایسی ہو جائے گی کہ تو خود کو نہ پہچان سکے گی۔ صبوحی نے بتایا تھا کہ اس نے ایسی کریم دیکھی ہے جو ایک ہفتے میں بدل کر رکھ دیتی ہے۔

''دیکھ میری آپا نے بھی لگائی تھی کیسا رشتہ طے ہو گیا فٹافٹ۔''

''ہائیں سچی!'' اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

''لو میں جھوٹ بول سکتی ہوں کیا؟ اور وہ بھی تجھ

سے؟'' صبوحی کی بات پر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مجھے بھی لا دے گی وہ کریم.....؟'' اپنے سانولے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے لالچی انداز میں پوچھا۔

''ہاں لا تو دوں مگر.....؟'' صبوحی کہتے، کہتے رک گئی۔

''مگر.....مگر کیا؟'' زرینہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''پورے سو روپے کی اتی سی ڈبیا ہے۔'' صبوحی نے ہمیشہ کی طرح اپنا منافع رکھ کر ہاتھ کے اشارے سے ڈبیا کا سائز بتایا۔

''ہائے اللہ سو روپے.....'' زرینہ نے سو روپے پر زور دے کر کہا اس کا چہرہ بجھ گیا تھا۔

''سن تو چھپر نہیں کر سکتی۔'' صبوحی نے نیا راستہ دکھایا۔

''ساجدہ خالہ پیسے کون سا چھپا کر رکھتی ہیں۔'' مزید اکسایا۔

''ہاں، ہاں اماں پیسے تو پاندان میں ہی رکھتی ہیں، چل میں دو چار دن میں کر کے دیتی ہوں۔'' صبوحی کی ترکیب پر زرینہ کے پرمژدہ چہرے پر یک دم سے رونق آ گئی تھی۔ ''صبوحی واقعی سچی دوست ہے۔'' دل ہی دل میں اس کی دوستی کو سراہا پھر کافی جدوجہد کے بعد اس نے آخرکار سو روپے اکٹھا کر کے صبوحی کے ہاتھ میں تھمائے اور دوسرے ہی دن وہ اس کے لیے بنا نام و پتے کی چھوٹی سی ڈبیا والی سفید خوشبودار کریم لے آئی تھی۔

☆☆☆

شرافت ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا جب زرینہ پیدا ہوئی۔ پھر اس نے دوسری شادی ساجدہ سے کی جس سے کافی سالوں بعد سرمد اور پھر ایک بیٹی وجیہہ تھی۔ یہ لوگ درمیانے درجے کی آبادی میں رہائش پزیر تھے۔ دو کمروں اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل اپنا چھوٹا سا گھر تھا۔ ساجدہ اگرچہ زرینہ کی سوتیلی ماں تھی مگر کبھی اس نے اس بات کا احساس نہ ہونے دیا۔ زرینہ کو ہمیشہ اپنی سگی بیٹی کی طرح سمجھا۔ زرینہ شکل صورت کی تو مناسب تھی بس رنگت گہری سانولی تھی۔ ان لوگوں کے علاوہ آس پاس کے لوگ کم حیثیت ہی تھے۔ چھوٹی، موٹی دکانیں، پان کے کھوکھے، پاپ کورن کے ٹھیلے لگانے والے اکا دکا ایسے لوگ تھے۔ صداقت میاں جیسے جن کے پاس دبئی کی کمائی آتی تھی، وہ قدرے بہتر تھے۔ غریب لوگ تھے تو رشتے بھی ایسے ہی آپس میں ہو جاتے مگر زرینہ کو تو ایسے رشتے کی تلاش تھی جو جینز، ٹی شرٹ پہنتا ہو، اس کے پاس چم، چم کرتی موٹر سائیکل ہو، آنکھوں پر سیاہ شیشوں والا چشمہ ہو اور پیروں میں نیلے کلر کے جوگرز ہوں، وہ اس کی کمر کو کس کے پکڑ کے پورے شہر کی سیریں کرے۔ ''ہائے اللہ'' انجانے لمس کو محسوس کر کے اسے خود بخود شرم آ جاتی۔

''ارے کہاں گھسی ہوئی ہے؟ دیکھ تو ذرا کتنا دن نکل آیا ہے دوپہر کی ہانڈی روٹی کی فکر بھی ہے کہ نہیں؟'' اماں کی تیز آواز اسے حال میں واپس لے آتی اور وہ ہاتھ میں پکڑا رسالہ وہیں پھینک کر باہر آ جاتی۔

''اماں! دو گھڑی سکون نہ لینے دینا تم بھی، تمہارا بس چلے تو مجھے بیل بنا کر کولہو میں لگا دو۔''

''چپ کر۔'' ساجدہ اسے گھرکی۔

''ہاں، ہاں آپا وہی کلثوم خالہ والا پچھلے سال کا بیل لگو گی کالا سفید دھبوں والا۔'' پاس بیٹھا سرمد پڑھتے، پڑھتے کتاب سے سر اٹھا کر ہنستے ہوئے مذاق اڑاتا ساجدہ کو ہنسی آ جاتی۔

''چپ کر۔'' یوں مذاق بنتا دیکھ کر زرینہ آگے بڑھ کر سرمد کے منہ پر جھانپڑ لگا دیتی۔

''ہائے، ہائے اماں آپا نے تیل نکال دیا قسم سے۔'' سرمد گال پر ہاتھ رکھ کر چلاتا۔

''اے ہے لڑکی! ذرا سی عقل پکڑ لے خدا کے واسطے بیاہ کر لے جانے والا سر پکڑ کر روئے گا اور تیری پھپھو سارا الزام مجھ غریب کے سر ڈال دے گی، اب اسے کیا بتاؤں کتنی مغز ماری کرتی ہوں تیرے ساتھ بجائے ساس بننے کے وہ تو نند پنا دکھائے گی میرے ساتھ۔'' ساجدہ خواہ مخواہ نند پر غصہ نکالنے لگتی۔

''قسم سے اماں، پھپھو کے نام پر تمہارے منہ پر جو بارہ بجتے ہیں ناں بیچ میں گول والی بڑی سی گھڑی لگتی

ہوتم۔'' زرینہ قریب آکر شرارت سے اس کے بڑے سے گول منہ کو نشانہ بناتی۔

''ارے رک، بتاتی ہوں تجھے۔'' ساجدہ چیختی رہ جاتی اور وہ ہنستی ہوئی کچن میں گھس جاتی۔

''ویسے اماں یہ پھوہڑ دوسرے دن کیوں چلی آتی ہیں؟''

''تیری سہیلی صبوحی بھی تو منہ اٹھا کر چلی آتی ہے۔'' صبوحی کے نام پر زرینہ کا منہ بن گیا۔

''اسے چھوڑ اماں، مجھے اچھا نہیں لگتا روز، روز منہ اٹھائے چلی آتی ہیں اپنے عالم چنا کے ساتھ۔''

''آپا عالم چنا نہیں نصیر سومرو۔'' سرمد پھر ٹکڑا لگاتا۔

''پڑھائی میں دل لگا لے اپنا۔'' دال پر بگھار لگاتے، لگاتے زرینہ نے سرمد کو گھور کر دیکھا۔

''اپنے بھائی کے گھر آتی ہے، وہ تیرا کیا بگڑتا ہے اور ویسے بھی وہ تجھے اپنی بہو بنانا چاہتی ہے۔'' ساجدہ نے ہرا دھنیا توڑ کر پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ہائے اماں! مجھے نہیں کرنی اس کارٹون سے شادی، شکل دیکھی ہے اس نے اپنی اور کام کیا کرتا ہے، اسکول میں چپراسی..... توبہ، توبہ ایک پھٹیچر سائیکل تک تو ہے نہیں۔''

''ارے آپا جب جمال بھائی صبح، صبح تیار ہو کر جاتے ہیں ناں تو سچ مچ ماسٹر لگتے ہیں ماسٹر.....'' سرمد پھر بولا تھا۔

''چپ کرو تم دونوں۔'' ساجدہ نے دونوں کو چپ کرایا اور اسے مخاطب کیا۔

''زرینہ کان کھول کر سن لے اپنے ابا کے سامنے ایسا ویسا کچھ مت بک دینا، چٹیا پکڑ کر نکال دے گا گھر سے تجھے بھی اور ساتھ میں مجھے بھی۔''

''ہونہہ ایسے کیسے نکالے گا؟'' زرینہ بڑبڑ کرتی زور، زور سے آٹے پر مکے برسانے لگی۔ اسے جمال بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ سیدھا سادہ اللہ میاں کی گائے جیسا کم گو، نیچے نظریں کیے، سر میں ہر وقت تیل لگائے رکھتا، معمولی کپڑے کے عام سے شلوار قمیص میں رہتا، زرینہ کو تو تیز، شوخ رنگوں والی شرٹس، پھول دار قمیص والے، تنگ جینز والے لڑکے اچھے لگتے تھے۔ بڑے، بڑے بالوں میں جیل لگائے جدید اسٹائل سے سیٹ کیے ہوئے۔ پُراعتماد اور نظر بھر کر دیکھنے والے، یہ کیا شرمانا، سر جھکانا، بات نہ کرنا یہ سب تو لڑکیوں کے کام ہیں، یہ زرینہ کی اپنی منطق تھی۔

زرینہ کو پتا تھا کہ ابا کسی صورت بہن کو انکار نہیں کریں گے لیکن اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ وہ ابا کی بات نہیں مانے گی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اماں کے ساتھ سرمد اور وجیہہ بھی سو گئے تو وہ رسالہ لے کر کمرے میں آ گئی۔ کھڑکی سے باہر جھانکا سامنے گلی کے نکڑ پر فیض چاچا کی پان کی چھوٹی سی کیبن تھی۔ ساتھ ہی فضل چاچا کا چھوٹا سا چائے کا ہوٹل جہاں محلے والوں نے مل کر چھوٹا سا رنگین ٹی وی لگا دیا تھا جب کوئی نئی دھماکے دار فلم آتی، فٹ بال یا کرکٹ کے ورلڈ کپ ہوتے تو سارا محلہ وہیں اکٹھا ہو کر لطف اٹھاتا، فقرے بازیاں ہوتیں، تب فضل چاچا کے کاروبار کی بھی خوب چاندی ہو جاتی۔ سب مل کر خوب شور، ہنگامہ کرتے۔ جیت جانے پر ٹافیاں تقسیم ہوتیں جس سے فیض چاچا کی خوب کمائی ہو جاتی، ہار جانے پر مل کر گفتگو ہوتی اور ٹیم کی خامیاں اور کوتاہیوں پر تبصرے ہوتے۔ اس میں آٹھ سال کے بچے سے لے کر ستر سال کے بزرگ بھی شامل ہوتے۔ خوب رونقیں لگتیں۔ روزانہ شام کے وقت اسی ہوٹل پر محلے کے آدمی جمع ہو جاتے۔ حالاتِ حاضرہ پر بات چیت ہوتی، سیاسی گفتگو ہوتی۔ بوڑھی خواتین اپنے، اپنے گھروں کے باہر مٹی کے بنے چبوتروں پر آ بیٹھتیں اور بچے وہیں کھیلتے۔ اس وقت دوپہر کا ٹائم تھا اس لیے اکا دکا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ اچانک زرینہ کی نظر پان کی کیبن پر موٹر سائیکل سے لگے کھڑے اجنبی نوجوان پر پڑی جو اس محلے میں پہلی بار نظر آیا تھا۔ حلیے اور کپڑوں سے بالکل الگ لگ رہا تھا۔ نیلی تنگ جینز پر کالے اور سفید بڑے، بڑے پھولوں والی شرٹ، آنکھوں پر بڑے شیشوں والی کالی عینک لگائے، ہاتھوں میں ادھ جلا سگریٹ جسے وہ بڑی ادا سے منہ سے لگا کر ہوا میں

دھواں اڑا رہا تھا۔ بالکل کسی افسانے یا ناول کے ہیرو جیسا لگ رہا۔ جیسا...... جیسا... زرینہ کے خوابوں اور خیالوں میں بسا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے اپنے خوابوں کی تعبیر کو یوں سامنے دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔ عین اسی لمحے اس نوجوان نے بھی چشمہ اتار کر کھڑکی کی جالیوں کے پیچھے سے جھانکتے زرینہ کے چہرے کو دیکھا۔ وہ خواب کے عالم میں بے ساختہ مسکرادی۔

''اُف اللہ۔'' جواباً وہ بھی مسکرا دیا تھا۔ زرینہ نے جلدی سے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا...... شرم سے اس کے سانولے گال گلابی ہونے لگے تھے۔ عین اسی وقت سرمد اور وجیہہ کمرے میں آ گئے۔

''آپا، اماں جاگ گئی ہیں کہتی ہیں چائے بنا دو' ہمیں ٹیوشن بھی جانا ہے۔''

''افوہ۔'' خیالات سے چونکی تو بری طرح جھنجلا گئی۔

''جاؤ کہیں جا کر مرو تم لوگ، بناتی ہوں چائے۔'' بچے کمرے سے نکلے تو دوبارہ سے کھڑکی کا پٹ کھولا۔ وہ بائیک پر بیٹھ چکا تھا اور جاتے، جاتے مڑ کر دیکھا پھر بائیک اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گیا۔

''اُف کتنا اچھا بندہ ہے! کیا اسٹائل ہے بائیک پر بیٹھنے کا......'' وہ سوچتی رہ گئی۔ اس سے پہلے کہ ساجدہ کی آواز آتی اس نے کچن میں جانے میں ہی عافیت جانی مگر...... وہ نوجوان مستقل اس کے حواسوں پر چھایا رہا، اس کا دیکھنا، مسکرانا، جاتے، جاتے پلٹ کر دیکھنا، ایک، ایک ادا میں شان تھی۔

''پتا نہیں کون تھا۔ کس کے گھر آیا تھا؟ معلوم نہیں پھر کبھی آئے یا نہ آئے؟'' عجیب سی بے چینی اس کے روم، روم میں اتر آئی تھی۔ ''صبوحی سے جس کو محلے کے ہر آنے جانے والے کی خبر ہوتی تھی اس کو ضرور پتا ہو گا، چائے بناتے، بناتے وہ سوچنے لگی۔ رات کا کھانا بناتے، بناتے بھی وہ مستقل اس نوجوان کے بارے میں سوچتی رہی..... وہ چہرہ، وہ مسکراہٹ اسے تنگ کرتی رہی۔ ابا فیکٹری سے آیا تو بہت خوش تھا۔

''کیا بات ہے زری کے ابا بہت خوش لگ رہے ہو؟'' کھانا کھاتے، کھاتے ساجدہ نے پوچھ لیا۔

''ہاں، زری کی ماں تو فکر مند تھی ناں کہ آپا بقر عید میں شادی کا کہہ رہی ہیں اور ہمارے پاس پیسے نہیں، دیکھ ہمارے نصیب کہ آج میری کمیٹی نکل آئی ہے۔'' شرافت کی آواز بھرّا گئی۔

''آپا کہتی تو ہیں کہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے مگر بیٹی ہے ہماری، ہمیں کچھ نہ کچھ دے کر ہی رخصت کرنا ہو گا ناں، دیکھ تو ذرا بچیاں کتنی جلدی بڑی ہو جاتی ہیں۔'' شرافت کی آنکھیں زرینہ کی شادی کے تصور سے بھیگنے لگی تھیں۔

''ہاں زری کے ابا ٹھیک کہتے ہو تم۔'' ساجدہ بھی افسردہ ہو گئی۔

''ہائے اللہ! یہ اماں اور ابا کیسی باتیں کر رہے ہیں اتنی جلدی شادی نہیں بھئی...... اور جمال سے تو بالکل بھی نہیں کروں گی۔'' شادی ہو جانے کے خیال سے زیادہ اس اجنبی کے یوں آ کر چلے جانے پر وہ زیادہ رنجیدہ تھی۔ دوسرے دن صبوحی آئی تو وہ ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی کمرے میں لے آئی۔

''کہاں مری تھی اتنے دنوں سے؟''

''کیا بتاؤں اوپر کا کمرا کرائے پر لگایا ہے تو اسی چکر میں دو دن نہ آ سکی۔'' صبوحی نے وضاحت دی۔

''ہائے اللہ دو دن میں تیری رنگت نکھر آئی ہے' یہ کریم کا کمال ہے یا کسی کی نظروں کا جادو؟'' اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے صبوحی نے آنکھ مارتے ہوئے عامیانہ انداز میں کہا۔ زرینہ کو شرم آ گئی۔

''چپ کر تو میری بات سن، دو دن پہلے فیض چاچا کی کیبن پر دن میں، میں نے ایک لڑکے کو دیکھا تھا موٹر سائیکل پر تھا جینز اور قمیص پہنے بہت اچھا بالکل ہیرو جیسا۔''

''ارے تو تیمور کی بات تو نہیں کر رہی، کالی سفید پھول دار قمیص میں تھا آنکھوں پر چشمہ لگائے؟'' صبوحی نے اشارے دیے۔

''ہاں، ہاں وہی بالکل وہی۔'' بے تابی عروج پر تھی۔

''وہی تو ہے ہمارا کرایے دار، اپنی ماں کے ساتھ آیا ہے دبئی میں رہ کر آیا ہے...... اب اس کی اماں اس کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہے وہ اماں سے کہہ رہی تھیں رشتے دیکھنے کو۔'' صبوحی کی بات پر نہ جانے کیوں اسے

شرم آگئی، ساتھ، ساتھ بے تحاشا اطمینان اور سکون بھی کہ وہ یہیں اسی محلے کا ہے۔

''تو نے کیسے دیکھ لیا ہے.....؟'' صبوحی نے شرارت سے پوچھا تب اس نے تفصیل بتائی۔

''ہائے اللہ صبوحی، قسم سے دو دن سے عجیب سی بے چینی، بے قراری ہے لگتا ہے جیسے وہ ایک نظر میں میرا سکون، چین سب کچھ لے گیا۔'' زرینہ بے بسی سے بولی۔

''ارے پگلی کیوں فکر کرتی ہے وہ بھی تیرے بارے میں پوچھ رہا تھا، آجانا شام کو گھر، ملاقات کروا دوں گی۔'' صبوحی نے مسکرا کر آنکھ دبائی۔

''ہائے سچ، اس نے میرا پوچھا؟'' زرینہ پلنگ سے ایسے اچھلی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اتنی بڑی اور غیر متوقع خوشی سے لگتا تھا جان ہی نکل جائے گی۔ اسے قریب سے دیکھنے اور بات کرنے کے تصور سے وہ پاگل ہونے لگی تھی۔

''اچھا میں چلتی ہوں.....تو، تو گئی کام سے۔'' صبوحی نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

''ارے نہیں بیٹھ میں شربت بنا کر لاتی ہوں۔'' زرینہ کو احساس ہوا تو اس نے ہاتھ پکڑ کر اپنی محسنہ کو دوبارہ بٹھالیا۔ تب ہی ساجدہ کمرے میں آگئی۔

''سلام ساجدہ خالہ۔'' صبوحی نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے بے دلی سے جواب دیا نہ جانے کیوں اسے صبوحی اچھی نہیں لگتی تھی۔

''خالہ اماں نے کہا ہے کیٹی کے پیسے دے دیں۔'' صبوحی نے یاد دلایا۔

''ہاں، رات کو زری کے ابا سے لے کر بھیج دوں گی۔'' ساجدہ بولی۔ اتنے میں زرینہ شربت بنا کر لے آئی تھی۔

''اچھا میں چلتی ہوں!'' شربت کا خالی گلاس پلیٹ میں رکھتے ہوئے صبوحی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''خالہ شام کو زرینہ کو تھوڑی دیر کے لیے بھیج دینا، ابا میرے لیے کچھ کپڑے لایا ہے وہ کٹوانے ہیں۔'' جاتے، جاتے صبوحی نے ساجدہ سے کہا اور ساتھ ہی پلٹ کر زرینہ کو دیکھ کر آنکھ ماری۔

''یہ جاتی دس منٹ کے لیے ہے اور دو گھنٹے لگا دیتی ہے پیچھے کام پڑا رہ جاتا ہے۔'' ساجدہ نے کہا۔

''اماں! اب ایسا بھی نہیں ہے تم تو ہر وقت پیچھے پڑی رہتی ہو میرے۔'' زرینہ کو غصہ آگیا۔

''چل زیادہ زبان نہ چلا۔ یہ گلاس اٹھا لے مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔'' ساجدہ نے کہا تو منہ بنا کر شربت کا گلاس اٹھا لیا۔ صبوحی چلی گئی اور زرینہ.... بے چینی سے شام کا انتظار کرنے لگی۔ آج وقت لگ رہا تھا کہ کٹ ہی نہیں رہا تھا۔ زرینہ نے شام سے پہلے رات کے لیے ہنڈیا بنالی تھی۔ آٹا بھی گوندھ کے رکھ دیا۔ باورچی خانہ صاف کرلیا تھا۔ نہا کر اچھا سا جوڑا پہن لیا آنکھوں میں کاجل، منہ پر پاؤڈر لگا کر بالوں میں لمبا سا پراندہ ڈالے وہ جانے کو تیار ہوگئی۔

''اماں میں نے برتن دھو دیے، ہانڈی بنالی اور آٹا بھی گوندھ لیا ہے آکر روٹیاں بنا دوں گی۔'' تیار ہو کر ساجدہ کو اطلاع دینے آئی تو ساجدہ نے سر سے پیر تک اسے گھور کر دیکھا۔

''دوپٹے کے اوپر تو چادر لے کر جانا۔''

''اچھا اماں۔'' زرینہ نے رسی پر پڑی کالی چادر اچھی طرح سے اوڑھ لی اور گھر سے باہر نکل آئی۔

صبوحی اسے لے کر چھت پر آگئی۔ چھت پر بنے دوسرے حصے میں چھوٹے سے کمرے میں تیمور اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ لوگ چھت پر آئے تو تیمور بھی دیوار پھلانگ کر آگیا۔ تیمور کو اتنے قریب پا کر زرینہ کے تو ہوش وحواس ہی جواب دینے لگے۔ آج بھی وہ نیلی جینز میں تھا۔ ساتھ لال ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کتنا خوب صورت لگ رہا تھا۔ شرم کے باعث زرینہ کی نگاہیں جھکی جارہی تھیں۔ یہ سوچ کر کہ تیمور بھی اس سے ملنا چاہتا ہے۔ صبوحی دونوں کو چھوڑ کر واپس نیچے چلی آئی۔ دونوں شیڈ کی طرف آگئے جہاں سے وہ بہ آسانی کسی کو نظر نہیں آسکتے تھے۔

''السلام علیکم۔'' تیمور نے ابتدا کی۔

''وعلیکم السلام۔'' زرینہ نے جواب دیا۔

''تم پڑھتی ہو؟''

''میں نے دو سال پہلے میٹرک کرلیا ہے۔''

زرینہ نے جواب دیا۔

''سچ، میں تو سمجھ رہا تھا تم ساتویں، آٹھویں میں ہوگی ... اتنی سی تو ہو تم معصوم سی۔'' تیمور کی بات پر زرینہ زیرلب مسکرادی۔

تھوڑی دیر میں وہ نارمل ہوگئی اور کسی حد تک پُراعتماد بھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ جان لیا اور ساتھ ہی تیمور نے اظہارِ محبت بھی کر ڈالا۔

''ہائے اللہ سب کچھ پہلی ملاقات میں۔'' اتنی جلدی یہ سب ہو جائے گا یہ تو زرینہ نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ وہ جس کا ہیولہ خوابوں میں دیکھا کرتی تھی جیتا جاگتا اس کے سامنے موجود تھا اور اس پر یہ بھی کہ وہ زرینہ کا طلبگار تھا۔

مغرب سے ذرا پہلے وہ تیمور کی خوب صورت باتوں کے حصار میں گم خوش کن لمحات کے حسین احساسات کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو سامنے پلنگ پر اماں کے ساتھ جمال کو بیٹھا دیکھ کر یکلخت سارے موڈ کا ستیاناس ہو گیا، عام سے شلوار قمیص میں اسفنج کی معمولی چپل پہنے سر کے بالوں میں ڈھیر سارا تیل لگا کر چپکائے ہوئے وہ لکیر کا فقیر ہی بنا رہتا۔ وہ بس سلام کرتی ہوئی اندر کمرے کی طرف چلی آئی۔ ابھی جا کر چادر اتاری بھی نہیں تھی کہ پیچھے وجیہہ آ گئی۔

''آپا، اماں کہہ رہی ہیں جمال بھائی کے لیے شربت بنا دو... اور جلدی سے روٹیاں بھی پکا دو، آج ابا جلدی آنے والے ہیں۔''

''ہونہہ۔'' وہ بری طرح جھنجلا گئی۔

''ایک تو اماں کو نہ جانے کیوں مجھ سے اللہ واسطے کا بیر ہے، مجال ہے جو دو گھڑی سکون لینے دیں۔ بس چلے تو مجھے ساری رات ایک ٹانگ پر کھڑا رکھیں۔'' ایک تو جمال کو دیکھ کر موڈ پہلے ہی خراب ہو گیا تھا اوپر سے اماں کی ہدایات نے مزید دماغ خراب کر ڈالا۔ چادر پھینک کر تن فن کرتی ہوئی باورچی خانے میں گھس گئی۔ شربت بنا کر وجیہہ کو آواز لگائی اور خود روٹیاں پکانے بیٹھ گئی۔

مغرب کی اذان ہوئی تو جمال بھی جانے کے لیے اٹھ گیا۔ اماں بھی نماز کے لیے اٹھ گئیں۔ زرینہ روٹیاں پکاتے، پکاتے تیمور کی آواز، اس کے وجود اور اس کی باتوں کے سحر میں گم ہوتی چلی گئی۔

اگلے دن ناشتے سے فارغ ہو کر زرینہ نے گھر کی صفائی کی تبھی صبوحی آ گئی۔ وہ تیمور کا خط لے کر آئی تھی۔ زرینہ کا دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔ صبوحی تو کچھ دیر بعد چلی گئی وہ خط لیے غسل خانے میں گھس گئی۔

''ہائے اللہ۔'' ایک، ایک لفظ میں بے تابی، بے قراری، عہد و پیماں، نہ جانے کیا، کیا تھا۔ جیسے، جیسے پڑھتی جاتی اس کی رگ، رگ میں سنسنی سی پھیلنے لگتی۔ کتنا کھلم کھلا اظہارِ عشق کر رہا تھا۔ کتنی تڑپ اور بے صبری کا اظہار تھا اس کی باتوں میں۔ زرینہ ہواؤں میں اڑنے لگی۔ تب اس نے سوچ لیا کوئی بھی بہانہ کر کے وہ شام کو ضرور تیمور سے ملنے جائے گی۔

دوپہر کے لیے اس نے دال چاول بنائے ساتھ میں پیاز، ٹماٹر کا کچومر اور آم کا اچار تھا۔ کھانا تیار کر کے دسترخوان لگا رہی تھی، بچے اسکول سے آ گئے تھے۔ اسی وقت فیروزہ بیگم آ گئیں۔

''اماں پھپھو آئی ہیں۔'' وجیہہ کی آواز پر اس نے دیکھا پسینے میں شرابور ہانپتی کانپتی فیروزہ آ رہی تھیں۔

''کیا ہوا آپا..... خیریت تو ہے؟'' ساجدہ نے دوپہر کی دھوپ میں آنا دیکھ کر سوال کیا۔

''ہاں، سب خیریت ہے جمال نے کچھ پیسے لا کر دیے تھے سوچا زری کو ساتھ لے جا کر بری کے جوڑے خرید لوں اس وقت مارکیٹ میں کم رش ہوگا۔'' فیروزہ نے پھولی سانسوں کے درمیان کہا۔

''کہاں پھپھو عید کے دنوں میں تو ہر وقت ہی رش ہوتا ہے۔'' سرمد نے دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بچے مگر کرنا تو ہے ناں۔''

''اچھا چلو آپا ذرا سا دم لے لو کھانا کھا لو پھر چلی جانا۔ زرینہ چلی جائے گی ساتھ۔'' وہ جتنا شادی کے موضوع سے بھاگتی اتنا ہی اسے انوالو کیا جاتا، مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اسے جانا تو تھا۔ چار گھنٹے کی تکلیف دہ اور تھکا دینے والی شاپنگ کے بعد وہ گھر لوٹی تو دماغ بے حد خراب تھا۔

''اماں آئندہ مجھے پھپو کے ساتھ بازار جانے کا مت بولنا۔'' چادر اتار کر پلنگ پر پھینکتے ہوئے وہ غصے سے ساجدہ سے مخاطب تھی۔ ''حد کرتی ہیں پھپو، سستی اور گھٹیا چیزوں کے چکر میں گھما، گھما کر میرا مغز بھی گھما کر رکھ دیا انہوں نے...... کنجوس ماری کہیں کی۔

''ہاں زری سچ کہہ رہی ہے تو، واقعی فیروزہ آپا تو توبہ، توبہ اتنی کنجوس ہیں کہ اللہ معاف کرے، میری شادی پر بھی اتنا خراب جوڑا لائی تھیں کہ مانو کسی ماسی کو دے رہی ہوں۔'' ساجدہ نے اپنے گلے پیٹتے ہوئے گزرے زمانوں کا ذکر کر کے دل کے پھپولے پھوڑنا ضروری سمجھا۔

''سچ میں میری سہیلیوں نے مذاق اڑا، اڑا کر میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ تمہاری دادی بھی ایک نمبر کی مہا کنجوس تھیں میں نے سنا ہے۔''

''بس کرو اماں، دادی کو تو بخش دو بیچاری کی ہڈیاں بھی گل گئی ہوں گی۔'' زرینہ نے اماں کو دیکھ کر غصے سے کہا۔

''بازار میں ایک سے ایک خوب صورت جوڑے ہیں کہ بندہ دیکھتا رہ جائے مگر ہمارے نصیب میں وہی فقیروں والے کپڑے لکھے ہیں وہی ترستی زندگیاں اور خواہشات کی لمبی قطاریں لگی ہیں جو کبھی نہ پوری ہوں گی۔'' وہ بڑبڑائی۔

''مگر اماں میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کرنے والی۔'' آخری جملہ وہ دل ہی دل میں بولی۔

''ہاں تو، تو کیا سمجھتی ہے کوئی شہزادہ آئے گا تیرے لیے......؟ ہمارے نصیب میں یہی کچھ ہے پگلی، ایسے گھروں میں پیدا ہونا، ایسے گھروں میں شادی کرنا اور یہیں مر جانا، بجائے یہ کہ ہم اپنے مقدر کو کوسیں، گلہ کریں، جلیں، کڑھیں، چپ چاپ اللہ کے فیصلوں کے آگے سر جھکا دینا چاہیے وہ ہے بھلا کرنے والا سمجھی؟'' ساجدہ نے پان کی گلوری منہ میں دباتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

وہ پہلے ہی جمال کے نام سے بدکتی تھی اوپر سے تیمور کی آمد اور تیمور کی باتوں نے اسے مزید ہوا دی۔

کافی ہمت اور حوصلہ آ گیا تھا اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ خود ہی کچھ کر ڈالے گی جب اماں، ابا کو میرا خیال نہیں، وہ میرے بارے میں نہیں سوچتے، اتنا بڑا فیصلہ کرتے وقت بھی نہ پوچھا تو میں کیوں خود کو داؤ پر لگاؤں؟ کیوں ساری زندگی سسک، سسک کر اذیت میں گزاروں؟ کیوں اپنے ارمانوں کا خون کروں؟''

''خالہ میں نے گھر پر اڈا لگایا ہے سلمیٰ ستارے کے لیے۔ زری گوٹے کا کام چل رہا ہے تم زرینہ کو بھی بھیج دینا وہ بھی کام بنا لیا کرے گی۔ شام کے وقت فارغ ہوتی ہے ناں؟'' باہر صحن سے صبوحی کی آواز آئی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھی صبوحی، ساجدہ سے مخاطب تھی یعنی روز ملنے کا بہانہ نکال رہی تھی۔

''ہائے میری جان! دل کرتا ہے تیرا منہ چوم لوں۔'' صبوحی، ساجدہ سے بات کر کے کمرے میں آئی تو زرینہ نے واقعی اس کا منہ چوم لیا۔ مگر ساجدہ نے جانے سے منع کر دیا تھا۔ صبوحی کا یوں بے باکی سے ادھر اُدھر گھومنا پھرنا ساجدہ کو بالکل اچھا نہیں لگتا تھا نہ جانے کیوں صبوحی سے ساجدہ کو بہت چڑ تھی۔

''زرینہ کے ابا کو یہ اچھا نہیں لگے گا کہ زرینہ روزانہ گھر سے جائے۔'' ساجدہ نے کہا تو زرینہ کا منہ لٹک گیا۔ صبوحی بھی چپ ہو گئی۔

''دیکھ لے میں نے تو کوشش کر لی مگر تیری اماں ہے ناں ہٹلر، تیمور تجھ سے بات کرنے کو ملنے کو تڑپ رہا ہے۔''

زرینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے اماں ظالم لمبی ناک والی چڑیل لگی۔ جس نے زرینہ کو لوہے کے پنجرے میں قید کر کے رکھا تھا، صبوحی چلی گئی تھی۔

''اماں تمہارا بس چلے تو میرے ہاتھ پیر توڑ کر کونے میں ڈال دو، دنیا جہان کی لڑکیاں جوان ہوتی ہیں، ایک میں انوکھی نہیں ہوں۔ تم نے تو مجھے پابندیوں میں بند کر کے رکھا ہے میں صرف چولھا ہانڈی، تمہاری، تمہارے بچوں کی خدمتیں کرنے کے لیے رہ گئی ہوں، میری مرضی، میری پسند، میرا حق، میری ضرورت، میری خواہش کوئی معنی نہیں رکھتی سب کا احساس، سب کا خیال کرنے کے لیے میں ہی رہ گئی ہوں اور کسی کو میرا

کوئی خیال نہیں، کوئی احساس نہیں۔''

''چپ کر۔'' ساجدہ جو خاموشی سے سن رہی تھی اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''تیرا احساس ہے، تیری فکر ہے، تیرا خیال ہے تب ہی ایسا کرتی ہوں۔ تو بچی ہے معصوم اور سیدھی سادی ہے، تجھے زمانے کی عیاریوں کی خبر نہیں ہے میری بچی۔ یہ زمانہ بہت چالاک ہے، کوئی کسی کا سچا ہمدرد نہیں ہے سب اپنے، اپنے فائدے کی بات کرتے ہیں تو میری ذمے داری ہے اور تو خیر سے اپنے گھر کی ہو جائے بس میری یہی آرزو ہے۔'' ساجدہ کی آواز بھرا گئی۔

''ہونہہ، ایک پنجرے سے دوسرے پنجرے میں قید کرنے کی آرزو ہے تمہاری۔'' غصے میں کہتی، تنفتاتی ہوئی کمرے کی طرف چل دی۔ ساجدہ تاسف سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ کتنی منفی سوچ رکھتی تھی وہ۔

دوسرے دن صبوحی پھر تیمور کا خط لے آئی۔

''جانِ من میں تمہیں قریب سے دیکھنے، تمہارے ہاتھوں کو تھامنے، تمہارے بالوں کو سنوارنے کے لیے تڑپ رہا ہوں، تم سے مل کر مستقبل کے پلان بنانا چاہتا ہوں..... پلیز ایک بار آ کر میری بے چینی، بے قراری، دل کو سکون بخش دو۔'' خط پڑھ کر زرینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں کیا کروں؟'' وہ صبوحی کے سامنے سراپا سوال تھی۔ ''ٹھہر جا میں کل آ کے جاچا سے کوئی بہانہ کرتی ہوں۔'' صبوحی اسے تسلی دے کر چلی گئی۔ وہ خط کے لفظوں کے سحر میں ڈوبی تھی کہ ساجدہ کی تیز آواز پر چونکی۔

''یہ صبوحی روز انہ منہ اٹھا کر کیوں چلی آتی ہے کوئی کام دھندا نہیں ہے اسے؟''

''اماں، صبوحی کی اماں تمہاری جیسی نہیں، اسے بھروسا ہے اپنی بیٹی پر انہوں نے قید کر کے نہیں رکھا ہے اسے، وہ مرضی سے زندگی جیتی ہے۔'' کٹیلے جواب پر ساجدہ بس اسے دیکھتی رہ گئی کتنا خناس تھا اس کے چھوٹے سے ذہن میں شاید زرینہ اس کو ماں نہیں سمجھتی صرف ''سوتیلی ماں'' ہی سمجھتی تھی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر ساجدہ واپس پلٹ گئی۔

زمانہ بدل گیا

ایک زمانے میں اسکول، کالج میں برائے نام فیس ہوا کرتی تھی لیکن تعلیم اعلیٰ۔ اور اب تو اسکول کی فیسیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں، اس کے ساتھ ہی کوچنگ کی فیس الگ..... اللہ کی پناہ! جتنے پیسوں میں ایک شادی اچھی طرح ہو جائے، اتنے پیسے بچے کو میٹرک کروانے میں لگ جاتے ہیں۔ ایڈمشن فیس کے ساتھ، ساتھ مہینے کی فیس۔ بچوں کو اسکول ٹیچر اور کالج کے اساتذہ خود بتاتے ہیں کہ وہ کس کوچنگ سینٹر میں پڑھاتے ہیں (اور بچوں سے یہ بھی کہتے ہیں کہ اسکول میں نہیں پتا چلے) بھئی ہم تو کہتے ہیں کہ پہلے کی طرح اسکول میں اتنا ڈل لگا کر پڑھا دیا کریں کہ کوچنگ کی ضرورت نہ رہے تو پتا ہے ہمیں کیا جواب ملے گا؟ یہی کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ اب پڑھائی بہت مشکل ہو گئی ہے اور سال ختم ہونے کے باوجود بچہ پورا کورس نہیں پڑھ سکتا۔ اسی لیے تمام اسکولوں میں ایکسٹرا کلاسز کا بھی سلسلہ ضرور رہتا ہے۔

پہلے سال میں ایک دو بار ہفتہ طلبہ منایا جاتا تھا اور جس کے پاس جو چیز ہوتی تھی وہ اس میں حصہ لے لیتا تھا اور ماں، باپ پر خرچے کا اضافی بوجھ نہیں پڑتا تھا اور اب تو اللہ کی پناہ، آج کلر ڈے ہے، اس کے لیے سرخ رنگ کا ڈریس چاہیے۔ اب اگر آپ کے بچے کے پاس نہیں تو بازار سے لا کر دینا پڑے گا۔ چاہے مہینے کا آخر ہو یا شروع، یہ اسکول والوں کا نہیں آپ کا مسئلہ ہے۔

بہر حال آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ ہم پڑھائی کے خلاف ہیں۔ نہیں، علم سے ہمیں بھی محبت ہے۔ اس لیے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق علم کے لیے نہ فاصلوں کی کوئی قید ہے، ''علم حاصل کرنا مسلمان مرد و عورت دونوں پر واجب ہے۔'' اور نہ عمر کی پابندی ہے۔ ''جھولے سے قبر تک علم حاصل کرو۔''

لہٰذا پہلے مرحلے پر حکومت کو چاہیے کہ ایسا نظام بنائے کہ تمام پاکستانیوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کے مواقع میسر ہوں۔ پھر ہم خود بھی محنت کریں اور بچوں کو بھی اچھی طرح سے پڑھائیں۔ کیونکہ زمانہ بدل گیا ہے۔

مرسلہ: نجمہ ضیا، کراچی

دوسرے دن شرافت فیکٹری سے آیا تو تھوڑی دیر بعد صبوحی بھی آ گئی۔ ''سلام چاچا۔'' ادب سے سلام کر کے وہ وہیں شرافت کے قریب یہ بیٹھ گئی۔ چاچا اس کے ابا کا حال احوال پوچھنے لگا۔

''ابا تو قربانی کا جانور خریدنے گیا ہے، اماں بھی گھر پر نہیں ہیں مجھے کھانا بنانا ہے تم اجازت دو تو گھنٹے بھر کے لیے زرینہ کو لے جاؤں؟'' کچھ دیر بعد وہ ڈرتے، ڈرتے بولی تھی۔

''لے جاؤ مگر جلدی بھجوا دینا دیر ہو جائے تو اس کی ماں پریشان ہو جاتی ہے۔'' شرافت نے کہا۔

زرینہ خوشی سے بے قابو ہو گئی۔ فوراً تیار ہونے چل دی۔ سارا وقت تیمور اور وہ پیار بھری باتیں کرتے رہے۔ زرینہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ جمال سے کسی صورت شادی نہیں کرے گی اور تیمور کے لیے وہ گھر بار بھی چھوڑ سکتی ہے۔ دونوں طرف سے اطمینان بھرے قول و قرار ہو چکے تھے باقی طے کرنے کے لیے صبوحی جیسی مخلص دوست تو موجود تھی۔

گھنٹے بعد وہ گھر لوٹی تو اماں نے بتایا کہ ''جمال آیا تھا' وہ کمرے میں رنگ کروانا چاہ رہا ہے تو اپنی پسند کا رنگ بتا دے۔'' وہ جو ابھی مکمل طور پر تیمور کی باتوں کے حصار میں تھی اسے یوں جمال کا نام لے کر اماں کی مداخلت بالکل پسند نہ آئی، بنا جواب دیے وہ کمرے میں آ گئی۔

دوسرے دن صبوحی تیمور کی طرف سے سستا سا میک اپ کٹ اور خط لے آئی، پیچھے ہی ساجدہ بھی کمرے میں آ گئی تھی اس وقت تک خط کو کمال ہوشیاری سے زرینہ گریبان میں منتقل کر چکی تھی جبکہ کٹ اس کے ہاتھ میں تھی۔

''یہ..... یہ کیا ہے؟'' ساجدہ نے چھوٹے سے لال رنگ کے پلاسٹک کے اس ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

''خالہ یہ میک اپ ہے سرخی اور پاؤڈر ہے اس میں، زرینہ کی شادی ہونے والی ہے ناں اس لیے میں لائی ہوں اس کے لیے کل جمعہ بازار گئی تھی تو مجھے اچھا لگا۔'' صبوحی نے جلدی سے بات سنبھال لی۔

''واہ بڑی ہوشیار ہے یہ تو بچی۔'' زرینہ نے نظروں، نظروں میں صبوحی کی بلائیں لے ڈالیں۔ کیسے ہر موقع پر کام آ جاتی ہے۔

زرینہ کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی تو وہ، صبوحی کے سامنے رونے لگی۔ ''کیا کروں میں؟''

''کیا کرنا ہے جب ان سب کو تیری پروا نہیں تو، تو بھی مت کر، ویسے بھی ساجدہ خالہ کون سی تیری سگی ماں ہیں جو انہیں دکھ ہو گا کون سا تیرے ابا نے سر پر ہاتھ رکھ کر تیری مرضی پوچھی ہے۔'' صبوحی کی بات میں دم تو تھا۔ واقعی اماں تو سوتیلی ہی تھی اور ابا بھی اماں کا غلام ہی تھا۔

سب خوشی، خوشی شادی کی تیاریوں میں لگے تھے۔ اس روز سرمد دوستوں کے ساتھ مل کر گھر میں رنگین بلب لگا رہا تھا، گھر میں شادی کا ماحول بنا رہا تھا۔ ساجدہ کی آنکھیں کئی بار زرینہ کی رخصتی کے خیال سے بھیگ چکی تھیں۔ کچھ دنوں بعد زرینہ کو وداع ہو جانا تھا بیٹیاں بھی کتنی جلدی بڑی ہو جاتی ہیں۔

صبوحی نے سارے معاملات کے بارے میں طے کر دیا تھا۔ تیمور نے کہیں اور گھر کا بندوبست کر لیا تھا اور وہ زرینہ کو لے کر وہیں جانے والا تھا اس کی اماں کچھ عرصے کے لیے اپنی بیٹی کے یہاں گئی ہوئی تھیں لیکن بقول صبوحی کہ ان کو سب علم ہے۔ صبوحی نے کہا تھا کہ پہلی فرصت میں تم اپنا زیور لے کر مجھے دے دو میں تیمور تک پہنچا دوں گی پھر تم دو دن بعد موقع دیکھ کر جتنے پیسے ہوں وہ لے کر نکل آنا باقی باتیں تیمور سے خط کے ذریعے طے کر لی تھیں۔

زیور کے نام پر ایک سونے کی چین تھی وہ بھی ساجدہ کو میکے سے ملی تھی۔ ایک سونے کی انگوٹھی جو ابا نے اماں کو دی تھی اور ایک بالیوں کی جوڑی جو زرینہ کی نگی اماں کی تھیں۔ وہ سارا کچھ ساجدہ نے زرینہ کے لیے ہی رکھ دیا تھا وجیہہ کے لیے کچھ نہ رکھا تھا۔ چاندی کی پائل، چاندی کی چین اور ایک سیٹ سب دھلوا کر زرینہ کے لیے رکھ دیا مگر..... کتنی بار زرینہ نے کوشش کی کہ وہ سارا زیور نکال لے مگر کوئی نہ کوئی سامنے آ جاتا۔ وہ جھنجلا جاتی۔ اس روز بھی وہ اسی غرض سے کمرے میں گئی تو

ساجدہ زیور نکالے شرافت کو دکھا رہی تھی۔

''ارے تم نے سارا کچھ زرینہ کو دے دیا تو وجیہہ کے لیے کچھ نہیں رہے گا۔'' شرافت نے کہا۔

''ہاں، زری کے ابا وجیہہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے اس کا وقت بھی دور ہے اس کے نصیب میں جو کچھ ہوا وہ وقت پر لے جائے گی۔ تو مانے یا نہ مانے میں نے ہمیشہ زرینہ کو وجیہہ سے زیادہ چاہا ہے، اس کو ڈانٹا، سمجھایا تو صرف اس کی بھلائی کے لیے۔ زمانہ بہت خراب ہے اور وہ بہت معصوم ہے مگر شاید وہ میری بات کا غلط مطلب ہی نکالتی ہے۔ بس اللہ پاک اس کو خوش رکھے۔'' ساجدہ کی آواز بھیگنے لگی تھی۔

''ہونہہ، سوتیلی ہی ہے لاکھ کچھ بھی کر لے کبھی میرے دل میں جھانک کر دیکھا ہے تم نے۔'' بڑبڑاتی وہ واپس لوٹ گئی۔

وہ رات کافی کٹھن تھی۔ اسے آج رات کو ہی یہ گھر چھوڑ دینا تھا۔ صبوحی نے خاص طور پر وقت کی پابندی کا احساس دلایا تھا۔ سب گہری نیند سو چکے تھے۔ اس نے چار جوڑے کپڑے ایک شاپر میں رکھے، ابا کی پرانی قمیص کی جیب سے شادی کے بقیہ اخراجات کے لیے رکھے گئے پندرہ ہزار روپے نکالے، باقی تو اماں نے نہ جانے کہاں چھپا کر رکھے تھے۔ زیور کی پوٹلی بنائی اور آہستگی سے باہر صحن میں آ گئی۔ دروازے تک پہنچی تو یہ دیکھ کر اس کا دم نکل گیا کہ آج دروازے پر تالا تھا ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ چابی اندر اماں، ابا کے کمرے میں تھی۔ وہ دبے پاؤں واپس آ گئی اور چابی لینے کمرے میں آ گئی۔ تب ہی شرافت نے کروٹ بدلی۔

''اُف۔'' وہ جلدی سے پردے کے پیچھے ہو گئی پھر اماں کے کھانسنے کی آواز آئی۔

''اُف توبہ کیا مصیبت ہے؟'' ایک، ایک لمحہ قیمتی تھا باہر تیمور بے چینی سے اس کا منتظر ہو گا یہ سوچ کر اسے کوفت ہونے لگی۔ ''اماں کو کھانسی کی بیماری بھی آج ہی لگنی تھی مر جائے اللہ کرے کھانس، کھانس کر.....'' اسے اماں پر بہت سخت غصہ آ رہا تھا۔ تیمور کی بے چینی کا سوچ کر اس کا دماغ کھول رہا تھا۔

اسی ادھیڑ بن میں بیس منٹ گزر گئے یہ بیس منٹ اس کے لیے بیس گھنٹوں پر محیط تھے۔ تب ہی گلی میں بے ہنگم سا شور بلند ہوا۔

''الٰہی خیر! یہ کیا ہو گیا ہے، آج نہ نکل سکی تو بہت مشکل ہو جائے گی۔'' شور پر گھبرا کر وہ جلدی سے کمرے کی طرف بھاگی کیونکہ شور بڑھ چکا تھا اور شرافت اور ساجدہ بھی جاگ چکے تھے۔ شرافت دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور وہ وہیں پلنگ پر دبکی پڑی رہی، ہاتھوں میں مختصر سے زیورات کی پوٹلی دبی ہوئی تھی اور پلنگ کے نیچے کپڑوں کا شاپر پڑا تھا۔

''یا الٰہی کیا مصیبت ہو گئی ہے۔'' اچانک افتاد نے اسے سراسیمہ کر دیا تھا۔

''توبہ، توبہ اللہ پاک رحم کرے کیا ہو گیا ہے آج کل کے لوگوں کو..... پیسوں کی ہوس نے کیسا اندھا، بہرہ بنا دیا ہے۔'' تھوڑی دیر بعد شرافت ... آیا تو بہت پریشان تھا۔

''کیا ہو گیا شرافت؟'' ساجدہ نے بھی پریشان لہجے میں پوچھا۔

''وہ ہے ناں کریم بھائی انہوں نے اپنے گھر میں کرایے پر ایک ماں بیٹے کو رکھا تھا مگر پتا چلا ہے کہ وہ ماں بیٹا نہیں تھے بلکہ ان کا گروپ ہے جو بھولی بھالی لڑکیوں کو محبت کے چنگل میں پھنساتا ہے، دبئی کے جھانسے دے کر ان سے زیور اور پیسے لے کر فرار ہو جاتا ہے اور سب سے تکلیف دہ بات تو یہ ہے زری کی ماں کہ کریم بھائی کی بیٹی صبوحی بھی اس کے ساتھ اس کام میں شامل تھی اب دیکھو نہ جانے کس نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ ابھی، ابھی پولیس آئی تھی تینوں کو پکڑ کر لے گئی ہے۔ توبہ، توبہ کریم بھائی بیچاروں کو دل کا دورہ ہی پڑ گیا لوگ انہیں اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ ان کے گھر میں تو کہرام مچا ہوا ہے۔ سنا ہے صبوحی کا خود اس لڑکے کے ساتھ چکر چل رہا تھا اور آج وہ دونوں یہاں سے فرار ہونے والے تھے۔'' زرینہ جو چپ پڑی سب کچھ سن رہی تھی اسے لگا جیسے کمرے کی چھت اس کے نازک وجود پر آ گری ہو۔

''یہ سب کیا ہو گیا تھا؟ یعنی صبوحی..... صبوحی نے بھی مجھ سے فراڈ کیا۔ مجھے پاگل بنا کر زیور اور پیسے لینا چاہتی تھی۔ اُف میرے مالک کتنی بڑی بدنامی سے بچا لیا تو نے۔ اگر اس وقت وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہوتی..... توبہ، توبہ۔'' اس کو جھرجھری آ گئی۔

''میری اماں!'' اسے ساجدہ پر ڈھیروں پیار آ گیا۔ ''اگر آج دروازے پر تالا نہ لگا ہوتا تو..... تو.....'' اس سے آگے وہ تو کچھ سوچ بھی نہ سکی۔

''اللہ پاک مجھے معاف کر دے تیرا لاکھ، لاکھ شکر ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو نکلتے ہی چلے گئے۔ اس کی اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر باہر نکل سکے۔ کتنی بار صبوحی کے لیے وہ ساجدہ سے لڑی تھی۔ ہر بار ساجدہ ہی قصوروار نظر آتی۔ ہٹلر اور ظالم جادوگرنی لگتی، صبوحی قدم، قدم پر دوست، مخلص اور ہمدرد لگتی..... دفعتاً اس کی نگاہ اٹھی۔ دروازے پر ساجدہ کھڑی تھی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ زیورات کی پوٹلی پر مزید سخت ہو گئے۔ نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ وہ نظر ملانے کے قابل بھی نہیں تھی۔ ساجدہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''اماں..... اماں مجھے معاف کر دو..... میں بہت بری ہوں..... بہت بری۔ بدتمیز اور کم عقل.....'' وہ ساجدہ کے گلے لگ کر بلک پڑی۔ ''بہت نادان تھی میں کہ تمہیں ہمیشہ سوتیلا سمجھا ''ماں'' نہ سمجھا۔''

''بس چپ کر جا میری بچی۔'' ساجدہ خود بھی رونے لگی۔ ''تو مانے یا نہ مانے مجھی تو مجھے وجیہہ سے زیادہ عزیز ہے۔ بہت پیار کرتی ہوں تجھ سے۔ سوتیلی ماں ہمیشہ سوتیلی اولاد کے ساتھ غلط سلوک کرتی ہے مگر مجھے سرمد اور وجیہہ کی قسم ہے میں نے کبھی تجھے ان دونوں سے کم نہ چاہا بلکہ زیادہ ہی چاہا، اگر تجھے کچھ کہا، پابندی لگائی، تجھے ڈانٹا تو صرف اور صرف تیری بھلائی کے لیے..... تیری عزت مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے اور مجھے صبوحی ہمیشہ سے بری لگتی تھی اس کا ہر جگہ یوں منہ اٹھا کر آ جانا، اتنی بے باکی، مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی تھی، اسی لیے میں اس کے ساتھ تجھے دیکھتی تو منع کرتی اور تو برا مان لیتی۔''

''ہاں اماں! مجھے کیا پتا تھا کہ جس کو میں سچی دوست سمجھتی ہوں وہی میری پیٹھ میں چھرا گھونپنے والی ہے۔'' وہ شرمندگی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے اپنی کوتاہی کا اعتراف کر رہی تھی۔

''چپ کر جا بس جو ہو گیا سو ہو گیا۔ رب نے کچھ رحم کر دیا ناں..... ہم پر بگی ''ماں'' تو بس ''ماں'' ہوتی ہے سگی اور سوتیلی بنانے والے ہم خود ہوتے ہیں۔ میں تیری ''ماں'' ہوں اور ماں کبھی اپنی اولاد کا برا نہیں چاہتی۔ چل اٹھ، اٹھ کر دروازہ بند کر لے میں اور تیرا ابا کریم بھائی کے گھر جا رہے ہیں سنا ہے ان کی حالت بہت خراب ہے۔ بھابی کا رو، رو کر برا حال ہے، ذرا ان کو دیکھ آئیں۔'' ساجدہ نے اسے چمکارتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا اور اٹھ کر جانے لگی۔

''اماں۔'' اس نے آواز دی۔ ساجدہ پلٹی۔

''یہ..... زیور کی پوٹلی اور پیسے۔'' اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے اور اس کے گلے لگ کر دوبارہ سے پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی۔ آج وہ گزشتہ کوتاہیوں کے سارے آنسو بہا لینا چاہتی تھی۔

ساجدہ اور شرافت چلے گئے تب ہی فجر کی اذان ہوئی۔ زرمینہ اٹھی، وضو کیا، نماز پڑھی آج وہ اپنے رب کے سامنے سچے دل سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگنا اور اس کا شکر ادا کرنا چاہتی تھی کہ اس نے اسے بہت بڑی بے عزتی اور بدنامی سے بچا لیا تھا۔ ساتھ میں اپنے اور جمال کے آئندہ خوشگوار تعلقات کی دعا بھی مانگنی تھی۔

تین دن بعد عیدالاضحیٰ کے دن اس کا نکاح ہونے والا تھا۔ دعائیں مانگتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ ''واقعی ماں باپ کے فیصلوں میں ہمیشہ، عزت، پائداری، بھرم اور پختگی ہوتی ہے جو اولاد کی خوشگوار زندگی کی علامت ہے۔ اللہ پاک سب نادان بیٹیوں کو بروقت عقل دے، اور وہ اپنے والدین کی عزتوں کو روند کر دہلیز پار کرنے کا سوچ بھی نہ سکیں۔'' اس نے صدقِ دل سے دعا مانگی اور مطمئن ہو کر مصلے سے اٹھ گئی۔

❁❁❁

آبلہ پا

فرحی نعیم

شنو خالہ، دوپہر کے کھانے کے لیے سبزی بنا رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''ارے دیکھنا رباب.....'' انہوں نے وہیں سے بیٹھے، بیٹھے بیٹی کو آواز دی تھی۔ جو کمرے میں تھی۔

ماں کی آواز پر وہ فوراً آئی اور دروازہ کھولا۔

''ارے مینا! تم؟'' رباب نے دروازے پر کھڑی مینا کو اس وقت آتے دیکھ کر کچھ اچنبھے سے پوچھا۔

''ہاں میں..... السلام علیکم خالہ.....'' مینا سلام کرتے ہوئے اندر داخل ہوگئی۔

''وعلیکم السلام..... آؤ مینا، بیٹھو۔'' خالہ بھی اسے بے وقت دیکھ کر حیران ضرور ہوئیں لیکن کچھ پوچھا نہیں۔

''گھر میں سب ٹھیک ہیں ناں.....؟'' انہوں نے اس کے بڑے بیگ کو دیکھا جو اب وہ اُن کے تخت پر رکھ رہی تھی پھر خود بھی ان کے پاس اطمینان سے بیٹھ گئی۔

''گھر میں تو خیریت ہی ہے، بس امی کو اچانک سکھر جانا پڑ گیا۔ رات فون آیا تھا، چاچا میاں کا انتقال ہوگیا ہے، بس بابا تو بہت ہی پریشان اور غمزدہ تھے۔ رات ہی ان لوگوں نے جانے کا پروگرام بنالیا تھا۔ وہ لوگ تو چلے گئے۔ میرے تو اگلے ہفتے سے پیپر شروع ہونے والے ہیں۔ اس لیے میں تو نہیں جاسکتی تھی۔ امی، بابا نے کہا کہ تم خالہ کے ہاں رک جاؤ، تین دن کی تو بات ہے..... ہم جلدی آجائیں گے، اس لیے میں ان کے جانے کے بعد گھر صاف ستھرا کر کے یہاں آگئی۔'' وہ تفصیل سے بتاتے ہوئے بولی۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون..... اچھا کیا تم یہاں آگئیں آخر قریب رہنے کا یہی تو فائدہ ہوتا ہے، بندہ جب دل چاہے چلا آئے۔ اور وہ تمہارے چھوٹے بہن، بھائی؟'' خالہ نے اس کے بہن، بھائیوں کے متعلق سوال کیا۔

''امی نے تو کہا کہ یہیں رہ جائیں لیکن وہ دونوں نہ مانے، آخر ساتھ ہی لے گئیں۔''

''اچھا، اچھا، ویسے کیا ہوا تھا، بھائی قمر کو.....؟''

''قمر چاچا پچھلے کئی مہینوں سے بیمار تھے، کچھ گردوں کا مسئلہ ہوگیا تھا۔'' قمر چاچا، مینا کے والد کے چچازاد بھائی تھے لیکن قربت سگے بھائیوں جیسی ہی تھی۔

''اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، بڑے اچھے آدمی تھے..... ارے رباب کہاں چلی گئیں، مینا کے لیے کچھ ناشتا لے آؤ۔'' خالہ نے بیٹی کو آواز لگائی۔

''ارے نہیں خالہ، میں نے ناشتا امی، بابا کے ساتھ کرلیا تھا۔ آپ آج کیا بنا رہی ہیں؟''

''آلو، گوبھی۔'' ابھی خالہ اسے یہ کہہ رہی تھیں کہ رباب ٹرے میں مکھن، سلائس چائے اور بسکٹ وغیرہ لے آئی۔

''اوہو بھئی، میں کوئی مہمان تھوڑی ہوں بلکہ میں تو تمہارے گھر تین دن رہنے آگئی ہوں اور مہمان تین دن کا ہو تو وہ.....؟'' مینا ہونٹ دبا کر مسکرائی تو رباب بھی سمجھ کر مسکرانے لگی۔

''ارے لڑکی، اچھا، اچھا بولا کرو..... چلو تم یہ تو لو، میں یہ ہانڈی چڑھا کر آتی ہوں.....'' خالہ کہہ کر سبزی کی ٹوکری لے کر اٹھ گئیں اور مینا، رباب کو تفصیل سے رات کا قصہ سنانے لگی۔

☆☆☆

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر رباب اور مینا نے کھانے کے برتن سمیٹے اور خالہ کہیں جانے کی تیاری کرنے لگیں۔

''خالہ آپ کہیں جارہی ہیں.....؟'' مینا نے ان سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا تم کو معلوم تو ہے میری مصروفیت، بس اسی سلسلے میں جارہی ہوں.....'' خالہ پرس میں اپنی کچھ چیزیں رکھتے ہوئے بولیں۔

''خالہ آپ کس طرف جارہی ہیں؟ اصل میں مجھے اپنی سہیلی بشریٰ کے پاس جانا ہے، کچھ امتحان اور نوٹس کے بارے میں بات کرنی ہے۔ آپ مجھے وہاں تک چھوڑ دیں گی۔'' مینا آخر میں کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''ارے ہاں، ہاں کیوں نہیں، مجھے تبسم آپا کی طرف جانا ہے۔ تمہاری یہ سہیلی بڑی مارکیٹ کی طرف ہے ناں.....؟'' انہوں نے بھانجی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا جواب میں اس نے تیزی سے سر ہلایا۔

''تو ٹھیک ہے، تبسم آپا کے گھر سے چند گلیاں تو آگے ہے، میں تم کو چھوڑ کر وہاں چلی جاؤں گی۔'' انہوں نے اطمینان سے کہا لیکن پھر کچھ سوچ کر بولیں۔ ''لیکن تم آؤ گی کیسے تبسم آپا کی طرف تو مجھے آدھا گھنٹا لگے گا۔ کیا تم آدھے گھنٹے میں فارغ ہوجاؤ گی؟''

''آدھے گھنٹے میں تو نہیں خالہ، کم از کم ڈیڑھ گھنٹا..... تو.....'' وہ خفیف ہو کر بولی۔

''اچھا چلو دیکھتے ہیں..... ابھی تو چلو.....'' رباب کے پاس اس کے ٹیوشن والے بچے آگئے تھے ورنہ مینا اسے ہی اپنے ساتھ لے لیتی۔ دونوں خالہ، بھانجی گھر سے باتیں کرتے ہوئے نکلیں اور آہستہ،

آہستہ چلنے لگیں۔ تبھی شنو خالہ کو اچانک کچھ خیال آیا اور انہوں نے اپنے پروگرام میں ردوبدل کیا۔

''مینا کیوں نہ تم بھی میرے ساتھ تبسم آپا کی طرف چلو۔ میں پھر جلد ہی وہاں سے نمٹ جاؤں گی پھر یہ جو تمہاری سہیلی ہے ناں بشریٰ، مجھے ابھی یاد آیا کہ اس کی گلی میں میرے میاں کی ایک رشتے کی پھوپی رہتی ہیں، اکثر شکایت کرتی ہیں کہ تم آتی نہیں..... چلو میں کچھ دیر ان کے گھر بیٹھ جاؤں گی۔ تم نمٹ جاؤ تو مجھے فون کر لینا۔'' شنو خالہ نے پورا پروگرام جیسے ترتیب دے لیا تھا۔

''ٹھیک ہے خالہ، آپ کو ان خالہ کے گھر (تبسم آپا) کو تو زیادہ دیر نہیں لگے گی ناں.....؟'' مینا نے احتیاطاً پوچھا۔

''میں کہہ دوں گی کہ آگے بھی جانا ہے..... بس یہ سامنے گلی ہے ناں اس میں ہے گھر.....'' یہ کہتے ہوئے خالہ نے سامنے اشارہ کیا چند منٹوں بعد خالہ ایک گھر کی گھنٹی بجا رہی تھیں۔

☆☆☆

شنو خالہ، جن کا اصل نام تو شگفتہ تھا، گھر والے پیار سے شگو کہتے تھے۔ پہلے پہل تو یہ شگو رہا لیکن پھر آہستہ، آہستہ شنو ہو گیا۔ اب وہ نہ صرف گھر والوں کے لیے شنو تھیں بلکہ خاندان اور اہلِ محلہ میں بھی شنو آپا اور شنو خالہ کہلاتی تھیں۔ وہ ایک درمیانے درجے کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ پھر شادی بھی اپنے جیسے سفید پوش گھرانے میں ہو گئی۔ شنو خالہ کو اللہ نے تین بیٹیوں سے نوازا تھا۔ لبنیٰ، اسما اور چھوٹی رباب۔ خالہ اپنے گھر اور بچوں میں مگن ایک مطمئن زندگی گزار رہی تھیں۔ میاں بھی ہم مزاج اور شریف انسان تھے۔ لبنیٰ نے انٹر کر لیا تھا اور پرائیوٹ بی اے کی تیاری کر رہی تھی۔ چھوٹی اسما ابھی فرسٹ ائیر میں تھی اور رباب تو ساتویں میں تھی۔ لبنیٰ کا ابھی بی اے بھی مکمل نہ ہوا تھا کہ ایک مناسب رشتہ دیکھ کر خالہ نے اس کے ہاتھ پیلے کر دیے۔ لبنیٰ اپنے گھر مطمئن تھی، اسما نے انٹر کیا تو اسی دوران اس کے لیے بھی ایک اچھا رشتہ آ گیا۔ خالہ نے اس کی بھی بات طے کر دی تھی۔ شادی میں ابھی سال تھا کہ خالو ایک بیماری میں مبتلا ہو کر خاک کا پیوند ہو گئے۔

شنو خالہ کے لیے یہ صدمہ اگرچہ بڑا جانکاہ تھا، لیکن قسمت کا لکھا سمجھ کر بہر حال تسلیم کرنا ہی تھا۔ عدت کے دوران ان کے گھر مختلف رشتے داروں اور محلے والوں کی آمد و رفت رہی، ہر آنے والا مختلف باتیں کرتا، اپنی سناتا، عدت سے نکلنے کے بعد بہت سے رشتے داروں نے انہیں اصرار کر کے اپنے گھر بھی بلایا اور انہی میں ان کے ایک رشتے کے بھائی یوسف بھی تھے۔ باتوں کے دوران، یوسف بھائی کی بیگم نے شنو خالہ سے کسی اچھی لڑکی کا پوچھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے ان دنوں لڑکی تلاش کر رہی تھیں۔ اچھے شریف، سلجھے ہوئے لوگ تھے، خالہ ان لوگوں کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ یوسف بھائی کی بیوی بھی خوش مزاج اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ ان کی اولاد بھی انہی کی طرح تھی۔ تبھی خالہ کو اپنی پڑوسن کی بیٹی نازش کا خیال آیا۔ نازش کی ماں اور شنو خالہ کی آپس میں بہت اچھی دوستی بھی تھی اور محلے داری بھی۔ پھر نازش کو بھی وہ خوب جانتی تھیں۔ سیدھی سادی، معصوم اور قبول صورت..... انہوں نے بھابی کو جھٹ نازش کے بارے میں بتایا اور وہ تو اچھی لڑکی چاہتی ہی تھیں۔ اگلے ہفتے ہی شنو خالہ کے گھر لڑکی دیکھنے کو موجود ہوئیں۔ شنو خالہ انہیں نازش کے گھر لے گئیں۔ دونوں گھرانوں کو ایک دوسرے سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، شاید وہ بھی ایسے ہی لوگ چاہتے تھے۔ اور یوں چھ ماہ کے اندر ہی نازش سسرال سدھار گئی۔ یوسف بھائی کی اچھی کھاتی پیتی فیملی تھی۔ نازش کی والدہ تو بہت خوش تھیں کہ شنو خالہ نے ان کی بیٹی کے لیے کیسا اچھا گھر اور لڑکا دیکھا۔ نہ صرف نازش کے گھر والے بلکہ اتنے اچھے اور کھاتے پیتے خاندان کو دیکھ کر تو محلے والوں میں بھی شنو خالہ کی واہ، واہ ہو گئی۔ ایک طرف اگر نازش کے گھر

والے ایسے شریف لوگ سے رشتہ جڑنے پر خوش تھے تو دوسری طرف وہ بھی سیدھی سادی نازش کو بہو کی صورت پا کر مطمئن تھیں۔ نازش نے بہت جلد اپنی خدمت گزاری اور خوش اخلاقی سے سسرال والوں کے دل جیت لیے تھے، اگرچہ شنو خالہ نے یہ رشتہ پورے خلوص اور دیانت داری سے کروایا تھا۔ اس میں ان کا کوئی مطلب نہ تھا..... یہ تو اتفاق ہی تھا کہ خالہ کی دونوں بیٹیاں ہی بتدریج شادی شدہ اور منگنی شدہ ہو چکی تھیں..... رہی رباب تو وہ ابھی کافی چھوٹی تھی۔

نازش کا یہ رشتہ بالکل اتفاقیہ ہوا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے خالہ کی اس مخلصی کا بڑا اچھا نتیجہ دیا۔ اب محلے اور خاندان کے اکثر لوگ ان کے پاس اپنے، اپنے بچے، بچیوں کے کوائف لانے لگے کہ ایسے ہی نیک شریف لوگوں سے ہماری بچیوں کے بھی بات چلا دیں۔ خالہ کتنا ہی منع کرتیں کہ یہ تو محض اتفاق تھا لیکن لوگ کہاں ماننے والے تھے۔ لہٰذا خالہ بھی آخر حامی بھر لیتیں..... ویسے بھی میاں کے بعد وہ بہت تنہائی محسوس کرتی تھیں..... اگرچہ گھر میں دو بیٹیاں موجود تھیں لیکن میاں کی کمی تو کوئی پوری نہیں کر سکتا تھا۔ پھر خالہ کے پاس یہ اچھا شغل ہاتھ آ گیا۔ وہ اسی طرح پوری نیک نیتی سے یہ ذمے داری پوری کرنے لگیں۔ یہ نیک نیتی ان کا ذریعۂ آمدنی بننے لگی تھی۔ سب سے پہلے نازش کی ماں نے ہی اپنی بیٹی کی رخصتی کے بعد خالہ کو مٹھائی اور جوڑا دے دیا تھا۔ حالانکہ انہوں نے انکار کر دیا تھا لیکن وہ زبردستی دے گئیں اسی طرح یوسف بھائی اور بھابی ایک دن بہو کے ساتھ ملنے آئے اور جاتے، جاتے شنو خالہ کے ہاتھ پر لفافہ رکھ گئے۔

''ارے بھائی یہ کیا ہے؟'' وہ حیران ہوئیں۔

''بھئی بہنیں کیا بھتیجوں کی شادی پر نیگ نہیں لیتیں بھائیوں سے؟''

''لیکن.....'' وہ جھجکیں۔

''بس شنو، یہ ہماری خوشی سمجھو، سچ میں تو تمہیں دعائیں دیتی ہوں، آج کل کی لڑکیوں کے مقابلے میں نازش ہیرا ہے۔'' بھابی بھی خوشی سے بولیں۔

اور اس کے بعد تو یہ سلسلہ چل نکلا..... خالہ نے آہستہ، آہستہ رشتہ کرانے کے عوض اپنی محنت کا جائز معاوضہ بھی لینا شروع کیا جو لوگ انہیں خوشی سے دے دیتے۔ اور آج تبسم آپا کے گھر مینا کے ساتھ بھی وہ اسی سلسلے میں جا رہی تھیں۔ تبسم آپا کو اپنے بیٹے کے لیے لڑکی چاہیے تھی..... اور انہوں نے شنو خالہ کو فون کر کے اپنے گھر آنے کی درخواست کی تھی۔

☆☆☆

مینا، خالہ کی ہمراہی میں جب گھر میں داخل ہوئی تو ایک لڑکی نے ان کی رہنمائی کی اور اندر کمرے میں پہنچا دیا جہاں درمیانی عمر کی ایک تیز طرار سی خاتون براجمان تھیں اور پاس ہی ان کے پاندان دھرا تھا جس میں سے وہ پان بنا رہی تھیں۔

''السلام علیکم!'' خالہ، بھانجی دونوں نے ہی میزبان خاتون کو سلام کیا جس کا انہیں جواب بڑی اچھی مسکراہٹ سے ملا تھا۔

''آیئے، آیئے آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔'' انہوں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''یہ آپ کی بیٹی ہو گی۔''

''نہیں بھانجی ہے، اسے بھی اپنی کسی سہیلی کی طرف جانا تھا تو میرے ساتھ آ گئی..... آپ بتایئے کیسے یاد کیا.....؟'' خالہ فوراً ہی مطلب پر آ گئیں۔ اس سے پہلے وہ اپنی کسی پڑوسن کے توسط سے ہی تبسم آپا سے ملی تھیں اور آج یہ ان سے دوسری ملاقات تھی۔

''بس بہن آپ کی بڑی تعریف سنی تھی کہ جو رشتہ بھی کراتی ہیں..... کامیاب رہتا ہے تو میں نے سوچا کیوں نہ اس دفعہ آپ ہی کے ذریعے معاملات طے کراؤں۔ بہو چاہیے مجھے، نیک سیرت اچھے مزاج کی، پڑھی لکھی، خوب صورت اور سب سے بڑھ کر... باکردار.....'' وہ اپنی بات پر زور دے کر بولیں۔

''جی، جی کیوں نہیں، بچیاں تو ساری ہی پیاری اور اچھی ہوتی ہیں۔''

''ارے اب کہاں..... یہ تو پچھلے وقتوں بلکہ ہمارے آپ کے وقتوں کی باتیں تھیں۔ اب ایسی لڑکیاں کہاں..... اس موئے موبیل (موبائل) نے تو ہر ایک کی مت ماردی۔ ہر کوئی عاشق، معشوق بنا ہوا ہے۔'' وہ ناک چڑھا کر ناگواری سے گویا ہوئیں۔ خالہ اور مینا تو اُن کی بات پر پہلو بدل کر رہ گئیں۔

''آپ کچھ اپنے بیٹے کے بارے میں بھی بتادیں تاکہ پھر مجھے رشتے کے لیے آسانی ہو.....''

''آپ کو زاہدہ نے میرے بیٹے کے بارے میں کیا بتایا نہیں تھا.....؟'' اب وہ کچھ تعجب سے پوچھ رہی تھیں۔

''بس یہی کہ آپ کے دو بیٹے، دو بیٹیاں ہیں، بڑا بیٹا، بیٹی شادی شدہ ہیں، آپ اب اپنے چھوٹے بیٹے، بیٹی کے لیے کوئی.....''

''او ہو یہ زاہدہ بھی نہ جانے.....'' ان کے ماتھے پر بل آئے۔

''اصل میں بات یہ ہے کہ مجھے اپنے بڑے بیٹے ہی کے لیے تو لڑکی دیکھنی ہے۔''

''بڑا بیٹا.....؟'' شنو خالہ کچھ گڑبڑائیں۔ ''لیکن وہ تو غالباً شادی شدہ ہے۔''

''شادی شدہ تھا.....'' انہوں نے ''تھا'' پر زور دیا۔ ''بھاگ گئی اس کی بیوی.....'' وہ بڑی نخوت سے بولی تھیں۔ اور یہ سن کر تو شنو خالہ اور مینا کا منہ لمحہ بھر کو کھلا ہی رہ گیا تھا۔

''بھاگ گئی.....؟ کس کے ساتھ؟'' خالہ کے لبوں سے بے ساختہ ہی نکلا تھا لیکن فوراً ہی انہیں اپنے لفظوں کے نامناسب ہونے کا خیال آیا اور انہوں نے گڑبڑا کر اپنے الفاظ بدلے۔ ''میرا مطلب ہے کہ کوئی مسئلہ ہوگیا تھا۔''

''ارے ایسا ویسا، شادی کو چار سال ہو چکے تھے، ایک تین سال کا بیٹا بھی تھا لیکن میاں کے بجائے دل بہنوئی سے لگتا تھا، کم بخت بہنوئی کے ساتھ چکر چلایا اور بھاگ گئی، میاں کا خیال کیا اور نہ بچے کا۔'' تبسم آپا زہر میں بجھے لہجے میں بول رہی تھیں۔

''تت..... تو..... اس کی بہن، وہ کچھ.....؟''

خالہ اٹکتے ہوئے بولیں، عجیب معاملہ تھا۔

''ایک سال پہلے مر جو گئی تھی..... بہن، راستہ تو صاف تھا پھر کیوں رکتی، بڑا پیسہ والا ہے وہ آدمی، بنگلا، گاڑی، نوکر، یہی تو چاہیے تھا اس (گالی) کو، میرا بچہ تو اس کے آگے بہت کم حیثیت رکھتا تھا۔ یہ چھوٹا ایک سو بیس گز کا گھر اور اسکوٹر، بس لات ماردی، پیسہ ہے ہی ایسی چیز، ہر رشتہ بھلا دیتا ہے۔'' وہ تلخی سے بول رہی تھیں انہیں یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کیسے ایک غیر عورت کے سامنے اپنے گھر کی اندرونی باتیں کھول رہی تھیں۔

''تعجب ہے، کیا آپ کی بہو کے والدین، انہوں نے کچھ نہ کہا بیٹی کو؟'' خالہ سے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ ایک شادی شدہ لڑکی، گھر چھوڑ کر بہنوئی کے ساتھ.....

''ارے سب ملے ہوئے تھے..... یہ منحوس موبیل (موبائل) یہ سب اسی کے کرامات ہیں، ہر وقت کانوں سے چپکا رہتا تھا.....؟ اب چھوڑو دفع بھی کرو..... میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے کوئی اچھی، خوب صورت لڑکی دکھاؤ لیکن اس کے کردار کو اچھی طرح چھان بین کر لینا، کہیں وہ بھی ایسی ویسی.....''

''جی، جی، میں دیکھتی ہوں۔'' شنو خالہ نے جلدی سے کہا۔ اتنی دیر میں تبسم آپا کی بیٹی چائے لے کر آئی تھی۔

''آپ نے یہ تکلف.....''

''پھر کب تک لے کر چلو گی.....؟'' تبسم آپا سے شاید اب صبر نہ ہو رہا تھا..... جب ہی ان کی بات کاٹتے ہوئے بولیں۔

''کوشش کروں گی آپ کے معیار کے مطابق مل جائے۔''

''ہاں، یہ بات تم نے اچھی کہی، اچھا یہ بسکٹ لو، تم بھی لو بیٹا۔'' انہوں نے اب مینا سے کہا۔ اور مینا نے سر ہلا کر جلدی سے ایک بسکٹ اٹھالیا اور پھر چائے پی کر خالہ نے ان سے اجازت لی۔

''اف..... خالہ یہ خاتون تو..... ان کی بہوتے یہ کیا۔ کیا؟''

''بس بیٹا دنیا مختلف النوع لوگوں سے بھری پڑی ہے لیکن یہ تبسم آپا جو الزامات اپنی بہو پر لگا رہی ہیں۔ ضروری نہیں کہ من وعن ایسا ہی ہوا ہو۔'' خالہ سنجیدہ تھیں۔

''کیا مطلب.....؟'' مینا بری طرح چونکی تھی۔

''بیٹا، مجھے اس پیشے میں آئے کئی سال گزر گئے ہیں۔ اور میرا واسطہ ہر طرح کے لوگوں سے پڑتا ہے۔ لیکن بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایسے لوگ جن کی اولاد کی پہلی شادی مختلف وجوہات کی بنا پر ناکام ہو جاتی ہے۔ جب وہ اپنے بچے، بچیوں کی دوسری شادی کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو اپنی سابقہ بہو یا داماد پر الزامات کی بارش کر دیتے ہیں۔ خاص طور پر بہوؤں پر تو ایسا لگتا ہے کہ بہتان تراشی کی انہیں کھلی چھوٹ مل چکی ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ ان کے گھر میں بھی بیٹیاں ہیں۔'' شنو خالہ تاسف سے کہہ رہی تھیں اور مینا بڑی حیرت و تعجب سے یہ سب سن رہی تھی۔ ''جس لڑکی کو بڑے چاؤ سے یہ اپنے گھر کی عزت بن کر لاتی ہیں اسے۔ کئی سال گزرنے کے باوجود اپنے گھر کا فرد دل سے تسلیم نہیں کر پاتیں۔ اور جب ناچاکیاں شروع ہوتی ہیں..... تو بجائے سمجھداری کا مظاہرہ کرنے کے اکثر گھرانوں میں ایسے ٹھن جاتی ہے جیسے ایک دوسرے کے پکے حریف ہوں۔ اکثر بہوؤں کا بھی قصور ہوتا ہے کہ تحمل و برداشت کا مظاہرہ نہیں کرتیں۔ بلکہ ٹھونک بجا کر مقابلے پر اتر آتی ہیں..... اور جب مقابلہ کریں گی تو شکست بھی ہوگی پھر جب گھر ٹوٹتے ہیں تو یہ خواتین اپنی سابقہ یا لڑکر میکے بیٹھی بہوؤں پر ایسے، ایسے ناقابل بیان الزامات لگاتی ہیں کہ الامان الحفیظ.....'' شنو خالہ گہری سانس لے کر کہہ رہی تھیں ساتھ لہجے میں ملال بھی تھا..... ''اُف میں بھی تم کو کیا قصہ سنانے لگی۔ چلو تمہاری سہیلی کی گلی آ گئی، کون سا گھر ہے اس کا؟'' خالہ پوچھ رہی تھیں اور مینا جو گم صم خالہ کی زبانی، معاشرے کے رویے سن رہی تھی یک دم چونکی۔

''آں..... ہاں ہاں، یہ والا.....'' اس نے کہا۔

''اچھا خالہ پھر آپ مجھے ایک گھنٹے بعد لے لیجیے گا۔''

''ہاں ٹھیک ہے، جاؤ۔'' اور خالہ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

☆☆☆

''خالہ پھر آپ ان آنٹی کے لیے کیسی بہو تلاش کریں گی؟'' رات کھانے کے بعد جب، مینا خالہ اور رباب کے ساتھ بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی تو اچانک اس نے خالہ سے سوال کیا۔

''کون.....؟ اچھا تبسم آپا کی بات کر رہی ہو، نہیں بیٹی میں ایسی خواتین سے معذرت کر لیتی ہوں، جو پہلی کو سکھ نہ دے سکیں، وہاں دوسری کیا خوش رہے گی۔''

''کس کی بات کر رہی ہیں امی.....؟'' اب رباب نے ماں سے پوچھا..... تب اس کو مختصراً خالہ نے بات بتائی۔

''لیکن خالہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دوسری کے ساتھ ایسا رویہ نہ ہو، اور لڑکی خوش رہے۔'' مینا کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''ہاں بیٹا، ہو سکتا ہے بالکل ہو سکتا ہے لیکن مجھے اپنے اللہ سے ڈر لگتا ہے، میرے آگے بھی بیٹیاں ہیں جب ایک لڑکی کا میں رشتہ کراتی ہوں تو لڑکی کے والدین میری بات پر اعتبار کر رہے ہوتے ہیں اگرچہ میں دونوں گھرانوں کو ملا کر یہ کہتی ہوں کہ باقی معاملات آپ خود طے کر لیں لیکن بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو میرے ہی ذریعے سے طے ہوتی ہیں۔ لیکن جب تبسم آپا جیسی خواتین سے میرا واسطہ پڑتا ہے تو میں معذرت کر لیتی ہوں۔''

''خالہ لڑکی کا بھی تو قصور ہو سکتا ہے، کیا معلوم وہ سچ ہی کہہ رہی ہوں.....'' مینا کے ذہن میں یہ بات چپک کر ہی رہ گئی تھی۔

''ہاں ممکن تو ہے لیکن بیٹا اس طرح، کسی کی بیٹی کو بدنام بھی نہ کریں۔ تم تو ابھی معصوم ہو تم نے کہاں دنیا دیکھی..... کہنے والے تو اپنی سابقہ بہوؤں کو چور، ذہنی مریض، بدکردار، آوارہ، بانجھ، پاگل اور بھی نہ جانے

کیا، کیا کہہ دیتے ہیں۔ یہ سب کہتے ہوئے ذرا ان کا دل نہیں کانپتا..... استغفر اللہ.....''

''تو ان کا کیا اپنا کوئی قصور نہیں ہوتا؟''

''ہوتا کیوں نہیں لیکن اپنی زیادتیاں کون بتانا پسند کرتا ہے، اپنا آپ تو بے قصور ہی لگتا ہے۔'' یہ کہنے والی رباب تھی۔ ''چھوڑو مینا تم کہاں ان باتوں میں الجھ گئی ہو..... تم اپنا پڑھو..... تمہارا ٹائم بڑا قیمتی ہے۔''

''ہاں بیٹی..... تمہارے پیپر ہونے والے ہیں، تم اپنی تیاری کرو، بس میں بھی اب لیٹوں گی۔'' اور اس کے بعد مینا نے کتابیں کھول لی تھیں لیکن ذہن بار، بار بھٹکتا جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے یکسوئی حاصل کی اور اپنی توجہ اسائنمنٹ کی طرف مبذول کی۔

☆☆☆

اگلے دن کا آغاز... اگرچہ عام ہی تھا لیکن انجام چونکا دینے والا تھا۔ خالہ کے ہاں صبح فجر کے وقت سے ہی ہو جاتی تھی۔ رباب کی بھی آج کل کالج کی چھٹیاں چل رہی تھیں۔ علی الصباح ناشتے کے بعد دونوں ماں، بیٹیاں حسب معمول گھریلو کام کاج میں لگ گئی تھیں..... مینا چونکہ رات دیر سے سوئی تھی۔ لہٰذا فجر پڑھ کر وہ دوبارہ سو گئی تھی۔ اب جب اٹھی تو رباب صفائی میں لگی ہوئی تھی جبکہ خالہ کچن میں مصروف تھیں۔ وہ بھی ناشتا کر کے خالہ کی مدد کرانے لگی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ اپنی پڑھائی میں مگن ہو گئی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دن بھر خالہ کے ہی فون آتے رہتے تھے۔ ان کا کام ہی ایسا تھا کہ لوگ زیادہ تر ان سے فون پر ہی گفتگو کرتے رہتے تھے۔ تیسری گھنٹی پر خالہ نے فون اٹھا لیا تھا۔ نرمی سے بات کرتے، کرتے اچانک ہی خالہ کی آواز میں نامحسوس پریشانی گھلی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھیں لیکن شاید دوسری طرف سے ان کی بات سننے کے بجائے اپنی ہی کہی جا رہی تھی۔ پھر جیسے خالہ نے بڑی مشکل سے بات بنائی اور ان سے چند دن بعد بات کرنے کا کہہ کر ٹالا تھا۔ فون بند کر کے خالہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئیں۔ مینا دوسرے کمرے میں تھی۔ اس نے اگرچہ خالہ کی گفتگو نہیں سنی تھی لیکن نظر اسے سب آ رہا تھا اور اس سے قبل کہ وہ خالہ سے پوچھتی اسی وقت رباب نے ماں سے دریافت کیا۔

''کیا ہوا امی.....؟ خیریت تو ہے..... آپ پریشان لگ رہی ہیں..... کس کا فون تھا؟'' رباب نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ لیے تھے۔

''ہاں بس.....'' وہ دو حرف کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

''بتائیں ناں خالہ کیا ہوا..... کس کا فون تھا؟'' اب کے مینا نے بھی آ کر اُن سے پوچھا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ اک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 20,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 19,000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا شمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

''اب کیا بتاؤں تم دونوں کو۔'' وہ پریشان تھیں، چہرے کے تاثرات وہ نہیں تھے جو اب سے کچھ دیر پہلے تھے۔ ''تبسم آپا کا فون تھا۔ اپنے بیٹے کے بارے میں مختصراً بتا کر بلکہ تعریفوں کے پل باندھ کر انہوں نے.....'' انہوں نے توقف کیا پھر ایک نظر مینا کو دیکھا۔

''کیا کہہ رہی تھیں وہ آنٹی.....آپ بتائیں کہ اتنے جلدی لڑکی تھوڑی ملتی ہے۔ چند دن تو صبر کریں۔'' رباب اکتا کر بولی۔ ''آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔''

''پریشانی کی تو بات ہے بیٹی، انہوں نے تو لڑکی پسند کرلی ہے اور مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ رشتہ دے کر بات پکی کردوں.....اور دو ماہ میں شادی بھی کروادوں.....''

''جب لڑکی پسند کرلی تو اچھا ہے ناں.....آپ کی ذمے داری ختم، ان سے کہیں خود ہی رشتہ دے دیں، آپ کو کیوں بیچ میں ڈال رہی ہیں۔'' رباب ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بے پروائی سے بولی رہی تھی۔

''بیچ میں اس لیے ڈال رہی ہوں کہ اس لڑکی سے میرا بڑا قریبی رشتہ ہے۔ میں.....میں اس لڑکی کی.....خالہ.....ہوں۔'' خالہ نے دھیرے، دھیرے، اٹکتے ہوئے بڑی مشکل سے اپنی بات مکمل کی۔

''کیا.....؟'' رباب اور مینا کی چیخ ایک ساتھ نکلی تھی۔

''کک.....کیا مطلب.....؟'' مینا کے حلق سے بمشکل نکلا تھا.....رباب بھی ہونق بنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔

''ہاں، کل میں مینا کے ساتھ ان کے گھر جو بات کرنے گئی تھی تو.....تو ان کو مینا اپنے بیٹے کے لیے بہت پسند آئی ہے اور اب انہوں نے اپنی بیٹیوں سے مشورہ کرکے مینا کے لیے مجھے رشتہ دے دیا ہے اور کہہ رہی ہیں کہ میں اپنی بہن سے بات کرکے، رشتہ پکا کردوں۔ میں نے انکار کیا تو ناراض ہونے لگیں، بڑی مشکل سے میں نے ٹالا کہ بہن تو شہر میں ہی نہیں ہے۔ پُرسے کے لیے گئی ہے.....جب آئے گی تبھی بات ہوگی۔'' خالہ نظریں چرائے شرمندگی سے کہہ رہی تھیں۔ ''یہ میرا قصور ہے کہ میں مینا کو ان کے گھر لے گئی لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ.....لیکن بیٹا.....'' انہوں نے مینا کو دیکھا۔ ''تم پریشان نہ ہو، کچھ نہیں ہوگا.....'' انہوں نے سفید پڑتی بھانجی کو ڈھارس دی۔ اور مینا ڈھیلے ڈھالے انداز میں ان کے برابر بیٹھ گئی بالکل خاموش، پریشان اور گم صم.....

''ارے مینا، جسٹ ریلیکس، تم تو ایسے پریشان ہورہی ہو جیسے رشتے پر ہاں ہی ہوگئی ہو، بھلا تمہاری امی، ابو کیا راضی ہوں گے۔ کبھی نہیں، مجھے جب اس کا یقین ہے تو کیا تمہیں نہ ہوگا۔'' رباب، مینا کی دلجوئی کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات کرگئی تھی۔

''ہاں واقعی، بھلا امی، بابا تو مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں وہ بھی.....اُف کیسی بیوقوف ہوں میں بھی اور خالہ بیچاری بھی میری وجہ سے شرمندہ ہورہی ہیں۔'' مینا نے دل میں سوچا اور پھر واقعی اسے تقویت ملی اور وہ مسکرادی اور سر ہلا کر پُرسکون ہوئی پھر خالہ کو دیکھا۔

''خالہ آپ بھی پریشان نہ ہوں، اور میں بھی اب ٹھیک ہوں۔'' اور پہلے خالہ نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور پھر اطمینان کی سانس لی اور سر ہلانے لگیں۔

☆☆☆

دو دن بعد امی بابا گھر آگئے تھے تو مینا نے اپنا بیگ اٹھایا اور گھر بھاگی۔ گھر دور ہی کتنا تھا۔ بیچ میں دو، تین گلیاں ہی تو تھیں۔ شام تک خالہ بھی امی، بابا سے تعزیت کرنے آگئی تھیں۔ پھر انہوں نے ہمت کرکے تبسم آپا کا بھی ڈھکے چھپے لفظوں میں ذکر کردیا.....کیونکہ ان دو دنوں میں بھی ان کا فون آچکا تھا۔ اور اب مینا کی امی سے کہنا بھی ضروری ہوگیا تھا۔

''ہائیں کیا کہہ رہی ہیں باجی! کیا لوگوں میں ذرا بھی لحاظ نہ رہا۔ وہ ان کا شادی شدہ بال بچے دار بیٹا اور کہاں میری کم عمر، کنواری، معصوم بیٹی، بھلا کوئی جوڑ بھی ہے.....؟'' مینا کی امی ساجدہ کے تو تن بدن میں لگ گئے تھے یہ سن کر.....''ان سے کہیں کوئی مطلقہ یا بیوہ ہی ڈھونڈیں اپنے بیٹے کے لیے، میری بچی کو تو معاف کریں۔''

''ویسے تو میں نے انہیں منع ہی کیا تھا.....لیکن ان کے بے حد اصرار پر مجھے تمہیں مطلع کرنا پڑا۔''

''کہہ دیں میری طرف سے بھی اور مینا کے بابا کی طرف سے بھی..... اور ویسے بھی مینا کی تائی نے بھی ایک دو دفعہ اشارتاً ہمیں مینا سے متعلق کہا ہے اور ان کے بابا کا ارادہ تو اپنے بھائی کے گھر ہی بیٹی دینے کا ہے۔'' امی نے سر جھٹک کر کہا اور شنو خالہ سر ہلا کر رہ گئیں۔ پھر بڑی مشکل سے انہوں نے تبسم آپا سے اپنے بہنوئی یعنی مینا کے بابا کی طرف سے انکار کر کے ایک طرح سے جان چھڑائی تھی۔

☆☆☆

پھر بابا نے بڑی بھابی یعنی مینا کی تائی سے اس کے آتے رشتوں کا ذکر کیا، ویسے بھی بڑے بھائی تو زندہ نہ تھے لہٰذا گھر کی بڑی تائی ہی تھیں۔ ان کا تو پہلے ہی مینا کو بہو بنانے کا ارادہ تھا جھٹ باقاعدہ رشتہ لے کر آگئیں۔ ساتھ بڑی بہو اور شادی شدہ بیٹیاں بھی تھیں۔ امی، بابا کو کیا اعتراض تھا اور یوں سال بھر میں ہی مینا اپنے گھر کی ہوگئی۔

''منابل اب تم گھر کے کاموں میں حصہ لیا کرو، ثمینہ کے ساتھ کچن سنبھالا کرو.....'' وہ تائی جنہوں نے اسے بچپن سے مینا اور مینو ہی کہا تھا شادی ہوتے ہی کتنا بدل گئی تھیں۔ شادی کے اگلے دن سے ہی انہوں نے اسے نام سے پکارنا شروع کر دیا تھا جس پر وہ بری طرح چونکی تھی۔ اور پھر صرف ایک ہفتے میں اسے چونکنے کے کئی مواقع ملے تھے۔ تیسرے دن سے کتنے چھوٹے، چھوٹے کام تو وہ خود کرنے ہی لگی تھی اور آج کچن سنبھالنے کا آرڈر بھی جاری ہوگیا تھا۔ لیکن آج تو الفاظ کے ساتھ لہجہ بھی بدلا تھا۔ مینا یہ سب سوچ کر رہ گئی تھی لیکن لبوں سے نکلا تو صرف اتنا..... ''جی تائی امی.....''

☆☆☆

''یہ تائی امی اور ایاز وہ تو نہیں ہیں جنہیں میں بچپن سے دیکھتی آرہی تھی، یہ کبھی منابل عرف مینا کو تائی اور میاں کے رویے اور انداز دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی۔ ساتھ دکھ بھی..... وہ میٹھی اور نرم تائی امی اور ایاز کا مسکراتا چہرہ، سب کتنے جلدی بدل گئے تھے یا شاید اس نے ہی انہیں کسی دوسری عینک سے دیکھا تھا اب عینک اتری تو حقیقت بھی بڑی جلدی واضح ہوگئی تھی اور پھر یہ حقیقت بہت تلخ ہوتی چلی گئی تھی۔

شادی کو چھ ماہ گزر گئے تھے۔ سب گھر والوں کے رویے اکثر تلخی لیے ہوتے حد تو یہ کہ ایاز بھی سرد مہری دکھاتا۔

''نہ جانے مجھ سے کہاں اور کیا غلطی ہوجاتی ہے۔'' مینا اپنی غلطیاں ہی ڈھونڈتی رہ جاتی۔ اور پھر وہ ہوا جس کا کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔ شادی کے چھ ماہ بعد مینا کو ڈاکٹر نے خوشی کی نوید سنائی تھی۔ وہ تو یہ سن کر بہت خوش تھی۔ لیکن گھر والوں کا رویہ وہی نارمل تھا۔ کام کا بوجھ اس پر اسی طرح تھا۔ آج صبح سے طبیعت گری، گری تھی۔ کسی وقت آنکھوں کے آگے اندھیرے بھی چھا جاتا۔

''منابل، ناشتا کر کے کپڑے دھونے کی مشین لگا لینا، بہت کپڑے جمع ہوگئے ہیں۔'' بھابی نے اسے ناشتا کرتے دیکھا تو یاد دہانی کرائی۔

''بھابی..... آج تو میری طبیعت ٹھیک نہیں، کل دھو دوں گی.....'' وہ کچھ بیچارگی سے بولی۔

''توبہ ہے، ماں کیا بننے لگی ہیں، ہر وقت بہانے ہی زبان پر آگئے ہیں۔'' وہ منہ ہی منہ میں... بڑبڑائیں۔ ''کپڑے بہت جمع ہوگئے ہیں پھر لائٹ کا بھی ٹھیک نہیں، میں تمہاری مدد کرا دوں گی..... تم مشین تو لگاؤ.....'' وہ بے نیازی سے کہہ کر کمرے سے نکل گئیں اور وہ ناچار مشین لگا کر کھڑی ہوگئی..... یہ مشین کا تیسرا چکر تھا..... بھابی اپنے کہے کے مطابق اب تک اس کی مدد کو نہیں آئی تھیں اس نے بھابی کو آواز لگائی تو ساس کا جواب آگیا کہ وہ روٹی بنا رہی ہے تم خاموشی سے اپنا کام کرو..... ناچار کیا کرتی۔ چپ چاپ کپڑے دھوتی رہی پھر یہ اگلا دن تھا جب اچانک اس کی طبیعت بگڑی، اسپتال لے کر بھاگے لیکن وہ خوشی جو چپکے سے آئی تھی۔ اتنی ہی خاموشی سے اس سے روٹھ کر چلی گئی۔ وہ تکیے میں منہ دے کر گھٹ، گھٹ کر روتی

رہی۔ ایاز اور تائی امی کو اس کے آرام کی غرض سے ماں کے گھر جانے پر بھی اعتراض تھا۔ لیکن امی، بابا بڑے بھاؤ سے تائی امی سے اجازت لے کر اسے گھر لے آئے تھے۔ صرف ایک ڈیڑھ ماہ کی خوشی تھی۔ امی کتنی ہی تسلیاں، دلاسے دیتیں لیکن وہ خاموشی سے منہ دیے پڑی رہتی۔

''ارے میری بچی، اللہ کی یہی مرضی تھی۔ بس خوش رہا کرو، بھول جاؤ، اللہ پھر نواز دے گا۔''

''امی، امی... میں نے انہیں کہا بھی تھا میری طبیعت خراب ہے لیکن وہ لوگ..... امی بہت بے حس ہیں ایاز، تائی اور سب۔'' وہ پھوٹ، پھوٹ کر روتی رہی اور امی اسے گلے سے لگائے ڈھارس دیتی رہیں۔ تائی نے تو اسے ایک ہفتے کے لیے بھیجا تھا۔ لیکن وہ نہ گئی اور آج پندرہ دن ہو گئے تھے۔ شروع، شروع میں تو ایاز اور تائی کے فون بھی آئے لیکن پھر فون بھی نہ آیا۔ امی نے اس سے نرمی سے جانے کی بات کی لیکن وہ اڑ گئی۔

''کیا آپ کو میرا یہاں رہنا اچھا نہیں لگ رہا.....؟ میں ابھی نہیں جاؤں گی۔''

''تم کیسی باتیں کر رہی ہو، مینا، بس اب بہت دن ہو گئے تم خیر سے اپنے گھر جاؤ..... نہ جانے تمہاری تائی تمہارے یہاں رہنے سے ناراض ہی نہ ہو رہی ہوں.....'' امی پریشانی سے بولیں۔ لیکن وہ خاموش رہی۔

''اچھا آج تو برابر میں میلاد ہے، بہت کہہ کر گئی تھیں۔ ایسا کرو تم وہاں ہو آؤ، گڈو کو آج بخار ہے، وہ مجھے جانے نہیں دے رہا تم ہی شرکت کر لو..... تھوڑی دیر بیٹھ کر آ جانا؟'' امی نے کہا تو اس نے کچھ سوچ کر حامی بھر لی تھی۔

☆☆☆

مینا کو گئے پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی تھی۔ آنے والی مینا کی پھوپی تھیں..... سلام دعا کے بعد انہوں نے مینا کے متعلق پوچھا۔

''ابھی پڑوس میں میلاد میں گئی ہے، میں نے ہی زبردستی بھیجا ہے، گھر میں چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔ بہت دکھ ہے اسے اپنے بچے کا.....'' امی افسردگی سے کہہ رہی تھیں۔

''طبیعت تو اب ٹھیک ہے ناں.....؟'' پھوپی جان پوچھ رہی تھیں۔

''ہاں بہتر ہے پہلے سے، بس کمزوری ہے پھر صدمہ.....''

''بھابی اگر طبیعت اچھی ہے تو آپ فوراً اسے سسرال بھیجو، اب گھر بٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' پھوپی جان کے لہجے میں ایسا کچھ تھا جو امی کو چونکا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتیں، وہ مزید بولیں۔

''میں ابھی بڑی بھابی کے گھر سے ہی آ رہی ہوں۔ وہاں ان کی بہن آئی ہوئی تھیں اور وہ ان کے ساتھ جو گفتگو ہماری مینا کے بارے میں کر رہی تھیں۔ میرے لیے وہ سب سننا ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ آپ کو نہیں پتا وہ کیا کہہ رہی تھیں..... اُف۔'' پھوپی جان نے جھرجھری لی تھی۔ ''مینا کو کام چور، جھوٹی، میسنی اور ذہنی نفسیاتی مریض تک تو وہ ثابت کر چکی تھیں۔ میں تو وہیں ان سے لڑ پڑی، بس اب میں کیا بتاؤں..... میرے اس تھوڑے کو کافی جانتے ہوئے آپ آج ہی مینا کو سمجھا بجھا کر بھائی جان کے ساتھ بھیجیں۔ ورنہ وہ تو ایاز کے بھی کان مینا کے خلاف بھر کر اس کی زندگی میں زہر گھول دیں گی۔ یہ بڑی بھابی اُف، میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی، ایسا بھی کریں گی۔'' پھوپی جان تو نہ جانے کیا، کیا کہہ رہی تھیں جس سے امی تو سن ہو ہی گئی تھیں لیکن دوسری طرف دروازے سے لگی کھڑی مینا جو ابھی چند منٹ پہلے ہی گھر آئی تھی۔ اس کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو چکا تھا۔

''الزام تراشی یا بہتان''۔ تائی امی، وہ بھی بہو کے خلاف اپنا بغض انہی روایتی، جاہل خواتین کی طرح نکالیں گی۔ یہ تو وہ شاید مر کر بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ اسے تبسم آپا یاد آ گئیں۔ اور پھر اسے بڑے زور کا چکر آیا تھا۔

❁❁❁

وہ اپنے قصبے کے واحد تعلیم یافتہ فرد تھے۔ بات مواقع کی کمی کی نہیں تھی بلکہ لڑکیوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی تو لڑکوں کو شوق نہ تھا۔ بجلی اپنے ساتھ ٹی وی جیسی تفریح لے کر آئی تو بدلتا وقت گاؤں والوں کو انٹرنیٹ سے متعارف کروا گیا۔ دنیا انگلیوں کی پوروں کے نیچے آ گئی مگر گاؤں کی شرح خواندگی میں اضافہ نہ ہوا۔

انہوں نے جب شہر جا کر پڑھنے کی بات کی تو والدین وسوسوں میں پڑ گئے۔ اب تک کے تجربے سے یہی معلوم ہوا کہ شہر کی جدید آسائشات گاؤں کی خالص محبتیں بھلا دیتی ہے۔ زرعی تعلیم حاصل کر کے واپس آنے اور گاؤں میں بسنے کے وعدوں کے ساتھ وہ گئے تو اپنی تعلیم و تربیت کا مان نہ توڑا۔ ڈگری حاصل کر کے آئے اور باپ، دادا کی زرخیز زمینوں پر نت نئے تجربے کیے۔

جب سوال شادی کا آیا تو وہ اپنے وعدوں پر قائم تھے۔ سادہ لوح والدین کو سارے اختیار دے کر انہوں نے واحد شرط یہ رکھی کہ لڑکی لکھنا، پڑھنا جانتی ہو۔ مطالعے کی شوقین ہو کہ کتاب دوست کا شعور عام لوگوں سے بلند ہوتا ہے۔

نام ہی کافی ہے

عائشہ تنویر

pklibrary.com

گاؤں میں کالج تو نہ تھا لیکن گاؤں میں لڑکیوں کا اسکول ضرور موجود تھا۔ جہاں وہ لکھنا، پڑھنا سیکھ لیتیں تو جن کو زیادہ دلچسپی ہوتی وہ شہر جانے والوں سے رسالے وغیرہ منگوا کر اپنا شوق پورا کرلیتیں۔ اب تابعدار بیٹے کی شرط جان کر ڈائجسٹ، رسالہ ہی ان کی والدہ کے لیے بہو منتخب کرنے کا معیار بنا۔

گھر میں کام کرنے والے ملازمین کے ذریعے یہ خبر گاؤں بھر میں پھیل گئی۔ زمینداروں کے پڑھے لکھے گبرو جوان کی آس میں گاؤں کی تمام مٹیارنوں نے دل میں پھوٹتے لڈوؤں کے ساتھ ان تمام رسالوں کے نام یاد کر لیے، جو کبھی کسی کے منہ سے سنے ہوں گے۔ کچھ عرصے کے لیے ٹی وی، انٹرنیٹ ایک طرف کیا اور تمام ہی لڑکیاں گھروں میں میز پر پھولوں کے بجائے مختلف ڈائجسٹ سجانے لگیں۔

والدہ نے فصل اچھی ہونے پر دیگ بانٹنے کے بہانے ایک دورہ گاؤں کے تمام گھروں کا کیا اور سب ہی گھروں میں رسالے دیکھ کر شش و پنج میں پڑ گئیں۔ بالآخر سب سے ڈائجسٹ کا نام معلوم کر کے واپس آئیں اور اپنے سروے کی ابتدائی رپورٹ سب کے سامنے رکھی۔

''مستورات ڈائجسٹ'' پڑھنے والی سلجھی ہوئی لڑکی کو والدہ نے خود مسترد کر دیا کہ اتنی سنجیدہ مزاج لڑکی نہیں چلے گی۔ جو رسالے اتنے ادبی ناموں کے پڑھتی ہو، وہ گھر کی رونق میں کیا اضافہ کرے گی۔ اکلوتی بہو تو خوش مزاج، ہنس مکھ ہونی چاہیے۔

''نازنین ڈائجسٹ'' پڑھنے والی بہن کی ناک کے نیچے نہ آئی۔ ایسی حسینہ بھابی لا کر بھائی ہاتھ سے نہیں گنوانا تھا۔

''انداز'' پڑھنے والی بہو جانے کون سے نئے زمانے کے انداز سیکھ کر آجاتی۔ ایسی لڑکیوں کے تو ویدوں کا پانی ہی مر جاتا ہے۔ بس اداؤں سے میاں کو مٹھی میں کر لیتی ہیں۔

''دینی بہنیں'' پڑھنے والی کو منتخب کرتے دل میں خدشہ جاگا کہ آتے ہی ''ساس، سسر کی خدمت فرض نہیں'' کا راگ الاپنے الگ ہی نہ ہو جائے۔ انہیں تو دنیا داری بہو چاہیے تھی، جو برسوں سے رائج طریقے کے مطابق دکھاوے کو ہی سہی سسرال کے ایک، ایک بندے کا خیال رکھے۔ میکے جا کر یا میاں کے سامنے بھلے جو مرضی کہے، پیٹھ پیچھے تو بادشاہ کی بھی برائی ہی ہوتی ہے۔

بہت سوچ بچار کے بعد قرعۂ فال آخر ''نرگس ڈائجسٹ'' پڑھنے والی صغریٰ بی بی کے نام نکلا کیونکہ نرگس، ابا جی کی پسندیدہ اداکارہ تھی۔

اس انوکھی طرز پر اپنی شریکِ حیات کا انتخاب ہوتے دیکھنا ان کے لیے اچنبھے کا باعث تو تھا لیکن زبان دے چکے تھے سو کچھ کہہ نہ پائے۔

رشتہ طے ہو گیا تو شادی ہونے کے دورانیے تک انہوں نے بیوی سے ہم آہنگی کے لیے ''نرگس ڈائجسٹ'' کے چند شمارے پڑھ ڈالے۔ کہانیوں میں رومانس کوٹ، کوٹ کر بھرا گیا تھا۔ وہ بھی کوئی اتنے پارسا نہ تھے، بالی ووڈ، لالی وڈ کی فلمیں بصد شوق دیکھ لیا کرتے تو یہ خواتین کا شرمیلا رومانس انہیں کیا کہتا لیکن ڈائجسٹ میں خواتین کے ہاتھوں مرد حضرات کی درگت بنتی دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ شادی ہو جاتی تو بیگم سے محبت کے زبانی یا عملی اظہار میں انہیں کوئی امر مانع نہ تھا لیکن جس حساب سے ہر دوسرے دن ان ڈائجسٹوں میں پورا کمرا پھولوں سے بھر دیا جاتا ہے اس کے لیے انہیں اپنی زمین پر گندم یا کپاس کے بجائے گلاب کی ہی فصل اگانی پڑتی۔ وہ بیگم کو ہر سیزن میں دس سوٹ دلوا سکتے تھے لیکن ہر ہفتے آؤٹنگ کے نام پر شہر شاپنگ کے لیے لے جاتے تو اپنے یار، دوستوں کے لیے وقت کب نکالتے۔ انہوں نے اپنی سابقہ شرط واپس لیتے ہوئے بہتیرا زور لگایا کہ ان کی شادی کسی بھی پھپھو، چچا، ماموں کی بیٹی سے کر دی جائے۔ وہ ایسے خوابوں کی دنیا میں اپنا کردار نہیں نبھا سکتے لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی کہ رشتہ طے ہونے کے بعد اب یہ عزت کا معاملہ تھا۔ ان سے نکاح نامے پر سائن کروانے کے لیے اماں کو روایتی طعنوں اور ابا جی کو اپنی پشاوری چپل سے کام لینا پڑا اور یوں صغریٰ بی بی پوری شان و شوکت کے ساتھ

بیاہ کران کی حویلی میں آئیں۔

جب زندگی بھر کا ساتھ قبول کر لیا تو ہنسی خوشی نبھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہی سوچ کر انہوں نے شادی کے دن کمرے کو پھولوں کے ساتھ جلتے دیوں سے بھر دیا۔ سب نے یہ سوچ کران کا ساتھ دیا کہ پڑھے لکھے سمجھدار ہیں۔ ہم سے زیادہ ہی جانتے ہیں۔ گلاب، موتیا کی سحر انگیز خوشبو کے ساتھ دیوں کی ٹمٹماتی لو۔ یقیناً شہر کے کینڈل لائٹ ڈنر والا رومانوی منظر پیش کرتے اگر یہ وقت رات کا ہوتا۔ ان کی شادی تو گاؤں کی روایات کے مطابق گرم دوپہر میں ہو رہی تھی۔ چلچلاتی دھوپ میں شیروانی پہن کر بارات لے جاتے ہوئے انہوں نے حسرت سے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کے باندھے تہبندوں ... کو دیکھا تھا۔ لان کے کڑھائی والے کرتوں میں ملبوس لڑکے انہیں حسد کا شکار کر رہے تھے۔ لباس ماحول اور ثقافت سے میل نہ کھائے تو عجوبہ ہی لگتا ہے۔

تمام آنے والے مہمان ان سے گلے مل کر یا سر پر ہاتھ پھیر مبارک باد دینا چاہتے تھے۔ اسی ملنے ملانے میں کلاہ میں لگا موتیوں کا پھول گر چکا تھا۔ گرمی اور گھبراہٹ سے حالت خراب ہو رہی تھی۔ نکاح ہونے تک ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ عجلت میں رخصتی کروا کر دلہن گھر لے آئے۔

صدشکران کے کمرے میں اے سی کی سہولت تھی سو دیے جلانے کے لیے بند کیے پنکھے ان کے مزاج پر گراں نہ گزرے۔ مگر ہر طرف سے روشن کمرے میں ننھے، ننھے دیے اپنا وجود ثابت کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ گرمی کے سبب تمام رسمیں دروازے کے بجائے کمرے کے اندر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ دیوں کے جلنے سے ایک ناگوار بُو بھی تھی جو گلاب اور موتیے کے پھولوں کی زیادتی کے باوجود صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ اطراف میں انہی جلتے دیوں کے درمیان دلہن ادا سے چلتی آئی۔ سامنے امی حضور رسم کے مطابق پانی کا جگ پکڑے کھڑی تھیں۔ ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ سب تقریب کا لطف لے رہے تھے تو وہ دلہن پر دھیان دیتے، اپنی آنے والی زندگی کا نقشہ سوچ رہے تھے۔ اس سب کے درمیان دیوں نے جان لگا کر اپنی موجودگی ثابت کر دی۔ دلہن کا نازک شیفون کا شرارہ آگ پکڑ چکا تھا۔ ہر طرف ہنگامہ مچ گیا۔ شکر ہے بروقت معلوم ہو گیا اور گاؤں کی رسم کے مطابق وارنے کا پانی یہ آگ بجھانے کے کام آیا۔

سب ان کے اس فضول خیال پر ملامت کرتے باہر نکلے تو وہ دلہن کی جانب متوجہ ہوئے۔

''میں نے تو صرف آپ کو خوش کرنے کے لیے یہ اہتمام کیا تھا۔''

انہوں نے نئی نویلی دلہن کا دل اپنی طرف سے صاف کرنے کی کوشش کی۔

''اتنے برس ان دیوں، لالٹینوں کے ساتھ گزار کر بمشکل منتوں، مرادوں کے بعد گاؤں میں بجلی آئی ہے اور آپ کو لگتا ہے کہ اب بھی میں ان دیوں سے خوش ہوں گی۔'' نئی نویلی دلہن نہ شرما کر گلابی ہوئی، نہ غصے سے لال بلکہ اس نے صاف لہجے میں سیدھا سا جواب دیا تھا۔

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے گئے۔

''آپ کے نرگس ڈائجسٹ ہی میں پڑھے تھے یہ بیکار آئیڈیاز، اماں جی بتا رہی تھیں ڈھیر ہے آپ کے پاس ان رسالوں کا۔''

انہوں نے شرمندگی ختم کرنے کو جتایا۔ وہ ان کی بیوقوفی پر ہلکا سا مسکرائی۔

''جی، کالج میں ایڈمیشن لینا ممکن نہیں ہوا تو بھائی کسی ردی والے سے ان کا ڈھیر لے آیا۔ مجھے پڑھنے کا شوق ہے ناں۔'' انہوں نے سر ہاتھوں پر گرا لیا۔ اپنی سوچوں پر ہنسی بھی آئی اور والدین کی مان کر اچھے نتائج ملنے پر اللہ کا شکر بھی ادا کیا۔

''میں آپ کو انٹر کی کتابیں بھی لا دوں گا اور آپ کے ذوق کے مطابق رسائل و کتب بھی۔ یقیناً ہم مل کر بہت کچھ سیکھیں گے۔''

دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ کہہ رہے تھے۔ آج زمانے بعد گاؤں کا واحد تعلیم یافتہ فرد ہونے کا خمار سر سے اتر گیا تھا۔

❁❁❁

چاہ کی راہ میں

فرح بھٹو

ناولٹ

اگلی صبح تک طوفان ٹھہر چکا تھا۔ بدمست ہوا اپنا زور سمیٹ کر کسی اور طرف نکل گئی تھی۔ کمرے کی کچھ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں سو سنہری نرم دھوپ بنا کسی رکاوٹ کے براہ راست علوینہ کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس نے کسمسا کر کروٹ بدلی..... پھر ایک دم آنکھیں کھول دی تھیں۔ رات کے سارے مناظر نگاہوں میں اتر آئے تھے۔ وہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو کر اٹھ بیٹھی۔

کمرے کی فضا میں شاویز کے مخصوص پرفیوم کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ علوینہ نے اپنے وجود سے بھی ایسی خوشبو اٹھتی محسوس کی۔

اس کے احساس میں بھی یہی خوشبو پھیلتی چلی گئی۔ وہ گھبرا کر بستر سے نیچے اتر کر واش روم چلی گئی۔ واش بیسن کے آئینے میں اپنی گلابی صورت کا گلال نہ جانے کیوں اجنبی سا لگا۔ وہ اپنے عکس سے نظر چرا گئی تھی۔ فریش ہو کر وہ نیچے آ گئی۔ ابھی تک افرادِ خانہ کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ ہال آج بھی خالی تھا۔

''شاویز کہاں ہے۔'' وہ میز پر ناشتا رکھتی ملازمہ سے بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

''وہ تو جی سویرے ہی واپس چلے گئے۔'' ملازمہ نے

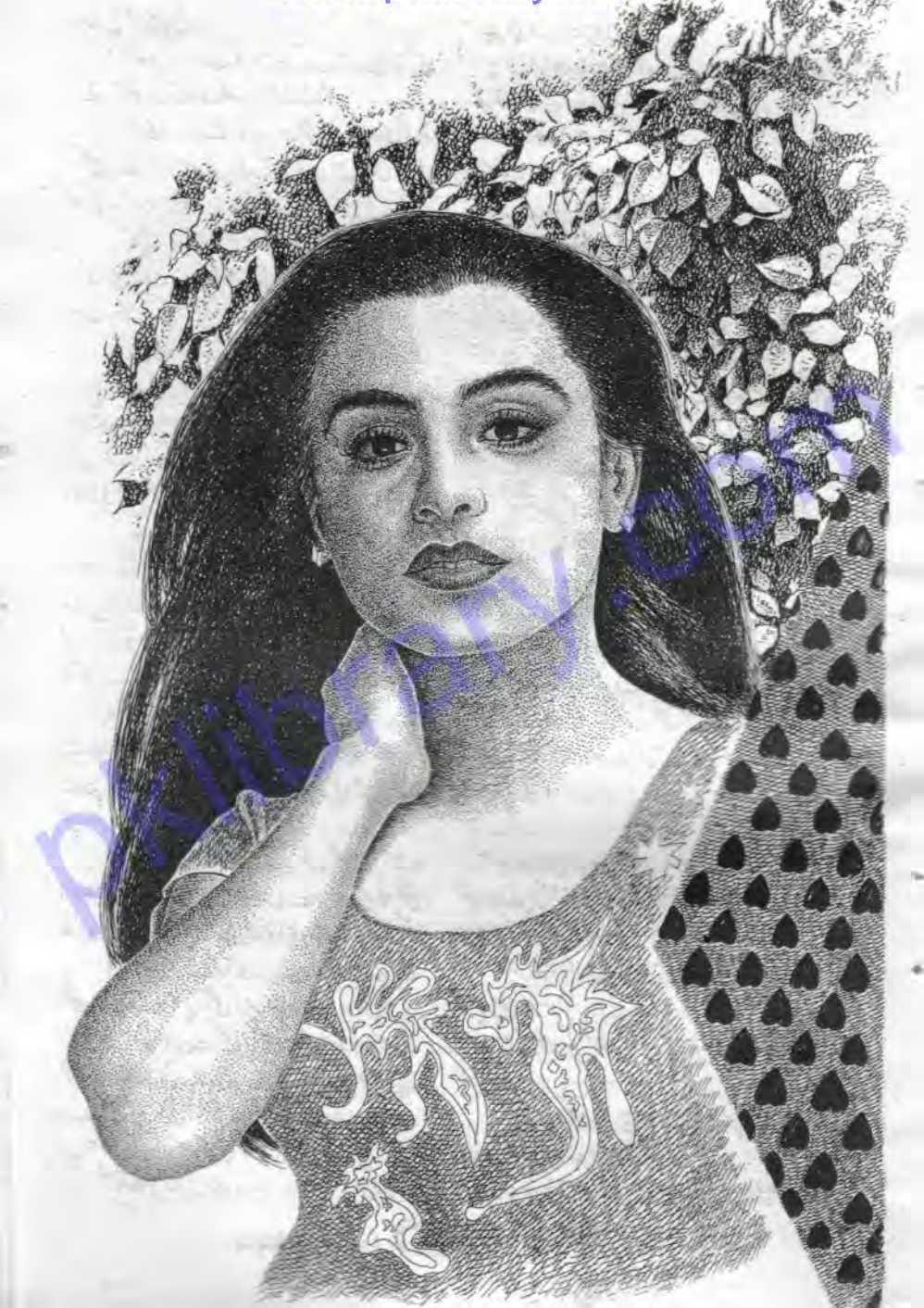

اطلاع بہم پہنچائی۔

''اوہ..... رات کو جنریٹر کیوں نہیں چلایا کسی نے۔'' علوینہ کے اندر غصہ سر اٹھانے لگا۔

''امی..... اتنے دنوں سے بجلی نہیں جا رہی تھی تو کسی نے سار سنبھال ہی نہیں لی۔ اس میں خرابی ہوگئی۔'' وہ سر جھکا کر بتانے لگی۔

''کیسے ملازم ہو تم لوگ..... ذرا پروا نہیں ہے کسی چیز کی..... اجڈ، گنوار کہیں کے۔'' وہ ایک دم تیز ہوئی۔ ملازمہ دو قدم دور ہٹی۔

''جی شاہ ادا نے بھی یارو کو بہت ڈانٹا، وہ ہی بجلی کی چیزوں کی دیکھ ریکھ کرتا ہے، ہم کیا جانے ان پڑھ عورتیں..... رات کو انہوں نے بڑی بے عزتی کی اس کی۔ شاہ ادا نے حویلی سے ہی نکالنے کی دھمکی دی ایسی کاوڑ (غصہ) کی تو بہ۔'' وہ انگلی سے ناک مسلنے لگی۔

''لیکن شکر ہے صبح تو شاہ ادا بہت خوش دکھتے تھے، انہوں نے خود یارو کو پاس بلا کر خرچی دی۔ ہمیں بھی روپے دے کر کہا کنوار کا صدقہ ہے۔'' وہ خوشی سے بتانے لگی تو علوینہ چونک اٹھی۔ پھر بظاہر بے نیازی سے ناشتا کرنے لگی۔

ناشتا کرنے کے بعد وہ کل کی طرح صحن میں جانے کے بجائے حویلی میں گھومتی رہی۔ بڑی راہداریوں اور قطار سے بنے بہت سے کمروں والی کشادہ حویلی میں تھوڑی سی چہل قدمی کر کے وہ اکتا گئی۔

حویلی بلاشبہ قدیم اور جدید طرزِ تعمیر کا حسین امتزاج تھی۔ اور کافی شہری سہولتوں سے مزین بھی پھر بھی علوینہ کے پاپا کا شاندار شہری بنگلا تو اپنی مثال آپ تھا۔

پھر وہ دوپہر تک برآمدے میں رکھے بڑے سے پنگھے (جھولے) پر بیٹھی اچھا خاصا بور ہو چکی تھی۔ زندگی میں اتنی بوریت کبھی دیکھی نہ تھی تھوڑی فرصت ملتی تو زاشا اور سنی کے ساتھ نئے، نئے پروگرام ترتیب دے دیتی تھی۔ اتنی آؤٹنگ اتنی انجوائے منٹ..... اور اب؟ علوینہ نے ایک گہری سانس لی تھی۔

''السلام علیکم۔'' شاویز کی آواز سنائی دی تو وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' وہ اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ علوینہ کے اردگرد وہی مہک پھیل گئی۔

''مجھے یاد کر رہی تھیں نا؟'' اس کے سوال پر علوینہ نے ایک خاموش نظر اس پر ڈالی۔

آف وائٹ کلر کے شلوار سوٹ میں ملبوس شاویز اجرک کندھوں پر ڈالے اس کی طرف وارفتہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کا رنگ گہرا سرمئی تھا۔ چہرے کی گندمی رنگت، ہلکی بڑھی ہوئی داڑھی، گھنی مونچھیں، ستواں ناک اور کتابی چہرہ..... وہ خاصا وجیہہ تھا۔

''کیا دیکھ رہی ہو.....؟ خوب رو ہوں ناں؟'' شاویز نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا کر پوچھا تو وہ نظروں کا زاویہ بدل گئی۔

''نہیں، تم سے زیادہ خوب رو دنیا میں موجود ہیں۔'' وہ بلا ارادہ بولی۔

''لیکن تم جیسی خوب صورت دنیا میں اور کوئی لڑکی نہیں۔ کیونکہ میری علوینہ دنیا میں صرف ایک ہے۔'' اس نے علوینہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے بھاری مردانہ ہاتھ کی حدت اسے اپنے وجود میں پھیلتی محسوس ہوئی۔ سنی نے بھی اس کے ہاتھ بارہا چھوئے تھے مگر ایسی کیفیت کبھی نہیں ہوئی تھی۔

وہ غیر ارادی طور پر شاویز کا موازنہ سنی سے کرنے لگی۔

''بور ہو رہی ہو۔ چلو آج تمہیں اپنا فارم ہاؤس گھماتا ہوں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا تو علوینہ سوچ میں پڑ گئی۔

''کیا ہوا؟'' وہ اس کو ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں۔'' علوینہ نے نفی میں سر ہلایا پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پہلے یہ اچھی طرح اوڑھ لو۔ پھر چلتے ہیں۔'' شاویز نے اس کا دوپٹا شانوں سے اٹھا کر پھیلایا اور اس کے سر پر رکھا۔ علوینہ نے برا سا منہ بنایا پر مزاحمت

نہ لی۔ وہ دونوں چلتے ہوئے پراڈو جیپ تک آ پہنچے۔

شاویز نے اس کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا پھر خود گھوم کر دوسری طرف آ بیٹھا۔ اور جیپ اسٹارٹ کر کے تیزی سے حویلی سے باہر لے آیا۔

دس پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد گاڑی ایک جدید طرز کے بنے فارم ہاؤس پر آرک گئی۔

شاویز نے ہارن دیا تو بڑا سا گیٹ وا ہوا۔ جیپ پورچ میں کھڑی کر کے وہ دونوں باہر نکل آئے۔

''آؤ اس طرف۔'' شاہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ اس کے ہم قدم فارم ہاؤس میں داخل ہوئی۔

کشادہ ماربل کے فرش اور خوب صورت وال پیپرز سے سجا ہال جس کی چھت کی فالس سیلنگ اور اس کے درمیان لٹکتا بڑا سا جھلمل کرتا فانوس نظروں کو خیرہ کر رہے تھے۔ آرام دہ اور ماڈرن فرنیچر اور پردوں کا کلر کامبینیشن کسی کے اعلیٰ ذوق کا عکاس تھا۔

''واؤ... یہ بہت زبردست ہے۔ کسی انٹیریئر ڈیزائنر سے ڈیکوریٹ کروایا؟'' علوینہ نے حیرت آمیز نظر سے چاروں طرف دیکھا۔

''بندہ خاکسار حاضر ہے؟'' شاویز نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو علوینہ کی آنکھوں میں حیرت بڑھ گئی۔

''تم؟''

''ہاں تو تم نے مجھے بالکل ہی پینڈو سمجھا ہوا ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا دیا۔

''ویسے تمہاری ایجوکیشن کتنی ہے؟'' علوینہ نے نظر چرا کر پوچھا۔

''اوہ خدا..... اپنے سر کے تاج کی تعلیم سے بھی ناواقف ہیں یہ محترمہ۔'' وہ آسمان کی طرف چہرہ کر کے کراہا تھا۔

''میں امریکا کی ہائی گریڈ یونیورسٹی سے گریجویشن کر کے آیا ہوں۔''

''کیا؟'' علوینہ کا منہ ذرا سا کھل گیا۔

''کیوں، کیا ہوا۔'' وہ مزہ لیتے بولا تو وہ اس سے دیکھتی رہی۔

''کیا مطلب؟'' شاویز نے بھویں سکیڑیں۔

''آئی مین وہیں رہ جاتے ناں بہت سارے مواقع تو وہاں ہیں، یہاں کیا رکھا ہے۔'' علوینہ نے برا سا منہ بنا کر کہا تو شاویز اس سے دیکھ کر رہ گیا۔

''بہت سارے مواقعوں کے پیچھے اپنی ماں کو چھوڑ دیتا؟'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''پھپھو کو بھی ساتھ لے جاتے۔'' علوینہ نے کندھے اچکا کر کہا۔

''میں اپنی دھرتی ماں کی بات کر رہا ہوں علوینہ۔'' شاویز نے کہا تو وہ چونک گئی۔

''وہاٹ؟'' ہاں علوینہ۔ اپنی زمین سے دور جا کر میں اچھے مواقع تو حاصل کر لیتا مگر میری جڑیں مجھ سے کٹ جاتیں۔ اسی زمین نے مجھے برسوں کھلایا ہے، پلایا ہے عزت دی ہے، مان دیا ہے اور سب سے بڑھ کر شناخت دی ہے..... میں کیسے جاؤں اسے چھوڑ کر۔'' وہ جذب سے بولا تو علوینہ نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کی کم عقلی پر افسوس ہوا ہو۔

''تم نے اپنی ڈگری ضائع کر دی۔'' وہ کسی تاسف کے تحت بولی۔

''نہیں علوینہ۔ میں نے اپنی ڈگری کام میں لگا دی ہے لیکن یہ بات تم جیسی ماڈرن ذہن کی لڑکی نہیں سمجھ سکتی۔ ہم فیک ماڈرن ازم کا پرچار کرتے، کرتے خود غرضی کی نہ جانے کس منزل پر جا پہنچے ہیں۔'' وہ ہنوز سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ علوینہ کو برا لگا۔

''ہر ایک کو حق ہے کہ وہ بہتر سے بہترین کی تگ و دو کرے۔ atleast میرا اور سنی کا تو شادی کے بعد آسٹریلیا شفٹ ہونے کا پلان تھا۔'' وہ روانی سے بول گئی تو شاویز نے لب بھینچ لیے۔

''چلو آؤ اس طرف۔'' وہ خراب موڈ سے دوسری جانب بڑھا تو علوینہ اس کے موڈ کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی۔

سارا فارم ہاؤس جدید سہولتوں سے آراستہ و

پیراستہ تھا۔ وہ شاویز کے ساتھ دوسری جانب آ گئی جہاں بیضوی شکل کا سوئمنگ پول بنا ہوا تھا۔

آرام دہ کرسیوں کے ساتھ ایک ایزل بھی رکھا تھا۔ علوینہ نے آگے بڑھ کر کچھ حیرت سے اس پر نظر دوڑائی۔

''یہاں کسی آرٹسٹ کا بھی آنا جانا ہے؟'' وہ نظروں میں اشتیاق بھرے اس پر رکھے کینوس کو دیکھنے لگی۔

''ہم..... م ہے تو۔'' شاویز نے مبہم سا کہہ کر کندھے اچکائے۔

علوینہ نے سوئمنگ پول کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دل میں سوئمنگ کی خواہش جاگی لیکن اس کے پاس نہ سوئمنگ کاسٹیوم تھا نہ موقع محل سو اپنی خواہش دبائی سلیپرز اتار کے ٹراؤزر کو ٹخنوں سے کافی اونچا فولڈ کر کے پول کے کنارے پانی میں پیر ڈال کر بیٹھ گئی۔ درختوں سے چھن، چھن کر آتی دھوپ بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ہاتھ زمین پر پیچھے کی طرف ٹکا کر چہرہ اوپر کر کے اس خوب صورت ماحول کا لطف لینے لگی۔ کئی روز بعد کچھ الگ سا محسوس ہوا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ اسی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔

شاویز اس کی خود فراموشی والی کیفیت کو بغور دیکھتا رہا۔

''سائیں اندر آؤں۔'' ایک ملازم لوازمات سے بھری ٹرالی گھسیٹتا دروازے پر رک کر اجازت طلب کرنے لگا۔ شاویز نے اسے وہیں رکنے کو کہا اور اٹھ کر علوینہ کے پاس چلا آیا۔

''علوینہ اپنا حلیہ درست کرو۔ ملازم آ رہا ہے۔'' وہ اس کی آدھی کھلی ہوئی ودھیا ٹانگوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''آنے دو۔'' علوینہ نے برا سا منہ بنایا۔

علوینہ نے بے نیازی سے کہا تو شاویز نے... ناپسندیدہ نظر اس پر ڈالی۔

''کیا مطلب آنے دوں۔ تم یہاں سے اٹھو اور پہلے اپنا حلیہ درست کرو۔'' وہ غصے سے آگے بڑھا اور اس کا بازو پکڑ کر اس کو کھینچ کر اٹھایا۔

''اُف۔'' علوینہ اس کے ہاتھ کی سخت گرفت سے چیخ اٹھی۔

شاویز نے اس کا بازو چھوڑ کر شہادت کی انگلی سے اس کو پائنچے نیچے کرنے کا اشارہ کیا۔

علوینہ نے دُہرے غصے سے اسے دیکھا اور جھک کر فولڈ کیا ہوا ٹراؤزر نیچے کیا پھر پیر پٹختی ہوئی کچھ دور رکھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آجاؤ خیر دین۔'' شاویز نے آواز دی تو ملازم سر جھکا کر اندر آیا ٹرالی دھکیل کر میز کے قریب رکھی اور ٹرالی میں سے لوازمات اٹھا کر میز پر سجانے لگا۔

''بس تم جاؤ۔'' شاویز نے ملازم کو روک کر خود چائے کپوں میں ڈالنی شروع کی۔

''یہ لو علوینہ۔'' پھر ایک کپ اسے پیش کیا۔ علوینہ نے ناچار ہاتھ بڑھا کر کپ تھام لیا۔

''یہ میٹھا ٹیسٹ کرو ہمارے یہاں کی مشہور سوغات۔'' پھر اس نے ایک پلیٹ آگے کی تو علوینہ نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ شاویز نے پلیٹ میز پر واپس رکھ دی۔

علوینہ خراب موڈ سے چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔

''ہماری زمینیں دیکھنے چلیں۔'' کچھ دیر بعد شاویز نے اس کے تیور دیکھ کر سرسان سے آفر کی۔

''مجھے تمہاری زمینیں دیکھنے میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔'' وہ بدلحاظی سے بولی تو اس کا جواب سن کر وہ خاموش سا ہو گیا۔

''او کے پھر واپس حویلی چلیں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا تو علوینہ بھی کھڑی ہو گئی کہ اِدھر رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

یہ ماحول کچھ الگ تھا اس کے پاپا کے گھر سے ملتا جلتا مگر قید تو ویسی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں سے وہ اپنی مرضی سے گاڑی دوڑاتی ہوئی کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ اس کے دل میں پھر سے احساسِ زیاں جاگا۔ کل رات کے ٹرانس سے وہ اب باہر آ گئی تھی۔

''پاپا نے بہت برا کیا میرے ساتھ۔'' پراڈو کی

کھڑکی سے نظر آتی ہری بھری فصلوں کو دیکھ کر علوینہ نے بے بسی کی لمبی سانس کھینچی۔

''دوپٹا سر پر صحیح سے جماؤ۔'' شاویز کی آواز پر وہ بدمزہ ہوئی۔

''مجھے دوپٹا اوڑھنے کی عادت نہیں ہے۔ سر پر جمانے کی تو قطعی نہیں۔'' وہ بے نیازی سے کہہ کر شیشے کے پار دیکھنے لگی۔

شاویز نے ہاتھ بڑھا کر خود ہی اس کے شانوں پر پڑا دوپٹا اس کے سر پر رکھا۔ علوینہ نے تلملا کر اسے دیکھا۔

''اب سر سے اترا تو اچھا نہیں ہوگا۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ بس غصے سے اس سے دیکھ کر رہ گئی۔

پھر گاڑی جیسے ہی حویلی میں آکر رکی علوینہ نے جھٹکے سے اپنا دوپٹا سر سے اتارا اور گاڑی سے نیچے اتر گئی۔ شاویز نے اس کا بے پروائی سے شانے سے لٹکتا دوپٹا دیکھا جسے وہ زمین پر گھسٹتی اپنے ساتھ لیے جا رہی تھی۔ وہ غصے کے گھونٹ بھرتا اس کے پیچھے آیا اور دوپٹا اٹھا کر جھاڑا اور اس کے شانوں پر لپیٹ دیا وہ چلتے، چلتے رک گئی۔

''اپنی اوڑھنی کی عزت کرنا سیکھو تاکہ عزت کی نگاہوں سے دیکھی جاسکو۔'' وہ ترش لہجے میں بولا تو علوینہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

شاویز آگے بڑھ گیا وہ پیر پٹختی پیچھے چلتی رہی۔

صحن میں چہل پہل نظر آئی۔ معصومہ چارپائیوں پر صاف رلیاں بچھوا رہی تھی۔ شاویز اور علوینہ کو آگے پیچھے آتے دیکھا تو وہیں پر بت بن گئی۔

''خیر تو ہے شاہ۔ کہاں سے لوٹے ہو؟'' وہ علوینہ کو بغور دیکھتی شاویز سے پوچھ بیٹھی۔

''میں علوینہ کو فارم ہاؤس گھمانے لے گیا تھا۔'' وہ وہیں چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا جبکہ علوینہ، معصومہ کو نظر انداز کر کے آف موڈ سے اندر چلی گئی۔

''بڑے تیور ہیں اس کے شاہ۔ اس کو اگر جنت بھی گھما لاؤ گے پھر بھی نہیں بہلے گی۔'' وہ کچھ جل کر بولی تو شاویز مسکرا دیا۔

''ماموں کی لاڈلی بیٹی ہے۔'' اس نے جیسے معصومہ کو باور کروایا۔

''ہونہہ... لاڈلی نہیں بگڑی ہوئی کہو۔ یہ نہیں گزار سکتی ہمارے بیچ۔ شہری زندگی کی لذت چکھ کر بیٹھی ہے۔'' وہ تلخی سے تبصرہ کرتی بولی تو شاویز کے لب بھنچ گئے۔

''وہ اس گھر کی بہو ہے معصومہ۔ اس کے متعلق تمیز سے بات کیا کرو۔'' اس نے تنبیہہ کی تو معصومہ طنزیہ ہنسی۔

''اس گھر کی بہو تو تب بنے جب وہ تمہیں اپنا گھوٹ (دولھا) تسلیم کرے۔ اس کے تو ہر انداز سے بغاوت جھلکتی ہے شاہ۔'' معصومہ نے استہزا سے کہا تو شاویز کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''وہ مجھے اپنا گھوٹ تسلیم کر چکی ہے صومی۔'' شاویز نے ایک، ایک لفظ پر زور دے کر کہا تو معصومہ ایک دم خاموش سی ہوگئی۔

''پھر ولیمے سے کیوں روک رکھا تھا چاچی کو؟ کرنے دیتے ناں ان کو اپنی خوشی۔'' معصومہ نے تیز ہو کر کہا تو شاویز نے دل میں ماں کی سادگی کو سلام پیش کیا جس نے بیٹے کے الفاظ من وعن معصومہ کے گوش گزار دیے تھے۔

''اب ولیمہ بھی کریں گے ان شاء اللہ۔'' وہ اطمینان سے بولا تو معصومہ جھلس گئی۔

''اچھا ایک گلاس لسی تو پلاؤ۔'' پھر وہ بات پلٹ گیا تو معصومہ نے بھی کام چھوڑ کر اندر کی راہ لی۔

☆☆☆

رات تک علوینہ کا موڈ آف رہا۔ رات کے کھانے پر بھی وہ موجود نہیں تھی، اس نے کمرے میں ہی کھانا منگوا لیا تھا۔ معصومہ نے جتاتی نظروں سے شاویز کو دیکھا پر وہ نظر انداز کر گیا۔

''بڑا غرور ہے تو بہ، تو بہ۔'' وہ پھر بھی کہنے سے باز نہ آئی تھی شاویز نے صبر کے گھونٹ بھرے۔

کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آیا تو علوینہ نائٹ بلب جلائے شب خوابی کے لباس میں بستر پر

دراز نظر آئی۔

شاویز دوسری طرف سے آکر بیڈ پر لیٹ گیا۔ پھر اس کی طرف کروٹ لی۔

علوینہ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اس کو متوجہ دیکھ کر فوراً بند کرلیں۔

شاویز نے اس کا نازک ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اپنے رخسار تلے رکھا تو علوینہ کو جھٹکا سا لگا۔

''یہ کیا حرکت ہے مجھے سونے دو۔'' وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر تیز لہجے میں بولی تو شاویز کا ٹیمپر لوز ہونے لگا۔

''آہستہ بات کرو۔ شوہر ہوں تمہارا۔'' وہ خود کو کنٹرول کرتے بولا۔

''زبردستی کا۔'' علوینہ نے لقمہ دیا تو وہ کھول اٹھا۔

''زبردستی کب کی ہے تمہارے ساتھ۔ اپنی پوری آمادگی سے تم نے خود کو مجھے سونپا ہے۔'' شاویز نے تحمل سے کہا تو وہ لب کاٹنے لگی۔

''وہ میری وقتی کیفیت تھی۔ اس وقت مجھے اندھیرے کے فوبیا نے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ ورنہ تم سے مجھے کلی دلچسپی تھی نہ آج ہے۔'' اس کی صاف گوئی قیامت تھی۔ شاویز صدمے میں گھر گیا۔

علوینہ نے دوسری طرف کروٹ بدل لی تھی۔ وہ اس کی پیٹھ کو دیر تک دیکھتا گہری سوچ میں گم ہوگیا۔

☆☆☆

دوسری صبح بہت خاموشی سے طلوع ہوئی۔ حویلی آج بھی اکثر مکینوں سے خالی تھی۔ شاویز بھی نظر نہ آتا تھا۔ ایک معصومہ تھی اور اس کی جانچتی پرکھتی نظریں۔

علوینہ نے اسے لفٹ نہ کروائی۔ وہ سارا دن اپنے کمرے میں بند رہی۔ اپنے گزرے ماہ و سال کا موازنہ اپنی حاضر زندگی سے کرتی رہی۔ ایک آزاد تتلی کو پروں سے دبوچ کر بے رنگ کردیا گیا تھا۔ مستقبل کی کوئی اچھی امید نہ بچی تھی۔ جس ماحول سے بیس سال پہلے ممی نے فرار حاصل کیا تھا وہ اسی ماحول کو اپنانے پر مجبور کردی گئی تھی۔

پاپا تو ممی کے ساتھ ان کے ماحول میں رچ بس گئے اور علوینہ کو پیچھے اپنے کیے کا ازالہ کرنے کو باندھ گئے۔ ایک ایسے شخص کے ساتھ جو پڑھا لکھا گنوار ہے۔ جو تا عمر کنوئیں کا مینڈک بن کر اسی گاؤں میں اپنی زندگی گزار دینا چاہتا ہے۔ شاویز کے روایتی خیالات نے علوینہ کو جی بھر کے بدمزہ کیا تھا۔

''اور زاشا کہہ رہی تھی کہ اس کو کنونس کر کے شہر لے آؤں۔ ہونہہ۔ ایسا کاٹھ کا الو نہیں ہے۔'' علوینہ نے تنفر سے سر جھٹکا۔ معاً موبائل کی بیل بجی تو وہ اس طرف متوجہ ہوئی۔ اسکرین پر پاپا کالنگ لکھا نظر آیا تو وہ چونک اٹھی۔

''ہیلو.....'' علوینہ نے کال اٹھا کر ہلکے سے کہا۔

''کیسی ہے پاپا کی جان۔ میری پیاری بیٹی۔'' دوسری طرف اس کی آواز سنتے ہی زاہد صاحب پُرجوش ہوئے۔

''آپ کو اتنے دن بعد خیال آیا میرا؟'' علوینہ نے جتا کر پوچھا تو زاہد صاحب لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوگئے۔

''خیال تو مجھے ہر وقت میری دینا گڑیا کا ہی رہتا ہے۔ اپنے پاپا کو بھولنے والا سمجھ لیا ہے کیا؟'' وہ محبت بھرے انداز سے بولے۔

''ہاں میرا بہت خیال کیا ہے آپ نے..... ساری زندگی میری مرضی کے خلاف۔ کبھی مجھے ایک چاکلیٹ تک نہیں دلوائی۔ اپنے متعلق چھوٹے بڑے تمام فیصلوں کا اختیار ہمیشہ مجھے دیا۔ بس میری زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ آپ نے خود سے کرلیا۔ نہ میری مرضی پوچھی نہ ہی مجھے اختیار دیا۔'' علوینہ نے جلتے دل کے ساتھ کہا۔

''اس طرح مت کہو بیٹا۔ میں تمہارا باپ ہوں اور اگر تم یقین کرو تو تمہارے متعلق میں نے بہترین فیصلہ لیا ہے۔ شاویز ایک ہیرا ہے۔ سنی تو اس کے پاؤں کی دھول بھی نہیں۔ تم دیکھنا ایک دن تم میرے فیصلے پر فخر کرو گی۔'' وہ یقین سے بولے تو وہ طنزیہ انداز میں ہنس دی۔

''پاپا آپ نے اپنے کیے کا تاوان میری صورت میں ادا کیا ہے۔ آپ کے اپنے جو آپ کی دوری سے دلبرداشتہ تھے، آپ کی بیٹی پر دسترس پا کر خوشی سے

پھولے نہیں سمارہے۔ آپ کے دان اور ان کی مسرت کے درمیان میری ذات پس کر رہ گئی ہے۔ جس کے متعلق سوچنا آپ نے گوارا نہیں کیا..... آپ نے بہت خودغرضی دکھائی ہے پاپا۔ میں آپ کو معاف نہیں کروں گی۔'' غصے سے بولتے علوینہ کی آواز پھٹ سی گئی۔ پھر اس نے کال کاٹ کر موبائل آف ہی کردیا۔ دل ایک دم ہی عجیب سے احساسات میں گھر گیا تھا۔ پاپا کی آواز سنتے ہی اپنے گھر واپس چلے جانے کی خواہش زور پکڑ گئی تھی۔ اپنا کمرا، اپنا بستر اپنی آزادی کے شب و روز شدت سے یاد آنے لگے تھے۔ وہ اس ماحول میں مس فٹ تھی اور یہ بات اس کو بغاوت پر اکسا رہی تھی۔

☆☆☆

زندگی بہت سپاٹ اور اچاٹ سے انداز میں گزرنے لگی۔ علوینہ نے اپنا مزاج اتنا برہم کرلیا کہ ماحول میں کشیدگی چھا گئی۔ شاویز نے اس کو مخاطب کرنا بھی چھوڑ دیا کہ وہ بات بے بات کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ وہ پھپھو سے بھی بدتمیزی سے پیش آتی، مہرالنسا اس کے رویے سے دلبرداشتہ ہوکر خاموش سی ہوگئی تھیں۔ معصومہ خوشی کے ان دیکھے احساس سے حویلی میں چہکتی پھرتی، وہ ویسے بھی شاویز کے گرد پروانہ وار گھومنے کی عادی تھی۔ اب تو مزید نثار ہوتی نظر آتی مگر علوینہ کو پروا کب تھی۔ وہ سارا دن پوستیوں کی طرح کمرے میں پڑی رہتی، ہاتھ میں سیل فون ہوتا اور انٹرنیٹ کی سرچنگ۔ اس نے کپڑے بھی اپنی مرضی کے پہننے شروع کردیے تھے۔ ایک طرح سے وہ شاویز کو جتا رہی تھی کہ وہ یہاں ایڈجسٹ نہیں کرسکتی۔

شاویز سب کچھ دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ علوینہ کے ساتھ سختی کرکے وہ اس کا ظاہر بدل سکتا ہے مگر اندر نہیں۔ اندر تو تب بدلے گا جب وہ خود چاہے گی۔ اور ایسا ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

اس دن بھی وہ بے دلی سے بیڈ پر نیم دراز ٹی وی کا ریموٹ ہاتھ میں لیے چینل پر چینل بدل رہی تھی کہ

مایوسی تو گناہ ہے

صرف بے اولاد

گھرانے متوجہ ہوں۔

انسان کو کسی بھی صورت رب تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ اکثر گھرانوں میں صرف اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اُداسی، پریشانی، ہر وقت کے گھریلو جھگڑے اور پھر علیحدگی تک بات پہنچ جاتی ہے۔ آپ مایوس نہ ہوں انشاء اللہ آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں ہم نے کستوری عنبر و دیگر ہربلز سے ایک ایسا خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے کہ جس کے استعمال سے انشاء اللہ آپ کے ہاں بھی ایک صحت مند خوبصورت بیٹا پیدا ہوسکتا ہے۔ آپ آج ہی فون کریں اپنی تمام علامات سے آگاہ کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوالیں۔

المُسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)

ضلع حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

شاویز حواس باختہ سا کمرے میں داخل ہوا۔

''علوینہ تم آنٹی کا فون ریسیو کیوں نہیں کر رہیں؟'' وہ اس کے سامنے کھڑا ہو کر پوچھنے لگا تو علوینہ نے ناگواری سے اس سے دیکھا۔

''میری مرضی۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی پھر پاس پڑا سیل اٹھا کر دیکھا تو ممی کی دس مسڈ کالز لگی تھیں۔

''علوینہ ماموں اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ ہمیں ابھی شہر نکلنا ہوگا۔'' وہ عجلت میں پیشانی مسلتے بتانے لگا تو علوینہ کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

''کک..... کیا ہوا پاپا کو؟'' وہ بستر سے اتر آئی اور تشویش سے شاویز کو دیکھا۔

''ان کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ تم چلو بس۔'' شاویز نے واضح انداز میں بتانے سے گریز کیا۔

''میرے پاپا کا..... ایکسیڈنٹ..... کیسے؟'' وہ بے ربط بولتی اس کے ساتھ چلنے کو آگے بڑھی۔

وہ بھی تیزی سے سیڑھیاں اترتا نیچے آیا۔ جہاں تسبیح ہاتھ میں پکڑے چادر سنبھالتی مہرالنسا ان کے ساتھ چلنے کو تیار کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''اللہ خیر کرنا میری بچی کے سر پر باپ کا سایہ سلامت رہے۔'' انہوں نے علوینہ کا سر پکڑ کر چوما اور بھرائی آواز میں سسکی۔

''اماں..... بس چلیں اب۔'' شاویز نے رکے بغیر کہا تو علوینہ ان کے ہاتھوں کو پرے کر کے اس کے پیچھے چلی۔ وہ بھی بغیر برا مانے تسبیح پڑھتے دروازے سے باہر نکلیں۔

سارا راستہ علوینہ کا دل انجانے خوف سے سہما رہا۔ وہ دل ہی دل میں پاپا کی زندگی اور صحت کی دعائیں مانگتی رہی۔ مہرالنسا بھی بلند آواز سے یا سلام اور درود شریف کا ورد کرتی رہیں۔

دو گھنٹے کی مسافت گویا صدی پر محیط ہوگئی۔ اسپتال کی عمارت کے احاطے میں گاڑی کھڑی کر کے شاویز ان دونوں کو لیے ریسپشن پر چلا آیا۔

''زاہد خان..... آئی سی یو میں ہیں۔'' سسٹر نے ان کو اشارہ کر کے بتایا تو علوینہ تیر کی طرح بائیں راہداری کی طرف بڑھی۔ کاریڈور میں ہی ممی بے چینی سے ٹہلتی نظر آگئیں۔

''ممی۔'' وہ بے اختیار ناہید بیگم سے لپٹ گئی۔

''وینا ڈارلنگ پاپا کے لیے دعا کرو۔'' وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے پریشان نظر آئیں۔

''ممی یہ سب کیسے ہوگیا وہ تو بہت سلو ڈرائیونگ کرتے ہیں۔'' علوینہ نے ان سے لپٹ کر پوچھا تو وہ بے بسی سے اس سے دیکھنے لگی۔

''بس بیٹا صبح آفس کے لیے نکلے پھر سائیٹ ایریا چلے گئے وہاں سے واپسی پر نہ جانے کیسے ایک تیز رفتار گاڑی سے ان کی کار ٹکرا گئی۔'' وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولیں۔ آج وہ معمول سے ہٹ کر بہت ملگجے حلیے میں دکھائی دے رہی تھیں۔

''ناہید فکر مت کرو اللہ ادا کو لمبی عمر دے گا۔'' مہرالنسا نے بڑھ کر ان کو تسلی دی تو انہوں نے ایک سپاٹ نظر اپنی نند پر ڈالی۔

شاویز ڈیوٹی ڈاکٹر سے زاہد صاحب کے متعلق پوچھنے لگا۔ اس نے صورت حال غیر تسلی بخش بتائی۔ ان کے سر میں گہری چوٹیں آئی تھیں اور اس وقت وہ..... بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ ان کا ہوش میں آنا تقریباً معجزہ ہی ہوسکتا تھا ورنہ کومے میں چلے جانے کے بہت چانسز تھے۔

شاویز کا دل یہ سن کر ڈوب سا گیا۔ وہ سر جھکا کر چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتا اماں کی طرف آیا۔ اس کے چہرے پر واضح فکرمندی جھلک رہی تھی۔

''کیا کہتے ہیں ڈاکٹر؟'' مہرالنسا نے اسے متوجہ کیا تو شاویز نے نظریں چرائیں۔

''اللہ سے دعا کریں اماں۔'' وہ ہلکی آواز میں بولا تھا۔

علوینہ نے روتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''یہ چند گھنٹے ان کی زندگی کے لیے بہت اہم

ہیں دینا۔ وہ بے ہوشی سے نکل کر واپس اچھے ہو جائیں دعا کرو بیٹا۔'' ناہید بیگم بھی شوہر کی کنڈیشن سے باخبر تھیں۔ گلوگیر لہجے میں بولیں تو علوینہ تڑپ اٹھی۔

''پاپا کو کچھ نہیں ہوگا ممی۔'' وہ ان کا ہاتھ تھام کر بولی تو وہ پھیکا سا مسکرا دیں۔

''ممی، روبی آنٹی کہاں ہیں؟'' معاً اسے خیال آیا۔

''میں نے اسے بتایا نہیں دینا۔ ہمارے تعلقات اب ویسے نہیں رہے۔'' انہوں نے ہلکے سے کہا تو علوینہ خاموش سی ہوگئی۔

وقت سستی اور اندیشوں سمیت سرک رہا تھا۔ مہرالنسا تو زاہد صاحب کو دیے گئے روم میں جائے نماز بچھا کر دعاؤں میں مصروف ہوگئیں۔ شاویز باہر کی بھاگ دوڑ کرنے لگا۔ علوینہ ماں سے لپٹ کر بیٹھ گئی۔ کتنے دنوں بعد وہ ان سے مل رہی تھی۔

''یا خدا پاپا ہوش میں آجائیں۔'' وہ شدت سے دعا گو ہوئی۔ ''پاپا سے کی گئی سابقہ گفتگو سے عرقِ ندامت میں ڈبونے لگی۔

''پاپا اچھے ہو جائیں تو میں ان سے معافی مانگ لوں گی۔'' اس نے ایک عزم سے سوچا تھا۔

لیکن بعض باتیں صرف سوچی ہی جا سکتی ہیں وقت ان پر عمل کرنے کی مہلت نہیں دیتا۔

کچھ گھنٹے ہی گزرے کہ زاہد صاحب کی طبیعت بگڑنے لگی۔ وہ ہوش میں تو نہ آسکے مگر اسی بے ہوشی کی حالت میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ زاہد صاحب کے انتقال کی خبر ملتے ہی علوینہ ماں کی بانہوں میں جھول گئی اور ناہید بیگم کو صدمے سے سکتہ سا ہوگیا۔ مہرالنسا بے اختیار اونچی آواز میں بھائی کو پکارتے رو پڑیں۔ شاویز نے ہی اپنے اعصاب قابو میں رکھے شفیق ماموں کی جدائی سے اس کا دل پھٹ رہا تھا لیکن وہ ان تین عورتوں کو نڈھال ہوتا دیکھ کر خود کو مضبوط رکھے ہوئے تھا۔

زاہد صاحب کے قریبی عزیز و اقارب اور احباب کو ان کی فوتگی کی اطلاع دینے اور تمام آخری رسومات نبھانے میں وہ تن تنہا لگا رہا۔

ماموں کی اولادِ نرینہ نہ ہونے کے باعث ان کو گور میں اتارنے کا فریضہ بھی کسی بیٹے کی طرح اسی نے ادا کیا۔

ناہید اور علوینہ تو حال سے بے حال ہوئی جاتی تھیں۔ مہرالنسا گھر میں تعزیت کرنے آئی عورتوں کو سنبھالتی رہیں۔

☆☆☆

ماحول سوگواریت کی لپیٹ میں تھا۔ علوینہ کو یقین نہیں آتا تھا کہ پاپا اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ کمرا بند کر کے روتی رہتی۔ شاویز، ناہید بیگم کی موجودگی میں زیادہ تر باہر ہی رہتا۔

زاہد صاحب کا سوئم گزر گیا۔ زندگی کسی حد تک معمول پر آنے لگی۔ ناہید بیگم بھی بہت حد تک سنبھل چکی تھیں۔ انہوں نے سب سے پہلے مہرالنسا کو گھر میں چلتے پھرتے اور کام کرتے ہوئے ناگواری سے دیکھا۔ اور پھر اپنی ناگواری جتانے میں دیر نہ لگائی۔

''آپ کو پیچھے اپنے گاؤں میں سو کام ہوں گے۔ یہاں میں اپنا گھر چلا سکتی ہوں۔'' وہ کچن میں آکر براہ راست مہرالنسا سے مخاطب ہوئیں تو وہ خانساماں .... اور ملازمہ کے سامنے ان کی اس بات پر شرمندہ ہو کر رہ گئیں۔

''میں نے کب کہا بھابی کہ آپ اپنا گھر نہیں چلا سکتی۔ اللہ آپ کو اپنے گھر کو برتنا نصیب کرے۔'' وہ دھیمی آواز میں بول کر چائے کی ٹرے واپس سلیب پر رکھ کر کچن سے نکلنے لگیں۔

''تو مجھے میرا گھر اچھے سے چلانے دیجیے اور آپ جا کر اپنا گھر سنبھالیے۔'' ناہید نے تنفر سے کہا تو مہرالنسا کے بڑھتے قدم رک گئے۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ اتنے بڑے جذباتی حادثے سے وہ اتنی جلدی نکل کر اپنی سابقہ جون میں واپس آجائیں گی۔

''الحمدللہ اُدھر میرا بھرا پُرا کنبہ ہے۔ کسی چیز کی کمی

موسم گرما

ماحولیاتی تبدیلیوں کے باعث دورِ حاضر میں جہاں موسم گرما طویل تر ہوتا جارہا ہے، اسی طرح سخت موسم کے اثرات سے خود کو بچانا بھی مشکل ہوتا جارہا ہے۔ ہر ذی روح گرمی کے اثرات سے بچنے کی فکر اور کوشش میں ہے۔ گرمی کے موسم میں پیاس، پسینہ اور گھبراہٹ کے تاثرات عام طور پر پائے جاتے ہیں۔

پسینہ گو کہ انسانی بدن کے لیے صحت مندی کی علامت ہے۔ کیونکہ یہ انسانی جسم سے مُضر اور فاضل مادّوں کو خارج کرنے کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے لیکن بعض اوقات بداحتیاطی سے مفید اجزا بھی بدن انسانی سے خارج ہوجاتے ہیں جو پھر جسمانی کمزوری کا باعث ہیں..... ایسے میں جسمانی توانائی کو برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے پہلے غذا پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

چنانچہ ایسے پھلوں اور سبزیوں کا استعمال زیادہ کریں، جن میں پانی کی مقدار زیادہ اور ان کی تاثیر ٹھنڈی ہو۔ یہاں ہم آپ کو ایسی غذاؤں کے متعلق آگاہ کریں گے جن کے استعمال سے گرمی کو مات دی جاسکتی ہے۔

تربوز، خربوزہ، گرما، سردا

عرصہ دراز سے بچوں اور بڑوں کا پسندیدہ پھل تربوز سے زیادہ کوئی چیز انسانی جسم کو گرمی کی حدت

نہیں ہے۔ بھائی کی جدائی کا خیال کرکے کچھ دن یہاں ٹھہر گئی تھی، آج ہی چلے جاتے ہیں ہم۔'' مہرالنسا نے بھرائی آواز میں کہا اور پھر رکی نہیں۔

''شاویز گاڑی نکال بیٹا۔ اب واپس چلیں۔''

وہ سیدھا شاویز کے پاس آئی تھیں۔

''کیا ہوا اماں؟'' وہ ان کو جانچتی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''کیا ہوگا بیٹا۔ بھائی کی موجودگی میں یہ گھر ہمارے لیے اجنبی تھا تو اب تو.....'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر ادھورا سا بولیں تو شاویز نے لب بھینچ لیے۔

''علوینہ چل رہی ہے؟'' اس نے پوچھا تو مہرالنسا پھیکا سا مسکرائیں۔

''اسی سے پوچھ لو بیٹا۔''

وہ کھوجتی نظروں سے انہیں دیکھتا اندر کی طرف بڑھا۔ ماربل کی گول سیڑھیوں سے اوپر آکر اس نے علوینہ کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

''یس۔'' اندر سے آواز آئی تو وہ کمرے میں داخل ہوگیا۔

علوینہ سامنے ہی صوفے پر آڑی ترچھی بیٹھی نظر آئی۔ اس کا سر زاشا کے کندھے پر دھرا تھا۔ جس کو وہ تسلی دینے کے انداز میں تھپک رہی تھی۔

وہ ملگجے سے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس تھی۔ آنکھوں کی سرخی اس کے روتے رہنے کی چغلی کھا رہی تھی۔

''ہیلو شاویز۔''

شاویز کو سامنے دیکھ کر زاشا سیدھی ہوکر بیٹھ گئی لیکن علوینہ نے کوئی جنبش نہ دکھائی۔

''علوینہ میں اماں کے ساتھ واپس جارہا ہوں۔ تم ہمارے ساتھ چلو گی یا کچھ دن ٹھہر کر تمہیں لینے آؤں۔'' وہ زاشا کو سر کے اشارے سے جواب دے کر براہ راست علوینہ سے مخاطب ہوا۔

''مجھے تمہارے ساتھ نہیں جانا۔ آج نہ کل۔'' اس نے بھیگی ہوئی آواز میں قطعیت سے کہا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ زاشا بھی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

کے مضر اثرات سے بچاؤ میں فوقیت نہیں رکھتی۔ تربوز میں 90 فیصد پانی ہوتا ہے اور یہ انسانی جسم کو پانی کی کمی کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ تربوز میں وٹامن اے اور سی شامل ہونے کے علاوہ یہ کینسر اور دل کی بیماریوں کے بچاؤ میں بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح خربوزہ پیشاب آور ہے، گرما اور سرد قبض کشا اور معدے اور اعصاب کو طاقت دیتا ہے۔

تُرش پھل

مالٹا، انگور اور لیموں جیسے ترش پھل بہت زیادہ ٹھنڈی تاثیر رکھتے ہیں۔ مزیدار ذائقوں کے علاوہ یہ پھل آپ کو صحت مند اور جوان بنائے رکھنے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ترش پھل نظام ہضم کو بہتر بنا کر عمومی صحت کو برقرار رکھتے ہیں۔

کدو، لوکی، کھیرا، ککڑی، سلاد اور پودینہ، پیٹھا.....

پھلوں کے علاوہ ٹھنڈی تاثیر رکھنے والی سبزیاں بھی موسم گرما میں انسانی جسم کے لیے نہایت مفید ہیں۔ ہمارے ہاں بہت ساری ایسی سبزیاں پائی جاتی ہیں جو جسمانی درجۂ حرارت کو کم ہونے سے روکے رکھتی ہیں۔ ایسی سبزیوں میں کھیرا، گاجر، سلاد اور پودینہ شامل ہیں جن میں پانی کی ایک خاص مقدار شامل ہوتی ہے جو خون کو پتلا اور جسمانی درجۂ حرارت کو مناسب رکھتے ہیں۔

مرسلہ: عروبہ ناز، کوٹلی

''پوچھ سکتا ہوں کیوں؟'' زاشا کی موجودگی کا خیال کر کے وہ ضبط سے کام لے رہا تھا۔

''مجھے تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا بس۔'' وہ بدتمیزی سے بولی تو شاویز نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

''آپ تھوڑی دیر باہر جائیں گی۔'' وہ زاشا سے بولا تو وہ علوینہ کو پرے سرکا کر اٹھنے لگی۔

''یہ کہیں نہیں جائے گی۔ جو بات کرنی ہے اس کے سامنے کرو۔'' وہ زاشا کا ہاتھ پکڑ کر بولی تو زاشا نے کوفت سے اسے دیکھا۔

''میں ماموں کی وفات کا لحاظ کر رہا ہوں جس کے باعث تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا۔ پندرہ دن بعد تمہیں لینے آؤں گا۔'' وہ ایک، ایک لفظ پر زور دے کر بولا تو علوینہ نے سر جھٹکا۔

''میں نے بھی پاپا کا لحاظ کیا تھا جو اتنے دن تمہارے ساتھ گزار لیے۔'' وہ بدلحاظی سے بولی تو شاویز ششدر رہ گیا۔

زاشا نے بھی خفت محسوس کی۔

''ٹھیک ہے پڑی رہو یہاں ساری زندگی۔ میں بھی تمہیں ڈائیورس نہیں دوں گا۔ میں جانتا ہوں تم کس کے بل پر اتنا اکڑ رہی ہو۔''

شاویز نے بہت غضب ناک ہو کر اس کو اور پھر زاشا کو دیکھا۔ پھر لمبے، لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔

''یہ کیا حرکت کی دینا۔ اتنی بدتمیزی سے اپنے بھی سے بات کرتے ہیں۔'' زاشا افسوس سے اسے دیکھنے لگی۔

''تمہیں نہیں پتا یہ فیوڈل ذہنیت کا بندہ کیسے مجھ پر رعب جماتا ہے۔ اس کی سوچ بالکل گنواروں والی ہے۔ اسے میری ڈریسنگ، میرے دے آف لیونگ، میری آزادی سے چڑ ہے۔ یہ مجھے پردے کی بُو بُو بنا کر اپنی حویلی میں دفن کر دینا چاہتا ہے۔'' وہ ناک سکیڑ کر بولی تو زاشا اسے سوچتی نظروں سے دیکھتی رہی۔

''وہ تمہارے اس فیصلے کی وجہ شاید سنی کو سمجھ رہا ہے۔ اس کو بتا دیتیں کہ سنی تو آسٹریلیا شفٹ ہو گیا

ہے۔'' زاشا نے کہا تو علوینہ نے اسے گھورا۔

''تو سمجھنے دو۔ میں کیوں وضاحتیں دوں۔'' وہ بے نیازی سے بولی تو زاشا اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''اتنے دن اس کے ساتھ رہی ہو کچھ تو اس کے لیے دل میں سوفٹ کارنر بنا ہوگا۔'' زاشا نے اپنے مخصوص کھلے انداز میں پوچھا تو علوینہ چند ثانیے خاموش سی رہ گئی۔

''نہیں' اتنا نیچ میں نہیں رہی جتنا تم سمجھ رہی ہو۔'' وہ نظریں چرا کر بولی تو زاشا بے یقینی سے کندھے اچکا کر رہ گئی۔

☆☆☆

''چار دن ماں کے سائے میں کیا رہی۔ کیسے ہم سے آنکھیں پھیر لیں۔ ہائے اب میں دنیا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔'' مہرالنسا نے سرد آہ بھری تو شاویز نے لب بھینچ لیے۔ اماں سے صاف بات کر کے وہ پھنس چکا تھا۔

ایک مہینہ گزر گیا اور بیٹا بہو کو لے کر آنے کے لیے تیار نہ نظر آیا تو مہرالنسا کٹھک سی گئیں۔

وہ بیٹے سے اٹھتے بیٹھتے علوینہ کو لے کر آنے کہتی رہیں۔ پھر بھائی کا چالیسواں بھی گزر گیا۔ وہ ناہید کے رویے سے دل برداشتہ تھیں خود تو نہ گئیں پر شاویز سے علوینہ کو لے کر آنے کا کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

مہرالنسا کو علوینہ کے اطوار بسنے والے تو نہ لگتے تھے پر وہ اپنی سادہ طبیعت کے باعث سوچ رہی تھیں کہ ایک بار عورت نکاح میں بندھ جائے تو نباہ کر ہی لیتی ہے۔ مگر شاویز نے کھل کر بتا دیا کہ وہ رہائی کی خواہشمند ہے اور اس کے ساتھ رہنے کو قطعی تیار نہیں تو ان کا دل لرز اٹھا۔ شاویز کے دل کا حال وہ جانتی تھیں ان کا بیٹا بہو سے محبت کرتا تھا مگر بہو.....؟

بھائی کی جدائی نے معاملات کو بگاڑ دیا تھا۔ وہ بیٹے کے لیے پریشان ہوا تھیں جو علوینہ کی چند دنوں کی رفاقت میں کیسا کھلا پڑ رہا تھا اور اب ہر بات پر جیسے چڑا ہوا رہتا۔

''یا خدایا۔ سب کچھ بہتر کر دے۔'' ان کے دل نے دعا مانگی تھی۔

لیکن کچھ دعائیں پوری ہونے کے لیے نہیں ہوتیں۔

☆☆☆

علوینہ اپنے گھر اپنے مخصوص طرز زندگی میں لوٹ آئی تھی، پاپا کو گزرے ایک سال ہو چلا تھا مگر ان کے بغیر بہت کچھ ادھورا تھا۔ ناہید بیگم مدت سے نکل کر اپنی مصروفیات میں الجھ گئی تھیں۔ زاہد صاحب کا کاروبار اب انہوں نے سنبھالا تھا۔ وہ پہلے بھی کاروباری معاملات کی کچھ سمجھ بوجھ رکھتی تھیں لیکن زاہد صاحب کے ہوتے وہ بے فکر تھیں پر اب ان کا بزنس ان کی مکمل توجہ کا متقاضی تھا۔ سونا ہید بیگم اپنی دوسری ایکٹویٹیز چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہوئیں لیکن کچھ ہی عرصے میں وہ چکرا کر رہ گئیں۔ خاور آفندی جو زاہد صاحب کے شیئر ہولڈر اور دایاں بازو تھے ایک کائیاں شخص ثابت ہوئے۔ وہ تمام کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے ..... ناہید بیگم کو سیٹ پر تو بٹھا دیا لیکن اختیارات اپنے پاس رکھے۔ وہ صرف آفس خانہ پری کو جاتیں۔ کچھ فائلیں سائن کرتیں اور گھر لوٹ آتیں۔

وہ کاروباری داؤ پیچ سے نابلد تھیں۔ اس کے باوجود رفتہ رفتہ ناہید بیگم کو احساس ہوا کہ بہت کچھ جو بظاہر صحیح نظر آرہا ہے وہ صحیح نہیں۔ پھر انہوں نے اپنے ایک خیر خواہ وکیل سے رابطہ کر کے مشورہ کیا تو وکیل صاحب نے معاملات کا جائزہ لے کر زاہد صاحب کے حصے کے شیئرز خاور سے علیٰحدہ کرنے کا مشورہ دیا۔

ناہید بیگم نے جب خاور سے یہ مطالبہ کیا تو جو حقیقت ان کے سامنے آئی اس نے ان کے پیروں سے زمین کھینچ لی۔ زاہد صاحب اپنے شیئرز کا بڑا حصہ خاور کو بیچ چکے تھے جس کی وجہ وہ کاروباری نقصانات تھے جن کا ذکر زاہد صاحب نے کبھی ناہید سے نہیں کیا تھا۔ وہ ششدر سی رہ گئیں۔ وکیل صاحب کاغذات ہاتھوں میں لے کر تاسف سے سر ہلاتے رہ گئے۔

''ہر چیز تھرو پراپر چینل کی گئی ہے ناہید بہن۔ ہم خاور کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کر سکتے۔ ان

دستاویزات سے صاف ظاہر ہورہا ہے کہ زاہد صاحب نے خود اپنے شیئرز خاور کے نام منتقل کیے ہیں۔'' ان کی بات پر ناہید نے صدمے کے زیر اثر ان کا چہرہ دیکھا۔

''یہ کاغذات جو بتا رہے ہیں۔ اس لحاظ سے تو ہم دیوالیہ ہو چکے ہیں وکیل صاحب۔'' ان کی آواز کسی کھائی سے آرہی تھی۔

''جی حقیقت بھی یہی ہے۔'' وہ افسوس سے بولے تو ناہید بیگم پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

انہیں شدید قسم کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہوگئیں۔ علوینہ کے لیے تو یہ دُہرا صدمہ تھا ابھی پاپا کا دکھ نہ سنبھلا تھا کہ ممی کی یہ حالت ہوگئی اور ان کی اس کنڈیشن کی وجہ بھی ناقابل یقین تھی۔ روبی آنٹی بھی بہن کے لیے پریشان ہوا ٹھی تھیں۔ دو دن کی بے ہوشی کے بعد وہ ہوش میں تو آگئی تھیں مگر ان کے زندہ بچ جانے کی خبر پر علوینہ پوری طرح خوش بھی نہ ہونے پائی تھی کہ پتا چلا کہ ان کے جسم کا دایاں حصہ فالج کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ وہ اپنی زبان سے بات کرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھیں۔

کچھ دن اسپتال میں رکھ کر ان کو ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ گھر آکر وہ بستر پر پڑی رہیں ان کی فزیوتھراپی اور علاج جاری تھا۔ علوینہ ماں کو یوں بے بسی کی تصویر بنے ہوئے بستر پر دیکھ کر آنسو ضبط کرتی رہتی۔ اس نے یونیورسٹی جانا بھی ترک کر دیا تھا۔ سارا وقت ممی کے پاس رہتی۔

ان کے معاشی مسائل بڑھ گئے تھے۔ گھر کے اکثر ملازمین کو نکال دیا گیا۔ زاہد صاحب کا بینک بیلنس اور اچھے وقتوں میں خریدے گئے چند فلیٹس اور دکانیں جو کرایے پر دیے ہوئے تھے ان کی آمدنی ان دو ماں بیٹی کو کافی تھی مگر یہ لائف اسٹائل اس لائف اسٹائل سے بہت مختلف تھا یوں جیسے کسی کے منہ سے سونے کا چمچ نکال کر اسٹیل کا رکھ دیا جائے۔

☆☆☆

علوینہ بالکل تنہا ہوگئی تھی۔ ممی کی بے بس خاموشی نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہی تو پاپا کے بعد اس کا سب کچھ تھیں۔ زاشا بھی شادی کر کے لندن شفٹ ہوگئی تھی۔

وہ ڈپریشن کا شکار رہنے لگی۔ اسی پریشانی میں اس نے اللہ سے سجدوں میں لمبی، لمبی دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔ وہ مذہب سے بالکل بے بہرہ تو نہیں تھی لیکن اس سے پہلے اسے بن مانگے سب کچھ حاصل ہوتا رہا تھا سو کبھی اللہ سے کچھ مانگنے کا خیال نہ آیا تھا لیکن اب اس کو بہت کچھ چاہیے تھا اپنے دل کا سکون۔ ممی کی صحت یابی پہلے جیسے حالات پہلے جیسی بے فکر ... زندگی اور.....

اس کی حاجتیں لامتناہی ہو چلی تھیں اور اللہ سے مطالبات لمبے۔

☆☆☆

پھر انہی بے کیف دنوں میں ایک دن سنی آسٹریلیا سے پاکستان چلا آیا۔ ناہید بیگم کے پاس کھڑے ہو کر کچھ دیر افسوس سے انہیں دیکھتا رہا پھر علوینہ کے پاس چلا آیا۔

''ہیلو وینا۔ ہاؤ آر یو؟'' وہ اپنے مخصوص انداز میں علوینہ سے مصافحہ کرنے کو آگے بڑھا تو علوینہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ہلکا سا کھینچ کر کے واپس کھینچ لیا۔

''فائن۔'' اس نے یک لفظی جواب دیا اور خاموش ہوگئی۔

''تم چینج ہوگئی ہو۔'' وہ اپنی حیرت چھپا نہ سکا۔

''ہم..... م چینج تو آگیا ہے لائف میں۔'' وہ ہلکے سے بولی تو وہ سر ہلانے لگا۔

''انکل کا سنا بہت افسوس ہوا اور اب آنٹی۔'' وہ جیسے مناسب الفاظ ڈھونڈنے کو چپ ہوا۔

''تمہیں تو آسٹریلیا نے باندھ دیا۔'' وہ پھیکا سا مسکرائی۔

''آئی ایم ویری سوری وینا۔ ان دنوں میں اپنی پرابلمز میں بزی تھا۔'' وہ شرمسار نظر آیا۔ ''اور سناؤ آج کل کیا کر رہی ہو؟'' پھر اس نے بات برائے بات پوچھا۔

''دعائیں۔'' بلا ارادہ علوینہ کے منہ سے نکلا تو سنی بھویں اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

''ہماری ریلیشن شپ کی۔'' وہ کہہ کر قہقہہ لگا کر

ہنسا تو علوینہ کی آنکھوں میں ناگواری پھیل گئی۔

''جسٹ آجوک یار.....'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

''میں اب ان فضول چیزوں سے بہت آگے نکل آیا ہوں۔ بیچلر لائف میں انجوائے منٹ کا جو مزہ ہے وہ میرڈ لائف میں کہاں۔'' پھر وہ آنکھ دبا کر بولا تو علوینہ کی ناگواری بڑھ گئی۔

''آسٹریلیا کی ہوا تمہیں بہت سوٹ کر گئی ہے۔'' وہ منہ بنا کر بولی تو سنی ہنس دیا۔

''ایسی ویسی..... خیر تم بھی اس سیڈ فیز سے باہر آؤ۔ یہ پرابلمز وغیرہ تو لائف کا حصہ ہیں۔ ان کو خود پر سوار کیوں کر لیا ہے۔ گروا پ بے بی۔'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے پھلکے انداز میں بولا تو علوینہ نے اس کا ہاتھ کندھے سے ہٹایا۔

''او کے چلتا ہوں۔'' وہ جانے کو کھڑا ہوا تو علوینہ نے بے تاثر انداز میں اسے بائے کہا۔

☆☆☆

ناہید بیگم کو سوپ پلاتے ہوئے وہ بہت افسردہ تھی۔ مسلسل علاج اور تھراپی کے باوجود وہ بہت سست رفتاری سے ریکور کر رہی تھیں۔ ان کے بازو میں ہلکی جنبش محسوس ہوتی تھی مگر دائیں ٹانگ بالکل سُن تھی۔ زبان سے تو صرف رال ٹپکتی یا غوں غاں کی آوازیں نکلتیں۔

اب بھی وہ کچھ کہنے کی جدوجہد میں عجیب آوازیں نکال رہی تھیں۔ علوینہ رومال سے ان کا منہ صاف کرتی جا رہی تھی۔

انہوں نے بائیں ہاتھ سے علوینہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور التجائی انداز میں اسے دیکھنے لگیں۔

''ممی میں بالکل نہیں سمجھ پا رہی آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔'' علوینہ بے بسی سے بولی تو ناہید بیگم کی آنکھوں میں پانی چمکنے لگا۔

''ممی۔'' اس نے بے چین ہو کر ٹشو ان کے گیلے ہوتے گالوں پر پھیرا۔

آج پہلی بار وہ یوں آبدیدہ ہوئی تھیں۔ اپنی رعب و دبدبے والی ماں کو بے کسی کی تصویر بنے دیکھ کر وہ بھی بار ہا رو چکی تھی۔ لیکن ان کے سامنے اس نے ہمیشہ ضبط رکھا تھا۔ اب جو اُن کو روتے دیکھا تو وہ خود بھی رو پڑی۔

ناہید بیگم کا چہرہ تاریک سا ہو گیا وہ ہلکے، ہلکے سسکنے لگیں۔

اس وقت علوینہ کو محسوس ہوا دنیا کی ساری چکا چوند ممی کی آنکھوں سے چھلکتے پانی کے قطروں میں آ سمٹی ہے اور ان کے تاریک ہوتے چہرے نے زندگی کی روشنیوں کو نگل لیا ہے۔ ان کا وجود جو بھی گھر میں نکتا نہ تھا۔ اب ایک کمرے میں بستر کا محتاج ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کی بے حساب دوستیاں، وسیع حلقۂ احباب دھویں کی طرح کہیں ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔

دنیا آپ کا ساتھ تب تک دیتی ہے جب تک آپ دنیا کا ساتھ دینے کے قابل ہوں بصورت دیگر وہ آپ کو یکسر بھلانے میں دیر نہیں کرتی۔ یہی زندگی ہے اور یہی زندگی کی حقیقت!

علوینہ پر جیسے سوچ کا نیا در وا ہوا تھا۔

☆☆☆

سنی کتنی ہی دیر سے اسے اپنے کل کے فنکشن کا انویٹیشن دے کر ضرور سے آنے پر اصرار کر رہا تھا۔ اور وہ مسلسل سر نفی میں ہلا رہی تھی۔

''میں نے فنکشنز وغیرہ میں جانا چھوڑ دیا ہے۔'' اس کے جواب پر سنی نے اسے گھور کر دیکھا۔

''میں کل آٹھ بجے تمہیں پک کرنے آ رہا ہوں بس۔''

''سنی پلیز۔'' علوینہ نے اس کو بیچارگی سے دیکھا۔

''میں نے کہا ناں تیار رہنا۔'' وہ تاکیدی انداز میں کہہ کر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اور میں نہ چلوں تو؟'' وہ تیزی سے بولی۔

''تو میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔'' وہ زعم سے بولا تو علوینہ نے اسے غصے سے دیکھا۔

وہ ابھی تک ویسا ہی تھا کلین شیو، پالش کیا ہوا چہرہ۔ کندھوں تک آتے سلکی بال اور جا بجا جیولری سے آراستہ وجود۔ اس کے نزاکت کا تاثر دیتے ہاتھوں کی

انگلیوں میں کئی انگوٹھیاں سجی تھیں۔
علوینہ کو اس کے ہاتھ دیکھ کر سانولے سے دو مضبوط مردانہ ہاتھ یاد آئے..... اور ان کا لمس!
وہ اپنی سوچ پر خود ہی چور سی بن گئی۔
''کیا دیکھ رہی ہو۔ ڈیشنگ ہوں ناں؟'' سنی کو کسی اور ہی خوش فہمی نے گھیرا تھا۔
علوینہ کو پھر کوئی یاد آیا۔
''اوکے پھر تیار رہنا۔'' سنی اس کی خاموشی سے بور ہوا اور اصرار کرتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

سنی کی کار کا ہارن سنائی دیا تو وہ تیزی سے سینڈل پہن کر باہر نکل آئی۔
''آج تو غضب ڈھا رہی ہو قسم سے۔''
وہ دروازہ کھول کر اس کے برابر میں بیٹھی تو سنی نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔
فائر بلو کلر کی لانگ میکسی جس پر سلور کلر کا اپر پہن رکھا تھا، اس پر خوب جچ رہا تھا شانے تک کٹے شہد رنگ سیدھے سلکی بال اس نے کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔ ہلکے سے میک اپ میں بھی وہ حسین لگ رہی تھی۔ بہت عرصے بعد وہ کہیں جانے کے لیے یوں تیار ہوئی تھی۔
''شاویز ہاؤ لکی یو آر۔'' سنی گاڑی آگے بڑھاتے بڑبڑایا تو علوینہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا تھا۔
وہ سنی کے ساتھ پارٹی میں آ تو گئی تھی لیکن پہلے کی طرح کسی چیز کو انجوائے نہیں کر رہی تھی۔ اس کا دھیان ممی کی طرف تھا۔
یہاں سارے خوش باش چہرے اسے مصنوعی سے لگ رہے تھے۔ لڑکیاں تقریباً عریاں لباس پہنے بے باکی سے قہقہے لگا رہی تھیں۔ لڑکے ان کی کمپنی میں کھلے پڑ رہے تھے۔ سامانِ شوق موجود تھا۔ سرمستی عروج پر تھی۔ پھر میوزک کی آواز اونچی ہوئی اور سب لڑکے، لڑکیاں ڈسکو فلور پر جوڑوں کی صورت میں تھرکنے لگے۔ علوینہ اپنی جگہ پر ہی بیٹھی رہی۔
''وینا ڈارلنگ کم آن لیٹس ڈانس۔'' سنی نے اچانک سے آ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تو وہ چونک اٹھی۔
''نہیں سنی تم انجوائے کرو۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' وہ رسان سے بولی۔
''وہاٹ میری جان تمہارے بنا میں فلور پر..... تم ہی تو ہمیشہ میری ڈانس پارٹنر رہی ہو۔'' سنی نے جیسے حیرانی سے کہا۔
''اب کسی اور کو اپنا پارٹنر بنالو۔'' علوینہ نے بے نیازی دکھائی۔
''تمہاری جگہ کسی اور کو پارٹنر بنالوں؟ اپنے جیسا سمجھا ہے کیا۔'' وہ دلبری سے بولا پھر اسے زبردستی بازو سے کھینچ کر فلور پر لے آیا۔
''سنی مجھے ڈانس نہیں کرنا ناں۔'' وہ اونچی آواز میں بولی۔ کان پھاڑ میوزک کچھ سننے نہ دیتا تھا۔
''تو نہ کرو۔ مجھے تو تمہارے ساتھ ہی ڈانس کرنا ہے۔'' سنی نے ضدی لہجے میں کہہ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔
''کیوں اتنا گھبرا رہی ہو وینا۔'' وہ اس کے بال سہلانے لگا۔ ''ڈانس سے کیا ہوتا ہے؟ اگر کچھ ہو بھی گیا تو۔'' وہ اپنی بانہیں اس کی کمر کے گرد تنگ کر کے وہ خباثت سے بولا تو علوینہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹ سی گئیں۔
''آئی لو یو مائی ایکس فیانسی۔'' پھر وہ علوینہ کے شانے پر چہرہ ٹکا کر مخمور انداز میں بولا تو وہ جیسے ہڑبڑا کر جاگی۔
''دور ہٹو مجھ سے۔'' علوینہ نے بزور اپنا آپ چھڑا کر دونوں ہاتھوں سے سنی کو پرے دھکیلا۔
سنی اس افتاد کے لیے تیار نہ تھا لڑکھڑا گیا۔
''یو..... (گالی) سمجھتی کیا ہو خود کو۔'' وہ سنبھل کر اتنی زور سے چیخا کہ تھرکتے پیر ساکت ہو گئے۔ چلتا میوزک تھم گیا۔
''مجھ سے ڈرامے کرتی ہو۔'' پھر وہ تیر کی طرح علوینہ کی طرف بڑھا۔ وہ چار پانچ قدم پیچھے ہٹی۔
''یہ لڑکی بہت بڑی hypocrate ہے فرینڈز۔'' وہ دو قدم آگے بڑھ آیا اور شہادت کی انگلی اٹھا کر علوینہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس نے اسی آزادی

اور انجوائمنٹ کے لیے اپنا ہسبینڈ چھوڑ دیا اور اب یہ مجھے پارسا بن کر دکھا رہی ہے۔'' وہ غصیلی آواز میں بولا تو علوینہ کٹ کر رہ گئی۔

''شاویز مجھے پردے کی بُو بُو بنانا چاہتا ہے۔ کیوں یہی کہا تھا نا زاشا سے۔'' وہ نسوانی آواز میں بولا پھر ہنسنے لگا، صاف لگ رہا تھا کہ اپنے حواسوں میں نہیں۔

''نہیں بننا تھا ناں پردے کی بُو بُو۔ تو اب کیوں attitude دکھا رہی ہو۔ ہٹا دو سارے پردے۔'' وہ جارحانہ اس کی طرف لپکا تو علوینہ نے گھبرا کر مخالف سمت دوڑ لگا دی۔

سامنے ہی ہال کا گلاس ڈور تھا وہ تیزی سے اسے دھکیل کر باہر نکلی۔ ہوٹل کی لابی میں سرپٹ دوڑتے ہوئے وہ سنی کی پرچھائی سے بھی دور نکلنا چاہتی تھی۔ اس کا دل بری طرح زخمی ہوا تھا۔ اس کے کردار کو رگیدا گیا تھا۔ وہ آنسو بہاتی ہوٹل کے ریسپشن تک چلی آئی تھی۔

یہاں لوگوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ علوینہ نے وہاں رک کر اپنی آنکھیں ہاتھوں کی پشت سے رگڑی اور ضبط کرتی آگے بڑھی پھر چونک گئی۔

سامنے براؤن کلر کے شلوار قمیص میں ملبوس کندھوں پر اجرک ڈالے بلاشبہ وہ شاویز ہی تھا۔

''وینا..... تو رک اِدھر ہی۔'' اسے اپنے پیچھے سنی کی لرزتی آواز سنائی دی تو وہ گھبرا کر تیز، تیز چلتی شاویز کے قریب آ گئی اور اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

شاویز جو کسی سے گفتگو میں مشغول تھا بری طرح چونک گیا۔ اپنے بازو سے لپٹی بے حد ہراساں سی علوینہ کو دیکھ کر اس کی سہمی آنکھوں میں حیرت در آئی۔

''وینا کیا ہوا؟'' وہ اس کی نظروں کے تعاقب میں لابی کی طرف دیکھنے لگا۔

''مجھے گھر جانا ہے۔'' وہ بھیگی آواز میں بولی۔

''ہاں، ہاں چلتے ہیں۔''

شاویز کو سچویشن کی نزاکت کا احساس ہوا تو گردن موڑ کر اپنے دوست کو دیکھا جس سے کچھ دیر پہلے وہ محوِ گفتگو تھا۔ اس کے چہرے پر الجھن نظر آئی تھی۔

''یہ میری مسز ہیں یاور۔'' شاویز نے بدقت کہا تو اس شخص کے تاثرات کچھ معمول پر آئے۔

''اوہ اچھا، میں پھر چلتا ہوں تم بھابی کے ساتھ جاؤ۔'' اس نے الوداعی ہاتھ ملایا اور مخالف سمت روانہ ہو گیا تو شاویز نے گہری سانس لی۔

''کیا بات ہے۔ تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو اور اتنی پریشان کیوں ہو؟'' وہ اب پوری طرح علوینہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''مجھے گھر جانا ہے۔'' علوینہ نے وہی بات دہرائی۔

''یہاں کس کے ساتھ آئی ہو؟'' اس نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سنی کے ساتھ۔'' علوینہ نے ہلکی آواز میں بتایا تو شاویز کے منہ میں کڑوی گولی گھل گئی۔

''اوکے پھر اسی کے ساتھ واپس جاؤ۔'' وہ اپنا بازو اس کے ہاتھوں کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے بولا تو علوینہ نے زخمی نظر اس پر ڈالی۔

''چلو شاویز دیر ہو رہی ہے۔'' اتنے میں معصومہ گود میں ننھا سا بچہ لیے چلی آئی۔ ساتھ اس کی ماں بھی تھی۔ دونوں نے علوینہ کو حیران ہو کر دیکھا۔

''چلتے ہیں معصومہ۔'' شاویز نے اجرک کھول کر شانوں پر پھیلائی اور علوینہ کو دیکھا جو معصومہ کی گود میں بچہ دیکھ کر گم صم سی ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر وہ وہاں رکی نہیں۔ تیز، تیز قدم اٹھاتی ہوٹل سے باہر نکل آئی۔ ہوٹل کی عمارت سے سڑک تک کا فاصلہ اس نے بہتے آنسوؤں سے طے کیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کس چیز نے اسے زیادہ دکھی کیا ہے۔ سنی کی گری ہوئی حرکات نے، شاویز کی بے گانگی نے یا پھر معصومہ کی گود کے بچے نے جو یقیناً شاویز کا تھا۔

''بس اتنی ہی محبت تھی مجھ سے۔ دو تین سال بھی صبر نہ ہو سکا۔'' وہ تلخی سے سوچنے لگی۔

اچانک کسی گاڑی نے قریب آ کر زور سے ہارن بجایا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکی اور غصے سے گاڑی کے ڈرائیور پر نظر ڈالی۔

وہ شاویز ہی تھا۔ اس نے علوینہ کے لیے کار کا دروازہ کھولا تھا۔

''آجاؤ گھر ڈراپ کردوں۔'' وہ آفر کرنے لگا۔

''بڑی مہربانی..... میں چلی جاؤں گی۔'' وہ چیخ کر بولی۔

''مجھے پتا ہے تم جاسکتی ہو۔ لیکن میں کہہ رہا ہوں ناں آجاؤ۔'' وہ رسان سے بولا تو علوینہ دھپ سے سیٹ پر بیٹھ گئی اور کھٹاک سے دروازہ بند کیا۔

''توڑ دو دروازہ..... توڑنے کے سوا تمہیں آتا ہی کیا ہے۔ دل توڑتی ہو۔ گھر توڑتی ہو اور اپنے آپ کو توڑتی ہو۔'' وہ گاڑی بڑھاتے ہوئے بولا تو علوینہ خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''ہاں، میں ہی بری ہوں سب مجھے ہی بلیم کرو۔ خود جو چاہے کرتے پھرو۔ تم سے صبر ہوا ذرا سا بھی۔ تمہیں وقتی طور پر چھوڑا ہی تو تھا مر تو نہیں گئی تھی جو دوسری کرلی۔'' وہ برہم انداز میں اس کی اجرک کھینچ کر بولی تو شاویز ذرا کو حیران ہوا۔

''سب لوگ مطلبی ہیں، یہ دنیا ہی مطلب کی ہے۔ یہاں جو گر جائے لوگ اسے کچل کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔'' وہ جلے دل سے مزید بولتی رہی۔

''ہم..... م..... اچھا فلسفہ سیکھ لیا ہے۔'' شاویز نے اچٹتی نظر اس پر ڈالی۔

''برا وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے۔'' وہ تلخی سے بولی تھی۔

''کار کی اسپیڈ بڑھاؤ دیر ہو رہی ہے۔ تم نے بھی اپنے بیوی بچے کو ڈراپ کرنا ہے۔'' وہ اسے دھیمی رفتار پر ٹوک کر بولی تو شاویز بے اختیار ہنس دیا۔

''ہاں میں تو بھول گیا..... واقعی میری فیملی وہاں ہوٹل میں میری راہ تک رہی ہے۔'' وہ رفتار بڑھاتے ہوئے فکرمندی سے بولا تو علوینہ کے دل پر چھری سی چلی۔

''سب اپنی دنیا میں مگن..... سب خوش..... اگر کچھ برا ہوا تو میرے ساتھ..... ممی کے ساتھ۔ ہم بھی پاپا کے ساتھ ختم ہوجاتے تو اچھا ہوتا۔'' وہ اپنے اشکوں کو ضبط کرتی کھڑکی کی طرف چہرہ موڑ گئی تو شاویز چونک سا گیا۔

کب سے اس کو روتے ہوئے اور مایوسی کی باتیں کرتے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ علوینہ تو نہیں تھی جس کو وہ جانتا تھا۔

''ایسا کیا ہوگیا ہے ماموں کے بعد اپنی من مانی کرکے مزے سے جی رہی ہو..... تم اب بھی خوش نہیں ہو؟'' وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ کر بولا۔

''ہاں کرلی اپنی من مانی۔ عیش میں گزر رہی ہے زندگی۔ تم نے تو پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک نہیں کی۔ نکاح میں ہوں ابھی تک تمہارے۔ کبھی میری خیر خبر لینے کا خیال نہیں آیا۔'' وہ غصے سے الفاظ چباتے ہوئے بولتی چلی گئی۔

''تم نے گنجائش کہاں چھوڑی تھی علوینہ کچھ پوچھنے کی..... میں تو تمہاری طرف سے خلع کی

غزل

احباب کررہے ہیں جو منزل کے فیصلے
ہم کو نہیں قبول یہ محفل کے فیصلے

طوفان سے تو بچ کے نکل آئے دوستو!
لیکن بڑے عجیب تھے ساحل کے فیصلے

پنچھی قفس کو توڑ کے آزاد ہوگیا
اور مل گئے ہیں خاک میں قاتل کے فیصلے

آنا پڑا ہے اس کو ہمارے حضور میں
ہم سے الجھ رہے تھے مقابل کے فیصلے

یمنیٰ شکستِ دل کا الم اس لیے نہیں
کچھ مصلحت پسند تھے عادل کے فیصلے

کلام: یمنیٰ احمد
پسند: مونا رضوان، کراچی

درخواست کا منتظر تھا۔'' وہ ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے دھیمے لہجے میں بولا تو علوینہ چپ سی رہ گئی۔

ماموں کے بنگلے کے آگے اس نے گاڑی روک کر ہارن بجایا۔ وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر اتر گئی۔

''آنٹی کو ہمیشہ ہی میرا یہاں آنا ناگوار گزرا ہے۔ بہرحال ان کو میرا اسلام دے دینا۔'' اس کے جملے پر علوینہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

''وہ اب کسی ناگواری کا اظہار کرنے کے قابل نہیں رہیں۔'' وہ سپاٹ انداز میں کہہ کر تیز قدموں سے گیٹ عبور کر گئی۔

اور پیچھے شاویز اس کے جملوں پر غور کرتا رہ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن ماسی ہاتھ میں ایک پیکٹ لیے چلی آئی۔ علوینہ نے کچھ حیرت سے اس پارسل کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ شاویز کا نام دیکھ کر اسے تعجب سا ہوا۔ اس نے دھڑکتے دل سے پیکٹ کھولا۔ اندر ایک فریم کی ہوئی پینٹنگ تھی۔ جسے دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا۔

شاویز کے فارم ہاؤس میں سوئمنگ پول میں پیر ڈال کر چہرہ اوپر کیے ترچھے رخ بیٹھی بلاشبہ وہ خود تھی، درختوں سے چھن، چھن کر آتی دھوپ کا عکس اس کے وجود پر پڑتے ہوئے بڑی مہارت سے دکھایا گیا تھا۔ پول کے نیلے پانی اور دھوپ کی شعاعوں کا سنگم اتنا خوب صورت تھا کہ علوینہ حیرت زدہ رہ گئی۔ نیچے باریکی سے ایک طرف شاہ لکھا تھا۔

''اوہ تو وہ آرٹسٹ دراصل شاویز خود تھا۔'' علوینہ نے ستائشی انداز میں ایک بار پھر پینٹنگ پر نظر دوڑائی۔ پینٹنگ کے ساتھ ایک کارڈ بھی تھا جس پر بڑے پیارے حروف میں شاہ بھٹائی کے اشعار درج تھے۔

سونے جیسا محبوب
تو لنے سے نہ تلے
جس کی میخیں
من کے اندر
سرکانے سے نہ
سرکے
وہ کیسے بھولے
جو سمایا ہے
سانسوں میں

شاہ عبداللطیف بھٹائی

انہیں پڑھ کر علوینہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہوگئی۔ پھر اس نے ایک لمبی سانس بھری اور دونوں چیزیں میز پر رکھ دیں۔

زندگی نے عجیب کروٹ بدلی تھی کہ اس کی نظر میں سب اہم چیزیں ثانوی ہوگئی تھیں۔ اور ثانوی چیزیں اہمیت اختیار کرتی جارہی تھیں۔ کبھی زیست کی رنگینی پر جان دینے والی علوینہ اب سادگی کی طرف مائل ہورہی تھی۔ مصنوعی چمک دمک اور کاغذی پھولوں جیسے بے رنگ و بُو انسانی وجود اسے کوفت میں مبتلا کرنے لگے تھے۔ دھند چھٹی تو اس کا دل بھی شاویز کی طرف ہمکنے لگا تھا۔

☆☆☆

علوینہ، ناہید بیگم کو منہ ہاتھ دھلوا کر فارغ ہوئی تھی کہ دروازہ ہلکے سے بجا کوئی اندر داخل ہوا۔

''السلام علیکم۔'' ایک گمبھیر آواز سنائی دی تو وہ بری طرح چونکی۔ شاویز سامنے کھڑا تھا۔

''وعلیکم السلام۔'' وہ دھیمی آواز سے بولی۔

''بی بی جی۔ صاحب جی ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بجائے یہیں چلے آئے۔'' شاویز کے پیچھے موبل .... (ملازمہ) نے دہائی دی۔ وہ ان کے درمیان رشتے سے آگاہ تھی اور چپقلش سے بھی۔ سو ڈانٹ کا خوف بھی تھا۔

''کوئی بات نہیں..... تم جاؤ۔'' علوینہ نے کہا تو وہ شکر ادا کرتی واپس مڑی۔

شاویز، ناہید بیگم کو تعجب سے دیکھتا ان کے بیڈ کے قریب چلا آیا۔

''یہ آنٹی کو کیا ہوا علوینہ؟ کیسی حالت ہوگئی ہے۔'' وہ تاسف سے انہیں دیکھتے پوچھنے لگا۔

''یہ پیرالائز ہوگئی ہیں۔ اور بھی بہت کچھ برا ہوا ہے لیکن تمہیں کیا؟ تم اپنی زندگی میں مگن رہو۔'' علوینہ بے ساختہ شکوہ کرنے لگی تو شاویز خاموش سا ہو گیا۔

''آنٹی۔'' شاویز نے ممانی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔

''تم مجھے بتاتیں تو سہی علوینہ۔'' وہ افسوس سے بولا تو وہ تلخی سے مسکرائی۔

ناہید بیگم کی آنکھوں سے پانی رواں ہونے لگا۔

''ممی پلیز آپ مت روئیں۔'' علوینہ نے فوراً ان کے اشک اپنے ہاتھوں میں سمیٹے۔

''اوہو......اوو......او۔''

وہ کچھ کہنے کی کوشش میں تھیں نظروں میں بے بسی اور ایک التجائیہ تاثر تھا۔

''آنٹی آپ پریشان مت ہوں میں ہوں ناں آپ کا بیٹا۔'' وہ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتا محبت سے بولا تو ان کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اپنے رویے پر شرمندہ تھیں۔

''ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ ان کا ہاتھ تھپکتے تسلی دیتے ہوئے بولا تو ناہید بیگم کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا۔

انہوں نے جیسے مطمئن ہو کر اپنی آنکھیں موندی تھیں۔

''ممی۔'' علوینہ خوفزدہ سی ہو کر ان پر جھکی۔

''ممانی ٹھیک ہیں علوینہ۔'' شاویز نے ان کا ہاتھ نرمی سے بیڈ پر رکھ کر اس سے کہا۔

علوینہ نے ان کی چلتی سانس محسوس کی پھر کچھ مطمئن ہوئی۔

''انہیں آرام کرنے دو۔ آؤ باہر چل کر بیٹھتے ہیں۔'' وہ ہاتھ بڑھا کر بولا تو علوینہ خفگی سے اس کے ہاتھ کو نظر انداز کرتی دروازے سے باہر نکل گئی اور اسی خفگی کے ساتھ لاؤنج کے صوفے پر آ بیٹھی۔ شاویز اسے بغور دیکھتا اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔

''ناراض ہو؟'' اس نے پوچھا تو علوینہ نے ترچھی نظر اس پر ڈالی۔

''شاہ بھٹائی کے اشعار بہت خوب صورت ہیں دل کو چھو لینے والے لیکن انہیں معصومہ کو ڈیڈی کیٹ کرتے تو بہتر ہوتا۔'' وہ تلخ لہجے میں بولی تو شاویز مسکرانے لگا۔

''معصومہ کو کیوں؟ اپنی وائف کو کیوں نہیں؟''

وہ نرم لہجے میں بولا۔

''وہ بھی تو تمہاری وائف ہے سیکنڈ ہی سہی۔'' علوینہ نے غصے سے اسے دیکھ کر کہا۔

''کیوں مجھے جہانداد کے ہاتھوں مروا رہی ہو۔ وہ اپنی بیوی کے لیے بہت ٹچی ہے۔'' شاویز نے کہا تو علوینہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''سچ کہہ رہا ہوں۔ اب اپنا ٹیمپر نارمل کر لو۔'' وہ محویت سے اس سے دیکھنے لگا جو بے حد عام سے حلیے میں بھی اس کے دل میں اتر رہی تھی۔

''ترے سوا بھی کئی رنگ خوش نظر تھے مگر
جو تجھ کو دیکھ چکا ہو وہ اور کیا دیکھے''

شاویز نے جذب سے کہتے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''ایسا ہی اتاؤلا ہوتا نہ تو تمہارے جاتے ہی دوسری کر لیتا۔''

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا تو علوینہ کو اس کے لہجے کی سچائی مسحور کر گئی۔

''اتنا عرصہ بے خبر رہے مجھ سے اور بات کرتے ہو محبت کی۔''

علوینہ کے لبوں پر شکوہ در آیا۔

''میں اس عرصے کے دوران ایک لمحہ بھی تمہیں بھول نہیں سکا علوینہ۔ تمہارے صاف انکار پر میں اور اماں بہت بددل ہو کر گاؤں واپس گئے تھے۔ کافی دن اماں مجھ سے تمہیں لے آنے پر اصرار کرتی رہیں لیکن میں تو تمہارا سخت انکاری رویہ دیکھ چکا تھا سو ان کو سمجھاتا رہا کہ اب ان کی نوں نے نہیں آنا۔ میری سادہ لوح ماں خاموش ہو گئی مگر خاندان کے لوگ چپ نہیں رہے۔ تائی اور چاچی اٹھتے بیٹھتے اماں کو طعنے دیتیں، ماموں کے فیصلے کو غلط کہتیں تو کبھی تمہارے ماڈرن پن

کونشانہ بناتیں۔ ناہید آنٹی کے ماضی کو دُہراتیں ان کی خود غرضی کو موردِ الزام ٹھہراتیں۔ غرض اماں ان کی باتیں سن، سن کر بستر سے جالگیں۔ اکلوتے بیٹے کا گھر نہ بسنے اور طنزیہ روتوں نے ان کے دل کو کمزور کردیا تھا۔'' وہ بتاتے، بتاتے ذرا دیر کو خاموش ہوا۔

''پھر ایک دن وہ ہارٹ اٹیک سے یہ دنیا چھوڑ گئیں۔'' وہ ضبط سے سرخ ہوتی آنکھوں کو رگڑ کر بولا تو علوینہ کو جھٹکا سا لگا۔

''پھپھو اس دنیا سے چلی گئیں؟''

وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ شاویز نے اپنی آنکھیں بند کر کے اثبات میں سر ہلایا۔

علوینہ جیسے پچھتاوے کے سمندر میں غرق ہوگئی۔

''میری وجہ سے پھپھو!'' وہ دکھ سے بڑبڑائی۔

''میں اس کے بعد سب سے خفا ہوگیا۔ چاچی، پھپھو خاندان والے اور تم..... ہاں میں تم سے بھی بے حد خفا تھا۔ تم اگر میرے ساتھ بس جاتیں تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ میرا دل جیسے ہر چیز سے اچاٹ ہوگیا تھا۔ میرا پیشتر وقت فارم ہاؤس پر گزرتا تھا پھر میں نے وہاں اپنا بنگلا الگ بنوالیا۔'' وہ گہری سانس بھر کر خاموش ہوا۔

''میں نے ''جاوداں حیات'' کے نام سے ایک ادارہ اپنی اور اپنے کچھ مخیر دوستوں کی امداد سے بنایا ہے۔ جس میں ہم دیہی علاقوں کے غریب لوگ جن میں میرے مزارعے بھی شامل ہیں انہیں مفت صحت کی سہولتیں فراہم کررہے ہیں۔ اس کے علاوہ معیاری تعلیم سے آراستہ اسکولز بھی کھولے ہیں۔ اس مقصد کے لیے میں نے اپنی کئی ایکڑ اراضی ڈونیٹ کی ہے۔ ہمارا گاؤں اور آس پاس کے متعدد گاؤں اب صحت اور تعلیم کے لحاظ سے پہلے جیسے پسماندہ بالکل نہیں رہے۔ میں نے اپنی توانائی اور وقت وہاں لگانا شروع کردیا تاکہ تنہائی کے آسیب سے بچ سکوں۔ میں مطمئن ہوگیا تھا علوینہ۔ اپنی ماں کو کھویا مگر دھرتی ماں کی قربت میسر رہی۔'' وہ بتاتا رہا اور علوینہ حیرت سے سنتی رہی۔ شاویز کی آنکھوں میں دورانِ گفتگو سابقہ چمک لوٹ آئی تھی۔ اب علوینہ بھی کہ اس دن فارم ہاؤس میں اس کی باتوں کا مقصد کیا تھا۔

''پھر جہانداد اور معصومہ کا رشتہ طے ہوا تو ان کی شادی میں میرے اور ان کے تعلقات میں کچھ بہتری آئی۔ اور اس رات ان کے بیٹے کی سالگرہ پر میں ہوٹل آیا تھا۔ جہانداد پارکنگ میں تھا۔ ہم نے ساتھ نکلنا تھا سو معصومہ نے مجھے چلنے کو کہا اور تم سمجھیں کہ وہ میری.....'' بات کے اختتام پر وہ ہلکا سا مسکرادیا۔

''میں نے سوچا نہیں تھا کہ تم یوں کبھی دوبارہ مجھ سے ٹکرا جاؤ گی اور میں ایک بار پھر جذبوں کے ہاتھوں مجبور ہوکر تم سے ہار جاؤں گا۔'' وہ اس کا ہاتھ دبا کر بیچارگی سے بولا۔

''اور اگر میں نہ ٹکراتی پھر؟'' علوینہ نے اس پر تیکھی نظر ڈالی۔

''پھر؟ شاید میں صبر سے یونہی عمر گزار دیتا۔'' اس کی آنکھوں میں رنجیدگی آن بسی تھی۔

''لیکن ایک دن ایسا ہونا تھا علوینہ۔ میرے لیے تمہارے دل میں کچھ گنجائش ضرور تھی تبھی تم نے مجھ سے علیحدگی کا مطالبہ نہیں کیا۔'' اس کے لہجے میں چھپے یقین نے علوینہ کو بھی سوچنے پر مجبور کردیا۔

''ہاں شاید۔''

''مجھے پتا ہے تم مجھ سے ویسی محبت نہیں کرتیں جیسی میں کرتا ہوں لیکن ایک دن تم مجھ سے بڑھ کر مجھ سے محبت کرو گی۔'' وہ بازو پھیلا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتا یقین سے کہنے لگا۔

''اب تو میرے ساتھ چلو گی ناں وینا۔ میں آنٹی کو اپنی ماں کی طرح اپنے گھر رکھوں گا۔ ہم دونوں مل کر ان کو بالکل اچھا کردیں گے، اپنی خدمت سے، اپنے پیار سے۔'' وہ آنکھوں میں امید لیے اسے دیکھنے لگا۔

علوینہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا تو شاویز کو جیسے بے پایاں مسرت مل گئی تھی اور اس کے وجود سے چھلکتی سچی خوشی کو دیکھ کر علوینہ کو یک گونہ اطمینان حاصل ہوا تھا اس نے شاویز کے کندھے پر سر ٹکا کر آنکھیں موندلی تھیں۔

زور، زور سے گھنٹی بجائی پھر دروازہ پیٹا تو کہیں جا کر دروازہ کھولنے چھوٹی بہن ہانیہ آئی تو بس نیلو کے ہاتھوں اس کی شامت آ گئی۔ دھوپ اور گرمی سے ویسے ہی منہ لال ہو رہا تھا۔ غصے سے اور تمتما اٹھا۔

''یا اللہ کیا کانوں میں سب تیل ڈال کر بیٹھے ہیں۔ کتنی دیر سے باہر کھڑی ہوں، گرمی سے میری جان نکل رہی ہے یہاں سب اے سی میں آرام کر رہے ہیں۔'' اندر آتے ہی دوپٹا ایک طرف پھینکا اور فریج سے ٹھنڈی بوتل نکال کر منہ سے لگائی۔

غٹا غٹ پانی کے کچھ گھونٹ بھرے تو دماغ ذرا ٹھنڈا ہوا۔ دوسرے کمرے سے امی کی آواز آئی۔

''ہانیہ کیا نیلو واپس آ گئی؟ ان کا جنازہ ہو گیا؟''

''جی ہو گیا جبھی تو آئی ہوں.....'' جلے کٹے لہجے میں نیلو نے بولنا شروع کیا۔

خوابِ غفلت سے جاگی ہوں ابھی

ہما علی

''آپ کا بی پی ہائی تھا اس لیے آپ نہیں جاسکیں اور یہ محترمہ.....'' بہن کی طرف اشارہ کرکے نیلو نے طنزیہ کہا۔ ''آپ کی خدمت کی وجہ سے رک گئیں۔ ایک رہ گئی میں قربانی کا بکرا۔ ہر جگہ مجھے بھیج دو بس.....''

''ارے بیٹا میں تو خود چلی جاتی پر کیا کروں، ان چکروں نے برا حال کر رکھا ہے۔''

''اُف میں تو کہتی ہوں پتا نہیں لوگ اتنی گرمی میں کیوں مرجاتے ہیں؟ بھئی ذرا موسم تو اچھا ہو لینے دو پھر مرجانا، تعزیت پر آنے والوں کا ہی کچھ سوچ لو مگر نہیں..... ہمیں تو بڑی جلدی ہے اوپر جانے کی..... ایک تو ان کا اتنی نیچی چھتوں والا گھر..... اوپر سے لوگوں کا ہجوم تو یہ میرا تو دم گھٹا جارہا تھا۔'' نیلو بغیر کسی فل اسٹاپ کے بولے جارہی تھی کہ امی نے ٹوکا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو کوئی اپنی مرضی سے بھی بھلا مرتا ہے کیا؟ اتنی اچھی عبادت گزار خاتون تھیں وہ اللہ کروٹ، کروٹ جنت نصیب کرے، آمین۔ مجھے تو بڑا افسوس ہے اپنے وہاں نہ جانے کا..... سب میرا پوچھ رہے ہوں گے۔''

''جی پوچھ رہی تھیں، میں نے ان کی بہو کو آپ کی بیماری کا بتادیا تھا۔ امی وہ چار گھر چھوڑ کر جو رہتی ہیں کیا نام ہے ان آنٹی کا؟''

''مسز خان ہوں گی۔'' اس بار ہانیہ نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''ارے نہیں بھئی، وہ جو اپنی آنکھوں میں اتنا... کا جل ڈالتی ہیں کہ ابل، ابل کر باہر آرہا ہوتا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ اتنی چھوٹی آنکھوں میں نہیں رہنا۔''

''اچھا، اچھا زینب آنٹی۔''

''ہاں، ہاں وہی..... پتا ہے امی وہ اپنے ساتھ ناں اپنی ایک مہمان خاتون کو بھی لائی تھیں۔''

''ہاں تو اس میں حرج کیا ہے، وہ بیچاری بھی تعزیت کے لیے آئی ہوں گی۔'' امی نے ذرا برا سا منہ بنا کر کہا تو نیلو مسکرائی۔

''ابھی بتاتی ہوں ان کی حقیقت آپ کو..... اور وہ جو کونے پر کوٹھی ہے ناں..... ہاشم انکل کی؟'' ہانیہ نے پھر ٹہوکا دیا۔

''ہاں ان کی بیگم اللہ معاف کرے اپنی عمر دیکھتی ہیں نہ موقع..... آپ نے مجھے tights پہن کر نہیں جانے دیا ناں اور وہ capries پہنے بیٹھی تھیں۔ ویسے بڑی بری لگ رہی تھیں آدھی، آدھی پنڈلیاں ان کی سب کی توجہ کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ کچھ خواتین تو چپکے، چپکے ان کی طرف اشارے کرکے منہ بنا رہی تھیں۔''

''ارے نیلو تم جنازے پر گئی تھیں یا سب پر اعتراض کرنے.....'' امی نے پھر نیلو کو ٹوکا۔

''اوہو، ابھی تو میں نے آپ کو کچھ بتایا ہی نہیں کہ وہاں خواتین آپس میں کیا باتیں کر رہی تھیں۔ پتا ہے امی جیسے ہی جنازہ اٹھا ناں تو کچھ دیر تو بہو، بیٹیوں کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں..... سوجی، سوجی آنکھیں لیے ماں کے کمرے میں چلی گئیں کچھ خواتین بھی اٹھ کر ان کے پاس جا بیٹھیں باقی گرمی کا بہانہ کرکے باہر لگے کولر میں بیٹھی رہیں اور شروع ہوگئیں دنیا کی ساری باتیں، ہنسی مذاق بھی چل رہا تھا۔ ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ زینب آنٹی اور مسز ہاشم کیا باتیں کر رہی تھیں۔ مسز ہاشم نے زینب آنٹی سے پوچھا کہ وہ آپ کے ساتھ کون خاتون آئی ہیں، میں نے پہچانا نہیں تو زینب آنٹی بولیں وہ مسز حامد ہیں میرے شوہر کی خالہ زاد۔ کل رات ہی کوئٹہ سے آئی ہیں۔ اب دیکھیں ناں دن کا جنازہ تھا میں کھانا کیسے پکاتی اور بالفرض پکانے بیٹھ جاتی تو جنازے میں شریک نہیں ہوسکتی تھی۔ اتنے برسوں کا ساتھ پھر پڑوس کا معاملہ'' پھر ان کا ہاتھ دبا کر شرارت سے دھیمی سی ہنسی میں بولیں'' میں نے سوچا یہاں ہی کھانے سے نبٹا دوں گی۔''

''استغفراللہ!'' بے ساختہ امی کے منہ سے نکلا۔ ''موت والے گھر میں کوئی ایسا کیسے سوچ سکتا ہے؟'' امی نے ابھی تک ایسا منہ بنایا ہوا تھا جیسے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی ہو۔

''ارے ابھی سنتی تو جائیں، یہ تو کچھ بھی نہیں.....''

میں لیا ہے؟''

''اللہ معافی!'' امی کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اور ہاتھ بھی اور ہاتھ بھی کانوں کو لگا لیے۔

''امی مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ لوگ موت کا کھانا کیسے خوشی، خوشی کھا لیتے ہیں۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کسی ''پوش'' علاقے کے کھاتے پیتے گھرانے کی خواتین ہیں، ایسا لگ رہا تھا جیسے پہلی دفعہ کھا رہی ہیں یا شاید آخری دفعہ...... کوئی گھر والوں کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا، پوچھ رہا تھا کہ آپ لوگ نہ جانے کب سے بھوکے ہوں گے اور کچھ نہیں تو پانی ہی پی لیں بلکہ الٹا گھر والے ہی خاطریں کر رہے تھے۔''

''بس بیٹا یہی دنیا ہے لوگ بھول جاتے ہیں کہ یہ وقت ہم پر بھی آنا ہے۔ اصل میں ہم لوگ بے حس ہو گئے ہیں، احساس مر گیا ہے ہمارا...... اب بھلا بتاؤ یہ کوئی غریب غربا میں شمار ہوتے ہیں۔ ایسے علاقے میں رہتے ہیں کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ لوگ انسانیت کے درجے سے اس قدر نیچے بھی آ سکتے ہیں۔'' امی پُر تاسف لہجے میں بولیں۔

''اچھا امی میں کمرے میں لیٹنے جا رہی ہوں۔''

''نیلو کھانا نہیں کھاؤ گی؟'' ہانیہ نے پوچھا۔

''نہیں، میری تو بھوک ہی مر گئی ہے۔''

''اللہ میں تو تمہارے انتظار میں بیٹھی تھی کہ آؤ گی تو ساتھ کھائیں گے۔''

''اچھا! کیا پکایا ہے کمرے میں ہی لے آؤ......''

فوتگی والے گھر سے آنے کے بعد سے رات تک بھی نیلو کی آنکھوں سے آج کے مناظر مٹ نہیں رہے تھے۔ رہ، رہ کر مرحومہ کا جنازہ ان کا چہرہ...... باری، باری لوگوں کا آنا، دیدار کرنا افسوس کے دو چار جملے بولنا۔ سب کچھ ایک فلم کی طرح نظروں میں پھر رہا تھا۔ پھر یک دم اس کی سوچیں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔

''ایک دن میں بھی اسی طرح بے حس و حرکت سفید لباس میں لیٹی لوگوں کے سامنے پڑی ہوں گی...... لوگ آتے جائیں گے کہ آخری دیدار کر کے

نیو کے آنکھوں نے دیدے منکا کر کہا۔

''تو جناب یہ سن کر مسز ہاشم نے بھی اپنے نیچ پن کا مظاہرہ کیا اور بولیں، سچ پوچھو تو بہن میں بھی کچھ نہ پکا سکی، دو بچے تو اسکول گئے ہوئے ہیں۔ اب آتے ہی ہوں گے، یہ دو چھوٹے آج اسکول نہیں گئے ان کو ساتھ لے آئی تھی۔ اتنی دیر سے انہیں کہہ رہی ہوں کہ کھانا کھلنے والا ہے جا کر بھائی اور آپی کو بھی بلا لاؤ مگر ملتے ہی نہیں...... اب اکیلے بریانی کھاؤں گی تو گلے میں اٹکے گی ہی۔''

''ہاں خوشبو تو بریانی ہی کی آ رہی ہے شکر ہے بریانی بنوائی۔ گرمی میں تو روٹی سالن کھایا ہی نہیں جاتا۔'' زینب آنٹی نے چپکے سے ان کا ہاتھ دبایا اور منہ نیچے کر کے ہنسیں۔ ان کو شاید کوئی احساس ہی نہیں تھا آس پاس کا...... میں بالکل ان کے نزدیک ہی بیٹھی تھی۔ ان کے تاثرات اور باتیں سب سن اور دیکھ رہی تھی۔ امی مجھے وہ دونوں ایسی لگ رہی تھیں جیسے گدھ ہوں جو مردہ گوشت کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ معلوم ہے جب تھوڑی دیر بعد مرد واپس آنا شروع ہو گئے تو مردوں کو دیکھتے ہی مسز ہاشم نے بیٹے کو پاس بلا کر پھر ایک دفعہ کہا جاؤ گھر جاؤ اور جو کہا ہے وہ کرو...... وہ تھوڑا سا منمنایا اور سر انکار میں ہلاتا ایک طرف دوڑ گیا۔ مسز ہاشم کا منہ دیکھنے والا تھا بس نہیں چل رہا تھا کہ پکڑ کر اسے ماریں مگر مجبوراً صرف گھور کر رہ گئیں۔ کچھ خواتین واپس جانے کی اجازت لینے بہو اور بیٹیوں کے پاس گئیں مگر وہ سب کو روکنے لگیں کو آپ کھانا کھا کر جائیے گا۔ باہر ٹینٹ سے چمچوں، پلیٹوں کی آوازیں اندر گھر میں بھی آ رہی تھیں۔ اتنے میں کھانا لگنے کی جو آواز آئی تو بس یہ سنتے ہی امی میں کیا بتاؤں کہ کیسے وہاں چہروں پر رونق دوڑ گئی۔ آنٹیاں بریانی میں لگتا تھا کہ ہاکی کھیل رہی ہیں۔ کتنی بوٹیاں اپنی طرف لے جا سکتی ہیں۔ شرم نام کی تو کوئی چیز مجھے وہاں نظر نہیں آئی اور ایک بوڑھی اماں جانے کہاں سے آئی تھیں انہوں نے تو حد ہی کر دی۔ پوچھنے لگیں۔ ''بیٹھے

کھانا کھائیں گے اور اپنے، اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔ مجھے ایک اندھیری قبر میں اتار دیا جائے گا اور میرا احساب کتاب شروع ہو جائے گا۔ اُف......'' ایک جھرجھری سی نیلو کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ دل زور، زور سے دھڑک رہا تھا۔ خشک ہوتے حلق کو پانی سے تر کیا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔

''پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے؟ جب ہو گا حساب تو ہو گا ابھی تو میں زندہ ہوں...... ابھی سے میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہی ہوں۔''

جب حشر کا دن آئے گا
اس وقت دیکھا جائے گا

''نیلو بابا آ گئے ہیں تم انہیں کھانا دے دو پھر چائے بھی بنا لینا، میں نہانے جا رہی ہوں۔'' ہانیہ کی آواز نے نیلو کے تانے بانے کا تسلسل توڑا۔ لشتم پشتم پیروں میں سلیپر ڈالے اور اس نے باورچی خانے کا رخ کیا۔

رات کھانے کے بعد وہ جلدی کمرے میں آ گئی لائٹس آف کر کے بستر پر لیٹی کہ آج جلدی سو جاؤں گی۔ آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ میت والے گھر کی فلم دوبارہ آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔ وہ ہی مناظر وہ ہی سوچیں...... حساب کتاب...... نیلو کا دل زور، زور سے دھڑکنے لگا۔ اللہ کے خوف سے سارے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''میں کیا حساب دوں گی۔ میرے پلے تو کچھ بھی نہیں...... سنا ہے سب سے پہلے نماز کا پوچھا جائے گا۔ میری تو نمازیں بس رمضان میں شروع ہو کر رمضان کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتی ہیں۔''

کمرے کا دروازہ کھلا تو نیلو کے خیالات منتشر ہو گئے۔ ہانیہ، عشا کی نماز سے فارغ ہو کر سونے کے لیے آ گئی تھی۔

''ارے نیلو تم ابھی تک جاگ رہی ہو، میں تو سمجھی تھی کہ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی ہو گی۔'' ہانیہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

''بس ایسے ہی نیند نہیں آ رہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اچھا نعمان بھائی کی یاد آ گئی ہو گی۔'' ہانی نے ہونے والے بہنوئی کے نام سے بہن کو چھیڑا۔

''ارے نہیں بھئی......'' نیلو نے بیزاری سے چڑ کر کہا۔ اور منہ دوسری طرف کر کے لیٹ گئی جیسے کہ سو رہی ہو۔

ہانیہ منہ پر تکیہ رکھ کر اپنے اسٹائل میں کب کی سو چکی تھی مگر نیلو کی آنکھوں سے نیند ایسے روٹھی تھی کہ نہ آنے کی ٹھان چکی تھی۔ کبھی آنکھیں کھولتی کبھی بند کرتی۔ یکبارگی مسز ہاشم کی کیپری والی پنڈلیاں پھر ذہن کی اسکرین پر جلوہ افروز ہو گئیں۔ دل میں شرمندگی کی ایک لہر اٹھی۔

''اُف...... میں بھی تو ایسے کپڑے بہت شوق سے پہنتی ہوں، کیا مجھے لوگ غلیظ نظروں سے نہ دیکھتے ہوں گے؟ لیکن قصور دیکھنے والوں کا تو نہیں...... نمائش تو میں کر رہی ہوتی ہوں...... دعوتِ گناہ دینے والی تو میں خود ہوں......'' اس جان لیوا احساس کے تحت وہ اٹھی اور اپنی وارڈ روب کھول کر اپنے بے شمار قیمتی اور برانڈڈ ملبوسات کا جائزہ لینے لگی۔

چھوٹی، لمبی شرٹس، آدھی آستین، بغیر آستین کی قمیص، جینز، ٹی شرٹس اور ہر اسٹائل کی کرتیاں وہ ایک، ایک کپڑے کو دیکھتی رہی اور ندامت سے سر جھکائے سوچتی رہی۔

''ایسے میں میرا بلاوا، آ جائے تو کیسے اپنے رب کا سامنا کروں گی۔ میں تو اپنے مالک و خالقِ کل جہاں کو اب تک ناراض کرتی رہی رہوں۔ یہ دنیا ہے گلیمر سے بھرپور اس کی دلکشی اپنی طرف کھینچتی ہے، اس کی چکا چوند، روشنی آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے اس کی رنگینی کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا مگر یہ سب آج ہے ابھی کے ابھی آنکھ بند ہو جائے تو سب ختم جیسے کوئی جلتی ہوئی لائٹ کا اچانک سوئچ بند کر دے تو ہر سو اندھیرا۔

pklibrary.com

اِک یہ جہاں، اِک وہ جہاں
ان دو جہاں کے درمیاں
بس فاصلہ ہے اِک سانس کا
جو چل رہی تو یہ جہاں
جو رک گئی تو وہ جہاں"

جانے یہ اشعار کہاں سے ذہن میں در آئے تھے مگر نیلو کے خیالات و جذبات کی من و عن ترجمانی کر رہے تھے۔ یہی کچھ سوچتے، سوچتے وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی گو کہ کمرے میں روشنی مدھم تھی۔ مگر اپنے خدوخال بالکل واضح نظر آ رہے تھے تھوڑا قریب ہو کر آئینہ میں اپنا سراپا دیکھا۔

"اللہ نے مجھے کتنا خوب صورت بنایا ہے رنگ روپ، قدوقامت، دلنشیں نقوش ادھ کھلی کلیوں سی آنکھیں، دراز ریشمی زلفیں، یہ سب تو میرے ہونے والے شوہر کے لیے ہیں اور میں ان سب کی نمائش کر کے، خود کو ایک چلتا پھرتا اشتہار بنا کر نامحرموں سے داد وصول کرتی ہوں..... اللہ نے تو ہر مقدس و قابل احترام چیز کو غلاف دیا۔ پردہ دیا۔ یقیناً اس میں رب کی حکمت ہوگی۔ اللہ بخشے نانی کو اماں وہ کتنا کہتی تھیں کہ اپنی زینت کی چیزوں کو چھپا کر رکھو اور مجھے ان کی باتیں کتنی بری لگتی تھیں۔ میں انہیں ہمیشہ ٹوک دیتی کہ نانو ہر وقت نصیحت نہ کیا کریں کبھی خوش بھی ہونے دیا کریں۔"

آج تو لگتا تھا جیسے غفلت اور لاعلمی کے تمام پردے آنکھوں سے سرک گئے تھے اور روز روشن کی طرح ہر چیز عیاں تھی۔ آج خیال آیا کہ وہ بالکل ٹھیک کہتی تھیں کبھی تو خانہ کعبہ غلاف میں، قرآن پاک غلاف میں اور مسلمان عورت کو بھی اسی لیے پردے کا حکم دیا کہ وہ بھی قابلِ عزت و مقدس ہے۔ کہیں فیس بک پر پڑھا ہوا کسی کا قول یاد آ گیا کہ ہم تمام عمر اپنے جسم کو خوب صورت بنانے میں لگے رہتے ہیں مگر روح کو نہیں حالانکہ جسم تو یہاں ہی رہ جائے گا، مٹی کھا جائے گی۔ اللہ کے پاس تو روح جاتی ہے۔

"میں اب تک کہاں تھی؟ کیسی زندگی گزاری ہے میں نے؟ کیسے سامنا کروں گی اللہ کا؟ یارب کریم مجھے معاف کر دے تو بخشنے والا مہربان ہے۔" اللہ کے خوف سے نیلو کے رونگٹے کھڑے تھے۔ یک دم ذہن کے دریچوں میں کالج کی وہ دوست جسے سب سہیلیاں پیار سے پینڈو یا کبھی ملانی کہا کرتی تھیں خراماں، خراماں چلی آئی۔ وہ سب کو سمجھاتی ضرور تھی مگر ساری فرینڈز اس کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا کرتیں۔ اسی نے کہا تھا کہ ایک عورت چار مردوں کو اپنے ساتھ دوزخ میں لے جائے گی۔ آج سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ چار مرد بھائی، باپ، شوہر اور بیٹا ہوں گے انہوں نے اسے بے حیائی سے کیوں نہ روکا۔

نیلو کا دل یہ سوچ کر دھڑ، دھڑ کرنے لگا۔

"کیا میں بھی انہی عورتوں میں شامل ہوں گی؟ نہیں، نہیں اللہ نہ کرے۔ اللہ نہ کرے..... میں اپنے اللہ

ادبی لطائف

مولانا شوکت علی جن خوبیوں کی وجہ سے ملک بھر کے نوجوانوں کے محبوب تھے اس میں ان کی بے پناہ ظرافت کو بہت دخل تھا۔ ان کی ہر بات اور ہر حرکت میں ہنسنے مسکرانے کا سامان موجود ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ آپ کے بڑے بھائی ذوالفقار علی کا تخلص گوہر ہے اور محمد علی کا جوہر ہے۔ آپ کا تخلص کیا ہے؟

مولانا شوکت علی نے بلا تکلف جواب دیا۔ شوہر!

☆☆☆

الہ آباد کے ایک مشاعرے میں ایک بزرگ شاعر نے تیغ الہ آبادی (مصطفیٰ زیدی مرحوم) سے پوچھا۔ کیوں میاں تیغ! کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟

تیغ کے جواب دینے سے پہلے شمیم کرمانی نے کہا۔ اجی جناب! کون باپ ایسا ہوگا جو اپنی بیٹی کو خود اپنے ہی ہاتھوں تہ تیغ کر دے۔

از: نسرین یاسین، حیدرآباد

اور پیارے نبیؐ کے بتائے ہوئے راستے کو اپناؤں گی۔ میں ان سارے بیہودہ کپڑوں کو آگ لگادوں گی۔'' اس نے ایک جنون میں ایک، ایک کر کے کپڑے الماری سے باہر پھینکنے شروع کر دیے آہستہ، آہستہ ساری الماری خالی ہونے لگی تو وہیں کونے میں پڑا ایک شاپر نظر آیا اس نے اسے بھی نکالا۔ ''اس میں کیا ہے؟ اوہ یہ کیا..... یہ تو یاد ہی نہیں کہ کب اور کہاں سے آیا تھا؟'' اندر ہاتھ ڈالا تو ایک خوب صورت سا عبایا نکل آیا۔

نیلو نے آج بڑے پیار سے عبائے پر ہاتھ پھیرا تو ایک شرمیلی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر مچل گئی۔ یہ تو وہ تحفہ تھا جو نعمان نے بڑے پیار سے اسے لا کر دیا تھا اور بہت ناز سے کہا تھا۔

''نیلو ہم شادی کے بعد سب سے پہلے عمرہ ادا کرنے جائیں گے۔ تم جب یہ عبایا پہنو گی تو اور بھی خوب صورت لگو گی۔'' اور میں نے کتنی بے دردی سے انکار کر دیا تھا۔

''میں تو پہلے دبئی جاؤں گی اور ڈھیروں شاپنگ کروں گی۔ یہ عمرہ اور حج تو بڑھاپے کی عبادتیں ہیں جب بوڑھی ہو جاؤں گی ناں تب چلی جاؤں گی۔'' نعمان نے بغیر برا منائے پیار سے سمجھایا تھا۔

''نیلو یہ جوانی میں کرنے کی عبادتیں ہیں بہت انرجی چاہیے ان کے لیے۔'' اور اس نے اسی دن یہ عبایا گول کر کے ایک کونے میں ڈال دیا تھا۔

''بھئی نعمان مجھ سے ایسی کوئی امید نہیں رکھنا۔ نہ بابا نہ میں تو ہرگز نہیں پہنوں گی بالکل penguin لگوں گی۔'' اس وقت اور اس وقت میں کتنا فرق ہے۔ آج ندامت سے اس کی نظریں جھکی جا رہی تھیں۔

''کیا سوچا ہوگا میرے اللہ نے..... مجھے تو رب العزت نے مقدس جان کر یہ تحفہ نعمان کے ہاتھ بھجوایا اور اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور ایک میں حقیر ناچیز میری اوقات ہی کیا اپنے رب کو ناراض کر بیٹھی۔ ہاں وہ ناراض ہی تو ہے رزق تو بند نہیں کیا مگر سجدے کی توفیق تو مجھ سے چھین لی۔'' عجب اضطرابی کیفیت میں وہ اٹھی۔

''میں اپنے رب کو ناراض نہیں رہنے دوں گی، میں منالوں گی وہ بڑا مہربان ہے۔ تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحیم و کریم ہے۔ اس کو منانا مشکل نہیں ہے، وہ مجھ سے راضی ہو جائے گا وہ تو ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے اپنی مخلوق سے میں راضی کروں گی ہاں میں اپنے رب العزت کو منالوں گی۔ وہ کوئی کم ظرف انسانوں کے جیسا تھوڑی ہے جو بغیر غرض کے کسی سے ملنا تو کجا بات تک کرنا پسند نہیں کرتا۔ وہ رب العزت ہے خالقِ دو جہاں وہ تو کہتا ہے اپنے بندے سے کہ تو ایک قدم چل کر میرے پاس آئے گا تو میں دوڑ کر تیری طرف آؤں گا۔ (مطلب بندہ ارادہ تو کرے وہ بڑھ کر تھام لے گا) یہ سوچ اور اس پختہ یقین کے ساتھ نیلو نے جلدی سے دو رکعت نماز توبہ کی نیت سے وضو کیا اور اپنے رب کے حضور عاجزی اور ندامت کی تصویر بن کے کھڑی ہو گئی۔ صلوٰۃ توبہ پڑھ کر سلام پھیرا اور سر دوبارہ سجدے میں جھکا دیا سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے شروع کرے اپنے گناہ، نافرمانیاں رب رحمان کے سامنے بیان کرے مگر آج تو جیسے سب الفاظ گونگے ہو گئے تھے بس آنسو تھے یا جسم پر اللہ کے خوف کی کپکپی یا پھر دل کو ڈھارس بندھانی اک آس کہ ''معاف کرنا تو میرے قادرِ مطلق کی صفت ہے، وہ معاف کرنا پسند کرتا ہے۔ وہ مجھے بھی بخش دے گا ضرور بخشے گا.....'' بے ربط جملے ادھورے الفاظ..... ہانیہ گہری نیند میں تھی جب اس کی سماعتوں سے مسلسل گھنٹی، گھنٹی رندھی ہوئی سسکیوں میں ڈوبی آواز ٹکرا رہی تھی۔ آنکھیں کھولنا چاہ رہی تھی مگر پوری طرح آنکھیں کھل ہی نہیں رہی تھیں۔ مندی ہوئی آنکھوں سے اس نے دیکھا کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا کچھ نظر نہیں آیا۔ گھڑی پر نظر ڈالی..... الارم تو بجا ہی تھا۔ رات تو لگا یا تھا یہ کیسی آواز تھی۔ میری آنکھ کھلی کیسے..... ابھی وہ اسی سمجھی نا سمجھی کی کیفیت میں تھی کہ ایک سرگوشی دوبارہ ابھری جیسے کوئی بہت تکلیف سے کراہ رہا ہو۔ ہانیہ کے جسم میں خوف کی ایک لہر سرایت کر گئی۔ اس نے ڈرتے، ڈرتے سوچا

کمرے میں کون ہے؟ ایک ہاتھ نیلو کے بستر کی طرف بڑھایا کہ اسے جگائے، اٹھائے مگر بستر تو خالی تھا۔ اب ہانیہ ہمت کر کے اٹھی اور زور سے چیخی ''نیلو، نیلو.....''

رونے اور گڑگڑانے کی آوازیں اب بالکل واضح تھیں۔ ہانیہ نے گھوم کر آوازوں کی سمت دیکھا۔ نیلو سجدے میں پڑی اپنے رب کے حضور معافی کی طلب گار تھی۔ وہ دعا اور گریہ وزاری میں اتنی مشغول تھی کہ اسے ہانیہ کی چیخ نے بھی متوجہ نہ کیا۔ ہانیہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''یہ نیلو کو آج کیا ہوا؟''

وہ کبھی سجدے میں گرتی اور کبھی سجدے سے سر اٹھاتی، ہاتھ جوڑتی، اب ہانیہ کو نیلو کے الفاظ سمجھ تو آرہے تھے مگر یہ ماجرا کیا ہے۔ عقل سے بالاتر تھا۔ نیلو کی سرسراتی آواز کمرے کی خاموشی کو توڑتی ہوئی پھر ابھری۔

''اے میرے رب کریم تو بڑا مہربان ہے تیری رحمت کے سہارے تجھ سے مغفرت کی طلب گار ہوں، تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحمان ہے۔ مجھ پر بھی اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔ معاف کر دے مجھے ہر اس گناہ سے جو میں نے کیے، جان بوجھ کر سرزد ہوئے یا انجانے میں چھپ کر کیے یا کھلم کھلا کیے۔ میرے معبود میرے ان گناہوں کو بھی بخش دے جو صرف تو ہی جانتا ہے۔ یا اللہ مجھے ویسا ہی بنا دے جیسا مجھے تو دیکھنا چاہتا ہے۔ اے خالقِ کائنات میں تیری رضا تیری جنت مانگتی ہوں تیرے غصے اور جہنم سے پناہ مانگتی ہوں، معاف کر دے مولا، معاف کر دے۔ تو، تو غفار ہے، ستار ہے، چھپالے میرے گناہوں کو، مٹا دے تمام خطاؤں کو۔'' دونوں ہاتھ معافی کے انداز میں جڑے تھے۔ صرف بخشش اور بار، بار بارگاہ الٰہی میں معافی کے الفاظ ہی سمجھ آرہے تھے۔

وہ جس بری طرح رو رہی تھی، گڑگڑا رہی تھی ہانیہ..... ڈر گئی کہیں اسے کچھ ہو نہ جائے اس نے اٹھ کر اس کے پاس جا کر اس کا کاندھا ہلایا۔

''نیلو، نیلو یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے؟ ڈر گئی ہو کیا.....'' نیلو نے بھیگی پلکیں اٹھائیں اس سے ٹھیک طرح سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا، روتے، روتے ہچکی سی لگ گئی تھی۔ وہ بمشکل بولی۔

''ہاں اللہ کے خوف سے آج ہی تو خوابِ غفلت سے جاگی ہوں۔ ہانیہ میرا اللہ بہت مہربان ہے وہ مجھے ضرور معاف کر دے گا۔'' نیلو کے اندر یقین بول رہا تھا۔ ''میں نے سچے دل سے توبہ کر لی ہے، میں نے رب کریم سے معافی مانگ لی ہے دیکھو.....'' آواز پھر رندھ گئی۔ ''دیکھو اس نے مجھے آج سجدے کی توفیق بھی عطا کر دی۔ مجھے بھی اس قابل سمجھا کہ میں اس کے حضور کھڑی ہوگئی۔ ہائے بڑی غلطی ہوگئی بہت بڑی غلطی.....'' آواز پھر آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

''کیا حکم تھا میرے رب کا..... میرے پیارے نبی کا اور میں نے کیسی زندگی گزاری..... ہائے کیسی غفلت میں پڑی رہی۔ دنیا کی رنگینی میں کھوئی رہی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ شیطان تمہیں برے اعمال کو آراستہ کر کے دکھاتا ہے۔ پھر بھی شیطان کے بہکاوے میں آگئی۔ پتا نہیں کہاں، کہاں اللہ کی نافرمانی کی مرتکب ہوئی، کس، کس کو بیوقوف بنایا۔ لوگوں کا دل دکھایا..... مگر شکر ہے پھر بھی میرے اللہ نے مجھے ہر بڑے گناہ سے بچایا۔ یا اللہ مجھے اتنی مہلت عنایت فرما دے کہ میں اپنے کردہ، ناکردہ گناہان کبیرہ وصغیرہ کا کفارہ ادا کر سکوں..... یا اللہ مجھے ویسا ہی بنا دے جیسا تو مجھے دیکھنا چاہتا ہے۔ مجھے صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما، آمین.....'' ہانیہ کچھ حیران کچھ پریشان اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ جب وہ اسے کہتی تھی کہ نیلو میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں تم بھی آجاؤ تو بیزاری سے جواب ملتا کہ زیادہ ملائی بننے کی ضرورت نہیں..... پڑھ لوں گی ابھی تو بہت ٹائم ہے اور اب جو یہ نیلو اس کے سامنے تھی یہ کون سی نیلو تھی.....؟ یہ اتنا بڑا چینج، ایسا تغیر یک دم آیا کیسے؟ سمجھ سے بالاتر تھا۔

ہانیہ یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ فجر کی اذان شروع ہوگئی۔ نیلو بے قراری سے ہانیہ کی طرف پلٹی اور اس کا

ہاتھ پکڑ کر عجب سرشاری کے عالم میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''دیکھو بلاوا آنے لگا، آؤ نماز کی طرف آؤ بھلائی کی طرف۔'' اس کی آنکھیں خوشی سے ایسے چمک رہی تھیں جیسے اللہ کی طرف سے صرف اسی کو بلایا جارہا ہے۔ اس پر ایک وجد کی کیفیت طاری تھی۔ خود سے ہی بول رہی تھی۔ یا اللہ ہی سے مخاطب تھی۔

''میں حاضر ہوں میرے اللہ میں حاضر ہوں..... لبیک اللھم لبیک.....'' اذان ختم ہوتے ہی ہانیہ واش روم کی طرف بڑھی اور نیلو نے نماز کی نیت باندھی۔ جب تک ہانیہ وضو کر کے نماز سے فارغ ہوئی نیلو کی اشکِ ندامت میں ڈوبی دعائیں، معافیاں، تلافیاں جاری تھیں۔

ہانیہ اس کے پاس جا کر بیٹھی اس کے آنسو پونچھے اور ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ تھام کر بولی۔

''میری اچھی بہن تم خود کو گناہ گار مت سمجھو..... بس تم راہِ ہدایت سے بھٹک گئی تھیں۔ تم سے کوتاہیاں سرزد ہوئیں، نافرمانیوں کی بھی تم مرتکب ہوئیں مگر اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس رب کریم نے ہمیشہ تمہیں ہر گناہِ کبیرہ سے محفوظ رکھا۔ تمہارا دامن تو پاک ہے تم تو صرف دنیا کی رنگینی میں گم ہوگئی تھیں۔ اللہ سے تم دور ہوگئی تھیں مگر اللہ تم سے دور نہیں تھا، وہ تو ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ اسی نے تو تمہیں ہدایت عطا کی اور کیا پتا اللہ کو تمہاری کون سی نیکی پسند آگئی کہ اس نے تمہیں اپنے حضور کھڑے ہونے کی اجازت دے دی۔ اللہ تعالیٰ سچے دلوں کی توبہ ضرور قبول کرتا ہے۔'' وہ اسے کسی بزرگ کی طرح تسلی دے رہی تھیں۔

''اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر تم بتاؤ کیا اب بھی وہ بے چینی، خوف اور اضطراب محسوس کر رہی ہو جس نے ساری رات تم کو سونے نہ دیا یا ایک اطمینان و سکون رگ و پے میں سما گیا ہے۔ نیلو میں تو کہتی ہوں شکر ادا کرو اللہ کی شانِ کریمی کا کہ جس نے تمہیں نئی زندگی دی اور سیدھی راہ پر پلٹا دیا۔ اٹھو تم بہت تھک گئی ہو میں چائے کے ساتھ کچھ لاتی ہوں۔ ہلکا سا ناشتا کر کے سو جاؤ۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

''ہاں ہانیہ مجھے چائے کی بہت طلب ہو رہی ہے مگر میں ابھی سوؤں گی نہیں..... آج تو میرا دل چاہ رہا ہے کہ میرا اللہ مجھ سے باتیں کرے۔ تم جاتے ہوئے مجھے قرآن پاک دیتی جاؤ۔'' ہانیہ نے بہت پیار سے اسے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

عقیدت و احترام سے نیلو نے قرآن شریف کھولا..... تعوذ اور تسمیہ پڑھنے کے بعد جب سورۂ فاتحہ مع ترجمہ پڑھی تو جیسے آنکھیں، دل و دماغ سب روشن ہوگئے۔ خود سے کہا۔

''ارے یہ تو مکمل دعا ہے شیطان سے بچنے کی، اللہ کے رحیم و کریم ہونے کی گواہی پھر صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعا، جن لوگوں سے غصے ہوا ان سے بچنے کی دعا.....'' باقی ترجمہ نیلو نے زور، زور سے پڑھنا شروع کیا۔ ''تو ہی ہمارا حاکم ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔'' یہ جملہ نیلو کی زبان سے کیا نکلا کہ اس نے رٹ ہی لگا دی۔ ''ہاں تجھ ہی سے تو مدد مانگتے ہیں۔ تجھ ہی سے تو مدد مانگتے ہیں۔ میری بھی مدد فرما اے تمام جہانوں کے خالق و مالک مجھے اب بھٹکنے نہ دینا مجھ سے راضی ہو جا میرے مولا مجھ سے راضی ہو جا۔ آمین ثم آمین.....'' نیلو کو ایسا لگا جیسے اس کی سن لی گئی ہے۔ دل جیسے تھم سا گیا تھا۔ بے شک سکون تو اللہ ہی کی یاد میں ہے۔ وہ مطمئن دل کے ساتھ اٹھی قرآن شریف اور جانماز اوپر شیلف پر رکھی۔ ہاتھ میں تسبیح لے کر وہ بستر پر آگئی۔ نیند کب مہربان ہوئی پتا ہی نہیں چلا..... ہانیہ چائے لے کر آئی تو نیلو بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے مناسب نہ سمجھا کہ اس کو اٹھائے۔ بس کمرے کی لائٹ بند کر کے ناشتے کی ٹرے لے کر باہر نکل آئی۔

خوابِ غفلت سے جاگ کر اب وہ اطمینان بھری نیند میں تھی۔

❁❁❁

انکل

شیریں حیدر

''لٹ گیا میں..... برباد ہو گیا، اب میں کیسے جیوں گا۔'' وہ نہ صرف اونچا، اونچا بول رہا تھا اور دونوں ہاتھوں کے گھونسے بنا کر آپس میں انہیں ٹکرا رہا تھا بلکہ اس کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کے چشمے جاری تھے۔ وہ کبھی چیختا، کبھی سسکتا اور کبھی دھاڑیں مار، مار کر رونے لگتا، دیکھنے والوں کے دل پسیج رہے تھے۔ اپنی چاندنی شکل صورت والی بیوی سے اتنا پیار کرنے والا شوہر تو شاید ہی کوئی ہوگا۔ وہ جو سمجھتے تھے کہ بیوی کی موت کہنی کی چوٹ سے بڑھ کر نہیں ہوتی، ان کے خیالات بھی تبدیل ہو جاتے جو وہ یوں اسے بلک، بلک

pklibrary.com

کررو تا ہوا دیکھتے۔

''مجھے بھی اس کے ساتھ ہی جانا ہے..... نہیں جینا مجھے اس کے بغیر، اس کے ساتھ ہی دفن کر دو مجھے بھی، میں جی کر اب کیا کروں گا؟'' جنازہ اٹھانے والے آئے تو وہ چارپائی سے لپٹ گیا، دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑے ہوئے وہ میت کے سرہانے جھک، جھک کر کہہ رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ اس پر گر جاتا، کسی نے اسے مضبوطی سے پکڑا اور وہاں سے ہٹانے کو زور لگایا۔ ''مت ہٹاؤ مجھے یہاں سے پلیز..... اسے آخری بار جی بھر کر دیکھنے تو دو، یہ چلی جائے گی تو میں کیا کروں گا؟'' اسے ہٹانے کی کوشش کرنے والے کو بھی اس پر ترس آ گیا۔

''یوں تو نہ روئیں انکل..... آپ مرد ہو کر ایسی کمزوری کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو اس کا تو سوچیں جس نے ابھی بچپن کی سرحد کو ہی نہیں چھوڑا۔'' انکل کہنے والی کا نرم و نازک ہاتھ اس کے کندھے پر ٹکا تھا۔

''میں کیا کروں..... میں کس طرح جیوں گا اس کے بغیر..... کس طرح بہادر بنوں میں؟'' انکل نے دلاسا دینے والی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا، وہ اس وقت مڑ کر دیکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھے مگر جانتے تھے کہ ان کی مرحومہ بیوی کی کوئی بھانجی ہی ہو گی۔ خود تو وہ اکلوتے تھے۔ بیوی کی طرف لڑکیوں کی بہتات تھی، پہلے اتنی بہنیں تھیں، اب سب کے گھروں میں بیٹوں سے زیادہ بیٹیاں۔

''تم بھی تو اس کی بیٹیوں جیسی ہو بیٹا، جانتی ہو کہ کیسے وہ اور میں یک جان دو قالب تھے..... ابھی تک ہمارے بیچ یوں پیار تھا جیسے ہم ایک دوسرے کے میاں بیوی نہیں بلکہ عاشق ہوں۔'' ان کا ہاتھ اس کے ہاتھ کو سہلا رہا تھا۔ وہ انکل کی حالت کے پیش نظر مروت سے ہاتھ ہٹا بھی نہیں رہی تھی مگر محسوس کر رہی تھی کہ انکل کو اس کا ہاتھ یوں نہیں سہلانا چاہیے۔ اس کی ساس اور نندیں اور دیگر سسرالی رشتے دار بھی اس کی خالہ کی میت کے اردگرد ہی بیٹھی تھیں۔

''انکل..... اپنی معصوم بچی کا خیال کریں جسے ابھی احساس ہی نہیں ہوا ہے کہ اس سے کیا چھن گیا ہے۔'' اس نے یہ سوچ کر جتلایا کہ اس کی اپنی بھی ایک بیٹی ہے، کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ تھوڑی سی ہمت سے کھینچ کر انکل کی گرفت سے نکالا کیونکہ انکل ایک مضبوط مرد تھے اور ان کی گرفت بھی۔

''اسے تم لوگ ہی سنبھالو بیٹا، میں خود کو بھی ہمت نہیں دے پا رہا، اسے کہاں سے ہمت دوں؟'' میت کے گرد بیٹھی ہوئی عورتیں مرنے والی کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔ ان کے شوہر تو ان کے مرنے پر یوں دیوانوں کی طرح کبھی نہ روتے، کئی کا تو دل چاہ بھی رہا تھا کہ ایک بار مر کر تو دیکھیں..... جو یقین نہ ہوتا کہ مرے ہوئے لوٹ کر نہیں آتے۔

☆☆☆

جو دیوانہ ہو رہا تھا، وہ تھا، جس کی ہر لڑکی کے پیچھے دیوانگی کے قصے اس کے بچپن، لڑکپن سے لے کر جوانی تک..... بلکہ اس کا بیاہ ہو جانے تک زبان زد عام تھے۔ ماں نے اس کی حرکتوں سے تنگ آ کر محلہ تو تبدیل کر لیا کہ اس کے منہ کو لگی ہوئی چھوٹ جائے مگر خاندان تو وہی تھا ناں۔ جو لوگ انہیں اچھی طرح جانتے تھے، وہ تو اس کی ماں کے رشتہ مانگنے پر ٹکا سا جواب دے دیتے کہ بی بی کسی اور کو بیوقوف بناؤ جا کر، سارے جہاں کا چھٹا ہوا بدمعاش، کیا ہماری شریف اور سیدھی بیٹیوں کے لیے رہ گیا ہے۔

تب اس کے سوئے ہوئے بھاگ جاگے اور ایک ایسے گھر سے اسے رشتہ مل گیا جہاں سات بیٹیوں کی مجبوری کی قطار تھی اور ماں باپ اتنے مال دار نہ تھے کہ انہیں جہیز دے کر بیاہ پاتے۔ لڑکیاں ساری خوش شکل، سلیقہ شعار اور شریف تھیں۔ مگر آج کے دور میں ان گنوں کی کیا وقعت۔ بڑی تین چھوڑ کر چوتھے نمبر والی پر ہاتھ رکھا۔

''یہ کون سے نمبر والی بیٹی ہے آپ کی؟'' چائے لے کر آنے والی کے بارے میں استفسار کیا گیا۔ اس

سے پہلے سب سے بڑی تو ان کی خدمت میں پیش کیا جا چکا تھا اور اس سے چھوٹی والی شربت دے کر گئی تھی۔ باقیوں کو ہدایت تھی کہ سامنے نہ آئیں۔ ماں باپ نے سوچا تھا کہ سب سے بڑی نہ ہوئی تو دوسرے نمبر والی ہی سہی۔

''یہ تو جی چوتھے نمبر والی ہے......'' اتنی بیٹیوں کے ہوتے ہوئے، ناموں کی اہمیت نہیں تھی، ترتیب کے نمبروں کی تھی۔

''باقی بیٹیوں سے بھی تو ملوائیں آپ۔'' فرمائش کی گئی۔ لڑکیوں کے ماں باپ کو وہ ان کے ہاں رشتہ کرنے پر سنجیدہ لگی تھیں ورنہ وہ یوں اپنی بیٹیوں کی نمائش کبھی نہ لگاتے۔ سب بیٹیوں کو بلوایا گیا، پانچویں نمبر والی بارہ، تیرہ سال کی اور اس کے بعد کی بھی نو، دس کے سن میں تھیں ورنہ تو وہ شاید ساتویں نمبر والی پر انگلی رکھتیں۔ ''مجھے تیسرے نمبر والی بیٹی چاہیے۔''

''اس کا نکاح اپنی پھوپی کے گھر ہو چکا ہے......'' ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ''جو اچھا مال ہے وہ پہلے سے ہی ٹھیک ہو چکا ہے......'' انہوں نے دل ہی دل میں اور زبان سے بڑبڑا کر، بچیوں کی پھوپی کی چالاکی کو کوسا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ اس کا نکاح ہو چکا تھا ورنہ ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ منگنی توڑنے کو کہہ دیتیں۔

''تو پھر چوتھے نمبر والی دے دیں مجھے۔'' انہوں نے اصرار کیا۔ انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ بمشکل پندرہ، سولہ برس کی تھی۔ جوبن کی لالی کے باعث اس کے چہرے پر نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ انہیں ایسی ہی لڑکی چاہیے تھی کہ جسے پا کر ان کا بیٹا باہر منہ مارنا چھوڑ دیتا۔

''چوتھے نمبر والی تو بہت چھوٹی ہے بہن جی۔'' لڑکی کے باپ نے اعتراض کیا تھا۔

''تو منگنی کر لیتے ہیں، دو ایک کو بیاہ لیں تو سوچ لیں گے۔'' مگر مجبور ماں باپ تھے، انہوں نے سوچا کہ جو بوجھ ہٹتا ہے اسے ہٹائیں۔

☆☆☆

حدود سے نکلی تو خود سے سوال کرتی۔ اسے کبھی اس بات کی سمجھ نہیں آئی تھی کہ اس کے ابا ایسے کیوں تھے...... کیسے؟ اس کا اسے کہاں فہم تھا۔ اس کی اماں کے جانے کے بعد، دادی تو بوڑھی اور بیمار تھیں، کبھی کوئی خالہ اور کبھی ان کی بیٹیاں باری، باری چند دنوں کے لیے آتیں تا کہ اس بچی کا دل بہلا رہے۔ کئی بار نانی اور خالاؤں نے اسے ساتھ لے جانے کا کہا مگر ابا نہیں مانے۔ اس نے بارہا ابا کو اپنی کزنز اور خالاؤں کے ساتھ ایسی حرکتیں کرتے دیکھا کہ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان حرکتوں کا مقصد کیا تھا۔

جو خالہ یا ان کی بیٹی ایک بار ان کے ہاں رہ کر جاتی، پلٹ کر دوبارہ نہ آتی۔ ذرا بڑی ہوئی تو اس کی خالہ زاد بہنیں اس کے سامنے اس کے باپ کی حرکتوں کی باتیں کرتیں...... وہ سب انہیں انکل کہتیں اور انکل کی گھٹیا حرکتوں کے تذکرے اب اتنے عام ہو گئے تھے کہ اُن کے ہاں کسی نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ دادی بمشکل کھانا پکانا کر لیتیں۔ جوں ہی وہ ذرا سی بڑی ہوئی تو دادی کی صحت کی حالت کے پیشِ نظر وہ خود ہی ان کی مدد کرنے لگی۔

آہستہ آہستہ، ان کا گھرانا خاندان کے دوسرے گھروں سے کٹ کر رہ گیا تھا، کسی کا اتنا آنا جانا نہ رہا تھا کہ وہ اپنے ابا کا موازنہ کسی اور سے کرتی۔ صرف اسی کے ابا ایسے تھے یا اس کی سہیلیوں اور کزنز کے ابا بھی ایسے تھے؟ اسے اس کا موازنہ کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا کیونکہ وہ اپنے ابا کے علاوہ کسی اور کے ابا کو جانتی بھی نہیں تھی۔ اسے صرف ان ''ابوں'' کے ناموں کا پتا تھا، وہ بھی جب کلاس میں حاضری کے وقت میڈم سب لڑکیوں کے مکمل نام پکارتی تھیں اور وہ جواب میں ''یس میڈم۔'' کہتیں۔ ہاں، اس کے ابا مختلف تھے کیونکہ اس کی سہیلیاں جو کچھ بتاتی تھیں، اس کے ابا ان سے مختلف تھے۔

اس کے ابا اسے پیار سے بیٹی کہہ کر نہیں بلاتے

تھے..... اسے نہیں یاد کہ ابا نے کبھی اسے گود میں اٹھایا ہوگا، بانہوں میں جھلایا ہوگا یا گھوڑا بن کر اپنی پیٹھ پر اسے سیر کروائی ہوگی۔ ابا نے اسے کبھی جیب خرچ بھی نہیں دیا تھا، اس کی فرمائش پوری نہیں کی تھی کیونکہ اس نے کبھی فرمائش کی ہی نہیں تھی۔ ابا نے کبھی اس سے نہیں پوچھا تھا کہ اسے کوئی ضرورت ہے..... کبھی اس کی کامیابی پر خوش ہوکر اسے اپنے ساتھ نہیں لگایا تھا، حالانکہ وہ اپنی محنت اور قابلیت کے باعث ہر کلاس میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لینے والی بچی تھی۔ کبھی اس کے ماتھے پر بوسہ نہیں دیا تھا، کبھی اس کے ساتھ بیٹھ کر ہنسے تھے نہ کبھی اس کی تکلیف پر تڑپے تھے۔ یہ ساری باتیں اس کی کلاس کی باقی لڑکیاں اسے بتاتیں اور وہ خاموشی سے سنتی رہتی۔

''تم بھی کچھ کہو ناں..... ہمیں بتاؤ ناں کہ تمہارے ابا کیسے ہیں؟'' اس کی ہمجولیاں سوال کرتیں تو وہ انہیں دیکھ کر نظر چراتی۔

''میرے ابا بہت اچھے ہیں..... بس مجھے زیادہ باتیں کرنے کی عادت نہیں۔'' اس کا جواب مبہم ہوتے ہوئے بھی واضح ہوتا اور لہجہ حتمی کہ اسے اب اس موضوع پر مزید نہیں بولنا۔

ساری لڑکیاں چھٹی ہوتے ہی باہر نکلتیں اور گیٹ کے اندر کی طرف بنے برآمدے اور بیڈمنٹن کورٹ کے پاس کھڑی ہوجاتیں۔ اس وقت ان کے پاس ڈیوٹی پر موجود دو اساتذہ ہوتی تھیں۔ ساری لڑکیاں تمیز کے دائرے میں رہتیں کہ اساتذہ کے سامنے کسی شرارت کی گنجائش نہ تھی۔ اسکول کا چوکیدار بند گیٹ کو کھول کر، بلند آواز سے لڑکیوں کا نام پکارتا، جس بچی کے نام کی پکار آتی وہ باہر نکلتی اور گیٹ پھر سے بند ہوجاتا۔ کون کس کے ساتھ اور کس طرح جاتی ہے، اندر والیوں کو اس کا علم نہ ہو پاتا۔ ہاں البتہ چوکیدار ہر بچی کی سواری اور اسے لینے کے لیے آنے والے کو جانتا تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ کون سی بچی کا باپ اسے لینے آتا ہے، کس کا بھائی اور کس کا ڈرائیور۔ اگر کسی بچی کو معمول کے خلاف کوئی اور لینے آتا تھا تو وہ اس بچی کا نام پکارنے کے بجائے، ڈیوٹی پر موجود اساتذہ میں سے کسی کو بتاتا کہ فلاں بچی کو کوئی ایسا شخص لینے آیا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں آیا اور میں اسے جانتا بھی نہیں۔ اسکول کی انتظامیہ اس کی رپورٹ ہیڈ مسٹریس کو کرتی اور اس کے گھر فون کرکے مکمل جانچ کی جاتی کہ لینے کے لیے آنے والا واقعی گھر والوں کے بھیجنے پر آیا ہے یا پھر.....

اسکول سے لے جانے کے لیے چند وینیں بھی تھیں جن پر وہ لڑکیاں جاتی تھیں، جن کے گھر اسکول سے زیادہ دور کے علاقے میں تھے، ایسی دور سے آنے والی بچیاں مل کر کسی وین ڈرائیور کا بندوبست کر لیتی تھیں۔ اس کا تعلق بھی اسی طبقے سے تھا، جب ان کی وین آتی تو اکٹھے دس بارہ لڑکیوں کے نام پکارے جاتے اور گیٹ کھلتا، جونہی ساری لڑکیاں نکل جاتیں تو گیٹ بند ہوجاتا۔ وین عین گیٹ کے سامنے کھڑی ہوتی تھی۔ گیٹ کے باہر کھڑا ہوا چوکیدار اس بات کو یقینی بناتا کہ کوئی لڑکی دائیں بائیں نہ ہو۔ گیٹ سے باہر کھڑی ہوئی ریڑھیاں دیکھ کر لڑکیوں کی رالیں ٹپکتیں، جن پر گول گپے، دہی بڑے، سموسے، پکوڑے، چھلیاں اور شکرقندی کی چاٹ ملتی تھی۔

جونہی سب لڑکیاں بیٹھ جاتیں، ڈرائیور دروازہ بند کر دیتا اور ان کی گنتی کرتا تھا۔ بڑی کلاسوں کی لڑکیاں وین میں بیٹھ کر پیسے اکٹھے کرتیں اور ڈرائیور کو دیتیں، جو اُن کو ان کی فرمائش پر چاٹ، سموسے یا جو بھی وہ چاہتیں، لا کر دیتا۔ وین کی اگلی سیٹوں پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں جو اس سے بلکہ سب سے بڑی جماعت میں تھیں، وہ اپنے اسکول بیگ سے سی ڈی نکال کر ڈرائیور کو دیتیں، (جسے سب انکل کہتی تھیں) وہ ان کا پسندیدہ میوزک آن کرتا اور وہ خوشی سے جھومنے لگتیں اور تالیاں بجاتیں۔

وہ ان بچیوں میں سے تھی جو چھوٹی کلاسز میں تھیں اور انہیں عموماً وین میں بیٹھنے کے لیے عقبی نشستیں ملتی تھیں۔ اس کے پاس پیسے بھی نہیں ہوتے تھے کہ وہ کچھ

کھائے، اسے طبعاً اس بات کا لالچ بھی نہیں تھا کیونکہ اماں اور دادی نے ہمیشہ باہر سے کھانے کی حوصلہ شکنی کی تھی اور اسے صحت کے اصولوں کے خلاف بتایا تھا۔ کھانے کا شوق تو نہ ہوتا تھا مگر اسے انکل کے ساتھ بیٹھ کر اپنے پسندیدہ میوزک پر جھومتی ہوئی، تالیاں بجاتی ہوئی اور مسکراتی ہوئی لڑکیاں بہت اچھی لگتیں۔ ڈرائیور انکل بار، بار مڑ کر ان بچیوں کو دیکھ کر مسکراتے اور ان لڑکیوں کی طرف سے بھی مسکراہٹوں کے تبادلے ہوتے۔ وہ سوچتی تھی کہ وہ کب اتنی بڑی ہوگی، کب ان لڑکیوں کی طرح فرنٹ سیٹ پر بیٹھے گی اور اپنے بیگ سے سی ڈی نکال کر دے گی جو انکل لگائیں گے اور پھر وہ اس کے میوزک کے ساتھ جھومے گی۔

''اگر میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھ بھی جاؤں گی تو سی ڈی کہاں سے لاؤں گی؟'' اس کا معصوم ذہن خود سے سوال کرتا۔

☆☆☆

''ابا..... آپ انکل سے بات کر سکتے ہیں؟'' اس نے منہ بسور کر باپ سے کہا۔

''کون سے انکل..... اور کیا بات؟'' ابا کچھ نہ سمجھے تھے۔

''ویگن والے انکل ابا۔'' وہ بتانے لگی۔ ''ہمیشہ سے وہ بڑی کلاسوں کی لڑکیوں کو ویگن کی فرنٹ سیٹوں پر بٹھاتے ہیں اور ان کی میوزک کی فرمائشیں بھی پوری کرتے ہیں، میں اب سب سے بڑی کلاس میں ہوں اور اب اصولاً آگے کی سیٹوں پر بیٹھنے کی باری میری بھی ہونی چاہیے مگر وہ مجھے نہیں بٹھاتے۔''

''کیا ضرورت پڑی ہے تمہیں اگلی سیٹ پر بیٹھنے کی، اسکول سے گھر تک کا تھوڑا سا سفر ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون کس سیٹ پر بیٹھا ہے۔''

''پڑتا ہے ناں ابا، فرنٹ سیٹ پر تین لڑکیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی ہے، دو لڑکیاں دسویں جماعت کی ہیں اور تیسری لڑکی ساتویں کی بیٹھتی ہے، حالانکہ میں نویں میں ہوں۔ ساتویں جماعت والی لڑکی،

جولائی 2021ء
کے دلکش شمارے
کی ایک جھلک

اولین صفحات

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستانِ حیات
روبینہ رشید کے قلم کی جادوگری.....

اناگیر

سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے نوجوان کی بے تابیوں کا اختتام
امجد جاوید کے سلسلے کی آخری قسط

الاؤ

مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل..... زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جارہی تھی..... **ڈاکٹر عبدالرب بھٹی** کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

حقیقت کے تعاقب میں منزل سے دور ہو جانے والوں کا فسانہ

دوسرا رنگ

وطن کی محبت میں جان لینے اور جان دینے والوں کا ماجرا

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

دسویں جماعت کی ایک لڑکی کی بہن ہے ابا، یہ تو میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ناں؟'' اس نے بھی باپ کے سامنے ضد نہیں کی تھی مگر بات اپنے حق کی آ گئی تھی اور اس کی جو کہ اسے اس روز سب کے سامنے اس وقت اٹھانا پڑی تھی جب اس نے اصرار کیا تھا کہ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا چاہتی ہے اور دسویں جماعت کی اس لڑکی نے دھڑلے سے اپنی بہن کو بٹھا کر کہا تھا کہ وہ اسے اٹھا کر تو دکھائے۔

ظاہر ہے کہ اس میں ایسی لڑکی سے لڑائی کی سکت تو نہ تھی، وہ بہت ملول ہوئی تھی کیونکہ سب لڑکیوں کی طنزیہ مسکراہٹ اسے مزید ذلت محسوس کروا رہی تھی جن سے چند منٹ پہلے اس نے دعوے سے کہا تھا کہ آج وہ ان سب کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر دکھائے گی۔ اسی لیے اس وقت اس نے ابا سے شکایت کی تھی اور ابا نے بھی اس کی توقع کے..... برخلاف اس سے کہہ دیا کہ وہ اگلے روز ویگن والے انکل سے بات کریں گے۔ اس کے لیے باپ کی طرف سے پہلی بار حمایت اور مدد کا وعدہ تھا، وہ اسی پر خوش ہوگئی تھی۔ لیکن ابا کہہ کر بھول نہیں گئے بلکہ اگلے روز ویگن والے انکل سے بات کی اور اس کے بعد انہوں نے اسے فرنٹ سیٹ پر بٹھایا اور ساتویں جماعت والی لڑکی کو پیچھے بیٹھنے کو کہا، اس کی بہن نے اصرار کیا کہ اس کی بہن اس کے ساتھ بیٹھے گی تو اس پر انکل نے کہا کہ وہ اپنی بہن کے ساتھ پیچھے بیٹھ جائے تو مجبوراً اسے اس کو پیچھے بھیجنا پڑا۔ ڈرائیور انکل کی اپنی ویگن کی سیٹوں کے متعلق جو اتھارٹی تھی اسے کوئی چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے فرنٹ سیٹ پر آجانے سے دسویں جماعت کی دوسری لڑکی، عفت بہت خوش ہوئی تھی، وہ اسے پسند بھی کرتی تھی اور اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کو سمجھتی تھی مگر اپنی ہم جماعت کی کھل کر مخالفت نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

اپنے ساتھ بیٹھنے پر اس نے اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور اس کا ایسی مسکراہٹ سے استقبال کیا جیسے اس نے اس سیٹ کو حاصل کر کے بڑی کامیابی حاصل کی ہو۔

عفت اسکول کی ان چند لڑکیوں میں سے تھی جس کی دوستی کا حلقہ اسکول میں کئی جماعتوں تک پھیلا ہوا تھا، اپنی جماعت کے علاوہ بھی۔ وہ لڑکیوں میں بہت مقبول تھی اور لڑکیاں پروانوں کی طرح اس کے گرد نثار ہوتیں۔ اس بات کو دو دن بھی نہیں گزرے تھے، وہ اسکول میں کھیل کے ایک پیریڈ میں عفت کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اسے اس سے کوئی اہم بات کہنا تھی۔ نویں اور دسویں جماعت کا کھیل کا پیریڈ اکٹھا ہوتا تھا۔ ''ممکن ہے کہ وہ کلاس روم میں ہی ہو'' سوچتی ہوئی وہ اس کی کلاس کی طرف چلی، کلاس کے کمرے کے قریب پہنچنے پر اسے دبی دبی سی آوازیں سنائی دیں۔ اس کا مطلب تھا کہ کلاس میں ایک سے زائد لڑکیاں موجود تھیں، کھیل کا پیریڈ بنک ہو رہا تھا۔ ممکن ہے کہ انہیں کوئی مسئلہ ہو، ایسا مسئلہ جسے اساتذہ عموماً سمجھتے ہی نہیں تھے اور اگر سمجھ جاتے تھے تو ان کا حکم ہوتا تھا کہ کھیل کا پیریڈ اٹینڈ نہ کرنے والی لڑکیاں بھی وہیں میدان میں ایک طرف بیٹھیں اور اپنی باقی ساتھیوں کو کھیلتے ہوئے دیکھیں۔ مگر اس وقت کمرے سے جو آوازیں آ رہی تھیں وہ ایک سے زائد لڑکیوں کی تھیں، ایک تو ان میں سے یقیناً عفت ہوتی۔

''عفت باجی۔'' اس نے پکارا تو کمرے کے اندر سے آنے والی آوازیں بند ہوگئیں اور وہ رک گئی۔ کیا اسے کوئی مغالطہ ہوا تھا کہ کمرے میں کوئی تھا..... ''عفت باجی۔'' اس نے پھر پکارا۔

''رکو باہر.....'' اندر سے آواز آئی۔ ''میں آتی ہوں۔'' وہ رک گئی، چند لمحوں کے بعد وہ باہر آ گئی۔

''تم نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔''

''آپ کون سا کوئی چوری کر رہی تھیں جو ڈر گئیں؟'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''چوری..... ارے چوری میں کس چیز کی کروں گی۔'' وہ کھسیانی سی ہنسی، ہنسی۔ ''میں سمجھی کہ مسز طور ہیں

اور کلاس میں چھاپا مارنے آئی ہیں، اصل میں پیٹ میں درد تھا تو میں باہر بیٹھنے کے بجائے یہاں آ کر آرام سے پنکھا چلا کر بیٹھ گئی۔''

''اندر اور کون ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''اندر اور کون ہوگا؟'' اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی طرف چلی۔ ''میں اکیلی ہی تھی۔''

''مگر اندر سے آوازیں.....''

''تم کہہ رہی تھیں کہ تم نے مجھ سے کوئی بات کہنا تھی؟'' عفت نے موضوع بدلا۔

''ہاں وہ اکیلے میں مجھے آپ سے کوئی بات کرنا تھی۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔

''آؤ..... وہاں اس بنچ پر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' وہ اسے لیے، لیے باہر لان میں ایک بنچ پر جا بیٹھی۔ ''اب بتاؤ؟''

''عفت باجی..... وہ مجھے آپ سے کہنا تھا۔'' وہ کہتے، کہتے رک گئی۔ دسویں جماعت کے کمرے سے اس کی جماعت کی رابعہ چور نظروں سے دائیں، بائیں دیکھتی ہوئی نکلی تھی۔ عفت کا چہرہ دوسری طرف تھا، وہ نہ دیکھ سکی تھی۔ ''اس میں ایسی کون سی بات ہے کہ عفت نے میرے ساتھ جھوٹ بولا؟'' اس نے سوچا۔

''تم کچھ کہہ رہی تھیں؟''

''اصل میں وہ انکل ہیں ناں.....'' اس نے رک، رک کر کہا۔

''کون سے انکل؟'' عفت نے سوال کیا۔

''ویگن والے انکل۔''

''اچھا۔ کیا ہوا ان کو؟'' عفت نے جھنجلا کر سوال کیا۔

''وہ ناں کچھ عجیب سے ہیں.....'' اس نے کہا۔

''ان کی حرکتیں..... ان کے ہاتھ.....'' وہ ٹھہر، ٹھہر کر عفت کو بتانے لگی۔

''ہاہا..... ہاہا.....'' اس کی بات کے اختتام پر عفت نے قہقہہ لگایا۔ ''کیا فرق پڑ جاتا ہے اس سے میری جان۔'' اس نے اپنی انگشتِ شہادت سے اس کی ٹھوڑی کو اٹھایا، اپنے ایک بازو کو اس کے گرد حمائل کر کے اپنی طرف کھینچا، اپنا منہ اس کے کان کے پاس لے جا کر، اپنے لب اس کے کانوں سے اتنے قریب رکھ کر کہا..... کہ آواز نہ بھی ہوتی تو اسے سمجھ میں آ جاتا کہ لبوں کی جنبش کیا تھی۔ ''کچھ اچھا پانے کی کچھ نہ کچھ قیمت تو دینا پڑتی ہے جانی۔'' عفت کے یوں اس قدر قرب سے بھی وہ گھبرا گئی تھی، اس کے کان ہی نہیں، پورا وجود سنسنا اٹھا تھا۔

''مجھے ایسا اچھا نہیں لگتا عفت باجی، یہ غلط ہے، میں تو آپ سے شکایت کر رہی تھی کہ آپ بڑی ہیں، آپ انہیں ڈانٹیں گی۔'' اس نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا۔

''یار..... اس بیچارے کے ہاتھوں سے کیا ہو جاتا ہے، کبھی، کبھی بے خیالی میں ہاتھ لگا لیتا ہے تو ہمارا کیا جاتا ہے، کون سا ہم زخمی ہو جاتے ہیں، چھل جاتے ہیں..... دیکھو ناں اس کے بدلے کبھی کبھار وہ ہماری چاٹ اور سموسوں کے پیسے بھی اپنی جیب سے ادا کر دیتا ہے۔'' عفت نے اس کی کمر کے گرد اپنا بازو ڈال کر اسے اپنے قریب کیا۔

''ہماری مرضی کے گانے لگا دیتا ہے۔'' اس نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کو پھر زور لگایا، اس بار اس کی گرفت مضبوط تھی۔ اسے دادی نے ہمیشہ مردوں کی طرف سے ایسی حرکتوں سے خبردار کیا تھا، کسی لڑکی سے تو وہ ایسی توقع کر ہی نہیں سکتی تھی۔

''بڑے، بڑے شہروں میں، ایسی چھوٹی، چھوٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں میری جان۔'' اس کے رینگتے ہوئے بازوؤں سے اسے اتنا عجیب احساس ہوا کہ خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروا کر وہ ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی، اس نے اپنا ہاتھ اس کے زانو پر رکھا تو وہ بدک کر کھڑی ہو گئی۔

''چلتی ہوں، مسز طور کہیں سزا کے طور پر باہر میدان میں ہی نہ کھڑا کر دیں۔'' کھیل کا پیریڈ بنک کرنے والیوں کو صرف اسی بات کا خوف ہوتا تھا۔

اپنے پیچھے اسے عفت کا قہقہہ سنائی دیا تھا، وہ خوفزدہ سی تھی، مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ میدان میں پہنچی تو رابعہ وہاں موجود تھی، اس نے اس کی طرف غور سے دیکھا، رابعہ نے اس سے نظر چرائی۔

☆☆☆

''تم آج ویگن کی فرنٹ سیٹ پر نہیں بیٹھی تھیں؟'' ابا نے اس سے پوچھا تھا۔

''نہیں ابا۔'' اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

''کیوں؟'' انہوں نے پھر سوال کیا۔

''یونہی ابا.....'' اس نے کہا۔ ''مجھے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر..... سامنے سے آنے والی گاڑیوں کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔'' اسے بہانہ سوجھ گیا۔

''خواہ مخواہ مجھ سے سفارش کروائی پھر تم نے؟'' ابا نے ناراضی سے کہا۔ انہیں ناراض ہونے کے لیے اس سے بڑی وجہ درکار ہوتی بھی نہیں تھی۔ ابا چائے کا خالی کپ رکھ کر بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''کیا یہی اصل بات ہے جو تم نے اپنے باپ کو بتائی ہے یا کچھ اور بات بھی ہے؟'' دادی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

''آپ نے دوپہر کو کیا کھایا تھا دادی؟'' اس نے الٹا سوال کر لیا۔

''تم ٹال رہی ہو میرے سوال کو؟'' دادی نے خفگی سے کہا۔

''دادی..... ویسے ہی، سچ میں مجھے پچھلی سیٹوں پر بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔''

''میں تمہارے چہرے کے ہر بدلتے رنگ کو، تمہاری ادھوری بات کے پورے مطلب کو اور تمہاری ان کہی بات کو سمجھتی ہوں۔ یہ چکما تم اپنے باپ کو تو دے سکتی ہو مگر مجھے نہیں۔'' دادی اس کی دادی تھیں، اس کی پیدائش سے لے کر اس کے اس عمر تک پہنچنے تک وہ ہر پل اس کے ساتھ تھیں، اس کے مزاج کے سبھی موسموں سے آشنا۔

''وہ انکل ہیں ناں دادی.....'' وہ دھیرے، دھیرے انہیں بتانے لگی۔ وہ تو ہمہ تن گوش تھیں ہی مگر اندر جا کر واپس لوٹتے ہوئے، دروازے کے عقب میں کھڑے، اس کے باپ کے چہرے کا رنگ اس کی بات کو سنتے ہوئے بدل رہا تھا۔ ''یہ سارے لوگ، جنہیں ہم لڑکیاں انکل کہتی ہیں، ایسے کیوں ہوتے ہیں دادی؟'' اس نے معصومیت سے سوال کیا۔

''ایک تو یہ منحوس لفظ انکل.....'' دادی نے کہا۔ وہ ماں کی بات کو سن کر یوں بدکا جیسے ماں نے اس کے منہ پر تھوک دیا ہو۔ واپس مڑا اور جا کر اپنے پلنگ پر ڈھے گیا۔

☆☆☆

''جلدی کریں ناں دادی..... پراٹھا رہنے دیں پلیز، بس چائے کا کپ دے دیں، وین آنے والی ہے۔'' بستہ کندھے پر لٹکائے، ایک ہاتھ سے جلدی، جلدی اپنی چوٹی گوندھتی ہوئی، اس کی بچپن کی حدوں کو چھوڑ کر، جوانی کی دہلیز پر کھڑی بیٹی، ماں کی سی معصوم اور بیماری صورت لیے دادی سے کہہ رہی تھی۔

''ناشتا سکون سے کرو، بیٹا۔'' تو لیا صحن میں تار پر ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔ ''آج سے وین نہیں آئے گی، میں اپنی بیٹی کو خود اسکول چھوڑنے جاؤں گا اور واپسی پر بھی خود لے لوں گا۔'' دادی پوتی نے چونک کر اسے دیکھا، کوئی انقلاب ہی آیا تھا۔

(فحش گالی) منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا وہ اپنے کمرے کی طرف گیا، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کنگھی کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔

''اتنی ہمت اس دو ٹکے کے ڈرائیور کی کہ میری بیٹی کا انکل بنے، اسے چھوئے.....'' اس وقت اسے اپنا ماضی اور حال سب یاد آ رہا تھا..... آئینے میں اسے اپنا بھیانک چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اتنی ڈھیر ساری بچیوں کا انکل..... اپنی بیٹی کی زندگی میں پہلے ہی انکل کے آنے سے چاروں شانے چت ہو گیا تھا۔

❁❁❁

وہ خوشبو سی

المیس جبار

pklibrary.com

ایک مسحور کُن سی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ آئینے میں نظر آتے عکس کو دیکھتے ہوئے ایک بے ساختہ سی مسکراہٹ حمدان کے لبوں پر دوڑ گئی۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو......'' اپنے بال بنا کر ہیئر برش واپس رکھتے ہوئے اسٹول پر بیٹھ کر فرصت سے وہ اس کی تیاری دیکھنے لگا۔ وہ جو خود میں محو سی اپنے ناخنوں پر نیل پالش لگا رہی تھی۔ اس کے یوں دیکھنے پر کنفیوز ہو گئی۔

''آپ چلیں نیچے، میں تیار ہو کر آتی ہوں۔'' حبہ نے بیچارگی سے کہا۔

''آپ جیسی لڑکی کنفیوز ہو رہی ہے۔ اسٹرینج......''

''جی ہو رہی ہوں کنفیوزڈ اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ دیر نہ ہو تو پلیز آپ چلیں میں آتی ہوں......'' واضح اعتراف کر کے آخر میں اس نے التجا کی۔

''بڑی ظالم ہو ویسے۔'' وہ مصنوعی خفگی سے کہتا اٹھا تھا۔ سائڈ ٹیبل سے فون اٹھاتے وہ باہر جاتے، جاتے واپس پلٹ آیا تھا۔

''آؤ سیلفی لیتے ہیں، باہر تو یہ چاند چہرہ پردے کی اوٹ میں ہوگا۔'' شرارت سے کہتے اس نے کئی تصویریں لے ڈالی تھیں۔ ''ماشاء اللہ کتنا پیارا لگ رہا ہوں؟'' تصویر وال پیپر پر سیٹ کرتے ہوئے وہ اپنی تعریف کر رہا تھا۔

''ظاہر ہے چاند کی کرنیں جو آپ پر پڑ رہی ہیں۔'' حبہ کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

''مجھے چاند سے روشنی لینے میں کوئی عار نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ تم میری زندگی کا ایک روشن ستارہ ہو۔'' وہ محبت سے دیکھتے ہوئے اسے اعتراف کر رہا تھا' حبہ کی آنکھوں میں احساسِ تشکر کی نمی چمکی تھی۔

''ہیں ناں وہی روایتی مرد، چاند سے مجھے فوراً ستارہ بنا ڈالا۔'' لہجہ خفگی سے بھرپور تھا۔

''کیا کروں ہوں تو ناں..... وہی ٹپیکل سوچ والا مرد جو عورت کو خود سے پیچھے دیکھنا چاہتا ہے۔'' حمدان کے لہجے میں درآئی سنجیدگی پر حبہ بے اختیار اسے دیکھنے پر مجبور ہوئی تھی۔ لہجے کے برعکس آنکھوں کی شرارت نے اسے بھی مسکرانے پر مجبور کیا۔

''اور مجھے چند قدم پیچھے رہنے میں کوئی عار نہیں بشرطیکہ آگے رہنے والے کو پتا ہو کہ اسے یہ اعزاز کیوں دیا گیا ہے۔'' وہ مسکرا کر کہتی کمرے کا پھیلاوا سمیٹنے لگی تھی۔ حمدان کچھ لمحوں کے لیے الجھا اور پھر سر جھٹکتے مسکرایا۔ طمانیت سے بھرپور مسکراہٹ..... وہ اپنی بیوی کی ذہانت کا معترف ہو گیا تھا۔

☆☆☆

وہ کافی خوشگوار موڈ میں لنچ کر رہے تھے۔ میرون شال کے ہالے میں دمکتا نورالعین کا چہرہ اس کے اندر کی خوشی اور طمانیت کا پتا دیتا تھا۔ جہاں حمدان اپنی بہن کو دیکھ کر مطمئن ہوا وہیں حبہ کے لبوں پر رقص کرتی مسکراہٹ آفاق کو بھی پُرسکون کر گئی تھی....

نورالعین اور حبہ کی دوستی بہت پرانی اور گہری تھی۔ جب... نورالعین کے والدین نے حبہ کو حمدان کے لیے مانگا تو حبہ کے والدین نے بھی نورالعین کا رشتہ مانگنے میں دیر نہ کی۔ یوں وہ چاروں ایک ماہ قبل ہی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے تھے۔ آج کا یہ ڈنر حمدان اور حبہ کی طرف سے تھا۔ وجہ حبہ اور نورالعین کا رزلٹ تھا جو کچھ روز قبل ہی آیا تھا۔ نورالعین اور آفاق کے جانے کے بعد وہ دونوں کافی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔

''تم جب تک تیار ہو جاؤ میں اماں اور ابا جان کے لیے کھانا پیک کروا کر لاتا ہوں، حمدان کا اشارہ اس کے گاؤن اسکارف کی طرف تھا۔ حبہ اپنا موبائل وغیرہ بیگ میں رکھتے نقاب درست کرنے لگی تھی۔ مین ہال سے گزر کر بیرونی دروازے کی طرف جاتے ایک عجیب سا احساس حمدان سے لپٹا تھا۔ وہ بے اختیار وہاں بیٹھے لوگوں کو دیکھنے پر مجبور ہوا اور پھر اپنے ساتھ چلتی اردگرد سے لاتعلق سی اپنی محبوب بیوی کو..... اس خوشگوار شام ایک الجھن بھی سید حمدان شاہ کے ہم قدم ہوئی تھی۔

اچھی اور نیک شریکِ حیات کا ساتھ زندگی کو پُرسکون کر دیتا ہے۔ حمدان اپنی زندگی سے بے حد خوش اور مطمئن تھا لیکن وہ اُلجھن جو اس خوشگوار شام اس کے ہم قدم ہوئی تھی۔ اب کسی پن کی طرح اکثر چبھنے لگی تھی۔

وہ بھی ایک خوشگوار سی شام تھی۔ چچا جان کی فیملی ان کے گھر پر انوائٹ تھی۔ سب مرد حضرات لاؤنج میں محفل جما کر بیٹھے تھے۔ جب نورالعین چائے کی ٹرالی لیے وہاں آئی تھی۔ سب باتوں میں مگن رہے تھے.... نورالعین کو اپنی جانب متوجہ کرنا پڑا تھا۔ سب کو چائے سرو کرتے، حال احوال پوچھتے وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد جب ان کے درمیان ایک دلچسپ سی سیاسی بحث گرما گرمی سے عروج پر تھی۔ لمحہ بھر کے لیے سب کی توجہ دروازے سے اندر آتی حبہ کی طرف ہوئی تھی اور پھر سے وہ دوبارہ اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے تھے۔ ابا جان کا فون انہیں دیتی وہ وہاں سے واپس چلی گئی تھی۔

حمدان کچھ لمحوں کے لیے اس محفل سے جیسے کٹا تھا۔

بات عجیب سی تھی۔ اتنی عجیب کہ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی اسے اپنے آپ میں برا محسوس ہوتا تھا۔ الجھن کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا اور وہ الجھن نہ صرف ناگواری میں بدلنے لگی تھی بلکہ وہ اب اکثر ہی نورالعین اور حبہ کا موازنہ کرنے لگا تھا۔ حبہ تو باہر جاتے ہوئے باقاعدہ گاؤن اور اسکارف لیتی تھی۔ گھر میں بھی ایک بڑی سی چادر اس کے وجود کو ڈھانپے اسے مزید پُروقار بناتی تھی۔ لیکن حمدان کو اب اکثر کوفت ہونے لگی تھی۔ وجہ اس کی باپردہ بیوی کی طرف لوگوں کا بار، بار پلٹ کر دیکھنا تھا جبکہ نورالعین اس کی بہن اس کی طرح پردہ نہیں کرتی تھی۔ باہر نکلتے ہوئے بس چادر سے ہلکا سا نقاب کر لیتی لیکن وہ کبھی اس کے ساتھ ایسا ان کمفرٹیبل .... نہیں ہوا تھا۔ جیسے حبہ کے ساتھ باہر جاتے ہوئے ہونے لگا تھا۔ اور آج جیسے لاؤنج میں آنے پر سب .... بے اختیار حبہ کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ اور اس نے ابا جان کی آنکھوں میں بھی ہلکی سی ناگواری بھی ابھرتے ہوئے دیکھی تھی۔

''میں تو ماشاء اللہ دو بیٹیوں کا باپ بن گیا ہوں، حبہ تو بڑا قیمتی تحفہ ہے میرے لیے۔'' ابا جان برملا اپنی محبت کا اظہار کرتے تھے مگر ان کی آنکھوں میں اپنی محبوب بیوی کے لیے آئی ناگواری حمدان کے لیے تشویش ہی نہیں تکلیف کا باعث بھی تھی۔

''مجھے تم سے ایک بات شیئر کرنی ہے۔'' مہمانوں کے جانے کے بعد وہ دونوں بہن، بھائی لان میں چہل قدمی کر رہے تھے جب حمدان نے نورالعین سے اپنا مسئلہ شیئر کرنے کا فیصلہ کیا۔

''کیا بات ہے بھائی.....؟'' نورالعین ہمہ تن گوش ہوئی۔

''بات عجیب ہے، تم پتا نہیں کیا سوچو میرے بارے میں۔''

''میں اپنے بھائی کے بارے میں ایسا ویسا کچھ نہیں سوچوں گی، ڈونٹ وری.....'' نور نے اسے بولنے پر اکسایا۔

''حبہ ایک آئیڈیل بیوی ہے، میں بہت خوش ہوں اس کے ساتھ لیکن میں کبھی، کبھی اس کے ساتھ.... ان کمفرٹیبل فیل کرنے لگتا ہوں۔'' نور حیرت سے اپنے بھائی کو دیکھنے لگی جس کے چہرے پر کوئی الجھن رقم تھی۔

''آپ کی خود ہی خواہش تھی کہ آپ کی بیوی پردہ کرتی ہو..... بلکہ شرعی پردہ کرتی ہو اب آپ کو اس کے پردے سے مسئلہ ہونے لگا۔ دس از ناٹ فیئر..... بھائی یہ تو اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ یہ رشتہ بھی ہوا ہی اس لیے تھا کہ آپ حبہ کو تحفظ دے سکیں اور اس کے پردے کی مخالفت نہ کریں۔ آپ کی اپنی بھی یہی خواہش تھی۔'' نورالعین صدمے میں تھی۔

''نور یار پلیز اب کوئی فتویٰ نہ لگا دینا مجھ پر۔'' وہ بری طرح جھنجلایا۔

''فتویٰ تو لگتا ہے آپ پر۔'' وہ خاصی سنجیدہ ہو چکی تھی۔

''یہ میرے اللہ کا حکم ہے اور میں ایسی بیوی چاہتا تھا، وہ میری آئیڈیل ہے، مجھے بے حد پیاری ہے۔'' حمدان نے اعتراف کر کے نورالعین کو یقین دلانے کی کوشش کی۔

''مسئلہ کیا ہے پھر آخر.....؟'' وہ حیران ہوئی۔

''مسئلہ یہ ہے کہ اس کے پردے کے باوجود لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، پلٹ کر ضرور دیکھتے ہیں۔ اپنی باپردہ بیوی کی طرف پردے کے باوجود لوگوں کا یوں پلٹ، پلٹ کر دیکھنا مجھے حیران، پریشان کرتا ہے۔'' وہ بے اختیار رک کر حمدان کو دیکھنے لگی۔ الجھن اگر لہجے میں تھی تو آنکھوں میں بھی کہیں ناگواری کا تاثر ابھر آیا تھا۔ ''جب تم لاؤنج میں آئیں تو تمہارے خود متوجہ کرنے سے پہلے کوئی تمہاری طرف متوجہ نہیں ہوا اور حبہ کے آنے پر سب نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا تھا اور آج تو ابا جان کی آنکھوں میں بھی ہلکی سی ناگواری محسوس کی میں نے۔'' وہ خاصی پریشانی سے بتا رہا تھا۔ نور کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ در آئی تھی۔

''تم مسکرا رہی ہو؟'' حمدان کو اس کی مسکراہٹ اپنا مذاق اڑاتی لگی۔ اسے لگا اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا ہے۔

''گھر میں ہے آج تک وہی خوشبو بسی ہوئی
لگتا ہے یوں جیسے کہ وہ آ کر نہیں گیا''

بڑے جذب سے شعر پڑھا گیا تھا۔

''نو!'' حمدان سخت خفگی سے کہتا اپنی جگہ سے اٹھا۔

''تیری خوشبو کا پتا کرتی ہے
مجھ پہ احسان ہوا کرتی ہے''

وہ پھر بھی شعر سناتے اس کے ساتھ ہی کھڑی ہوئی تھی۔

''دیٹس ناٹ فیئر نور۔'' اب کی بار وہ شدید خفگی سے کہتا وہاں سے واک آؤٹ کر گیا تھا۔

''اس کی خوشبو کہیں نہیں ملتی
سارے پرفیوم خرید کر دیکھے''

اب کی بار گنگنا کر شعر سناتے نور العین کی آواز اتنی اونچی ضرور تھی کہ اندر کی طرف جاتے حمدان کے قدم زنجیر ہوئے۔ وہ تیز، تیز قدموں سے چلتا واپس اس کی طرف پلٹ کر آیا۔

''یعنی کہ......'' وہ دوبارہ سے تصدیق چاہ رہا تھا۔

''جی یعنی کہ......'' نور العین حمدان کی الجھن کا سرا اس کے ہاتھ میں دیتے اس کے تاثرات پر...... بے اختیار مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے لیپ ٹاپ سامنے رکھے وہ کام کرنے میں محو تھا۔ انگلیاں تیزی سے کی پیڈ پر حرکت کر رہی تھیں۔ وقتاً فوقتاً وہ ایک سرسری سی نظر حبہ کی تیاری پر بھی ڈال لیتا۔ فیروزی اور سلور کلر کے خوب صورت فراک اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس ہم رنگ دوپٹا سلیقے سے سر پر اوڑھے وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ تیاری کو آخری ٹچ دیتے اس نے سیاہ عبایا پہنا۔ میرون اسکارف کو اپنے چہرے کے گرد لپیٹا کہ چہرے کو نفیس نقاب نے ڈھک لیا تھا۔

''حبہ......!'' حمدان نے بے اختیار پکارا تھا وہ جو پرفیوم کا ڈھکن کھولے عادتاً خود پر اسپرے کرنے والی تھی۔ یوں پکارے جانے پر ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔ لیپ ٹاپ ایک طرف کرتے وہ اٹھ کر اس کی طرف آیا۔ نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا تھا۔

''کیا ہوا ہمدان......؟'' وہ اس انداز پر پریشان ہوئی تھی۔

''پتا ہے یہ جو تمہارا روپ ہے ناں، یہ مجھے بے حد...... پسند ہے۔ میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا تھا کہ میری بیوی باپردہ عورت ہو، سیپ میں چھپے موتی کے مانند قیمتی ہو اور خاص مجھے ہیرے کی طلب کبھی نہیں رہی جس کی چمک سب کی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ تم میرے لیے وہی سیپ کا موتی تھیں اور ہو۔'' وہ سنجیدگی اور بہت نرمی سے کہہ رہا تھا۔

''پچھلے دنوں میں بڑی عجیب سی الجھن میں مبتلا رہا جب میں نے لوگوں کو اپنی حبہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پایا۔ کیا تمہیں کبھی محسوس نہیں ہوا۔'' نرمی سے اس کے ہاتھ سہلاتا وہ سوال کر رہا تھا اور وہ اس غیر متوقع سوال پر ششدر سی حمدان کو دیکھنے لگی تھی۔

''حبہ ریلیکس یار!'' اس کا ماند پڑتا چہرہ حمدان کو شرمندہ کر رہا تھا لیکن یہ کوتاہی بھی نظر انداز کیے جانے والی نہیں تھی۔

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' اس کا لہجہ اندر کی ناگواری اور غصے کا عکس دکھلا رہا تھا۔

''تمہاری خوشبو تمہارے ہونے کا پتا دیتی ہے۔'' حبہ کی آنکھوں میں استعجاب سمٹ آیا تھا۔ یہ تعریف تو ہرگز نہیں تھی۔

''خوشبو لگانا سنت رسولؐ سے ثابت ہے اور یقیناً باعثِ اجر بھی ہے۔ آپؐ نے فرمایا تمام انبیا کو جو چیز پسند تھی اس میں سے ایک خوشبو بھی ہے۔ آپؐ خوشبو کا تحفہ قبول کرتے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ نے فرمایا اگر کوئی خوشبو کا تحفہ دے اسے واپس

نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ خوشبو خوشگوار ہوتی ہے۔" (ابوداؤد) حبہ کی آنکھوں میں روشنی سی چمکی تھی۔ وہ مزید توجہ سے اس کی بات سننے لگی۔

"لیکن عورتوں اور مردوں کی خوشبو میں فرق ہے۔ سنن نسائی میں ابو ہریرہؓ سے حدیث مروی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا۔ مردوں کی خوشبو وہ ہے جو نمایاں ہو اور عورتوں کی خوشبو وہ ہے جس کا رنگ نمایاں ہو اور خوشبو مخفی ہو..... ہمارے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے میرے اور تمہارے پرفیومز میں حدیث کے مطابق فرق موجود ہے کیا؟" وہ نرمی سے سوال کررہا تھا حبہ بے اختیار نفی میں سر ہلا گئی تھی اسے گفتگو کا مقصد سمجھ آنے لگا تھا۔

"جب تم مجھ سے زیادہ اسلام کو جانتی ہو تم نے کبھی نہیں پڑھا خوشبو لگانے کے آداب کے بارے میں؟" وہ حقیقت میں حیران تھا۔

"میں نے اگر کبھی پڑھا بھی تو میں عمل نہیں کرسکی حمدان۔" وہ سر جھکائے شرمندگی سے اعتراف کررہی تھی۔

"ایسی خوشبو جس سے دوسرے اٹریکٹ ہوں۔ اس کے استعمال سے منع کیا گیا ہے۔ ہماری عورتیں اس عمل کو بہت معمولی سمجھتی ہیں۔ آپؐ نے شدت سے اس عمل کی مذمت کی ہے ابوموسیٰ فرماتے ہیں آپؐ نے فرمایا۔ ہر آنکھ زانی ہے (جس شے سے دیکھنے سے منع کیا گیا ہے وہ دیکھنا) وہ عورت جو خوشبو لگا کر مردوں کی محفل میں سے گزرتی ہے ایسی اور ایسی ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا وہ ایسی اور ایسی کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا وہ زانیہ ہے۔ (جامع ترمذی) اور یہ اس شخصیت کے الفاظ ہیں جو سچوں میں سب سے سچا ہے۔ جب اس نے کہہ دیا تب دنیا کا کوئی بھی انسان خود کو اینڈ نٹ ماڈرن ہائی فائی سولائیڈ (solight) کا ٹائٹل نہیں دے سکتا۔" حبہ کی رنگت پھیکی پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔

"میں عادتاً خوشبو لگاتی ہوں۔ میں نے کبھی اتنی باریک بینی سے نہیں سوچا۔ کبھی لگا ہی نہیں کہ میں نے ایسی خوشبو لگائی ہے جو دوسروں کو بھی متوجہ کرسکتی ہے۔"

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ جولائی 2021ء کی جھلکیاں

پابجولاں

اس شاعر کی زندگی جیل اور جلاوطنی میں گزری

مادر مہربان

غازی ارطغرل کی ماں جس کا تذکرہ تاریخ ساز ٹھہرا

عظیم فرار

وہ سب ناقابل تسخیر زندان سے فرار ہوئے تھے

سروں کی ملکہ

ملکہ ترنم نور جہاں کے وہ واقعات جو بہت کم لوگ جانتے ہیں

پل صراط

عورت کی زندگی غم و آلام ہے، دلچسپ سچ بیانی

اس کے علاوہ

اور بھی بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے

حبہ کے رونے میں شدت آئی تھی۔

''اگر ایسی خوشبو لگا رکھی ہے جو باہر نہیں پھیل رہی تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن ایسی خوشبو جو گاڑی میں بیٹھے ڈرائیور تک پہنچ رہی ہے یا پیدل چلتے ہوئے سڑک پر چلنے والوں تک پہنچ رہی ہے تو اسی سے منع کیا گیا ہے۔ بازار میں بھی جاتے وقت تھوڑی سی خوشبو لگانے سے بھی گریز کریں۔ عورتیں گزر جاتی ہیں اور ان کی خوشبو کے اثرات پیچھے رہ جاتے ہیں اور جو عورت پوری زیب و زینت سے بھی نکلتی ہے ہم اس کی نیت پر شک نہیں کر سکتے کہ وہ بری عورت ہے یا ایسی ویسی ہے۔ بعض اوقات نیت بری نہیں ہوتی۔ اپنا دل تو صاف و شفاف ہوتا ہے لیکن ہم دوسروں کی نیتوں کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔ اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ تم ایسا کام نہ کرو جس کی وجہ سے دوسروں کی نیتوں میں خلل آجائے۔'' وہ نرمی سے سمجھاتے ہوئے اس کے آنسو بھی صاف کر رہا تھا۔

''مجھے کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ میں کتنا بڑا گناہ کرتی رہی ہوں.....'' آنسو اب شرمندگی اور خوف سے بہنے لگے تھے۔ ''پسینے کی وجہ سے ناگوار بُو آنے لگتی ہے جو دوسروں کے لیے تو کراہیت کا باعث ہوتی ہے تو پھر کیا کریں ہم.....''

''بھئی خوشبو لگانے سے تو منع نہیں کیا گیا۔ ایسی خوشبو لگانے سے منع کیا گیا ہے جو پھیلنے والی اور دوسروں کو متوجہ کرنے والی ہو۔ یعنی بہت تیز ہو۔ اس کے آلٹرنیٹ (متبادل) بے شمار چیزیں ہیں۔ رکو ایک سیکنڈ.....'' وہ کہتے ہوئے اٹھ کر الماری کی طرف گیا اور ایک خوب صورت سا بیگ لے آیا۔

''یہ دیکھو یہ ان رولر پاؤڈر، باڈی لوشنز اور ساری چیزیں استعمال ہو سکتی ہیں۔ جن کی خوشبو باہر تک نہیں پھیلتی۔'' وہ ایک، ایک چیز نکال کر اسے دکھا رہا تھا اور حبہ چیزوں کے بجائے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' وہ حیران ہوا۔

''جزاک اللہ حمدان..... اگر آپ احساس نہ دلاتے تو جانے کب تک میں یہ گناہ کرتی رہتی۔'' اب کی بار اس کے ہاتھ تھامتے وہ شکر گزار تھی۔

''اللہ بہت غفور الرحیم ہے۔ وہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور اگر تم لگانا چاہو تو صرف میرے لیے خوشبو استعمال کر سکتی ہو۔'' حمدان اسے تسلی دیتا مسکرایا۔ یک لخت یہ مسکراہٹ قہقہے میں بدل گئی تھی۔

''حبہ کہاں رہ گئی ہو بیٹا..... کب سے میں اور تمہارے انکل نیچے انتظار کر رہے ہیں۔'' اماں دروازہ ناک کرتے خفگی سے کہتی اندر آئی تھیں۔ جہاں حمدان کی مسکراہٹ سمٹی وہاں ہی حبہ بھی بوکھلا کر کھڑی ہوئی۔

''میں آرہی تھی بس۔'' وہ جلدی سے اپنے سر سے سرکتا اسکارف ٹھیک کرنے لگی تھی۔

''روکیوں رہی تھیں..... کیا لڑائی ہوئی ہے تم دونوں میں؟'' وہ ان دونوں کے تاثرات جانچ رہی تھیں۔

''نہیں تو.....؟'' حبہ نے فوراً تردید کی۔

''تو کیا یہ نقش و نگاریوں ہی چہرے پر بکھرے ہوئے ہیں۔''

''اماں کے طنزیہ کہنے پر حبہ نے بے اختیار آئینے میں خود کو دیکھا تو اپنے مضحکہ خیز چہرے کو دیکھتے حمدان کی ہنسنے کی وجہ سمجھ میں آئی تھی۔

''بہت ہی غلط بات ہے یہ۔ ہزار بار منع کیا ہے کہ گھر سے باہر نکلنے سے پہلے بحث و مباحثے سے گریز کیا کرو۔ حمدان تم کچھ احساس کر لیتے بچی کا۔ اچھی بھلی خوشی، خوشی تیار ہو رہی تھی لیکن نہیں تمہیں تو۔'' اماں اب حمدان کی کلاس لے رہی تھیں۔

''مجھے معاف کر دیں..... اللہ تعالیٰ ہر اس گناہ کے لیے جو جانے انجانے میں مجھ سے سرزد ہو جاتا ہے۔'' دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے اس نے اپنے سارے پسندیدہ پرفیومز اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دیے تھے کیونکہ ان کا استعمال اس کی پختہ عادت بن چکا تھا اور وہ آج اور ابھی سے اس عادت کو بدلنے کی کوشش کرنا چاہتی تھی۔

❁❁❁

''اُف کیا بوریت ہے، وہی صبح وہی شام۔'' فری اچانک ہی بول اٹھی۔

''جی ہاں پھر چار دن کی چھٹی پھر وہی بوریت۔'' عریشہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہاں جی..... بقول شاعر

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے''

''یہ ہم لڑکیوں کی بھی کوئی زندگی ہے، بس گھر، گھر کھیلتے رہو لڑکوں کے مزے ہیں، جب دل چاہا باہر نکل گئے، کبھی پکنک تو کبھی کہیں اور اب تو دوستوں کے ساتھ چائے پر اٹھا ہی کافی ہو جاتا ہے مزے ہی مزے۔'' فری نے دل کی بھڑاس نکالی تو عریشہ بھی بول اٹھی۔

''اور ہم بس گھر میں سڑتے رہیں۔''

''اب کیا کریں گے ان چار چھٹیوں میں کچھ تو سوچو۔''

جی لیں زندگی

مریم شہزاد

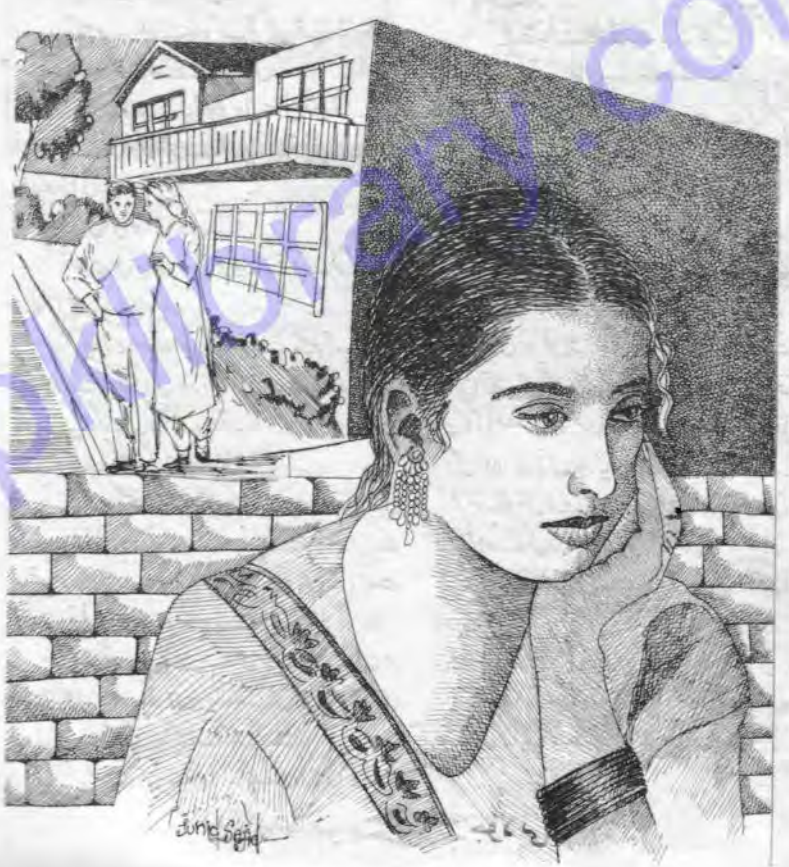

''کرنا کیا ہے! وہی جو ہمیشہ کرتے ہیں، صبح گھر کے کام امی کی ڈانٹ اور پھر موبائل..... لو جی گزر گئیں چار چھٹیاں۔'' فری نے چار چھٹیاں چٹکیوں میں اڑادیں۔

''ویسے کوشش تو کرنی چاہیے شاید کچھ پلان بن جائے۔'' عریشہ نے کہا۔ ''ابو سے بات کر کے دیکھتے ہیں شاید کسی فارم ہاؤس کا ہی پروگرام بن جائے۔''

''plan is nothing, planning is everything''

فری نے کہیں پڑھا ہوا جملہ دُہرایا۔ ''ہم تو صرف پلان بناتے ہیں اور وہ بھی فلاپ پلان..... یہ بھی کوئی زندگی ہے۔''

''کیوں بھئی اب کیا ہو گیا زندگی کو۔'' راحت پھپھو اندر داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

''پھپھو..... ارے واہ کب آئیں آپ؟'' دونوں سب کام چھوڑ کر پھپھو کے گلے جا لگیں۔

''ارے واہ..... یہ چھوٹو گول مٹول بھی آیا ہے۔'' فری نے ننھے علی کو گود میں لے کر پیار کیا تو پیچھے سے مہک کی آواز آئی۔

''میں بھی تو آئی ہوں۔''

''او میری جانو.....'' عریشہ نے مہک کو گود میں لے کر ڈھیر سارا پیار کیا۔

''کیا زبردست سرپرائز دیا ہے پھپھو آپ نے، اتنی بوریت ہو رہی تھی اور ہم سوچ رہے تھے کہ یہ چار چھٹیاں کیسے گزریں گی شکر ہے آپ آ گئیں۔''

''اب رکیں گی ناں، ہفتے بھر تو؟''

''نہیں بھئی، میں بھی بس یہ چار چھٹیاں ہی گزارنے آئی ہوں تمہارے پھوپا چلے گئے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے اور ہم اور بچے میکے میں۔'' راحت نے بتایا تو فری نے اپنا رونا دوبارہ رویا۔

''وہی تو..... یہ لڑکوں کے ہی مزے ہوتے ہیں ہر وقت انجوائے کرتے ہیں، حالانکہ ہمیں بھی تو ایک ہی زندگی ملتی ہے ہم کیوں انجوائے نہیں کر سکتے۔''

''یہ تم سے کس نے کہا کہ ایک ہی زندگی ملتی ہے زندگی تو بار بار ملتی ہے۔'' پھپھو نے کہا۔

''ہائیں، کیا ہو گیا آپ کو! بھلا زندگی کیسے بار، بار ملتی ہے۔''

ابھی راحت نے کچھ جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ امی آ گئیں۔

''راحت پہلے کچھ کھا پی لو پھر ان کے ساتھ دماغ کھپانا۔''

''جی بھابی۔'' وہ فوراً ہی اٹھ گئیں۔ ''پتا نہیں میکے آ کر بھوک کیوں لگنے لگتی ہے، ہر وقت کچھ نہ کچھ مزے کرنے اور کھانے پینے کو دل کرتا ہے۔'' راحت نے دل میں سوچا۔

باہر آئی تو بھائی بھی آفس سے آئے ہوئے تھے، ان سے باتیں شروع ہوئیں تو شام کی چائے کے ساتھ ہی ختم ہوئیں۔

''عریشہ، فری جلدی سے برتن نکال لاؤ، گول گپے بھئی گول گپے۔'' عفان نے پھپھو کے آگے گول گپوں کی تھیلی رکھی اور بہنوں کو آواز دی۔

''واؤ! گول گپے۔'' راحت خوشی سے بولیں۔

''چلو سب آجاؤ میدان میں، مقابلہ شروع کون زیادہ کھاتا ہے۔''

ہنسی مذاق کے دوران گول گپے کھائے گئے اور مقابلہ حسبِ معمول راحت پھپھو نے جیت لیا۔

فری اور عریشہ زندگی بار، بار ملتی ہے کہ فلسفے میں الجھی انتظار میں تھیں کہ پھپھو سے پوچھیں کہ اس بات سے ان کا کیا مطلب تھا مگر رات ہو گئی وہ کبھی ابو کے پاس تو کبھی امی کے پاس اور یہ دونوں پھپھو کے بچوں میں مگن، آخر سونے چل دیں مگر دوسرے دن سب کاموں سے فارغ ہوتے ہی دونوں نے پھپھو کو پکڑ لیا۔

''اب بتائیے کیا کہہ رہی تھیں آپ، زندگی کیسے بار، بار ملتی ہے۔''

تو وہ گویا ہوئیں۔

''دیکھو زندگی بار، بار ملتی ہے مگر مختلف روپ میں اور خاص کر ایک عورت کو تو پتا نہیں کتنی ہی مرتبہ.....''

''مگر کیسے؟''

''وہی تو بتا رہی ہوں، جب ہم پیدا ہوئے زندگی مل گئی پھر اسکول گئے، کالج گئے نئی زندگی، نئی سہیلیاں، نیا ماحول اور پھر شادی۔ شادی کے بعد ایک نئی زندگی شروع جس سے مقابلہ کرنا ایک عورت کا ہی کام ہے کیونکہ عورت ہی گھر بناتی ہے اور عورت ہی بساتی ہے۔ مرد کی تو صرف معاشی ذمے داریوں میں اضافہ ہوتا ہے مگر عورت کو بہو، بیوی، نند بھابی اور نہ جانے کتنے رشتوں کو نبھانا ہوتا ہے، گویا ''ہاں'' کا مطلب ہے ذمے داری ہی ذمے داری۔''

''اُف پھپھو کیسی خطرناک باتیں کر رہی ہیں۔'' فری نے جھرجھری لی۔

''پھر ماں بننے کے بعد تو نئی زندگی ملی ہی ملی بلکہ عورت کی ذمے داری میں صرف اضافہ ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک نیا رشتہ بھی بن جاتا ہے۔ یوں ایک نئی زندگی کی تخلیق کے بعد وہ خود بھی ایک نئی زندگی شروع کر دیتی ہے جہاں نہ نیند اس کی ہوتی ہے، نہ اس کی اپنی کوئی روٹین، سب بچوں کے حساب سے چلنا پڑتا ہے۔''

''تو آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی ایک بار ملتی ہے یہ غلط تصور ہے بلکہ زندگی تو بار، بار ملتی ہے مگر اس کے روپ مختلف ہوتے ہیں، خاص کر عورتوں کے لیے۔''

''ہاں بالکل ٹھیک سمجھی ہو تم..... سب کے لیے ایسا ہی ہے مگر عورتوں کی ذمے داریاں زیادہ ہوتی ہیں ناں.. بہ نسبت مردوں کے۔''

''اور پھپھو جو کہتے ہیں کہ موت ایک بار ہی ملتی ہے، یہ تو صحیح بات ہے ناں؟''

''ہاں بھئی موت تو اٹل حقیقت ہے مگر اس کی تیاری تو زندگی میں ہی ضروری ہے، وہ تو ہماری پوری زندگی کا رزلٹ ہے اور جب رزلٹ آؤٹ ہو گیا تو کوئی فیل کوئی پاس مگر فیل ہونے والوں کے پاس کلاس repeat کرنے کا کوئی آپشن نہیں ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' دونوں نے قائل ہوتے ہوئے سر ہلایا۔

اتنے میں امی نے آ کر کہا کہ ''کچھ آرام بھی کرنے دو پھپھو کو، ب سے باتوں میں لگایا ہوا ہے۔''

راحت نے فری اور عریشہ کو مسکرا کر دیکھا اور کہا۔

مجھے اپنا بنالوگے

اگر تیرے لیے دنیا کی ہر اک چیز کو چھوڑوں
بھلا دوں ضبط کے رشتے
وفا کے پیار کے رشتے
تمہارے پیار کی خاطر میں سب کچھ چھوڑ بھی آؤں
کرو وعدہ
قسم کھاؤ مرے سر کی
مجھے اپنا بنالو گے
اگر ایسا ہی ہے ہمدم
میں سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں
محبت کا وفاؤں کا میں رشتہ جوڑ سکتی ہوں!

کلام: فریدہ جاوید فری، لاہور

''غور کرو اپنی امی کی زندگی پر، کیسے روز، روز نئے چیلنجز ہوتے ہیں انہیں اور وہ کتنی اچھی طرح سب پورے بھی کرتی ہیں۔''

''ہاں جیسے ''نند صاحبہ'' اچانک نازل ہو گئیں۔'' فری نے شرارت سے چھیڑا تو راحت نے کشن اٹھا کر اس کی طرف پھینکا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''بتاتی ہوں تمہیں ابھی، نند کی بچی۔''

''نند کی نہیں، بھابی کی بچی۔'' فری نے اس کا جملہ درست کیا اور باہر بھاگی، پھپھو اپنی بھتیجی کی شرارت پر ہنستے ہوئے نیم دراز ہو گئیں اور سکون سے آنکھیں بند کر لیں کہ ان خوشیوں بھرے لمحات کے لیے ہی تو وہ میکے آئی تھیں۔ جن بیٹیوں کو میکے میں آ کر سکون ملے اور ان کی پہلے سے زیادہ قدر دانی ہو، عزت افزائی ہو تو اس کا زیادہ تر کریڈٹ بھی اس عورت کو ہی جاتا ہے جو اس گھر میں ان کی بھاوج کے روپ میں موجود ہوتی ہے۔

❁❁❁

سلسلے وار ناول

میں عشق ہوں

نایاب جیلانی

عشق، محبت، الفت، چاہت، انسیت، لگاؤ، پیار، اپنائیت۔۔۔ اللہ تعالی کے عطا کردہ حسین جذبے۔۔۔ کہیں یہ پھول برساتے ہیں، زندگی مہکاتے ہیں، سانسوں کو معطر کرتے ہیں، لبوں کو ترنم بخشتے ہیں، تاریک راہوں کو منور کرتے ہیں اور کبھی، کبھی یہ مردہ ہوتے وجود میں زندگی کی نئی لہر بھی دوڑاتے ہیں۔۔۔ غرضیکہ انسانی حیات انہی جذبوں کی مرہونِ منت ہے۔۔۔ لیکن یہی جذبے کبھی عمر بھر کی تلاش کا حاصل ہوتے ہیں اور کبھی ریت کے ذروں کی طرح ہاتھ سے پھسلتے چلے جاتے ہیں اور انسان تہی داماں رہ جاتا ہے۔۔۔ اسی حاصل اور لاحاصل کے گرد گھومتی حساس جذبوں کی آئینہ دار ایک دلکش و دل پزیر تحریر

ابھی تو عشق میں ایسا بھی حال ہونا ہے
کہ اشک روکنا تم سے محال ہونا ہے
ملیں گی ہم کو بھی اپنے نصیب کی خوشیاں
بس انتظار ہے کب یہ کمال ہونا ہے
ہر ایک شخص چلے گا ہماری راہوں پر
محبتوں میں ہمیں وہ مثال ہونا ہے
وصی یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا
اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہونا ہے

pklibrary.com

pklibrary.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

عمائم عالمہ بن رہی تھی، وہ اور عالی جامعہ میں ایک ساتھ پڑھتی تھیں۔ عمائم کو آج کل کچھ کال اور ایس ایم ایس آرہے تھے جو اس کی زندگی میں آنے والے ہر حادثے کی پیشگی اطلاع دے دیتے تھے، عمائم بچپن سے دیکھتی آئی تھی اُسے دولوگوں سے چھپایا جاتا تھا۔ بابا صاحب اور اموجان اور تیسری شخصیت دادی پھپو۔ بابا صاحب کا گھرانا مشترکہ خاندانی نظام کے تحت چل رہا تھا۔ امی، احتشام اور اذان میں دوریاں چاہتی تھیں لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ بسمہ چاچی، عمائم کو کہتی ہیں کہ تمہیں دیکھ کر اپنے خسارے یاد آتے ہیں۔ عمائم، نورس کے ساتھ ٹریم کے گھر تقریب میں جاتی ہے تو نورس اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے ایک لڑکی عمائم کو ایک پارسل دیتی ہے کہ یہ نوس ہیں تم نورس کو دے دینا۔ پولیس راستے میں گاڑی روکتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ میں ایس پی اذان کی کزن ہوں تو آفیسر اس سے معذرت کر لیتے ہیں۔ گھر واپس آتی ہے تو اس کے پاس میسج آتا ہے کہ منع کیا تھا ناں جانے سے۔ صبح عمائم کے کمرے سے وہ پیکٹ غائب تھا۔ کرن، عمائم کو بتاتی ہے کہ جب وہ مہندی کی رات عمائم کو پیکٹ دے کر واپس آئی تو ٹیرس پر اس نے نورس کو دیکھا تھا وہ کسی ضروری کام سے نہیں گئی تھی۔ ثریم بتاتی ہے کہ کرن اغوا ہو گئی ہے، عمائم، نورس سے کہتی ہے کہ کرن اغوا ہو گئی۔ وہ بے قصور تھی تو نورس کہتی ہے کہ تمہیں کیا پتا کہ وہ بے قصور تھی یا گناہ گار..... عمائم، اُمِ رومان کو جو اسے کھانا دینے آتی ہے باتھ روم میں بند کر کے باہر نکلتی ہے اور ایک لڑکی (نور) سے بات کر کے اپنا گاؤن اور کارڈ چینج کر کے جامعہ سے باہر نکل آتی ہے۔ عمائم کے پاس میسج آتا ہے تو وہ اپنی الماری میں دیکھتی ہے تو کپڑوں کے نیچے سے وہ پیکٹ مل جاتا ہے۔ عمائم، نورس سے ملنے جاتی ہے تو نورس اس کی بہت تعریف کرتی ہے اور اسے آفر کرتی ہے کہ اگر وہ نورس کے ساتھ کام کرے گی تو وہ اسے جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر بنا دے گی اور اس کو وہ کلیو دکھاتی ہے کہ کس طرح وہ جامعہ سے بھاگ نکلی تھی۔ عمائم کہتی ہے میں اتنی بھاری ذمے داری نہیں اٹھا سکتی..... عمائم، نورس کو بتاتی ہے کہ وہ پیکٹ مل گیا ہے لیکن پیکٹ سے برآمد چیزیں دیکھ کر وہ کہتی ہے کہ یہ سامان بدل گیا ہے۔ عمائم جامعہ سے واپس جانے کے لیے نکلتی ہے تو احتشام اسے لفٹ دیتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ برطانوی نژاد کرن کی لاش ان کی جامعہ کے بیک سائڈ گٹر سے ملی ہے۔ عالی، کرن کی والدہ سے سوالات کرتی ہے اس رات کے بارے میں تو پتا چلتا ہے کہ کرن نے شاید راستے میں کسی کو لفٹ دی تھی۔ نورس، کرن کے گھر تعزیت کرنے آتی ہے تو عمائم کے ساتھ نورس اور عالی بھی حیران رہ جاتی ہیں۔ پھر وہ تائی امی کو گھر ڈراپ کر کے جامعہ آتی ہیں تو فٹ پاتھ پر ایک بظاہر بزرگ بیٹھا تھا جسے عالی کوئی رقعہ دیتی ہے تو وہ اپنی ٹوگ اتار کر سامنے کی بلڈنگ میں چلا جاتا ہے، عمائم جب عالی سے پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اسے اس نے دس روپے کا نوٹ دیا تھا۔ عمائم واپس وہاں جاتی ہے تو اسے وہ نوٹ ملتا ہے جس پر لکھا تھا کہ میدان خالی ہے۔ جامعہ میں الیکٹریشن آتا ہے تو عمائم اس کے پیچھے جاتی ہے اور اس کو ایک آلہ دیوار میں نصب کرتے دیکھ کر سوچتی ہے کہ نورس کی جان کو خطرہ ہے۔ روشان کے گھر میں اذان اور احتشام تھے وہاں عالی آتی ہے تو احتشام انہیں بتاتا ہے کہ عمائم ان کی باتوں پر چونک رہی ہے۔ تائی امی بتاتی ہیں کہ ایمان نے کہا کہ میں اموجان کی نفرت کی وجہ جانے بغیر پیچھے نہیں ہٹوں گا اور بابا صاحب نے کہا ہے کہ ہمیں عمائم کی خوشی مقدم ہے۔ عمائم کے دل کو بابا صاحب کی باتیں لگی تھیں۔ ایمان، عمائم سے اس کا جواب جاننا چاہتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ میری رائے تائی امی کے پاس محفوظ ہے۔ ایمان، عمائم کو بتاتا ہے کہ اموں نے اس فیصلے پر خاموشی اختیار کی ہے اور خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے۔ لہٰذا اب جلد ہی منگنی ہوگی۔ حریم، عمائم پر منگنی کو لے کر غصہ کرتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ اور کوئی آپشن ہی نہیں تھا۔ بسمہ، عمائم کو بتاتی ہے کہ اموکو جیل میں سے کسی نے فون کیا تھا اس لیے وہ تیار ہوئی ہیں۔ احتشام، عمائم کو کہتا ہے کہ یہ منگنی زیادہ دیر چلتی نظر نہیں آتی۔ دادی، عمائم کو کہتی ہیں کہ مجھے دادی نہ کہا کرو..... میں تمہاری ماں کی ماں ہوں اور عمائم یہ حوالہ جان کر بہت خوش ہوتی ہے لیکن دادی اسے کہتی ہیں کہ ابھی یہ بات کسی کو پتا نہیں چلنی چاہیے اور بابا صاحب اس کے لیے وہی فیصلہ کریں گے جو اس کے لیے بہتر ہوگا۔ عمائم کو میسج آتا ہے کہ ایمان دور اندیش نہیں ہے اور اسے ایسے شخص کا ہاتھ تھامنا چاہیے جو دور رس ہو۔ اموکی طبیعت خراب ہوتی ہے احتشام ان کو اسپتال لے کر جاتا ہے، احتشام سے اموکہتی ہیں کہ ان کا ضمیر انہیں سکون نہیں لینے دیتا۔ احتشام، عمائم سے کہتا ہے کہ تمہاری جامعہ کی ایڈمنسٹریٹر کی جان کو خطرہ ہے لیکن وہ سیکورٹی کی آفر ٹھکرا چکی ہے اگر وہ اسے راضی کر لے تو ان کی آفر برقرار ہے۔ عمائم کی ایمان سے منگنی ہو جاتی ہے، عمائم رات کو ماہم کو..... بے حال دیکھتی ہے تو اسے حیرت ہوتی ہے کہ وہ ایمان کے لیے اتنا آگے چلی گئی۔ ایمان، عمائم سے ڈنر پر چلنے کے لیے کہتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اسے منگنی کے بعد فون پر باتیں کرنا پسند نہیں ہے۔ نورس، عمائم کو بتاتی ہے کہ اس نے کرن سے لفٹ لی تھی لیکن پوچھ گچھ کی وجہ سے یہ بات سب سے چھپائی تھی۔ احتشام اور اذان کو بریفنگ میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک نجی نمائش میں دہشت گردی کی باوثوق

اطلاعات ہیں۔ بسمہ، عمائم کے پوچھنے پر کہتی ہیں کہ انہوں نے تمہارے باپ کو قتل کیا تھا۔ عمائم اس بات پر یقین نہیں کرتی، اذان اور روشان، عمائم کی منگنی پر احتشام کے رویے پر حیران تھے۔ اذان، احتشام سے کہتا ہے کہ وہ ایمان کو سب بتا دے لیکن وہ اس بات پر کان نہیں دھرتا۔ احتشام کو بہت پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ عمائم کو سب چھوت سمجھتے ہیں تو وہ اس کی طرف اپنے جھکاؤ کو کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ احتشام کی ماں اسے بتاتی ہے کہ ان سے ایک گناہ ہوا تھا اور وہ آج بھی اس کی گرفت میں ہیں تو احتشام کہتا ہے کہ کیا ہم کفارہ ادا نہیں کر سکتے تو وہ کہتی ہیں کہ اس گناہ کا کوئی کفارہ نہیں ہے، اسے امو سے بچالو یہی کفارہ ہے۔ مسیج آنے پر عمائم، ایمان سے معذرت کرنے جاتی ہے تو امو کی بات سن کر حیران رہ جاتی ہے، وہ ایمان سے کہہ رہی تھیں کہ اس فیصلے سے ماہم، تم، عمائم اور احتشام کوئی بھی خوش نہیں ہے۔ عمامہ سے عمائم تک یہ داستان مت دُہراؤ اتنا کہہ کر وہ بے ہوش ہوجاتی ہیں۔ سب امو کو اسپتال لے کر جاتے ہیں تو کرن کی مما مسز ابرار (سونیا) ان کے گھر آ کر عمائم سے کہتی ہیں کہ میں تمہاری ماں ہوں۔ عمائم، سونیا کے جانے کے بعد خود کو کمرے میں بند کر لیتی ہے تو حریم، احتشام کو بلاتی ہے اور اسے بتاتی ہے لیکن وہ اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور واپس چلا جاتا ہے تو حریم چابیاں ڈھونڈنے جاتی ہے۔ حریم کے جاتے ہی احتشام ایک اوزار کے ذریعے کمرے کا لاک کھول کر اندر داخل ہوجاتا ہے۔ سونیا گھر واپس آ کر ابرار کو بتاتی ہے کہ عمائم کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا اور وہ ثبوت مانگ رہی ہے۔ عمائم کو احتشام سمجھاتا ہے کہ اس معاملے میں لگی گرہوں کو ذہانت سے کھولو گی تو ساری الجھنوں کا حل پالو گی لیکن عمائم ان اجنبی راہوں پر چلنے کو تیار نہ تھی۔ ماما، ماہم کو دیکھتی ہیں تو ان کے ذہن کے پردے پر ماضی کے کردار واضح ہوجاتے ہیں لیکن یہ اپنی اور پرائی اولاد کا فرق تھا کہ آج وہ چاہتی تھیں سب کچھ ماہم کی مرضی کے مطابق ہوجائے۔ احتشام، ماہم سے کہتا ہے کہ محبت ایثار کا جذبہ ہے۔ ماہم کو اس کی بات سمجھ آ گئی تھی۔ عمائم جامعہ جانے کے لیے نکلتی ہے تو گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے ایمان اسے اپنی گاڑی میں ڈراپ کرنے کا کہتا ہے اور پھر اسے ایک ریسٹورنٹ لے جاتا ہے تو عمائم گاڑی سے نہیں اترتی کہ اسے شادی سے پہلے یہ سب پسند نہیں۔ ایمان غصے میں واپس لے آتا ہے...... تائی امی، عمائم سے اس عورت کے بارے میں پوچھتی ہیں تو وہ بتاتی ہے کہ وہ کرن کی مما مسز ابرار تھیں۔ تائی امی کہتی ہیں کہ اب شادی کی تیاری کرو کیونکہ ایمان کو جلدی ہے۔ آمنہ، ایمان سے کہتی ہے کہ عمائم کے دو بڑے عیبوں کے ساتھ زندگی کیسے گزارو گے تو ایمان ششدر رہ جاتا ہے۔ جیل والوں سے ملاقات کے بعد بڑوں کی میٹنگ ہوتی ہے تو حریم یہ سن کر خوش ہوتی ہے اور احتشام کو بتاتی ہے کہ شادی کی ڈیٹ تو فکس ہوگئی ہے مگر دادی اس سے خوش نہیں ہیں۔ ایمان، احتشام سے کہتا ہے کہ اس شادی کو رکوانے کے لیے اسے احتشام کی مدد درکار ہے۔ سونیا، ابرار سے کہتی ہے کہ عمائم کو خود ٹھکرایا اور کرن کو تقدیر نے ہم سے جدا کردیا۔ عمائم سوری کرنے کے لیے ایمان کا نمبر ملاتی ہے تو وہ نہیں ملتا۔ ایمان شادی سے انکار کردیتا ہے۔ عمائم کے پوچھنے پر بسمہ بتاتی ہے کہ جیل سے اس کے دو ماموں بسمہ کے شوہر اور ایمان کے والد آرہے ہیں۔ بسمہ اسے بتاتی ہے کہ عمامہ (عمائم کی ماں) کے قتل میں وہ دونوں جیل میں تھے اور بہت عرصے تک طاہر، بسمہ کو ہی گناہ گار گردانتا رہا کیونکہ اس کی بہن کی شہ پر عمامہ نے غلط قدم اٹھایا اور ڈیڑھ ماہ روپوش رہنے کے بعد جب وہ واپس آئی تو تم اس کی گود میں تھیں اور تمہاری دادی نے کہا کہ تم ان کے بیٹے کی اولاد نہیں...... پھر اسے گناہِ کبیرہ کا مرتکب ٹھہرا کر اس کے بھائیوں نے اس کا جنازہ بھی نہیں اٹھایا پھر جیل والوں کو تمہارے اس گھر میں رہنے پر اعتراض تھا۔ اسی لیے ان کا پورشن الگ کرلیا گیا۔ پھر ایمان کی تم سے منگنی کی خواہش پر تقی بھائی کے فون کرنے پر بھابی راضی ہوئیں۔ پھر جب ایمان کو اس پوری کہانی کی بھنک پڑی تو اس نے منگنی توڑ دی۔ عمائم، نانی سے عمامہ کے گناہ کے بارے میں پوچھتی ہے تو وہ بتاتی ہیں کہ وہ اپنے پھوپا کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ عمائم کو اپنے شرمناک حوالے پر رونا آیا تھا۔ احتشام، عمائم کو بتاتا ہے کہ اس کے بہت پوچھنے پر جب اس کی ماں نے بتایا تو وہ اپنے باپ کی قبر پر گیا اور وہیں قریب ہی عمامہ کی بھی قبر تھی۔ وہ عمائم کو سمجھاتا ہے کہ تصویر کا ایک رخ دیکھ کر فیصلہ نہیں کرتے۔ تائی امی، عمائم کو نمائش میں جانے سے منع کردیتی ہیں۔ طاہر، عمائم سے اچھے سے مل کر سب کے خدشات غلط ثابت کردیتا ہے۔ طابہ، تقی سے کہتی ہے کہ عمامہ کی بیٹی بہت پیاری ہے اور اس کی بھابی نے بہت اچھی تربیت کی ہے۔ تقی بتاتا ہے کہ احتشام نے کہا تھا کہ میں نے سب کو راضی کرلیا ہے اور اپنی محبت ہار آیا ہوں۔ ایمان، عمائم سے معافی مانگتا ہے تو عمائم معاف کردیتی ہے۔ تقی، عمائم سے کہتا ہے کہ بیٹیوں کو عمائم کے جیسے ہونا چاہیے فرمانبردار...... عمائم، حریم سے کہتی ہے کہ اسے تائی امی نے منع کردیا ہے اور وہ لوگ بھی نہ جائیں نمائش میں جس پر وہ بہت ناراض ہوتی ہے۔ عمائم کے پاس مسیج آتا ہے اور وہ اسے ملنے کے لیے کہتا ہے تو عمائم کہتی ہے کہ میرے بلانے پر تمہیں آنا ہوگا۔ اس پراوکے کا مسیج آتا ہے۔ فضا میں ایک دم بارود کی بو محسوس ہوئی تھی۔ صوفی صالح کے چھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی جس میں سے دو بیٹے اور ایک بیٹی حافظ قرآن تھی۔ عمامہ، شام سے ملنے آتی ہے تو وہ

pklibrary.com

اسے واپس جانے کو کہتا ہے صوفی صاحب اسے دیکھ کر سوچتے ہیں کہ کہیں جانے کے لیے شام کو کہنے گئی ہوگی۔ طاہرہ، ساس کے پوچھنے پر کہتی ہیں کہ وہ چاہتی ہیں کہ عمامہ ان کی نظروں کے سامنے رہے جس پر وہ کہتی ہیں کہ شام کا رشتہ ان کی بہن نے فیقہ کے لیے دیا تھا۔ لیکن عمامہ اپنی پسند سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ شام کی غیر موجودگی میں اس کا رشتہ فیقہ سے طے پا کر کارڈ بھی چھپوا کر بانٹ دیے اس پر عمامہ، شام کو پیش دلانے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ کہتا ہے کہ مجھے تمہارے باپ کے سر پر رکھے عمامے اور اپنی عزت پیاری ہے۔ تم واپس لوٹ جاؤ۔ طاہر (بھاوج) عمامہ کو کہتی ہے کہ شام بھی تمہیں بہت چاہتا ہے، وہ اسے مجبور کرے گی تو وہ ضرور بولے گا۔ عمامہ، طاہر کے ذریعے شام کو بلاتی ہے اور اس کو سول میرج کے لیے راضی کرتی ہے ساری بات فیقہ سن لیتی ہے۔ عمامہ آنے والے فون پر کہتی ہے صوفی صالح کی بیٹی عمامہ حادثاتی موت کا شکار ہوگئی ہے۔ آپ بارات مت لائیے گا۔ عمامہ کو یہ بات کرتے طاہرہ سن لیتی ہیں، وہ اس پر غصہ کرتی ہیں وہ صوفی صالح سے کہتی ہیں ہم نے جلد بازی کر لی۔ فرخ (منگیتر عمامہ) اور اس کے بہنوئی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے جس میں بہنوئی کی ڈیتھ ہو جاتی ہے، دونوں شادیاں نامعلوم مدت کے لیے کینسل ہوگئیں۔ شمسہ بھابی، عمامہ کو کہتی ہیں کہ طاہرہ سے دور رہو وہ تمہیں نقصان پہنچائے گی۔ عمامہ کا کالج میں ایڈمشن ہوتا ہے تو دادی کہتی ہیں کہ وہ کوئی چاند چڑھائے گی۔ عمامہ کو کالج چھوڑنے شام جاتا ہے تو گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو جاتا ہے اور ایک آدمی ملتا ہے جو عمامہ کے لیے گھٹیا الفاظ استعمال کرتا ہے اور شام کے پوچھنے پر خود کو اس کا باپ بتاتا ہے۔ منصور سیال (شام کا باپ) ایک لالچی آدمی ہے۔ سونیا کے ساتھ عمامہ کالج میں جلد ایڈجسٹ ہو جاتی ہے۔ سونیا جب عمامہ کے ساتھ گھر آتی ہے تو دادی کو وہ بالکل پسند نہیں آتی۔ عمامہ، سونیا کو بتاتی ہے کہ فیقہ کا یہ حشر کیسے ہوا وہ پہلے ایسی نہیں تھی۔ پہلے بہت خوب صورت تھی۔ لبنیٰ، شام کو بتاتے ہیں کہ فیکٹری کے سامنے پلاٹ کا جو کیس تھا وہ ہم ہار گئے ہیں اور وہ پلاٹ منصور سیال نے لیا ہے اور اب وہ ان کے مقابل آ کر بدلہ لینا چاہتا ہے کیونکہ صوفی صالح نے رابعہ (شام کی ماں) کے ساتھ منصور سیال کے سلوک کی وجہ سے اسے جیل کی شکل دکھائی تھی۔ اور وہ شام کو خود لے آئے تھے۔ تاج بیگم (دادی) شام سے کہتی ہیں کہ وہ تین مہینے کے بعد فیقہ سے اس کی شادی کر دیں گی وہ تیار رہے۔ سونیا، عمامہ کو فون کر کے کہتی ہے وہ فیقہ کی برین واشنگ کر کے اس کو صحیح اور غلط فیصلے کی پہچان کروا کر اس کی دوسری جگہ شادی کروا دے گی۔ وہ ابھی بات کر رہی ہوتی ہے کہ فون کٹ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد فون پھر بجتا ہے تو فون پر سونیا کے دھوکے میں شام کے باپ منصور سے کہہ بیٹھتی ہے کہ وہ شام کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ طاہر، عمامہ کو بتاتی ہے کہ اس نے منصور اور اس کی باتیں سن لی تھیں۔ طاہر اور (وکیل) بسمہ ہمدانی کو منصور ہوٹل میں چائے پیتے دیکھ لیتا ہے۔ منصور سیال، شام سے دوبارہ بیس ہزار روپے لیتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ صالح کی بہن سے شادی کر کے اپنے جذبات اور زندگی کے ساتھ کیوں کھیل رہے ہو پھر وہ صوفی صالح کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ عمامہ اور شام کی شادی کر دیں۔ طاہر اپنی پسند کو لے کر گھوم پھر سکتا ہے تو میرا بیٹا کیا گناہ کر رہا ہے۔ سونیا کالج نہیں آ رہی تھی تو عمامہ فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرتی ہے اور اپنے آنے کا کہتی ہے پھر بڑی مشکل سے وہ اجازت لیتی ہے تو دادی کہتی ہیں کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ جاؤ لیکن طاہرہ، شام کو فون کر کے بلا لیتی ہیں۔ سونیا اس کے آنے سے بہت خوش ہوتی ہے۔ سونیا، عمامہ کو بتاتی ہے کہ اس کی بہن کو محبت ہوگئی ہے۔ عمامہ کہتی ہے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے..... پھر وہ چونکتی ہے کیا تم دونوں کو ایک ہی بندے سے محبت ہوگئی ہے۔ سونیا، طاہر سے مارکیٹ میں ملتی ہے تو منصور سیال اسے دیکھ لیتا ہے اور پھر صوفی صالح کو فون کر کے کہتا ہے کہ تمہارا بیٹا دو، دو لڑکیوں کے ساتھ عیاشی کرتا پھر رہا ہے۔ سونیا، عمامہ کو بتاتی ہے کہ میں نے اپنا رستہ بدل لیا ہے۔ سونیا، عمامہ کو اپنے منگیتر سے ملواتی ہے تو فیقی جو عمامہ کو لینے آتا ہے وہ دیکھ لیتا ہے اور عمامہ پر غصہ کرتا ہے۔ فیقہ، سونیا کا نمبر عمامہ کی ڈائری سے لے کر اسے فون کر کے مدد کرنے کا کہتی ہے سونیا، فیقہ کی مدد کرنے کی ہامی بھرتی ہے اور پھر اس کا حلیہ بدل دیتی ہے اور کہتی ہے کہ آپ یہ احسان اتار سکتی ہیں۔ شام اور فیقہ کا جوڑ نہیں ہے اور وہ ایک بہت زبردست پروپوزل لائی ہے لیکن دادی اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتی ہیں کہ ہمارے ہاں بچپن کے رشتے توڑے نہیں جاتے۔ شام، عمامہ کے استفسار پر کہتا ہے کہ تمہارے علاوہ کوئی بھی ہو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ صوفی صالح، طاہر سے لڑکی کے بارے میں پوچھتے ہیں اور ایڈووکیٹ ہمدانی کی بیٹی بسمہ کا سونیا کی بہن ہونے کا سن کر فوراً اس کی شادی طے کر دیتے ہیں۔ عمامہ، سونیا سے کہتی ہے کہ محبت حق نہیں مقدر ہوتی ہے اور اس نے محبت اور عزت کی جنگ میں عزت کو جیت لیا ہے۔ شام کو دیکھ کر عمامہ کا ساکت ہونا فیقی کو بہت عجیب لگتا ہے۔ شام، طاہرہ (عمامہ کی ماں) سے معافی مانگتا ہے کہ میں نے عمامہ کا دل توڑا ہے۔ میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔ طاہرہ کہتی ہیں کہ تم اپنے حصے کی خوشیاں حاصل کرو وہ تمہارے رستے میں کبھی نہیں آئے گی۔ حالانکہ ابھی دو دن پہلے ہی وہ صوفی صالح کے پاس گئی تھیں کہ کسی طرح وہ یہ شادی رکوا دیں۔ لیکن انہوں نے

صاف انکار کر دیا تھا کہ میں زبان دے چکا ہوں وہ میری بیٹی جیسی بہن ہے میں اس کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔ تقی کے پوچھنے پر طاہر اسے بتاتی ہے کہ شام اور عمامہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور اس نے جب بتانا چاہا تو تقی نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔ طاہر، راقعہ کو بتاتی ہے کہ تقی کو پتا چل گیا ہے لیکن اب کیا فائدہ یہ بات عمامہ سن لیتی ہے۔ نکاح کے بعد شام، عمامہ سے کہتا ہے کہ ''میں خود کو مار آیا ہوں.....'' شام، فقہ سے کہتا ہے کہ میں آپ سے مخلص ہوں اور کبھی آپ کو تکلیف نہیں دوں گا۔ اور آپ سے بھی یہی امید رکھتا ہوں۔ طاہرہ، عمامہ سے کہتی ہیں کہ تم کبھی شام کی راہوں میں نہیں آؤ گی۔ طاہر کے کالج نہ جاسکنے پر شام، عمامہ کو پک کرنے چلا گیا اور واپسی پر وادی کو پتا چلتا ہے تو وہ عمامہ کی درگت بنا ڈالتی ہیں۔

اب آگے پڑھیے

قسط نمبر:19

معاً بڑے ہال سے ملی جلی آوازیں ابھریں۔ تائی امی، بڑی امی، امو، ماما اور باقی لوگ..... جیسے ہر کوئی اونچی آواز میں اظہارِ افسوس کر رہا تھا۔ تبصرہ کر رہا تھا۔

''فورٹ پارک میں ہونے والی نمائش کے دوران ایک ساتھ کئی بم دھماکے..... انتہائی سکیورٹی کے باوجود لگاتار دھماکے ہوئے۔ سیکڑوں طالبات جاں بحق..... جامعہ کی سالانہ فنڈنگ نمائش میں دھماکے کی مصدقہ اطلاعات..... کئی شہری ہلاک اور متعدد زخمی..... انتہائی جانی نقصان..... بچیوں کی شناخت تک دشوار.....'' آگے مزید تفصیلات بتائی جارہی تھیں۔ ہر کوئی غم زدہ تھا۔ افسردہ تھا، افسوس کر رہا تھا۔

عمائم کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔ سر پر آسمان آگرا تھا۔ اس کا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔ جھکڑوں کی زد میں تھا۔ کیا یہ وہی نمائش تھی جس میں جانے سے تائی امی نے روکا تھا۔ کیا یہ وہی نمائش تھی جس کے بارے میں اس نے بھیانک خواب دیکھا تھا۔ پھر نور، ثریم اور عالی کو بھی منع کیا۔

اور اب کیا ہوا تھا..... ؟ عالی، نور، ثریم، نورس..... اور وہ سیکڑوں جامعہ کی طالبات.....؟ عمائم کا دل جیسے بند ہونے لگا تھا۔ اس نے بمشکل لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا۔ ہال میں پلازمہ ٹی وی پر ابھی تک بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ ساتھ عالی کے خوب صورت فوٹوز، وہ عالی ہی تھی۔ وہ بالکل عالی تھی۔ عمائم نے اسے پہچان لیا تھا۔

''مشہور جرنلسٹ، ہوسٹ، ٹی وی اینکر عائلہ اپنی پیشہ ورانہ خدمات سرانجام دیتے ہوئے سانحہ فورٹ پارک میں جاں بحق.....'' آگے مزید تفصیلات بتائی جارہی تھیں۔ اور عمائم کو اپنی چیخوں پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ وہ اونچی آواز میں دھاڑیں مار، مار کر رونے لگی تھی۔ تائی امی، بڑی امی، امو، ماما، سمیہ سب ہال سے نکل کر عمائم کی طرف دوڑ رہے تھے۔ وہ اونچی آواز میں چیختے ہوئے بے یقینی سے بتا رہی تھی۔ چلا رہی تھی۔

''تائی امی! عالی چلی گئی..... عالی چلی گئی.....'' وہ تائی امی کے بازوؤں میں جھولتے ہوئے بے ہوش ہو چکی تھی۔ یہ صدمہ اتنا بڑا، اتنا خوفناک اور اتنا بھیانک تھا کہ عمائم کو کئی گھنٹے تک ہوش نہیں آیا تھا۔

اور جب ہوش آگیا تب بھی یقین نہیں آیا تھا کہ سانحہ فورٹ پارک میں جاں بحق ہونے والی مشہور جرنلسٹ عائلہ، عمائم کی سہیلی عائلہ ہی تھی یا پھر کوئی اس کی ہم شکل.....

☆☆☆

عائلہ جرنلسٹ تھی، عمائم کو یقین آتا ہی نہیں تھا۔ وہ ٹی وی پر آتی تھی؟ عمائم کو پتا ہی نہیں تھا کیونکہ عمائم نے کبھی ٹی وی دیکھا ہی نہیں تھا۔ اور عالی نے کبھی خود سے بتایا ہی نہیں تھا۔

ایک دن سوئے اتفاق عمائم نے ٹی وی پر عالی کو دیکھا بھی تھا۔ مگر میک اپ، ہیر اسٹائل کی وجہ سے وہ قطعاً پہچان نہیں سکی تھی۔ کیونکہ اسے توقع ہی نہیں تھی کہ عالی بھی ٹی وی پر پہنچ سکتی ہے۔ اور اب سانحہ فورٹ پارک کو ایک

صاف انکار کر دیا تھا کہ میں زبان دے چکا ہوں وہ میری بیٹی جیسی بہن ہے میں اس کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔ تقی کے پوچھنے پر طابہ اسے بتاتی ہے کہ شام اور عمامہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور اس نے جب بتانا چاہا تو تقی نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔ طابہ، رافعہ کو بتاتی ہے کہ تقی کو پتا چل گیا ہے لیکن اب کیا فائدہ یہ بات عمامہ سن لیتی ہے۔ نکاح کے بعد شام، عمامہ سے کہتا ہے کہ ''میں خود کو مار آیا ہوں.....'' شام، فقہ سے کہتا ہے کہ میں آپ سے مخلص ہوں اور کبھی آپ کو تکلیف نہیں دوں گا۔ اور آپ سے بھی یہی امید رکھتا ہوں۔ طاہرہ، عمامہ سے کہتی ہیں کہ تم کبھی شام کی راہوں میں نہیں آؤ گی۔ طاہر کے کالج نہ جا سکنے پر شام، عمامہ کو پک کرنے چلا گیا اور واپسی پر وادی کو پتا چلتا ہے تو وہ عمامہ کی درگت بنا ڈالتی ہیں۔

اب آگے پڑھیے

قسط نمبر:19

معاً بڑے ہال سے ملی جلی آوازیں ابھریں۔ تائی امی، بڑی امی، امو، ماما اور باقی لوگ..... جیسے ہر کوئی اونچی آواز میں اظہارِ افسوس کر رہا تھا۔ تبصرہ کر رہا تھا۔

''فورٹ پارک میں ہونے والی نمائش کے دوران ایک ساتھ کئی بم دھماکے..... انتہائی سکیورٹی کے باوجود لگاتار دھماکے ہوئے۔ سیکڑوں طالبات جاں بحق..... جامعہ کی سالانہ فنڈنگ نمائش میں دھماکے کی مصدقہ اطلاعات..... کئی شہری ہلاک اور متعدد زخمی..... انتہائی جانی نقصان..... بچیوں کی شناخت تک دشوار.....'' آگے مزید تفصیلات بتائی جا رہی تھیں۔ ہر کوئی غم زدہ تھا۔ افسردہ تھا، افسوس کر رہا تھا۔

عمائم کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔ سر پر آسمان آ گرا تھا۔ اس کا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔ جھکڑوں کی زد میں تھا۔ کیا یہ وہی نمائش تھی جس میں جانے سے تائی امی نے روکا تھا۔ کیا یہ وہی نمائش تھی جس کے بارے میں اس نے بھیانک خواب دیکھا تھا۔ پھر نور، ثریم اور عالی کو بھی منع کیا۔

اور اب کیا ہوا تھا.....؟ عالی، نور، ثریم، نورس..... اور وہ سیکڑوں جامعہ کی طالبات.....؟ عمائم کا دل جیسے بند ہونے لگا تھا۔ اس نے بمشکل لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا۔ ہال میں پلازمہ ٹی وی پر ابھی تک بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ ساتھ عالی کے خوب صورت فوٹوز، وہ عالی ہی تھی۔ وہ بالکل عالی تھی۔ عمائم نے اسے پہچان لیا تھا۔

''مشہور جرنلسٹ، ہوسٹ، ٹی وی اینکر عائلہ اپنی پیشہ ورانہ خدمات سرانجام دیتے ہوئے سانحہ فورٹ پارک میں جاں بحق.....'' آگے مزید تفصیلات بتائی جا رہی تھیں۔ اور عمائم کو اپنی چیخوں پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ وہ اونچی آواز میں دھاڑیں مار، مار کر رونے لگی تھی۔ تائی امی، بڑی امی، امو، ماما، بسمہ سب ہال سے نکل کر عمائم کی طرف دوڑ رہے تھے۔ وہ اونچی آواز میں چیختے ہوئے بے یقینی سے بتا رہی تھی۔ چلا رہی تھی۔

''تائی امی! عالی چلی گئی..... عالی چلی گئی.....'' وہ تائی امی کے بازوؤں میں جھولتے ہوئے بے ہوش ہو چکی تھی۔ یہ صدمہ اتنا بڑا، اتنا خوفناک اور اتنا بھیانک تھا کہ عمائم کو کئی گھنٹے تک ہوش نہیں آیا تھا۔

اور جب ہوش آ گیا تب بھی یقین نہیں آیا تھا کہ سانحہ فورٹ پارک میں جاں بحق ہونے والی مشہور جرنلسٹ عائلہ، عمائم کی سہیلی عائلہ ہی تھی یا پھر کوئی اس کی ہم شکل.....

☆☆☆

عائلہ جرنلسٹ تھی، عمائم کو یقین آتا ہی نہیں تھا۔ وہ ٹی وی پر آتی تھی؟ عمائم کو پتا ہی نہیں تھا کیونکہ عمائم نے کبھی ٹی وی دیکھا ہی نہیں تھا۔ اور عالی نے کبھی خود سے بتایا ہی نہیں تھا۔

ایک دن سوئے اتفاق عمائم نے ٹی وی پر عالی کو دیکھا بھی تھا۔ مگر میک اپ، ہیر اسٹائل کی وجہ سے وہ قطعاً پہچان نہیں سکی تھی۔ کیونکہ اسے توقع ہی نہیں تھی کہ عالی بھی ٹی وی پر پہنچ سکتی ہے۔ اور اب سانحہ فورٹ پارک کو ایک

ہفتہ بیت چکا تھا۔ عالی کو مرے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ مگر عائم کو کچھ بھی بھولتا نہیں تھا۔

اور صرف عالی ہی نہیں..... کرن کے بعد ثریم، نور اور جامعہ کی سیکڑوں لڑکیاں اپنے، اپنے خوابوں کو آنکھوں میں بسائے ہی اس دنیا سے چلی گئی تھیں۔

وہ غریب، یتیم، لاوارث طالبات جو جامعہ میں فقہ اور شریعہ پڑھنے آتی تھیں۔ جو قرآن پڑھنے آئی تھیں۔ وہ یتیم اور لاوارث لڑکیاں جو جامعہ میں ہر عمر کے دور سے مقیم تھیں۔ جن کا کوئی آگے پیچھے حوالہ نہیں تھا..... اور وہ غریب لڑکیاں جو اپنے، اپنے اسٹائل سجا کر نمائش میں خوابوں کی تجارت کرنے گئی تھیں سب کی سب تہ خاک ہو گئیں..... ان کے خواب ٹوٹ گئے..... ان کی آنکھیں پھٹ گئیں..... وہ جو خوابوں کی سوداگری کرنے دلوں میں حسرت کے تاج محل سجا کر گئی تھیں۔ اور وہ جو ضرورتوں کے شیش محل سجا کر گئی تھیں۔ کسی نے اپنے بیمار باپ کی دوائی لینی تھی، کسی نے بھائی کو نیا یونیفارم لے کر دینا تھا، کسی نے بہن کو اسکول میں داخل کروانا تھا۔ کسی نے ماں کا علاج کروانا تھا۔ نمائش سے ہونے والی فنڈنگ، ہزاروں روپوں کا منافع، جل کر خاکستر ہو گیا تھا۔ سارے خواب جل گئے تھے کیونکہ خواب دیکھنے والی آنکھیں جل گئی تھیں۔

جامعہ ''عالم سوگ'' میں ایک مہینے تک بند رہا..... اور اس کے بعد دھیرے، دھیرے سے ہی سہی ایک مرتبہ پھر معمولاتِ زندگی معمول پر آ گئے تھے۔

عائم پچھلے ایک مہینے سے جامعہ نہیں گئی تھی پھر بھی اسے خبر تھی ..... جامعہ میں ''نیو ایڈمشن'' ہو رہے تھے۔ بھوک، افلاس اور غربت کے مارے ہوئے دور دراز کے علاقوں سے اپنی آٹھ، آٹھ لڑکیاں پڑھائی کے نام پر جامعہ میں چھوڑ کر جاتے اور پھر پلٹ کر خبر بھی نہ لیتے۔ یہاں روٹی فری، کپڑا مفت اور رہائش پڑھائی کا کھلا انتظام تھا..... پڑھائی نہ بھی ہوتی تو کم از کم روٹی تو ضرور ملتی۔ دور دراز سے آئے دیہاتیوں کو ''روٹی'' سے غرض تھی۔ پڑھائی سے نہیں..... کم از کم لڑکیاں بھوکی تو نہیں مریں گی۔

اور سانحہ فورٹ پارک کے بعد خالی ہوا جامعہ ایک مرتبہ پھر بے سہارا لڑکیوں سے بھرنے لگا۔ یوں ہی ہوتا ہے، اسی طرح سے ہوتا ہے۔ جانے والوں کے بعد زندگی رکتی نہیں..... آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور پھر زندگی بڑھتی رہی، چلتی رہی، کبھی گھٹتی رہی، کبھی پھسلتی رہی۔ لیکن عائم کو نور، ثریم اور عالی کبھی نہیں بھولی تھیں۔

وہ عالی جو معروف جرنلسٹ تھی مگر عائم کی سہیلی تھی اور عائم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی جبکہ عالی، عائم کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔

عائم کو تو اتنا بھی نہیں پتا تھا، عالی جب اپنے اس ہیرو نما ''وہ'' کا ذکر کرتی تھی تو پس پردہ کسی شخصیت کی طرف اشارہ کرتی تھی۔

عالی کا ''وہ'' بھلا کون تھا؟

عالی اس کا ذکر عائم کے سامنے کیوں کرتی تھی؟ اور عائم اس کا نام کیوں نہیں پوچھتی تھی؟

اور عالی نے کہا تھا، وہ شراب دو آتشہ جیسا ہے۔ دو دفعہ کشید کی ہوئی شراب جیسا..... جیسے شرابی آنکھیں..... اسے دیکھ کر ''شراب طہور.....'' کا نشہ چڑھ جائے۔

اور عالی کا ''وہ'' اب کہاں تھا؟

اور پھر عالی کے مشکوک انداز؟ معنی خیز جملے..... وہ کچھ انکشافات بھی کرنا چاہتی تھی مگر زندگی نے اسے مہلت نہیں دی تھی۔

اور ابھی عائم، عالی، ثریم اور نور کے غم کو بھلا نہیں سکی تھی جب ایک روز پھر کرن کی مما آ گئیں۔

اب کے ان کی آمد پہلے سی نہیں تھی۔ وہ بڑے طمطراق سے آئی تھیں وہ خوب صورت، ماڈرن ینگ سی خاتون..... حریم نے دیکھا اور پورے گھر میں اعلان کردیا..... ہر کوئی تیزی سے ہال کمرے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ امو، ماما، بڑی امی، تائی امی، نانی اور حتیٰ کہ بابا صاحب بھی۔

اور تائی امی اس ینگ سی ماڈرن خاتون کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ یہ وہی اسٹائلش عورت تھی جس کے گھر عمائم کے ساتھ اس کی بیٹی کے قتل کا افسوس کرنے گئی تھیں۔ وہی جانے پہچانے نقوش، وہی دیکھے بھالے عکس، وہی بھولے بسرے نقش.....

اور پھر کئی خواتین نے ایک ساتھ ہی آنے والی خاتون کو پہچان لیا تھا..... سالوں کا سفر جیسے لمحوں میں طے ہوا تھا۔ یوں لگا، بیچ میں بیس سال آئے ہی نہیں تھے۔ ابھی کل کی تو بات تھی۔ وہ عمامہ کے ساتھ قلانچیں بھرتی آئی تھی۔ پھر اس گھر میں چھاتی چلی گئی۔ کبھی جو کر بنتی اور کبھی دادی کو بے نقط سناتی..... کبھی ہنساتی اور کبھی غصہ کرتی لڑ جھگڑ کر واپس چلی جاتی۔

اس کی بے شمار یادیں اس گھر میں موجود تھیں۔ اور اس کی سب سے بڑی ''یاد'' بسمہ کی شکل میں موجود تھی اور صرف بسمہ ہی کیوں؟ ایک ''نشانی'' تو عمائم کی شکل میں بھی مجسم حقیقت تھی۔

بسمہ نے آنے والی کو دیکھا اور اس پر قیامت گزر گئی تھی۔ یوں لگا، زمان و مکاں بھول گئے ہیں۔ یوں لگا، زندگی میں کوئی حسرت باقی نہیں رہے گی۔ کوئی خواہش باقی نہیں رہے گی۔ کوئی تمنا باقی نہیں رہے گی۔

وہ سالوں بعد اپنی بہن سے ملی اور سراپا آنسو بن گئی۔ ملن کی یہ گھڑیاں بھی دردناک تھیں۔ جانے وہ کتنے کشٹ کاٹ کر آئی تھی۔

آئی تھی تو کیا ایسے ہی آئی تھی؟ محض بسمہ سے ملنے..... کیا وہ اسی مقصد کے لیے آئی تھی؟

نہیں، وہ صرف اس مقصد کے لیے نہیں آئی تھی۔ وہ تو عمائم کو لینے کے لیے آئی تھی۔

اور اس نے بالآخر دھاکا کردیا تھا۔

''میں اپنی بیٹی عمائم کو لینے کے لیے آئی ہوں.....'' وہ آج بھی دعویٰ کر رہی تھی۔ اور اس کا دعویٰ بے شمار لوگوں کے سروں پر بم کی طرح پھٹا تھا۔ کسی آتش فشاں کی طرح پھٹا تھا۔

نانی اور تائی امی حواس باختہ ہوگئی تھیں۔ آخر سونیا کیا کہہ رہی تھی؟ کیوں کہہ رہی تھی؟ عمائم کا سونیا کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ کیا رشتہ تھا؟ یہاں کیوں آئی تھی؟ کس لیے آئی تھی؟ وہ اس گھر سے نکالی گئی تھی، عمامہ کو گمراہ کرنے کے الزام میں..... تو کیا اب وہ انتقام لینے آئی تھی؟ بدلہ لینے آئی تھی؟

لیکن وہ تو عمائم کو لینے آئی تھی۔

یہ شور معمولی نہیں تھا جو تقی صحانی تک نہ پہنچتا، طاہر صحانی تک نہ پہنچتا۔

اور پھر سارا گھر اکٹھا ہوگیا..... ہال کھچا کھچ بھر گیا۔ بھانت، بھانت کے لوگ، بھانت، بھانت کی بولیاں..... نانی، بابا صاحب، تائی امی، بڑی امی جیسے سب تھر تھرا رہے تھے، کانپ رہے تھے۔ ایک دفعہ پھر اس گھر میں کیا ہونے والا تھا؟

سونیا نے ساکت، پتھر میں ڈھلی عمائم کا بازو پکڑ کر کہا۔

''تم میری بیٹی ہو عمائم! میرے ساتھ چلو..... یہ گھر تمہارا گھر نہیں.....'' سونیا کی ''التجا'' پر سارے ہال میں سکوت طاری ہوگیا..... ہر کوئی دنگ تھا، حیران تھا، متعجب تھا، ششدر تھا۔

پھر بیس سال پہلے کی طرح تقی اور طاہر کو ہی میدانِ عمل میں کودنا پڑا تھا۔ کل وہ عمامہ کے لیے ڈھال نہیں بنے

تھے۔ جب عمامہ کی ساس اس پر الزام لگا رہی تھی۔ بہتان لگا رہی تھی۔ تب وہ سب یقین کر رہے تھے، تسلیم کر رہے تھے۔ لیکن آج وہ عمامہ کی بیٹی کے لیے ڈھال بن گئے، سیسہ پلائی دیوار بن گئے..... پہاڑ بن گئے تھے۔

''تم پھر ہماری زندگیوں کو بے سکون کرنے آ گئی ہو..... تمہارا تعلق عمامہ کے ساتھ تھا، عمامہ گئی تو تعلق بھی گیا۔ عمائم تمہاری کچھ نہیں لگتی، یہ ہماری بیٹی ہے، جو گناہ تم نے کیا..... اپنے باپ کے منہ پر کالک مل کے..... وہی گناہ تمہاری سہیلی نے کیا..... وہ بھی عمائم کی دعوے دار تھی۔ تم بھی عمائم کی دعوے دار ہو..... عمائم پر تمہارا کوئی حق نہیں.....'' تقی کے دوٹوک سنجیدہ اور ٹھوس الفاظ پر سونیا بے قرار ہو کر تڑپنے لگی۔

''میرے پاس ثبوت ہیں.....'' اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''جانے اس کے پاس کیسے ثبوت تھے؟'' اندر ایک عدالت لگی تھی۔ اندر کئی کٹہرے سجے تھے۔ اندر عمائم پر ''بحث'' ہو رہی تھی۔ وہ لوگ جھگڑ رہے تھے۔ ساری عمر عمائم سے نفرت کرنے والے اس وقت ڈھال بنے کھڑے تھے۔ سائبان بنے کھڑے تھے۔ کل جو ''دھتکار'' رہے تھے آج اپنا رہے تھے۔ یہ قدرت کا کیسا انصاف تھا؟ وہ الٹے قدموں منہ پر ہاتھ رکھ کر پلٹتی گئی، پیچھے ہٹتی رہی..... آوازیں بڑھتی رہیں، لپکتی رہیں، اسے تقی صحبانی کی زہر میں ڈوبی آواز سنائی دی تھی۔ ایسا زہر جو عمائم کو بھی نیل، نیل کر رہا تھا۔

''عمائم کی تم کس طرح سے ''حق دار'' ہو..... تم نے بھی تو گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی۔'' تقی کی آواز میں بیس سال پہلے کی پھنکار گونج رہی تھی۔ حقارت گونج رہی تھی۔ طویل گیلریوں میں بھاگتی ہوئی عمائم نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ وہ کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کچھ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ پہلے عمامہ کا شرمناک حوالہ اس کا سر جھکا رہا تھا اب ایک اور حق دار اٹھ رہا تھا جس کا ماضی بھی عمامہ سے مختلف یا الگ نہیں تھا..... ویسا ہی غلیظ، گندا اور ناپاک..... تو عمائم کے نصیب میں کیا ایسے ہی گندے حوالے تھے؟

اسے بھاگتے، بھاگتے ٹھوکر لگی تھی..... کوئی ہال کمرے میں بڑی شدت سے چلایا تھا۔ بڑی شدت سے پھنکارا تھا۔

''عمامہ ''گند'' اٹھا کر لائی تھی یا ''گناہ''..... وہ تم سے منسوب ہو یا عمامہ سے..... اب سارے پچھلے ''حوالے'' جہنم میں جھونک چکے ہیں..... جن قدموں پر آئی ہو انہی پر لوٹ جاؤ.....''

عمائم جیسے منہ کے بل جا گری..... اس کا ماتھا فرش سے ٹکرایا تھا..... شاید خون بھی نکل آیا تھا۔ لیکن وہ اندھا دھند پھر سے اٹھ کر بھاگ پڑی تھی۔ وہ ان آوازوں سے دور جانا چاہتی تھی۔ وہ اس گھر سے دور جانا چاہتی تھی۔ وہ ان حوالوں سے دور جانا چاہتی تھی۔

یہ حوالے جو ہار، ہار ماضی کی طرف دھکیلتے تھے۔ جہاں عمامہ کھڑی تھی۔ جہاں سونیا کھڑی تھی۔ اور عمائم کو گناہوں کی ''غلاظت'' کہا جا رہا تھا۔ وہ کس کا ''گند'' تھی، وہ کس کا ''گناہ'' تھی؟ پھر اسے تائی امی کی آخری آواز سنائی دی تھی۔

''میری عمائم کہاں گئی؟''

اور عمائم نے آخری مرتبہ اونچے محرابوں والے اس گھر کی طرف دیکھا تھا پھر اندھا دھند بھاگ پڑی۔ وہ سارے غلیظ حوالوں کو اپنے پیچھے چھوڑ آئی تھی..... وہ سب کے سوالوں کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اس کے سامنے ماربل کی لشکتی عمارت کھڑی تھی۔ جس کی پیشانی پر ''جامعہ امِ عمارہ'' لکھا تھا۔ اور بالآخر عمائم اپنے آخری ٹھکانے پر پہنچ گئی تھی۔ اس کی آخری اور پہلی منزل..... جانے وہ کہاں، کہاں بھٹکتی رہی تھی۔ کہاں، کہاں دھکے کھاتی رہی تھی۔ اسے تو یہیں آنا تھا۔ اسی جگہ پر آنا تھا..... یہاں پر ''لاوارث'' لوگ آتے تھے۔ بے سہارا لوگ آتے تھے جن کا کوئی ٹھکانا

نہیں تھا..... جن کا کوئی سہارا نہیں تھا۔

وہ جامعہ کی طویل راہداریوں میں چلتی رہی۔ بھاگتی رہی، لیکن پیچھے آتی یادیں اور باتیں ساتھ لپک کر آرہی تھیں۔ تعاقب کرتی، گھات لگاتی بھاگ رہی تھیں۔

اسے جامعہ کے طویل کاریڈور میں کہیں نور کھڑی دکھائی دی۔ کہیں ثریم اور کہیں پُراسرار سی عالی..... لیکن آنکھیں مسل، مسل کر دیکھنے پر بھی کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔ کوئی عکس، کوئی نقش، کوئی منظر کہیں نہیں تھا۔ سارا جامعہ اجنبی لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ جانے پہچانے سارے چہرے سانحہ فورٹ پارک کا شکار ہو گئے تھے۔ اب تو نئے لوگ تھے، نئے چہرے تھے، جو نہ عمائم کو پہچانتے تھے اور نہ جنہیں عمائم پہچانتی تھی۔

وہ چلتے، چلتے تھکنے لگی تھی۔ تھک، تھک کر گرنے لگی تھی۔ اور پھر اسے ایک مرتبہ اور ٹھوکر لگی۔ وہ ماربل کے فرش پر گر پڑی تھی۔ معاً وہ سنبھل کر اٹھی۔ اسے نورس سے ملنے کی جلدی تھی۔ وہ اپنے اندر کے جوار بھاٹے کو باہر نکالنا چاہتی تھی۔ نورس کو اپنی ذات پر اترے اندھیرے دکھانا چاہتی تھی۔ لیکن پیچھے سے آتی آوازیں..... کوئی اب بھی چیخ، چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''عمائم میری بیٹی ہے، عمائم میری بیٹی ہے۔'' چیخوں کی آواز بڑھتی جارہی تھی، بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

''میں کسی کی بیٹی نہیں..... میں کسی کی بیٹی نہیں.....'' وہ رو، رو کر بے حال ہو رہی تھی۔ نڈھال ہو رہی تھی۔ پھر اندھیرے کاریڈور میں عمائم کو ٹھوکر نے دوبارہ گرایا تھا۔ وہ پھر سے منہ کے بل گرنے لگی تھی۔ لیکن اس دفعہ کسی نے عمائم کا بازو دبوچا اور اندھیرے تاریک کمرے میں گھسیٹ لیا۔

عمائم کی بے ساختہ چیخ نکلنے لگی تھی۔ کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ عمائم کی چیخیں اندر ہی اندر گھٹ گئی تھیں۔ لیکن اس کی مزاحمت جاری تھی۔ اچانک نیم تاریکی میں بتیاں جل اٹھی تھیں۔ عمائم کے منہ سے ہاتھ اٹھا لیا گیا تھا۔ اسے اندر گھسیٹ کر کمرا لاک کرنے والا اب عمائم کے سامنے تھا۔ جسے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹنے لگی تھیں۔

اس کی موجودگی کم از کم عمائم کے لیے یہاں کسی آتش فشاں کے پھٹ جانے سے کم نہیں تھی۔ وہ جامعہ میں کیسے آیا۔ اندر کیسے داخل ہوا۔ اتنی سیکورٹی کے باوجود..... پھر وہ آیا کیوں تھا؟ کس مقصد سے آیا تھا؟ اور اگر نورس کو پتا چل جاتا.....؟ پھر تو قیامت آجاتی..... اور عمائم تو یہاں ہمیشہ کے لیے آئی تھی۔ اونچے محرابوں والا گھر چھوڑ کر آئی تھی۔ آخری ٹھکانا سمجھ کر آئی تھی۔

اگر نورس کو پتا چل جاتا..... اس اونچی چار دیواری میں ایک اجنبی غیر مرد داخل ہو چکا تھا۔ اور وہ اجنبی عمائم کا رشتے دار تھا..... تب تو قیامت آجاتی۔ یہ عورتوں کا مدرسہ تھا، یہاں غیر محرموں اور مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ نورس نے تو اس کے ساتھ، ساتھ عمائم کو بھی دھکے دے کر نکال دینا تھا۔ اس کا بھلا کیا جاتا.....؟ بس عمائم کا آخری ٹھکانا بھی چھن جانا تھا۔ پھر وہ کہاں جاتی؟ کہاں رہتی؟ پچھلوں کو وہ خود چھوڑ آئی تھی اور اگلے اسے نکالنے والے تھے۔

جامعہ کے رولز، اصول، قواعد کے برخلاف کسی لڑکی یا طالبات کے لواحقین اندر نہیں آسکتے تھے۔ جو آتے وہ باہر تک محدود رہتے..... غیر مردوں، طالبات کے رشتے داروں اور مہمانوں تک کا داخلہ ممنوع تھا۔

پچھلے چند ایک سال میں کچھ آوارہ لڑکے جامعہ کی سطحی لڑکیوں کے پیچھے دیواریں پھلانگ آئے تھے۔ نورس نے انہیں ''ڈیل'' کر کے جامعہ سے نکال دیا تھا۔ سیکورٹی سخت تھی۔

اور اب عمائم کا بھی ویسا ہی انجام ہونے والا تھا۔ جو کچھ وہ پیچھے سے ''غم'' کرب اور صدمات کے بوجھ اٹھا کر لائی تھی وہ کیا کم تھے جو نئی کہانی، نئی داستان، اور نئی ذلت کی تاریخ رقم ہونے جارہی تھی۔ کل ہی سارے جہان

میں خبر نشر ہو جاتی۔

''جامعہ ام عمارہ کی سینئر اسٹوڈنٹ اپنے معشوق کے ساتھ جامعہ کے اندر سے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔'' اس سوچ نے تو اس کی جان ہی نکال دی تھی۔ ذلتوں کے جو بوجھ اس کے پیچھے چلے آئے تھے..... اب دُگنی شکل اختیار کرنے والے تھے۔ اور عمائم سب کچھ برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن اپنی عزت اور کردار پر حرف آنا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ابھی ایک قیامت کو وہ سہہ کر آئی تھی۔ اب نئی ''قیامت'' سامنے کھڑی تھی اور عمائم کی آنکھیں پھٹ، پھٹ کر تھکنے لگی تھیں۔ تھک، تھک کر بہنے لگی تھیں۔ اور پھر بہہ، بہہ کر سوکھنے لگی تھیں۔ لیکن سامنے کھڑے وجود پر کوئی ''اثر'' نہیں تھا۔ وہ بڑے اطمینان اور سکون سے کھڑا تھا۔ بڑے سکون سے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ایک، ایک تاثر کو نوٹ کر رہا تھا۔ پھر کئی لمحے دبے پاؤں گزر گئے تھے، معاً اس نے از خود گہری، گمبھیر اور خوفناک خاموشی کو توڑ دیا تھا۔

''تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں..... کسی سے بھی.....'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا تھا۔ پھر کرٹن کی ڈوریاں کھول کر پلٹ کر عمائم کی طرف آیا۔

''اور مجھے پورا یقین تھا..... گھر میں لگی ''عدالت'' سے گھبرا کر تم یہیں آؤ گی..... ہر انتہائی منفی بات جو لوگ سب سے آخر میں سوچتے ہیں، وہ تم سب سے پہلے سوچتی ہو..... یہ تمہاری کمزوری نہیں، عیب ہے۔'' اس کا لہجہ دو ٹوک تھا۔ عمائم جیسے دم بخود ہو رہی تھی۔

''آدھی، ادھوری باتوں کو سن کر فیصلے نہیں کرتے۔ عمل بھی نہیں کرتے۔ بدگمان بھی نہیں ہوتے۔ اور خود کو ڈی گریڈ بھی نہیں کرتے.....'' وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ سنجیدہ، مستحکم اور ٹھوس لہجے میں بولتا ہوا۔

''اگر تم کچھ دیر مزید وہاں رک جاتیں تو ابھی مجھے اتنی لمبی داستان تمہیں سنانا نہ پڑتی۔ وہ داستان جو صدیوں سے بند تھی۔ بوسیدہ کتاب کا حصہ تھی۔ غلیظ لفظوں سے اٹی ہوئی تھی۔ جسے کوئی کھولنا پسند کرتا تھا۔ نہ پڑھنا پسند کرتا تھا..... دیکھنا تو بہت دور کی بات تھی۔ اس بوسیدہ کتاب کو آج مسز سونیا ابرار نے کھول دیا..... اس انداز میں کہ نہ کوئی سوال رہا نہ کوئی جواب رہا..... سارے بادباں کھل گئے تھے۔ سارے راز افشاں ہو گئے تھے۔ ساری حقیقتیں اپنی کریہہ صورت کے ساتھ نمودار ہو گئیں۔ اس حال میں کہ ''بارِ ندامت'' کو اٹھانا محال ہو گیا تھا۔'' وہ لمحے بھر کو رکا۔

''آؤ..... عمائم..... میں تمہیں اونچے محرابوں والے اس گھر میں بیس سال پہلے لے چلوں..... جس میں..... بے شمار گیلریاں تھیں..... برآمدے تھے، گلیارے تھے، راہداریاں تھیں۔ اس گھر کے باغیچے میں لاجوردی کنٹھے والے منال ٹہلتے تھے۔ وہ منال اس عمامہ کے تھے جس کی بادامی آنکھوں میں ''شامِ محبت'' شہد کے مانند بہتی تھی۔ وہ محبت جو چڑھنے سے پہلے ڈھل گئی تھی۔ آؤ اور بیس سال پہلے والے ''صحابی ہاؤس'' کا حصہ بن جاؤ.....''

☆☆☆

وہ گرما کے بڑے پُرتپش اور ویران سے دن تھے۔ اتنے ویران کہ صحرا کا گمان ہوتا۔ مغرب سے کچھ پہلے، عصر کے بعد پورب سے گرد کے طوفان اٹھتے تھے اور سارا آسمان غبار آلود ہو جاتا۔

وہ گرما کے ایسے ہی ''پُرحدت'' غضبناک دن تھے اور شاموں میں غبار سے اٹی، گرد میں لپٹی، دھول میں گھری پورب اور پچھم پر مٹی کا جنون چڑھ جاتا اور اونچی، اونچی محرابوں والے گھر میں دھول ہی دھول جمع ہو جاتی۔ یوں لگتا تھا گرد کے طوفان پر نئی، نئی جوانی چڑھی ہو۔ لیکن مغرب کے بعد جوانی کا سورج ڈھلنے لگتا تھا۔ پھر سے طوفان پر سکوت آنے لگتا۔ پھر مست اور سُبک ہوا کا زور بڑھتا اور ٹھنڈی، ٹھنڈی پُرنم پون سی چلتی۔ دور بہت دور کوئی محبت کا

مارا اور عشق میں ہارا...... ستار کی کھرج کو اونچا کرتا...... دردبھری دُھن ابھارتا، کبھی بے خیالی میں ''جواری'' کے سُر ڈھیلے پڑ جاتے پھر وہ اس ڈور کو جو ستار یا طنبور کے اوپر لگا ہوتا تھا۔ اس کو درست کرتا کیونکہ سُروں کا اونچا کرنا اسی پر موقوف تھا۔ جیسے ہی ستار کی گھوڑی کے سُر ترتیب میں آ جاتے۔ فضا میں سوز بھرے نغموں کی دھنیں بکھر جاتی تھیں۔ اور عمامہ کے اندر ''جوار'' ابھرنے لگتا۔ سمندر کا اتار جزر کے خلاف ایک تلاطم جوار بھاٹا اُمڈتا تھا۔ سمندر کے پانی کا اتار چڑھاؤ جو چاند کی کشش سے روزمرہ ہوتا ہے، مدوجزر جیسے......

وہ سبز دریچے میں کھڑی پہروں سوچتی تھی۔ اسے پتھریلی روش پر پٹختی عمامہ بھولتی نہیں تھی۔ وہی پتھریلی روش، جس پر سر جھکائے وہ مگن سی اپنے دھیان میں گم چلا کرتی تھی۔ اس دن بھی چل رہی تھی۔ گم صم، اپنے دھیان گیان میں کچھ سوچتی ہوئی، کچھ الجھتی ہوئی۔

اور تب ہی اچانک دادی اس پر کسی بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑی تھیں۔ انہوں نے اس کے منہ پر کس کے تھپڑ مارا تھا۔ وہ منہ کے بل گر پڑی۔ اس کی ساری کتابیں جابجا فرش پر بکھر گئی تھیں۔ وہ اتنی ششدر اور حواس باختہ تھی کہ دادی کے منہ سے نکلتے مغلظات کے طوفان کو بھی سمجھ نہیں سکی تھی۔

''بے حیا! تو کب چھوڑے گی میرے بچے کا پیچھا...... تجھ میں ذرا بھی غیرت نہیں...... اللہ کا خوف نہیں...... اس کو ''ورغلا'' کر گلچھرے اڑاتی ہے۔ کم بخت...... تیرے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔'' وہ عمامہ کی دادی نہیں کوئی پھنکارتی ناگن لگ رہی تھیں۔ جن کے منہ کو انسانی خون لگ گیا تھا۔ وہ بے حواس سی زہر اگل رہی تھیں۔

''کالج کے نام پر جس ''عیاشی'' کا ڈراما رچا رکھا ہے اگر تو میری آخری وارننگ کو بھی نہ سمجھی تو سارا کچا چٹھا تیرے باپ اور بھائیوں کے سامنے کھول دوں گی۔'' دادی کا دوپٹا اتر گیا تھا۔ بال بکھر گئے تھے۔ وہ اس پر جھپٹ

جولائی 2021ء کے شمارے کی ایک جھلک

کانچ محل
طاہر جاوید مغل کے قلم سے آخری صفحات پر دلوں کو گرماتی تحریر...... ٹوٹے خوابوں کی کرچیوں پر محوِ سفر...... ایک بے باک مگر گھائل عشق اور حسن کی فتنہ سامانیوں کی طویل داستان

فخر آدمیت
تا قیامت انسانیت جس پر فخر کرے...... ایسے انسان بہت نایاب ہوتے ہیں زویا اعجاز کے قلم سے تاریخ کے ایک بہت خوب صورت پہلو پر روشنی......

شہ زوز
عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال اسما قادری کے قلم کا کمال

ساشا
کبھی پر خطر جزیروں، کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان...... عمر عبداللہ کے قلم کا شاہکار

سسپنس کلاسک
محی الدین نواب
کی خوب صورت تحریر کا انتخاب

اس کے علاوہ
نجمہ مودی، تنویر ریاض، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، صبا مغل، منظر امام، اعتزاز سلیم وصلی، اور شاہ زین رضوان کی خوب صورت تحریریں

pklibrary.com

بڑی تھیں۔
''یہ میری شرافت ہے جو خاموش ہوں...... اور تجھے آخری مرتبہ سمجھا رہی ہوں...... اب بھی تو باز نہ آئی تو دیکھنا میں تیرا کیا حشر کرتی ہوں...... صالح سے تجھے کوڑے پڑواؤں گی......'' وہ زخمی شیرنی کی طرح پھنکاریں۔
''بے غیرت...... تیری ناک سے ''بو'' مک مکا گئی ہے۔ ایسا بھی کیا عشق کا بخار...... جو اتر کر نہیں دے رہا۔'' دادی غرا، غرا کر تھکنے لگی تھیں۔
''جس دن بھائیوں کی مار پڑی، اس دن تیرے سارے نشے ہرن ہو جائیں گے۔ پھر ماں کے چرنوں میں بیٹھ کر رونا...... جس کی شہ پر میری بیٹی کا گھر اجاڑ رہی ہو۔'' دادی نے ہانپ کر کہا تھا۔ طاہرہ، رافعہ، طابہ اور بسمہ شور کی آواز سن کر بھاگتی ہوئی چلی آئی تھیں۔ فیقہ بھی حواس باختہ سی پہنچ گئی۔ پتھریلی روش پر گری عمامہ کو دیکھ کر طاہرہ کے دل پر گھونسا پڑا تھا۔ وہ جیسے چیخ پڑی تھیں۔
''اماں...... خدا کا خوف کریں...... اللہ کے قہر سے ڈریں...... کیوں میری بیٹی کو رسوا کر رہی ہیں؟'' طاہرہ کا کلیجا پھٹ گیا تھا۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ ساس کے سامنے بلند آواز میں بول رہی تھیں۔ بہوؤں کے سامنے اس عظیم ذلت پر وہ شرم سے مر رہی تھیں۔ دادی جیسے پھنکار اٹھیں۔
''تمہاری بیٹی میری بچی کا گھر اجاڑ رہی ہے۔ ارے، ذلیل تو اس نے ہمیں کر دیا ہے۔ منہ چھپانے کو کہاں جائیں......''
''آپ عمامہ پر الزام مت لگائیں......'' طاہرہ نے غرا کر کہا تھا۔ بسمہ جلدی سے لپک کر آئی تھی۔ اس نے بمشکل عمامہ کو اٹھایا۔ اس کے بال سمیٹے، کتابیں اٹھائی تھیں۔ وہ اس صورتِ حال پر سخت حواس باختہ تھی۔ بسمہ کبھی ایسی سچویشن سے دوچار نہیں ہوئی تھیں۔ اس کے گھر کا ماحول ایسا نہیں تھا۔
''میں بڈھی جھوٹ بولتی ہوں......'' دادی پھر سے چلا اٹھیں۔ ''اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ دفتر سے اٹھ کر اسے گھر چھوڑ گیا۔ کیا تم اندھی ہو تمہیں ''رابطے'' نظر نہیں آتے۔ اسے دفتر میں بیٹھے الہام ہو گیا تھا کہ اس ''بی بی'' کو گھر چھوڑ کے آنا ہے... اور جانے یہ کالج گئی بھی یا نہیں...... یا نہیں...... اسی کے ساتھ گلچھرے اڑا، اڑا کر پہنچ گئی......'' دادی کے صاف الزام پر طاہرہ کا دماغ گھوم گیا۔ ان کی بادامی آنکھوں میں غیظ بھر گیا۔ وہ جیسے پھٹ پڑیں۔
''مجھے تقی نے فون کر کے بتایا...... وہ فیکٹری سے آ نہیں سکتا۔ شام کو اس نے دفتر فون کیا تھا تا کہ عمامہ کو گھر چھوڑ دے۔ عمامہ کسی کے ساتھ گلچھرے اڑا کر نہیں آئی۔ نہ وہ اپنی مرضی سے شام کے ساتھ آئی ہے۔'' طاہرہ کی وضاحت پر دادی کا منہ کھل گیا تھا۔ فیقہ کے تنے تاثرات میں بھی کمی آئی تھی۔ رافعہ کچھ بدمزہ ہوئی اور طابہ کا استہزا کچھ اور بڑھ گیا۔ عمامہ کی جتنی ہو چکی تھی، یہ کم نہیں تھی۔ بس ایک بسمہ تھی جو اس ساری سچویشن پر انتہائی دکھ محسوس کر رہی تھی۔ بڑی دونوں بھابیاں اپنے، اپنے میکوں میں تھیں۔ سو اس وقت عمامہ کے دکھ پر اکیلی بسمہ پریشان اور غمزدہ تھی۔
''ارے، ہم کیا جانیں......'' دادی خفت چھپاتی اندر بڑھ گئی تھیں۔ فیقہ بھی ایک سلگتی نظر عمامہ پر اچھال کر دادی کے پیچھے چلی گئی تھی۔ طابہ اور رافعہ بھی منظر سے ہٹ گئیں۔ بسمہ نے بمشکل عمامہ کو اٹھایا اور طاہرہ کے ہمراہ کمرے میں لے آئی۔ اس کارواں، رواں اس درندگی پر سسک رہا تھا۔
''اتنی جہالت......؟ بغیر وضاحت لیے فحش الزامات حد ہے یہاں تو......'' بسمہ نے عمامہ کے سوجے گال سے آنسو صاف کیے تھے۔ طاہرہ گرم ہلدی دودھ بنا کر لے آئیں۔ بسمہ اس کا چہرہ صاف کر کے بال سمیٹ رہی تھی۔ اس کے انداز میں بڑی اپنائیت تھی۔ طاہرہ بھی تھکی، تھکی سی وہیں بیٹھ گئیں۔

عمامہ چت لیٹی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہاں ایک تاثر بھی نہیں نظر آ رہا تھا۔ غم کا نہ دکھ کا، نہ ذلت کا۔ وہ جیسے ہر احساس سے عاری ہو چکی تھی۔

اس کے ساتھ اتنا کچھ ہو رہا تھا کہ آہستہ، آہستہ اس کے سوچنے، سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہونے لگی تھیں۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ لوگوں نے اس کے خلاف تلواریں کیوں بلند کر لی تھیں۔ اس کا قصور کیا تھا؟ جرم کیا تھا، گناہ کیا تھا؟

پھر وہ اپنی ماں کے بھیگے چہرے کو دیکھنے لگی۔ وہ کس قدر شکستہ لگ رہی تھیں۔ کس قدر آزردہ لگ رہی تھیں۔ عمامہ کی آنکھیں پھر سے نم ہونے لگیں۔

''اماں کو عمامہ کے بارے میں الہام ہوتے ہیں..... وہ اسے ذلیل کرتے ہوئے کبھی نہیں سوچتیں کہ عمامہ ان کی پوتی ہے۔'' طاہرہ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے رنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔ بسمہ چونک سی گئی۔

''ان کو الہام نہیں ہوتے بلکہ کوئی ان کو مس گائڈ کرتا ہے۔'' بسمہ کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ طاہرہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''کون انہیں مس گائڈ کرنے کی جرأت کرتا ہے..... کون ان کے کان بھر سکتا ہے؟ وہ خود ہی بہت کچھ ہیں۔ وہ عمامہ کو دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ بس چلے تو اس کا گلا ہی گھونٹ دیں۔''

''ہاں... ہے تو...'' بسمہ کہتے، کہتے رک سی گئی تھی۔ طاہرہ چونکیں۔

''کون.....؟'' انہوں نے بلا ارادہ ہی پوچھ لیا تھا۔

''طابہ بھابی.....'' وہ لب بھینچ کر بولی تھی۔ طاہرہ کے ساتھ اب کے عمامہ بھی ٹھٹک گئی تھی۔

''طابہ.....'' ان کی آنکھوں میں عجیب سی ناگواریت در آئی تھی۔ بسمہ کو مزید بھی بتانا پڑا۔

''وہ ٹیرس پر تھیں جب عمامہ آئی۔ طابہ بھابی نے عمامہ کو آتے دیکھا تھا شام کے ساتھ..... یہ تیزی سے نیچے دادی کو اطلاع دینے آئی تھیں۔ پھر دادی پر جن سوار ہو گیا۔''

''یہ طابہ.....'' طاہرہ لب بھینچ کر غصے میں اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھیں۔ عمامہ نے بے ساختہ انہیں روکا تھا۔

''اماں! رکیں.....'' اس نے بے ساختہ ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ طاہرہ بھی ٹھہر گئی۔

''آپ طابہ بھابی کو کچھ مت کہیں..... وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔ آپ منع کریں گی یا ڈانٹیں گی۔ وہ الٹا بے عزتی محسوس کر کے مزید غلط انداز میں بکواس کریں گی۔'' عمامہ کے چپ ہوتے ہی بسمہ نے بھی تائید کی تھی۔

''عمامہ ٹھیک کہتی ہے اماں.....! طابہ بھابی فطرت سے مجبور لگتی ہیں۔'' بسمہ بھی بات بڑھانے کے حق میں نہیں تھی۔ طاہرہ تب مصلحتاً خاموش ہو گئی تھیں تاہم ان کے دل میں بال ضرور آ گیا تھا۔

''مجھے طابہ سے یہ امید نہیں تھی۔'' ان کا غم و غصے سے برا حال تھا۔

''اور مجھے طابہ بھابی سے ہر قسم کی امید تھی۔'' عمامہ زیر لب بڑبڑائی۔ ایک مرتبہ پھر اسے دادی کا تھپڑ یاد آیا۔

☆☆☆

دادی جس بات کو پھیلانا نہیں چاہتی تھی اس بات کو اندر ہی اندر چھپا لیتی تھیں۔

عمامہ کو مارنے والا تھپڑ اور سبب دونوں باتیں انہوں نے دبا لی تھیں۔ انہیں یقین تھا طاہرہ بھی مردوں تک بات نہیں پہنچائیں گی۔ ساری عمر کا ساتھ تھا۔ وہ طاہرہ کی عادت سے واقف تھیں۔ سو اپنے تئیں وہ عمامہ کو مارنے والا تھپڑ بھلا چکی تھیں..... لیکن اس دفعہ ان کی توقع کے برعکس ہوا تھا۔ بات وہاں تک پہنچ گئی تھی جس کی انہیں امید نہیں تھی۔

جانے طاہر کو کس نے معاملے کی بھنک پہنچا دی تھی۔ طاہرہ اور عمامہ ایسی ہمت نہیں کر سکتی تھیں۔ پھر بسمہ کے علاوہ اور کون تھا؟ طاہر صبح، ہی صبح دادی کے سر پر سوار ہو گیا تھا۔ وہ ہکا بکا رہ گئیں..... کیونکہ اس کے تیور بہت برہم تھے۔

''آپ آج کل ہٹلر مانی کیوں بنی ہوئی ہیں؟'' اس کا لہجہ بہت روکھا سا تھا۔ لگتا تھا، بیوی نے خوب پمپ کر

کے بھیجا ہے۔ دادی کے دل میں بسمہ کے خلاف عناد بھر گیا۔

''کیا بکواس ہے؟'' ان کے تیور بھی برہم ہوتے دیر نہیں لگی تھی۔ وہ ساری بات سمجھ گئی تھیں۔

''آپ نے عمامہ کو......'' طاہر نے کچھ بولنا چاہا ہی تھا جب دادی نے چمک کر اسے ٹوک دیا۔

''میری اولاد کی اولاد ہے، میں کسی غلط، درست بات پر اسے منع نہیں کر سکتی...... ڈانٹ بھی نہیں سکتی......؟ غصہ بھی نہیں کر سکتی......؟'' دادی نے الٹا ایسا جذباتی وار کیا تھا کہ طاہر کا منہ بند ہو گیا۔ اب بھلا وہ کیا کہتا؟ اسے بسمہ پر بھی غصہ آیا۔ جس نے غلط بیانی سے کام لیا تھا اور اسے دادی کے خلاف خوب بڑھکایا۔ اور یہ بھی کہا کہ وہ دادی کو سمجھائے، عمامہ بچی نہیں...... جسے سب کے درمیان دادی ڈی گریڈ کرتی تھیں۔ طاہر کچھ شرمندہ ہو گیا۔ دادی اس گھر کی بزرگ تھیں۔ ان سب پر حق رکھتی تھیں اور اچھی بری بات پر ٹوک سکتی تھیں۔

طاہر چلا گیا...... اور دادی فاتحانہ انداز میں مسکراتی رہیں۔ طاہر کو تو انہوں نے خاموش کروا دیا تھا۔ لیکن اگلی شام کچھ عجیب واقعہ ہو گیا۔ بات وہاں تک بھی پہنچ گئی تھی جس طرف ان کا گمان نہیں تھا ہوا کچھ اس طرح...... فیقہ پھر شام ہی بے چین ہو گئی تھی۔ حالانکہ دادی نے بہت روکنا چاہا لیکن وہ ٹفن میں کھانا بھر کے اپنے پورشن میں آ گئی تھی۔ گو کہ شام نو، دس کے قریب آتا تھا۔ پھر بھی وہ اکیلے پن کے باوجود آ گئی۔

آج جو کچھ بھی ہوا تھا فیقہ کو بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ گو کہ ساری وضاحت ہو چکی تھی۔ پھر بھی فیقہ کے دل میں شک کا معمولی بیج گڑ گیا تھا۔ اور اس شک کے بیج کو پانی ہر روز طابہ لگاتی تھی۔ وہ فیقہ کو ہمہ وقت چوکنا رہنے پر اکساتی رہتی تھی۔ اسے کہتی، وہ شام میں عمامہ کو دیکھے...... عمامہ ابھی اس کے اندر سے گئی نہیں...... وہ شام پر نظر رکھے...... اسے ڈھیل نہ دے۔

فیقہ تب سے خوب چوکنا تھی لیکن اسے کوئی قابل گرفت بات نظر نہیں آتی تھی۔ وہ ابھی انہی سوچوں میں گم تھی معاً کھٹکے کی آواز کے ساتھ شام اندر چلا آیا تھا۔ فیقہ چونک کر سنبھل گئی تھی۔ شام اتنی جلدی آ گیا......؟ وہ کچھ حیران ہوئی پھر بھی خیر مقدمی مسکراہٹ سجا کر اس کی طرف بڑھی...... اس کے ہاتھ سے فائلیں، بیگ اور چابیاں پکڑ لیں۔

''چائے لاؤں......؟'' فیقہ نے مسکرا کر پوچھا تھا۔ شام نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں، پانی......'' وہ کپڑے بدلنے واش روم چلا گیا۔ فیقہ کچن میں آ گئی۔ اسے شام کچھ غیر معمولی خاموش اور سنجیدہ لگا تھا۔ عام روٹین میں وہ فیقہ سے باتیں بھی کرتا اور کبھی کبھار ہنسی مذاق بھی...... خاص طور پر آفس سے آ کر وہ خاموش نہیں رہتا تھا۔ بلا ارادہ ہی بولتا رہتا...... حالانکہ وہ خاصا کم گو مشہور تھا۔

فیقہ جانتی تھی یا نہیں جانتی تھی۔ وہ اندر کے شور سے گھبرا کر بولتا تھا یا باہر کے سناٹوں سے۔ فیقہ پانی کے بجائے جگ بھر کے لیموں کی سکنجبین بنا کر لے آئی تھی تب تک شام باہر نکل آیا۔ وہ شاور لے کر آیا تھا۔ گیلے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس نے بالوں میں کنگھا بھی نہیں کیا تھا۔ بے ترتیب بال ماتھے سے چپک رہے تھے۔ فیقہ گلاس بھر کے اس کی طرف آئی۔ شام نے چونک کر پکڑ لیا۔ پھر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے کچھ چونک گیا ہو۔ شاید فیقہ کی موجودگی سے چونکا تھا۔

''آپ واپس آ گئیں......؟'' وہ کافی دنوں سے خالہ کی طرف تھی اور ابھی اس کا آنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔

ہم اسے واپس دیکھ کر وہ حیران کیوں نہ ہوتا؟

pklibrary.com

کے بھیجا ہے۔ دادی کے دل میں بسمہ کے خلاف عناد بھر گیا۔

''کیا بکواس ہے؟'' ان کے تیور بھی برہم ہوتے دیر نہیں لگی تھی۔ وہ ساری بات سمجھ گئی تھیں۔

''آپ نے عمامہ کو.....'' طاہر نے کچھ بولنا چاہا ہی تھا جب دادی نے چمک کر اسے ٹوک دیا۔

''میری اولاد کی اولاد ہے، میں کسی غلط، درست بات پر اسے منع نہیں کر سکتی..... ڈانٹ بھی نہیں سکتی.....؟ غصہ بھی نہیں کر سکتی.....؟'' دادی نے الٹا ایسا جذباتی وار کیا تھا کہ طاہر کا منہ بند ہو گیا۔ اب بھلا وہ کیا کہتا؟ اسے بسمہ پر بھی غصہ آیا۔ جس نے غلط بیانی سے کام لیا تھا اور اسے دادی کے خلاف خوب بڑھکایا۔ اور یہ بھی کہا کہ وہ دادی کو سمجھائے، عمامہ بچی نہیں..... جسے سب کے درمیان دادی ڈی گریڈ کرتی تھیں۔ طاہر کچھ شرمندہ ہو گیا۔ دادی اس گھر کی بزرگ تھیں۔ ان سب پر حق رکھتی تھیں اور اچھی بری بات پر ٹوک سکتی تھیں۔

طاہر چلا گیا..... اور دادی فاتحانہ انداز میں مسکراتی رہیں۔ طاہر کو تو انہوں نے خاموش کروا دیا تھا۔ لیکن اگلی شام کچھ عجیب واقعہ ہو گیا۔ بات وہاں تک بھی پہنچ گئی تھی جس طرف ان کا گمان نہیں تھا ہوا کچھ اس طرح..... فیقہ سر شام ہی بے چین ہو گئی تھی۔ حالانکہ دادی نے بہت روکنا چاہا لیکن وہ نفن میں کھانا بھر کے اپنے پورشن میں آ گئی تھی۔ گو کہ شام نو، دس کے قریب آتا تھا۔ پھر بھی وہ اکیلے پن کے باوجود آ گئی۔

آج جو کچھ بھی ہوا تھا فیقہ کو بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ گو کہ ساری وضاحت ہو چکی تھی۔ پھر بھی فیقہ کے دل میں شک کا معمولی بیج گڑ گیا تھا۔ اور اس شک کے بیج کو پانی ہر روز طاہ لگاتی تھی۔ وہ فیقہ کو ہمہ وقت چوکنا رہنے پر اکساتی رہتی تھی۔ اسے کہتی، وہ شام میں عمامہ کو دیکھے..... عمامہ ابھی اس کے اندر سے گئی نہیں..... وہ شام پر نظر رکھے..... اسے ڈھیل نہ دے۔

فیقہ تب سے خوب چوکنا تھی لیکن اسے کوئی قابل گرفت بات نظر نہیں آتی تھی۔ وہ ابھی انہی سوچوں میں گم تھی معاً کھٹکے کی آواز کے ساتھ شام اندر چلا آیا تھا۔ فیقہ چونک کر سنبھل گئی تھی۔ شام اتنی جلدی آ گیا.....؟ وہ کچھ حیران ہوئی پھر بھی خیر مقدمی مسکراہٹ سجا کر اس کی طرف بڑھی..... اس کے ہاتھ سے فائلیں، بیگ اور چابیاں پکڑ لیں۔

''چائے لاؤں.....؟'' فیقہ نے مسکرا کر پوچھا تھا۔ شام نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں، پانی.....'' وہ کپڑے بدلنے واش روم چلا گیا۔ فیقہ کچن میں آ گئی۔ اسے شام کچھ غیر معمولی خاموش اور سنجیدہ لگا تھا۔ عام روٹین میں وہ فیقہ سے باتیں بھی کرتا اور کبھی کبھار ہنسی مذاق بھی..... خاص طور پر آفس سے آ کر وہ خاموش نہیں رہتا تھا۔ بلا ارادہ ہی بولتا رہتا..... حالانکہ وہ خاصا کم گو مشہور تھا۔

فیقہ جانتی تھی یا نہیں جانتی تھی۔ وہ اندر کے شور سے گھبرا کر بولتا تھا یا باہر کے سناٹوں سے۔ فیقہ پانی کے بجائے جگ بھر کے لیموں کی سکنجبین بنا کر لے آئی تھی تب تک شام باہر نکل آیا۔ وہ شاور لے کر آیا تھا۔ گیلے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس نے بالوں میں کنگھا بھی نہیں کیا تھا۔ بے ترتیب بال ماتھے سے چپک رہے تھے۔ فیقہ گلاس بھر کے اس کی طرف آئی۔ شام نے چونک کر پکڑ لیا۔ پھر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے کچھ چونک گیا ہو۔ شاید فیقہ کی موجودگی سے چونکا تھا۔

''آپ واپس آ گئیں.....؟'' وہ کافی دنوں سے خالہ کی طرف تھی اور ابھی اس کا آنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ پھر اسے واپس دیکھ کر وہ حیران کیوں نہ ہوتا؟

''کیا نظر نہیں آ رہا.....'' اس نے ایک اور گلاس سکنجبین کا بھرا..... شام سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر بات بدل گیا۔

''طبیعت کیسی ہے؟'' شام کے انداز میں ملائمت تھی لیکن وہ کچھ الجھا، الجھا بھی لگ رہا تھا۔ نہ جانے کیا مسئلہ تھا..... فیقہ کا ماتھا ٹھنکا۔

''بہتر ہوں......'' وہ مختصر جواب دے کر خاموش ہوگئی تھی۔
''ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں......؟'' اس کی خاموشی سے تنگ آکر شام نے مزید پوچھا۔
''کس کے ساتھ جاتی؟ تمہارے کام ختم نہیں ہوتے۔'' وہ بے ساختہ شکوہ کناں ہوئی...... شام کو تاسف نے گھیرا۔ پھر اسے کچھ یاد آیا تھا۔
''آپ نے کہا تھا، میں طابہ کے ساتھ جاؤں گی۔'' شام کو بروقت خیال آیا۔
''میں نے ارادہ بدل لیا ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ ہی جانا چاہیے۔'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی تھی۔ شام کچھ سوچ کر بولا۔
''تو پھر کل چلیں گے۔'' اس نے بیٹھے بٹھائے پروگرام بنالیا تھا۔ کیونکہ فیقہ کی صحت اور منتقلی چیک اپ اس کے ہر کام سے زیادہ ضروری تھا۔ ویسے بھی ڈاکٹر نے بہت احتیاط بتا رکھی تھی اور شام حتی المقدور... اس کا خیال رکھتا...... اور ٹینشن سے بچانے کی کوشش کرتا۔
''ٹھیک ہے، ابھی تمہارے کپڑے نکال دوں؟'' وہ سنبھل کر اٹھنے لگی تھی جب شام نے اسے بے ساختہ روکا...... فیقہ رک گئی پھر اسے سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔ جیسے کچھ قیاس کرنا چاہتی ہو...... اسے شام کچھ متفکر اور الجھا، الجھا لگ رہا تھا۔
''آپ وہاں سے کب آئیں؟'' بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔ فیقہ چونکی۔
''ابھی کچھ دیر پہلے ہی......'' اس نے بے چینی چھپا کر کہا تھا۔
''تو پھر آپ جانتی ہوں گی، آج کیا ہوا تھا؟'' شام نے بڑے طریقے سے بات گھما کر آخر پوچھ ہی لیا تھا تو گویا اسے بھی ''اطلاع'' پہنچ گئی تھی۔ فیقہ کے اندر اِک لہر سی اٹھی تھی۔ وہ بمشکل غصہ ضبط کرسکی۔ شام پر کچھ بھی وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔
''کیا ہوا تھا؟'' اس نے انجان بن کر پوچھا۔ شام نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ جیسے اس کے لاتعلقی ظاہر کرنے پر متعجب ہوا ہو...... پھر اس نے کھل کر وضاحتی انداز میں کہا۔
''عمامہ کے ساتھ......''
''عمامہ کو کیا ہونا ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے۔ اماں نے کسی بات پر اسے ڈانٹا تھا۔ وہ ناراض ہوگئی۔'' فیقہ نے نظر چرا کر بتایا تھا۔ ''اب یہ شام بھی ناں بال کی کھال اتارے گا۔ آخر بات عمامہ پر آرہی تھی۔ اسے تکلیف کیوں نہ ہوتی۔'' فیقہ سوچ رہی تھی۔
''کس بات پر......؟'' اب کے شام کا انداز روکھا تھا۔ فیقہ نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔
''مجھے نہیں پتا......'' وہ روہانسی ہوکر بولی۔ ''گھر میں سو طرح کی باتیں ہوجاتی ہیں، اب کیا ایک، ایک کی طرف دھیان رکھا جائے۔ ویسے بھی اماں ذرا سا عمامہ کو ڈانٹ دیں تو طاہرہ بھابی رائی کا پہاڑ بنالیتی ہیں۔ اماں کو بھی عمامہ بہت پیاری ہے۔ اگر کچھ کہتی ہیں تو بھلے کے لیے......'' اس نے لگے ہاتھوں طاہرہ بھابی کو بھی بخشا نہیں تھا۔ حالانکہ شام جانتا تھا وہ تو کبھی کسی معاملے میں نہیں بولتی تھیں۔ فیقہ مبالغے سے کام لے رہی تھی۔
''سمجھانا اور بات ہوتی ہے اور ''بے عزت'' کرنا اور بات...... خالہ سے کہہ دیں، وہ عمامہ پر ہاتھ ہولا ہی رکھیں۔ وہ کوئی پہلی مرتبہ میرے ساتھ نہیں آئی۔ اور جب وہ عمامہ پر انگلی اٹھائیں گی یا عمامہ پر پتھر پھینکیں گی تو صاف طور پر چھینٹیں میرے تک بھی پہنچے گی...... میں واضح طور پر بتا رہا ہوں...... آئندہ اس گھر میں ایسا کوئی ڈرامانہ ہو...... نہ مجھے ملوث کیا جائے، اور نہ میرے حوالے سے عمامہ کو ڈی گریڈ کیا جائے۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتا

ہوں مگر اپنی ذات کی توہین نہیں۔'' اس کا لہجہ بہت دھیما مگر سخت تھا۔ اور وہ صرف فیقہ کی طبیعت کے خیال سے محتاط الفاظ کا چناؤ کر رہا تھا۔ ورنہ اس کی کنپٹی کے پاس پھولتی رگ بتا رہی تھی کہ وہ بہت شدید غصے میں ہے۔ لیکن شام کو کس نے سب کچھ بتایا......؟ فیقہ متعجب تھی۔ آخر کون تھا مخبر؟ جس نے سب کچھ من وعن بتا دیا تھا۔ فیقہ کا دماغ گھوم گیا۔ غصہ تو فیقہ کو کرنا چاہیے تھا۔ وہ ابھی تک عمامہ کو ''ڈھوتا'' پھر رہا تھا یہاں الٹا معاملہ ہو گیا...... اسے چاہیے تھا کہ وہ پہلے ہی چڑھائی کر لیتی۔ تاکہ شام کو وضاحت دینی پڑتی۔ وہ اس کے ساتھ صرف آئی نہیں تھی بلکہ اور بھی گلچھڑے اڑاتی رہی تھی۔

☆☆☆

''رات بھر ہمدردی کا بخار چڑھا دیا۔ صبح تک موڈ آف رہا، حتیٰ کہ ناشتا تک نہیں کیا۔'' وہ تخت پر بیٹھی ماں کے گھٹنے سے لگی دھیمی آواز میں بتا رہی تھی۔ وہ جیسے انگشت بدنداں ہو گئیں۔ حیرت سے ناک پر انگلی رکھ لی تھی۔

''کیا واقعی......؟ اس تک خبر کس نے پہنچائی؟'' ان کی آنکھوں میں دبی، دبی ناگواری ابھری تھی۔

''مجھے کیا پتا۔'' وہ سخت بیزار تھی۔ رات بھر شام نے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ صبح بھی منہ اندھیرے نکل گیا تھا۔ تب سے فیقہ کے دل کو پتنگے لگے ہوئے تھے۔

''کسی نے تو بتایا ناں......!'' وہ برہم انداز میں بولیں۔

''کون ہو سکتا ہے؟'' فیقہ تلخی سے سوچ رہی تھی۔ دادی نے اسے ٹہوکا دیا۔ وہ چونکی تھی۔

''شی، آہستہ۔'' انہوں نے کچھ فاصلے پر بیٹھی طاہرہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ ''پنج شاخہ'' بنا رہی تھیں۔ ارد گرد بانس کی لکڑی کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ وہ لوہے کے پنجے کو بانس کی لکڑی میں لگا رہی تھیں۔ پھر اس میں فیتے لگا کر روشن کرنے تھے۔ ایک طرح سے یہ پانچ بتیوں والا فانوس بن رہا تھا۔ چاہے تو بلب لگا لیتے اور چاہے تو موم بتیاں فیقہ سمجھ کر آواز دھیمی کر گئی تھی۔ دادی نے سرگوشیانہ کہا۔

''میں جانتی ہوں شام کے کان کس نے بھرے ہیں......'' وہ فیقہ کو بتا رہی تھیں۔ تخت کی طرف پیچھے سے آتی بسمہ چونک گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جو وہ کچن سے لا رہی تھی۔ دادی اور فیقہ کی سرگوشیوں پر وہ چونکی۔

''کس نے؟'' فیقہ نے تعجب کا اظہار کیا۔

''ارے، ایک ہی تو ہے آستین کی سپولن......'' دادی نے برہمی سے بتایا تھا۔ ان کا لہجہ بلا کا زہریلا ہو گیا تھا۔ بسمہ ٹھٹک گئی تھی۔ اس کی سماعتیں کچھ تیز ہوئیں۔

''کون......؟'' فیقہ کی آنکھوں میں سوال تھا۔

''عمامہ اور کون......'' وہ پھنکاری تھیں۔ بسمہ کے ہاتھ سے ٹرے گرتے، گرتے... رہ گئی تھی۔

''اس نے شام کے کانوں میں پھونکا ہو گا...... اندر ہی اندر رابطے تو ہیں......'' دادی زہر خند ہوئیں...... بسمہ کو جھٹکا لگا۔ وہ کچھ متذبذب سی آگے بڑھی۔ پھر اس نے چائے کی ٹرے دونوں کے سامنے کی۔ دادی اور فیقہ ایک دم گڑبڑا گئی تھیں۔ یہ کہاں سے ٹپک پڑی۔ دادی کو تو بسمہ ویسے ہی اچھی نہیں لگتی تھی۔

اس نے دونوں کو چائے کے کپ پکڑائے تھے پھر خود بھی قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ دادی نے زور سے پہلو بدلا۔ فیقہ بھی جز بز ہوئی تھی۔ کیونکہ بسمہ کچھ کہنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ کیا اس نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔

''ایک بات کہوں دادی، پلیز غصہ مت کیجیے گا۔ دراصل وکیل کی بیٹی ہوں اور بدقسمتی سے خود بھی وکیل ہوں...... کچھ غلط ہوتا دیکھ سکتی ہوں نہ برداشت کر سکتی ہوں...... وکالت پیشہ ہے تو سچائی کی وکالت کرنا فرض سمجھتی ہوں...... اتنی لمبی بات آپ سے ہضم نہیں ہو گی۔ بس اتنا کہوں گی آپ تصویر کا ایک رخ دیکھ کر کوئی انتہائی فیصلہ

نہیں کر سکیں، نہ کسی پر الزام رکھ سکتی ہیں۔'' بسمہ نے اپنے تئیں بڑے مناسب الفاظ کا چناؤ کیا تھا۔ جو دادی اور فیقہ کو برے نہ لگتے۔ وہ کچھ پل کے لیے چپ بھی کر گئی تھیں۔ لیکن یہ لمحاتی کیفیت تھی۔

''دیکھو، لڑکی..... تمہیں ہمارے معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ جمعہ، جمعہ چار دن ہوئے تمہیں اس گھر میں آئے ہوئے..... اور تم ہمیں اونچ نیچ سمجھاؤ گی.....؟ حد ہے، طاہرہ کی کمال بہویں ہیں ایک سے بڑھ کر ایک..... اب کل کی چھوکریاں ہمیں سمجھائیں گی۔'' دادی کے واویلے پر طاہرہ فانوس میں بتیاں سیٹ کرتی چونک گئی تھیں۔ پھر انہوں نے لکڑی کے ٹکڑے ہاتھ سے رکھ دیے۔ وہ بسمہ کو دیکھ رہی تھیں۔

''یہی تو میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں..... انسانوں کی پہچان کرنا سیکھیے..... جو آپ کا اپنا ہے وہ آپ کا رہے گا..... اور یہ بھی کہ اپنوں سے بدگمان نہیں ہوتے۔'' بسمہ ان کی ناگواری سمجھ کر بھی بولنے سے باز نہیں آئی تھی۔ دادی کی تیوری چڑھ گئی تھی۔ ان کے ماتھے پر بل گہرے ہوتے گئے تھے۔

''میں کہتی ہوں..... اپنی بکواس بند کرو..... یہ تمہارے باپ کی عدالت نہیں ہے۔'' انہوں نے بھیے وارننگ دی تھی۔

''یہ میرے باپ کی عدالت ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ مجھے تو صرف آپ کو ایک بات بتانی ہے جو آپ کو مس گائڈ کر رہا ہے وہ بھی اور آپ بھی خسارے میں رہیں گی۔'' بسمہ کے اگلے الفاظ نے دادی اور طاہرہ دونوں کو دم بخود کر دیا تھا۔ طاہرہ ہکا بکا رہ گئی تھیں جبکہ دادی کو تو چپ لگ گئے تھے۔

''اتنی لمبی زبان ہے تمہاری..... آخر سونیا کی بہن ہو..... اب مزید کچھ کہا تو زبان کاٹ دوں گی۔ بڑی آئی..... ہمارے خساروں کا حساب رکھنے والی.....'' وہ جیسے غرا کر رہ گئی تھیں۔ طاہرہ بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھیں..... پھر انہوں نے بسمہ کا بازو پکڑ کر اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بے بسی سے طاہرہ کو دیکھتی رہی۔

''کچھ لوگ ٹھوکر کھائے بغیر سمجھتے نہیں..... ان کو حالات پر چھوڑ دینا چاہیے.....'' طاہرہ زیر لب بڑبڑائی تھیں۔ بسمہ کا ملال بڑھ گیا تھا۔ اس نے سوچا، وہ کھڑے، کھڑے بہت کچھ بتا دے..... تاکہ دادی اور فیقہ کی آنکھیں کھل جائیں۔

لیکن طاہرہ نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ لب بھینچ کر اندر جانے لگی۔ سیڑھیوں پر کھڑی طاہبہ اسے استہزائیہ دیکھ رہی تھی۔ بسمہ نے ایک تلخ نگاہ اس کی طرف اچھالی تھی۔ اس نگاہ میں کچھ تو تھا جس نے طاہبہ کو ''چونکا'' دیا۔

رات کو دادی نے طاہر کو نمک مرچ لگا کر۔ سارا قصہ بتا دیا تھا۔ بار، بار بسمہ کی بدتمیزی پر زور دیا۔ طاہر کو فطری طور پر بہت غصہ آیا تھا۔ تاہم وہ بسمہ پر بہت غصہ نہیں کر سکا لیکن اسے سمجھایا ضرور تھا۔

''تم دادی اور فیقہ کے معاملے میں نہ پڑو..... ان سے دور ہی رہا کرو.....'' طاہر غصہ ''پی'' کر بتا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کی دادی کا مزاج کیسا ہے؟ اور بسمہ ان کے مزاج کو سمجھتی نہیں تھی۔ دادی کو کسی بھی وقت کوئی بھی بات بری لگ سکتی تھی۔

''میں ان کے معاملے میں کیوں آؤں گی؟ لیکن جب بیچ میں عمامہ کو گھسیٹا جائے گا تو پھر گرفت کرنا پڑے گا۔ طاہر! عمامہ تم لوگوں کی بہن ہے.....'' بسمہ روہانسی ہو کر بولی تھی۔ اس نے اتنے کم عرصے میں اتنا کچھ نوٹ کر لیا تھا جو اس گھر کے افراد اتنے سالوں میں نہیں کر سکے تھے۔ اس نے محسوس کیا تھا..... گھر میں سب سے زیادہ ہولڈ دادی کا تھا۔ اور ان کی چمچیاں طابہ اور رافعہ تھیں۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی دادی کو بڑھا چڑھا کر بتاتی تھیں..... خاص طور پر اپنی ساس اور نند کے خلاف۔ ان دو بے ضرر خواتین کے لیے دونوں کے دل میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ رافعہ تو عمامہ سے چڑتی ہی تھی تاہم طابہ تو بہت خار کھاتی تھی۔ یہ فطری سانند اور ساس سے جلاپا تھا یا کوئی

اور بات..... لیکن بسمہ کو لگتا تھا طابہ کی آنکھ میں زیادہ عمامہ ہی کھٹکتی ہے۔ وہ عمامہ کو دیکھ نہیں سکتی تھی، برداشت کرنا تو بہت دور تھا۔ البتہ تقی بھائی کو عمامہ سے بہت محبت تھی۔ اور بسمہ کو لگتا تھا طابہ سے یہ بھی برداشت نہیں ہوتا تھا کہ تقی، عمامہ کو پک اینڈ ڈراپ دے۔

پھر وہ کہیں نہ کہیں دادی اور فیقہ کے کان بھی بھرتی تھی۔ خاص طور پر طاہرہ اور عمامہ کے خلاف..... اور ابھی کل کی تو بات تھی..... سہ پہر کے ڈرامے کا اختتام ہوا اور سرِ شام ہی طابہ باغیچے میں ٹہلنے لگی تھی۔

کچن کا کام باری کے حساب سے ہوتا تھا۔ طابہ کی باری نہیں تھی۔ رافعہ اور طاہرہ کچن میں تھیں۔ بسمہ کھانا پکانے سے ابھی دور تھی۔ وہ نماز پڑھ کر نیچے آئی تو ایسے ہی بلا ارادہ گیلری سے ہوتی ہوئی عقبی برآمدے تک آ گئی۔ سامنے دور تک سبز گھاس کا فرش پھیلا ہوا تھا۔ جس پر خوب صورت منال کیٹ واک کر رہے تھے۔ عمامہ کے منال..... وہ نگاہ گھما کر پورے باغیچے کا جائزہ لیتی ٹھٹک گئی تھی۔

باغیچے کے آخری کونے میں طابہ ٹہل رہی تھی۔ اس کے انداز میں واضح بے چینی تھی۔ بسمہ کچھ چونک گئی۔ معاً گیٹ کھلا اور شام کی گاڑی اندر آئی۔

طابہ کے پیروں میں اسپرنگ لگے تھے۔ وہ تیزی سے گیراج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پھر پلر کی اوٹ میں شام کے پاس کھڑی ہو گئی۔ بسمہ کے من میں نہ جانے کیا آئی..... وہ بھی باڑ سے پیچھے چھپ چھپا کر گول چکر کاٹتی دوسری طرف سے گیراج تک آ گئی تھی۔ اور پھر اوٹ میں ہو کر باتیں سننے لگی۔ گو کہ یہ غیر اخلاقی حرکت تھی۔ بسمہ کی تربیت اور مزاج کے بھی خلاف تھی پھر بھی اسے کسی انجانی قوت نے روک لیا تھا۔ وہ طابہ کی باتیں سننے لگی۔ شام کو روک کر وہ اسے کچھ بتا رہی تھی..... بھلا کیا.....؟

''دادی نے تماشا ہی لگا دیا..... جب انہیں پتا چلا..... عمامہ کالج سے تمہارے ساتھ آئی ہے۔ انہوں نے عمامہ کی دھنائی کر ڈالی۔ حد ہوتی ہے شام.....! تم نے عمامہ کو ''فٹ بال'' بنا دیا..... کسی طرف کا نہیں چھوڑا۔ وہ دادی کے شک اور شبہات کے حصار سے نہیں نکل سکتی..... وہ اسے کچوکے لگاتی ہیں..... پرانے حوالے جتاتی ہیں۔ بیچاری عمامہ کس عذاب سے گزر رہی ہے۔ یہ تم نہیں سمجھ سکتے..... خود تو شادی کر کے اپنی الگ دنیا بسالی..... عمامہ کا بھی نہیں سوچا۔ وہ گھٹ، گھٹ کر مر رہی ہے۔ کم از کم اسے تسلی کے دو بول یا معذرت کا ایک لفظ کہہ دیتے.....''

طابہ بڑی ہمدردی کا مظاہرہ کرتی شام کو شرمندگی اور پچھتاوے کی کھائی میں دھکیل رہی تھی۔ اس کے اندر بل کھاتا احساسِ جرم ابھر آیا تھا وہ عمامہ کا مجرم تھا۔ اور عمامہ اس کی وجہ سے عذاب جھیل رہی تھی۔

اسے اپنی خالہ پر بھی شدید غصہ آیا۔ اس کی آنکھیں اچانک لہو رنگ ہو گئی تھیں۔ جیسے لال بوٹی، خون میں دھوئی آنکھیں..... جن میں ٹوٹے کانچ بکھر رہے تھے۔ بل کھاتا ہوا ایک احساسِ زیاں پھر سے حلق کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگا تھا۔ اس کی سانس تک گھٹنے لگی۔

وہ شکستہ قدموں سے چلتا ہوا اپنے پورشن کے ڈرائیوے پر چلنے لگا تھا۔ طابہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اوٹ میں کھڑی بسمہ بھی شام کو جاتا دیکھتی رہی۔ وہ اس کے نڈھال قدموں سے لپٹی ایک، ایک زنجیر کو دیکھ سکتی تھی..... وہ زنجیروں میں جکڑا تھا اور بے بس تھا۔ اتنا بے بس کہ زندہ رہ سکتا تھا نہ مر سکتا تھا۔

بسمہ کے اندر دکھ کی لہر سی اتر گئی تھی..... اس نے نگاہوں کو موڑ کر طابہ کی طرف دیکھا..... وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ بسمہ پر کھڑے، کھڑے ہی انکشاف ہوا تھا۔ اسے سہ پہر کے وقت بالکونی میں کھڑی طابہ کا خیال آیا۔ جب شام، عمامہ کو گھر ڈراپ کر کے گیا تھا۔ تب طابہ نے انہیں دیکھا اور نیچے آ کر دادی کو بتایا۔ پھر جو کچھ دادی نے کیا وہ بھی قابلِ مذمت تھا۔ اور اب وہ شام کو بتا رہی تھی۔ اگر طابہ نہ بتاتی تو شام انجان رہتا..... اور اگر شام

انجان رہتا تو ڈیل ٹیم کا لطف کیسے دوبالا ہوتا.....؟ بسمہ کی آنکھ سے اِک پردہ سا ہٹا تھا..... تو طاہر ایک طرف نہیں..... دو طرف گیم کھیل رہی تھی..... لیکن اس میں طاہر کا فائدہ کیا تھا؟

☆☆☆

عمامہ کے امتحان شروع ہوئے اور ختم ہو گئے..... ان دنوں راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

اس دن کے بعد سے عمامہ، دادی کے سامنے ہی نہیں آئی۔ اس کا بہت سے رشتوں اور محبتوں سے دل اٹھ گیا تھا۔ عمامہ نے دیکھ لیا تھا۔ بعض رشتے اور محبتیں محض دکھاوا اور غرض کی تھیں..... آئیں اور چلی گئیں..... کوئی انمٹ نشان نہیں چھوڑا۔ جہاں اپنی ''غرض'' آئی آنکھیں بدل لیں۔ رستے بدل لیے، رویے بدل لیے، انداز بدل لیے۔ اس دن سونیا آئی تو عمامہ کو سخت دل برداشتہ پا کر پریشان ہو گئی تھی۔ وہ تو اپنی ٹینشن ریلیز کرنے آئی تھی۔ عمامہ کو دیکھ کر متفکر ہو گئی..... اور بسمہ کو دیکھ کر بھی فکر مند ہو گئی۔

بسمہ اور عمامہ دونوں ہی غمزدہ تھیں..... اس نے پہلے بہن کی روداد سنی..... بسمہ کو طاہر سے ڈھیروں شکوے اور گلے تھے۔ وہ شادی کے بعد بدل گیا تھا۔ اس کی کوئی بات سمجھتا نہیں تھا۔ الٹا الزام لگاتا کہ بسمہ لگائی بجھائی کر کے گھر کا ماحول خراب کرتی تھی۔

اب یہ ہوائی طاہر نے اڑائی تھی یا دادی نے..... بسمہ کو پتا نہیں چل سکا تھا۔ تاہم وہ طاہر سے ناراض تھی..... اور یہ ناراضی عمامہ کے سبب سے تھی۔ وہ عمامہ کی خاطر اپنے لیے اس گھر میں کئی دشمن بنا چکی تھی۔ لیکن طاہر تھا کہ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ بسمہ کا اپنا تو ذاتی کوئی مفاد نہیں تھا۔ وہ تو محض عمامہ کی خاطر تپسیا کر رہی تھی جو کہ ابھی تک بیکار جا رہی تھی۔ اسے عمامہ پر ترس آتا۔ وہ چھوٹی سی لڑکی کتنی تنہا اور اکیلی ہو گئی تھی۔ اس گھر میں عمامہ کی کنڈیشن سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی کیفیت، اس کے جذبات تک پہنچنے والا کوئی نہیں تھا۔

بسمہ نے سونیا سے بھی اس موضوع پر بات کی..... تب سونیا نے اس کی تمام بات سن کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارا سسرال ہے بسمہ! تمہیں سب کے رویوں کو سہنا ہے اور ساتھ لے کر چلنا ہے۔ تم یہاں مگر مچھوں کے ساتھ بیر مت لگاؤ..... اور اپنے شوہر کو ناراضی کا موقع مت دو..... جہاں تک عمامہ کا تعلق ہے تو عمامہ کی خاطر تمہیں اپنی کشتی کو ڈبونا نہیں چاہیے.....'' سونیا کا انداز ناصحانہ تھا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''یہ تم کہہ رہی ہو..... عمامہ کے لیے؟'' اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ سونیا تو عمامہ کی خاطر کیا کچھ کرنے کے دعوے کرتی تھی لیکن اب.....؟

''میری بات اور ہے بسمہ! میں اس کی سہیلی ہوں پر تم عمامہ کی بھابی ہو..... اور اس گھر کی بہو بھی۔ تمہاری ذرا سی غلطی قابلِ معافی نہیں ہوگی۔ تم عمامہ کا خیال رکھو اور اس سے ہمدردی نبھی کرو..... اس کی دلجوئی بھی کرو..... مگر ہر نازک معاملے سے الگ رہنا۔ اس کی بھابیاں بہت چالاک ہیں۔ وہ تمہیں پھنسوا کر خود الگ ہو جائیں گی۔'' سونیا اس کے تاثرات سمجھ کر سنجیدگی سے سمجھا رہی تھی۔ اب کے بسمہ کی عقل میں بھی بات سما گئی۔

''اور ان لوگوں نے خیال کر لیا تھا۔ شام کی شادی کے بعد حالات ان کی گرفت میں ہوں گے تو دیکھ لینا۔ یہ ممکن نہیں ہوگا۔ یہ لوگ ناسمجھ ہیں..... اپنے ہی گھر کو اپنے ہاتھ سے آگ لگائیں گے۔'' سونیا گو کہ زندگی کا بہت تجربہ نہیں رکھتی تھی پھر بھی بسمہ کو ہمیشہ اپنے سے زیادہ سمجھدار لگتی۔

''کبھی تم نے سمندر کا کنارا دیکھا ہے؟ نہیں ناں..... سمندر کا کنارا ہوتا ہی نہیں..... اور نہ سمندروں پر بند باندھے جاتے ہیں۔ اس طرح عشق بھی سمندر ہے۔ اس کی تلاطم خیز موجوں کو روکنا بھی محال ہوتا ہے۔ جتنے چاہے پل بنا دیا بند باندھو.....'' سونیا کا انداز کھویا، کھویا تھا۔ بہت اداس اور ویران..... تب تک عمامہ بھی آ گئی تھی۔ اور وہ

دونوں سونیا کی گہری باتیں سن کر ششدر ہو رہی تھیں۔
کیا یہ وہی بے نیاز اور لاابالی سی سونیا تھی؟ ان دونوں کو یقین نہیں آیا۔ لیکن عمامہ اس کیفیت سے نکل آئی تھی۔ بسمہ جانتی یا نہ جانتی..... عمامہ کو سونیا کے لہجے کی گہرائیوں کا علم تھا۔ ''دل کی چوٹ کوئی معمولی چوٹ نہیں ہوتی۔ آرام اتنی آسانی سے نہیں آتا۔ پھر جب آجاتا ہے تو کوئی ملال نہیں رہتا۔''
''بہت فلسفہ بولنے لگی ہو سونیا.....'' بسمہ نے جھرجھری سی لی تھی۔ ''اچھا، بتاؤ..... ابرار کا معاملہ کہاں تک پہنچا.....؟ ڈیڈی تو ابھی تک اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں.....'' اس نے موضوع ہی بدل دیا تھا۔ عمامہ نے بھی شکر کیا کیونکہ سونیا کی 'یاسیت' اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو ہمیشہ سونیا کو ہنستا مسکراتا دیکھتی آئی تھی۔ اس پر سنجیدگی سوٹ نہیں کرتی تھی۔
''ڈیڈی اڑے ہیں تو میں کون سا اپنی بات سے ہٹی ہوں۔'' سونیا نے گہری سانس کھینچ کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔
''ابرار بھی تو اپنی فیملی کو منا کر نہیں لا رہا۔'' بسمہ نے خفگی سے کہا۔ ''اسے تھروپر اپر چینل پروپوزل تو بھیجنا چاہیے.....''
''اس کا باپ اسے ڈھونڈ کر مارنے کے چکر میں ہے، تم پروپوزل کی بات کرتی ہو.....'' سونیا استہزائیہ مسکرائی۔
''اسی لیے تو ڈیڈی ان غنڈوں (وڈیروں) میں رشتہ کرنے سے ڈرتے ہیں۔'' بسمہ نے ایک مرتبہ پھر... جھرجھری سی لی تھی۔
''ڈیڈی کے ڈرنے یا نہ ڈرنے سے کیا ہوگا.....؟'' وہ اپنے ازلی اعتماد کو بحال کرتے ہوئے بولی تھی۔ ''میری زندگی کا تو ایک ہی اصول ہے جو آپ کو چاہے، اسے کبھی نہ ٹھکراؤ..... بلکہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اپناؤ.....''

طاہر جاوید مغل کے سحر انگیز قلم کا جادو
کانچ محل
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
• حساس معاشرتی پہلوؤں پر ایک جراح کی نشتر کاری.....
• رنگین و سنگین احساسات و جذبات کی جنگ اور
• عبرت اثر انجام پر مشتمل ایک خوبصورت داستان
جولائی 2021ء سسپنس کے صفحات کی زینت

''چاہے پیرنٹس رضامند ہوں یا نہ ہوں.....؟'' بسمہ نے طنزیہ کہا۔
''یہ تو وقت پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔'' اس کی بے نیازی عروج پر تھی۔ عمامہ کو اس پر رشک آیا تھا۔ بسمہ نے اسے گھور کر دیکھا۔
''ابرار مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں بھی..... کیا یہ کم ہے؟'' سونیا نے سنجیدگی سے پوچھا۔
''اگر ڈیڈی نہ مانے تو.....؟'' بسمہ کا انداز ذرا تلخ ہو گیا تھا۔
''تمہاری دفعہ مان سکتے ہیں میری دفعہ نہیں.....'' اس کے لہجے میں بھی واضح چبھن تھی۔ بسمہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہوئی۔
''فرض کرو ڈیڈی مان بھی گئے تو ابرار کی فیملی.....؟'' بسمہ آنے والے وقت سے ہراساں ہو رہی تھی۔ کیونکہ سونیا کی ضد اور ارادے کی پختگی سے کوئی ناواقف نہیں تھا۔ وہ ایک مرتبہ فیصلہ کر لیتی تو بس کر لیتی۔
''ڈیڈی مان گئے تو ابرار کی فیملی میرا سر در نہیں.....'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ بسمہ اسے گھور کر چائے بنانے باہر نکل گئی تھی جبکہ عمامہ حواس باختہ سی سونیا کی طرف دیکھ کر چیخی۔
''مجھے تمہارے ارادے بہت خطرناک لگتے ہیں.....'' اس کے کھوجی انداز پر سونیا بے اختیار ہنس پڑی تھی پھر اس کی گہری آنکھوں میں جھانک کر بولی۔
''تمہارا اندازہ کچھ غلط نہیں عمامہ.....'' اب وہ مزے سے پیر جھلا، جھلا کر کوئی انگلش نمبر گنگنا رہی تھی۔

☆☆☆

عمامہ لکڑی کا زینہ اترتی نیچے آئی تو بڑے سے کچن میں ''پوآ.....'' کی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ اماں اور بڑی بھابیاں کچن میں تھیں۔ دادی ہمیشہ کی طرح کھڑکی کے پاس تخت پر براجمان تھیں تاکہ ہر ایک پر نظر رکھ سکیں۔ فیقہ اپنے پورشن میں اور بسمہ شاید کمرے میں تھی یا پھر فیقہ بھی یہیں تھی۔ اماں نے بتایا تھا۔ وہ ان دنوں ہیڈ ریسٹ پر تھی۔ عمامہ نے کھڑکی سے باہر امڈتی گھٹائیں دیکھ کر اندازہ لگایا تھا۔ موسم کی مناسبت سے چوڑی چوڑی گھی میں تلی ہوئی میٹھی ٹکیاں بن رہی تھیں۔ جنہیں ''چوڑ مگلا'' بھی کہتے تھے اور ''پوآ'' بھی..... شام کو یہ میٹھی ٹکیاں بڑی پسند تھیں۔ عمامہ کو کیا کچھ نہیں یاد آیا تھا۔ وہ چلتی، چلتی عقبی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔
گردن نکال کر باہر دیکھا تو ٹھنڈی ہوا کا راحتِ جاں جھونکا بالوں میں اٹکھیلیاں کرتا گزر گیا..... عمامہ کا بوجھل موڈ خوشگوار ہو گیا۔
دادی، عمامہ کو دیکھ کر کچھ چوکنا ہو گئی تھیں۔ آج بڑے مہینوں بعد وہ ان کے سامنے آئی تھی۔ اس دن کے بعد آج پہلی مرتبہ، وہ عینک کے پار اسے دیکھتی رہی..... عمامہ کے بے ترتیب بال کمر سے نیچے جھول رہے تھے۔ وہ ان کی طرف نیم رخ سے کھڑی تھی۔ سانچے میں ڈھلی موم سی ساکت گڑیا کی طرح..... کھڑکی میں جھانکتی ہوئی۔ وہ اسے غور سے دیکھتی رہیں..... کبھی یہ وجود ان کی آنکھ کا تارہ تھا۔ پھر بیچ میں اتنا کچھ ہوا..... ساری محبت گرد دھول ہو گئی۔ وہ اپنے دل کو ٹٹولتی تو حیران رہ جاتیں..... ان کے اندر عمامہ کے لیے ذرا سی انسیت بھی نہیں بچی تھی۔ وہ بھی کیسے بدنصیب دن تھے۔ جب عمامہ کے ستاروں نے چالیں بدل لی تھیں۔ وہ کرتی کچھ اور ہوتا کچھ تھا۔
اس وقت بھی کھڑکی میں کھڑی وہ موسم کی خوب صورتیاں دیکھ رہی تھی۔ معالا اونچ کے دروازے سے شام اندر داخل ہوا تھا..... اسے ''پوا'' کی خوشبوئیں کھینچ کر نہیں لائی تھیں..... بلکہ وہ دادی کے پاس ''شکایات'' لے کر آیا تھا۔
''آپ کسی ملازمہ کا بندوبست کر دیں..... سارا گھر گندا پڑا ہے..... دو دن سے صفائی نہیں ہوئی..... ہر چیز دھول مٹی میں اٹی ہے۔'' اس کے لہجے میں واضح بیزاری تھی۔ گندگی اس کی نفاست پسند طبیعت پر گراں گزر رہی

تھی۔ وہ خاصا ناراض لگ رہا تھا۔

''پہلے بھی تو میرے پورشن کی کوئی صفائی کرتا ہی تھا۔ فقیہہ کا بیڈ ریسٹ ہے تو سارا گھر الٹا پڑا ہے۔ جگہ، جگہ پھیلاوا.....'' وہ خفگی سے کہتا ہوا دادی کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔ عمامہ عقب میں کھڑی تھی۔ اور شام ایسے رخ پر تھا کہ عمامہ کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔

''لو، مجھے تو دھیان نہیں رہا..... فیقہ نے بھی کہا نہیں..... حد ہے بھئی..... کل ہی کرواتی ہوں صفائی.....'' دادی فوراً میدان میں آئی تھیں۔

''کل.....؟'' وہ دبی، دبی آواز میں چیخا..... ''اور آج اس دھول مٹی میں کون سوئے؟''

''ابھی تو رحیمہ چلی گئی.....'' انہوں نے جز وقتی ملازمہ کا نام لیا جو صرف صفائی کے لیے آتی تھی۔

''تو پھر.....؟'' شام سوچ میں گم ہو گیا تھا۔ ابھی، ابھی دو، دو جگہ کام بھگتا کر تھکا ہوا آرہا تھا۔ ورنہ پائپ لگا کر فرش دھونا اس کے لیے بہت معمولی کام تھا۔ اور ویسے بھی شام کو شروع سے اپنے ہاتھ استعمال کرنے کی عادت تھی۔ وہ دوسروں سے کم ہی مدد لیتا تھا۔

''رافعہ تو میکے گئی ہے۔ صباحت کو بخار تھا۔ شمسہ کچن میں ہے اور طابہ کا بھی دوسرا مہینہ ہے، اس کی نزاکتوں کے کیا کہنے..... بسمہ سے تو ویسے بھی پناہ مانگتی ہوں، اللہ بچائے، ایسی تیز طرار ہے حد نہیں.....'' دادی کی لمبی تمہید پر شام پورا سا ہو گیا تھا۔ اس میں شام کے مطلب کی کوئی بات نہیں تھی۔

''رہنے دیں..... میں خود کر لیتا ہوں.....'' وہ بیزاری سے اٹھا۔ دادی نے ''اے ہے'' کرتے بمشکل اسے روکا۔

''تھکے ہارے آئے ہو، تم کیوں کرو گے۔'' دادی نے ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ ''تم ایسا کرو..... فیقہ کے کمرے میں چلو..... آرام کرو، میں چائے اور ''پوآ'' بھجواتی ہوں، تب تک تمہارا کمرا شمرا سب صاف ہو جائے گا.....'' وہ جانتی تھیں شام، رات سونے کے لیے یہاں نہیں رہے گا۔ اپنے پورشن میں ہی سوئے گا۔ اور گندگی سے اسے الرجی تھی۔

شام سر ہلا کر چلا گیا۔ اندرونی گیلریوں کی طرف جاتے، جاتے اس نے غیر ارادتاً لکڑی کے زینے کی طرف دیکھا تھا اور اس سے اوپر کا رنز والا کمرا اور دریچہ..... جس کے دونوں پٹ بند تھے، شام کے شہر دل کی طرح کسی منہ بند قلعے کی طرح..... اس کی آنکھیں مایوسی سی پلٹ آئی تھیں۔ پھر وہ اندھیری گیلری میں گم ہو گیا۔

عمامہ جیسے ساکت رہ گئی..... لمحہ بھر کی وہ اٹھ کر پلٹتی اور جھکتی نگاہ کی چوری عمامہ کے دل کی دھڑکنوں کو زیر و بم کر گئی تھی..... اس سے کھڑا ہونا محال ہو گیا۔ وہ کسی پتھریلی صورت میں ڈھل چکی تھی۔

معاً دادی نے اسے آواز دی۔ عمامہ چونک کر حواسوں میں آئی۔ جیسے کسی لمبے اور پُرتھکن سفر سے پلٹ کر آئی ہو۔ تھکن سے چور، انتہائی نڈھال، بے حال.....

دادی نے اسے پھر سے آواز دی تھی۔ عمامہ کو قریب آنا ہی پڑا۔

''بات سنو عمامہ.....'' وہ بڑی ''بچار'' کے بعد دل پر پتھر رکھ کر عمامہ سے ہم کلام ہوئی تھیں۔ اتنے ڈھیر سے مہینوں کے بعد عمامہ انگلیوں پر حساب لگاتی تب بھی تھک جاتی۔

''فیقہ کے گھر کی صفائی کر آؤ..... اور دیکھو، دھیان سے.....'' ان کا لہجہ مدھم اور تنبیہہ کرتا ہوا تھا۔ جب کوئی آپشن نہیں بچا تھا تو عمامہ یاد آ گئی۔ خود سے تو کچھ کر نہیں سکتی تھیں۔ طاہرہ سے بھلا کیا کہتیں..... اس کی بہوؤں کے اپنے ہزار کام تھے۔ ایک عمامہ پر زور چلتا تھا تو کام کے وقت گدھے کو باپ بنا لیا..... خود غرض تو وہ بلا کی تھیں۔ پھر اس وقت شام بھی یہیں موجود تھا۔ عمامہ کو وہاں بھیجنے کا رسک لیا جا سکتا تھا۔

عمامہ نے سوچا، وہ انکار کردے..... وہ شام کے پورشن میں نہ جائے..... لیکن دادی کو جواب دینا مناسب نہیں لگا۔ کیا پتا..... وہ اسی بہانے عمامہ سے راضی ہوجاتیں۔ وہ سر ہلا کر باہر نکل آئی..... اس وقت ہوا تھم گئی تھی۔ ماحول پر سکوت طاری تھا اور ''پوا'' کی خوشبو پورے صحن میں چکرا رہی تھی۔

عمامہ چلتے، چلتے شام کے پورشن میں آگئی۔ کھلی گرل میں منال کھڑا تھا۔ عمامہ کو جاتا دیکھ کر پیچھے، پیچھے بھاگتا آیا۔ اور اب اپنے پر پھیلا کر جیسے اس کا استقبال کررہا تھا۔

عمامہ کے ہونٹوں پر بھولی بسری سی مسکان پھیل گئی۔ اس نے جھک کر منال کو اٹھایا اور پیار کیا..... پھر گرل سے اندر داخل ہوگئی تھی۔

یہ فیقہ کی راجدھانی تھی..... جس میں عمامہ نے بغیر اسے بتائے قدم دھر لیے تھے۔ وہ ایک، ایک چیز کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ یہ شام کا پرانا پورشن نہیں لگتا تھا۔ یہ کوئی سپر لگژری اپارٹمنٹ لگتا تھا۔ لیکن اس وقت دھول مٹی سے اٹا ہوا تھا۔

عمامہ ایک، ایک چیز کو دیکھتی حیران ہورہی تھی۔ وہ ان چیزوں پر کوئی حق نہیں رکھتی تھی لیکن وہ ان چیزوں کو دیکھ تو سکتی تھی۔

وہ چلتے، چلتے شام کے بیڈروم میں آگئی۔ یہ کوئی عام بیڈروم نہیں لگتا تھا جیسے پہلے سا..... یہ تو کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا ''سوئٹ'' لگتا تھا۔ انتہائی نفیس، خوب صورت اور اعلیٰ فرنیچر سے سجا ہوا۔

عمامہ کو کوئی بھی چیز متاثر نہیں کررہی تھی۔ بس دیوار پر لگی شام اور فیقہ کی اتارج سائز تصویر کے سوا۔

وہ جیسے دم بخود فیقہ اور شام کو دیکھ رہی تھی۔ دیکھتی جارہی تھی۔ دیکھ، دیکھ کے تھک نہیں رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ریت بھرنے لگی۔

اس نے آنکھیں مسل، مسل کر دیکھا..... ایک بار، دو بار، سہ بار، کئی بار، بار، بار..... پھر اس کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سا نغمہ پھیل گیا۔

''اور اسے نصیب کہتے ہیں، اور نصیب سے بڑھ کر کچھ نہیں..... اور کوئی کسی کا نصیب چھین نہیں سکتا۔'' عمامہ نے آنکھوں کو مسل کر صاف کیا تھا پھر گہری سانس کھینچ کر صفائی میں جت گئی تھی۔ عام روٹین میں اس نے کبھی صفائی نہیں کی تھی۔ بلکہ گھریلو کاموں سے ہمیشہ دور رہتی تھی۔ بھابیاں اور اماں ناز اٹھانے کے لیے تھیں۔ وہ گھریلو امور سے دور رہتی تھی۔ کام اسے ویسے بھی پسند نہیں تھے۔ کبھی موڈ ہوا تو کرلیا..... کپڑے استری یا باغیچے کی گوڈی..... اچھے زمانوں میں دادی نے بھی کبھی کام کرنے نہیں دیا تھا۔ بعد میں سارا وقت ہی بدل گیا۔

ویسے بھی شام کا کام کرنا اسے برا نہیں لگ سکتا تھا۔ کبھی نہیں..... وہ اگلے دو گھنٹوں میں سارا گھر چمکا کر فارغ ہوچکی تھی۔ اور اب فیقہ کی راجدھانی میں گھوم، گھوم کر ایک، ایک شفاف چیز کو دیکھ کر مطمئن ہورہی تھی۔

اس کے دل میں بڑے دنوں بعد سکون کی لہریں اٹھی تھیں۔ اتنا سکون تھا کہ وہ اس سکون کی فراوانی اور کثرت پر بھی گھبرا گئی تھی۔

معاً گرل میں منال کے پر پھڑ پھڑائے تھے۔ عمامہ چونک سی گئی۔ منال کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے نہ سمجھتے ہوئے گرل کے پار بہت دور تک دیکھا۔ وہاں سے شام آتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جیسے کچھ سمجھ کر الٹے قدموں پلٹی تھی۔ وہ منال کے الرٹ کرنے پر دوسرے دروازے سے ہوتی ہوئی باہر نکلی تھی اور پھر پچھلی گلی سے اپنے پورشن کی طرف آگئی۔ منال ابھی تک ''پر'' پھیلائے گرل میں کھڑا تھا۔

(جاری ہے)

pklibrary.com

دُکھ اوڑھتے نہیں ہیں

تسنیم منیر علوی

آج ایک عرصے کے بعد ہم دوستیں "عائزہ" کے گھر جمع ہوئے تھے گو کہ ہم لوگ موبائل کے ذریعے رابطے میں رہتے ہیں لیکن کبھی، کبھی ایک دوسرے کے گھر پر ہلا بھی بول دیتے اور اس طرح بھولی بسری یادوں کی برسات رم جھم، رم جھم برستی۔ ویسے تو "عائزہ" کالج لائف میں سب سے زیادہ چلبلی اور نٹ کھٹ لڑکی ہوا کرتی تھی۔ مشہور شخصیات کی نقلیں اس خوبی سے اتارتی کہ نقل پر اصل کا گماں ہوتا۔ کبھی، کبھی

خالی پیریڈ میں ٹیچر کے ڈائس کی جگہ کھڑے ہو کر ایسی، ایسی اوٹ پٹانگ حرکتیں اور استادوں کی نقلیں کرتی کہ پوری کلاس زعفرانِ زار بن جاتی۔ لیکن اب وہ ایک ذمّے دار معلم اور محترم خاتون بن کر بہت متین و سنجیدہ شخصیت بن چکی ہے۔ اسی کو شاید کہتے ہیں کہ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے، کیسے۔ وہ ہم سب کے مقابلے میں بہت پڑھاکو، محنتی اور وقت کی پابند طالبہ رہی جس کی وجہ سے استادوں کے عتاب سے بچی رہی۔ تو جناب عائزہ نے آج ہم ''پنج ستارے'' گروپ کو اپنے گھر مدعو کیا ہوا تھا۔ آج کل تعطیلات تھیں، سب نے جلدی، جلدی کام سمیٹے اور ہمارا ''فائیو اسٹار گروپ'' عائزہ کے گھر موجود۔ دل کے دریچوں کو وا کیے سب اپنی، اپنی پٹاری سے کچھ نہ کچھ نکال رہے تھے۔ ایسے میں عائزہ کا ایک سوال پھلجڑی کی طرح بھڑکا اور تاروں کی جھلملاہٹ کی طرح چھا گیا۔ ہم لوگ جب بھی جمع ہوتے کوئی نہ کوئی ایکٹویٹی بھی کرتے، کبھی گانوں کا مقابلہ، کبھی بیت بازی، لطیفے یا کسی اہم مسئلے پر گفتگو کرتے۔ ہاں تو عائزہ نے پوچھا تھا کہ سب باری، باری بتائیں۔ ''کہ کس بات پر غصہ آتا ہے؟''

سب ایک ساتھ چلّانے لگے۔

''لو یہ کیا سوال ہے؟ بھئی مجھے تو تمہارے اس غیر پارلیمانی اور غیر سنجیدہ سوال پر ہی بے طرح غصہ آرہا ہے۔'' اسما نے عائزہ کے سوال پر ردِعمل دیا۔ بس پھر کیا تھا سب بے پر کی اڑانے لگے۔

''میں تو جب کہیں پارٹی میں جانے کی تیاری کے مرحلے سے گزر رہی ہوتی ہوں تو سارا گھر آوازیں لگا رہا ہوتا ہے۔ بس اب آ بھی جاؤ اتنا وقت تو کوئی کوئین بھی نہیں لگاتی۔ ''لیڈی ڈیانا'' صاحبہ تشریف لے آئیں۔ بس اسی وقت میرا دماغ بھنّا جاتا۔ ایک دفعہ تو غصے میں ڈریسنگ ٹیبل پر لیکویڈ لائنر کی بوتل اچھال دی جو جا کر دیوار سے جا ٹکرائی اور پھر جو نقش و نگار چھوڑتی ہوئی سوئے فرش ہوئی تو میری مزید تلملاہٹ......''

''اسی لیے کہا جاتا ہے کہ غصہ حرام ہے اور اس میں نقصان سراسر اپنا ہی ہوتا ہے۔'' ''فضیلت اللہ والی'' نے حسبِ عادت نصیحت کا تڑکا لگایا۔ اب سب عائزہ استاد صاحبہ کی طرف مڑے۔

''آپ نے ہی سوال کیا سو آپ ہی جواب بھی دیں۔''

عائزہ نے اپنی طرف توپوں کا رخ دیکھ کر کچن کی طرف دوڑ لگائی۔ ہم سب آہ و فغاں کرتے رہ گئے۔

''نہیں، نہیں پہلے بتاؤ۔'' وہ جاتے، جاتے رک گئی۔

''ظاہر ہے ایک استاد ہوں غصہ شاگردوں پر ہی نکال سکتی ہوں..... آخر گھر کا ستون بھی تو عزیز ہے تو شامت طالب علموں کی ہی آتی ہے لیکن مس شیبا کی طرح بچوں پر غصہ نہیں کرتی۔''

ہم لوگوں کو اپنی ٹیچر یاد آ گئیں کہ وہ کس طرح غصے میں آکر پورے ہفتے اپنے پیریڈ میں اسٹینڈ اپ رکھتی تھیں۔ وہ بریانی کی خوشبو پر اُدھر لپکی۔ ہم نے کچن سے اشتہا انگیز آتی خوشبو پر..... غصے کو دور جا پھینکا اور میز کو اسمبلی کی ڈیسک سمجھ کر بجانا شروع کر دیا۔

''کھانا کھلاؤ، بھوک مٹاؤ، چوہے آؤٹ آف کنٹرول ہو کر نعرے بازی کر رہے ہیں شاید کسی مارچ کی تیاری ہے۔'' ماحول عورت مارچ میں تبدیل ہوتا نظر آیا۔ میں عائزہ کے ساتھ اس کی مدد کے لیے کچن میں جا پہنچی اور پھر قورمہ، بریانی سے پوری طرح انصاف کے لیے سب نے دو، دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کیا۔

''اگر ذرا دیر ہو جاتی تو میرے خیال میں ہلکا لاٹھی چارج یا آنسو گیس کی نوبت آ جاتی۔'' فصیحہ نے جملہ اچھالا۔ سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''ٹھیک کہتی ہو کامریڈ۔'' اس کا میاں مزاحمتی نظمیں اور کہانیاں لکھتا، آزادی کے نغمے الاپتا پھر پائپ کے لمبے، لمبے کش لے کر سکون کی نیند سو جاتا...... ہم لوگ اس بات پر سو فیصد متفق تھے کہ فصیحہ کا میاں جعلی کامریڈ ہے ترقی پسند، قدامت پسند، شدت پسند اور انتہا پسند کی بحث کرتا پھر تھک کر

pklibrary.com

ہتھیار ڈال دیتا۔ فصیحہ کا موضوع نکلا تو یاد آیا۔ جب تک اس کی شادی نہیں ہو گئی تھی ہم سب اس خبیث کو دل میں ہزار گالیاں دیتے جس نے ہماری سہیلی کا دل توڑا۔ اس نازک اندام حسینہ کا دل بھی نازک تھا۔ روزنِ دل سے یاد کا شعلہ لپکا۔

''ہم لوگ آرٹس کونسل کی سیڑھیاں تیزی سے پھلانگ رہے تھے جب ہی وہ فصیحہ سے ٹکرا گیا تھا۔ نیچے کوزہ گر کے ہاتھ کی جنبش پر تیزی سے صراحی کی گردش پر ایک شاہکار تخلیق ہو رہا تھا۔ اب وہ اجنبی کمہار سے اصرار کے بعد تکرار پر اتر آیا تھا کہ وہ بھی ایک جامِ سفال تخلیق کرنا چاہتا ہے کوزہ گر کچھ شدومد کے بعد پیچھے ہٹ گیا اور اب اس اجنبی نوجوان کے ہاتھ چاک پر تیزی سے چلنے لگے۔

سب تماشائی دم سادھے حیرت کدہ میں غوطہ زن تھے کہ اتنی مشاقی کہاں سے پائی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس ملائم مٹی سے تراشا ایک ''سبُو'' تیار ہو گیا۔ سب نے تالیاں بجا کر خراجِ تحسین پیش کیا جو اس نے سر کے خم سے قبول کیا۔ بس یہی لمحہ تھا کہ بیچاری فصیحہ دل تھام کے رہ گئی۔ سب تو تالیاں بجا کر ادھر اُدھر ہونے لگے۔ فصیحہ بت بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ابھی تک اس کے ہاتھ تالی کے انداز میں بندھے ہوئے تھے۔ عالیہ نے کندھے پر دستک دی۔

''ہیلو میڈم تماشا ختم شد، تمہاری تالی کی اونچی تال اس تک ضرور پہنچ گئی ہو گی۔'' سب نے اس کی سُدھ بُدھ کو اسی وقت محسوس کر لیا تھا۔ کیا، کیا جائے دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں؟ ہم نے اس ''ان کہی'' محبت کا خوب مذاق اڑایا۔

کوئی ایک مہینے بعد کالج کی طرف سے (واضح رہے ہم لوگ ہوم اکنامکس کالج کی طالبات تھے) آرٹس کونسل نمائش میں جانے کا اتفاق ہوا۔ تو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہی ''اجنبی کوزہ گر'' پھر آ ٹکرایا اور اب کی بار ایسی جدت کر بیٹھا کہ وہ نقشین پیالہ جو قوسِ قزح کے رنگوں سے مزین تھا فصیحہ کو بڑی تعظیم کے ساتھ تھما کر ہاتھوں سے غائب ہو گیا لیکن فصیحہ کے دل میں انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔ فصیحہ عرصے تک غمِ فراق میں مبتلا رہی اور ہم سہیلیاں اس کی گمشدہ محبت کو تلاش کرنے میں ہاتھ پیر مارتے رہے۔ کئی چکر آرٹس کونسل کے لگائے۔ موہٹہ پیلس میں لگی نمائش میں بھی ناکام محبت کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ لیکن وائے ناکامی کہ متاعِ کارواں جاتا رہا اور اس کی بیوقوف محبت پر کفِ افسوس ملتے رہے۔ زندگی میں بڑے نشیب و فراز آئے بالآخر چڑھا دریا آہستہ، آہستہ ایک متوازن راہ پر آ گیا کہ بچوں کی آمد خوشگوار ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ اب وہ اپنے ''نام نہاد'' کامریڈ میاں کے ساتھ مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔

ارے لیجیے بیچ میں فصیحہ کا قضیہ کہاں سے آ گیا۔ یہ کم بخت ماضی مرحوم بھی بڑا ظالم ہے۔ اچھا برا سب یاد دلا دیتا ہے۔ عائزہ کی میزبانی کے بعد چائے کا دور چلا۔

''لیکن عدیلہ (میں غریب) تم نے تو کچھ بتایا ہی نہیں۔'' اور پھر سب کو ہم ناچیز یاد آ گئے۔ ''تم لکھاری ہو اپنی تحریر میں ہی سارا کتھارسس اتار دیتیں پر جو بچ گیا ہے وہ یہاں سنا دو۔'' فرح، فصیحہ، عائزہ، عذرا سب ہاتھ دھو کے جیسے پیچھے ہی پڑ گئیں یوں ہم نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔

''دیکھو پہلے وعدہ کرو کوئی ہمارا مذاق نہیں اڑائے گا۔ غصہ تو ہمیں بھی آتا ہے لیکن اب ہم میں جرأت اظہار نہیں اس لیے غصے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر بجھا لیتے ہیں اور سکھ کی سانس لیتے ہیں۔'' لیکن سب ہماری منطق سے متفق نہ تھے۔

''نہیں، نہیں بتانا ہو گا ورنہ دھرنا ہو گا۔''

''نہیں، نہیں ہم نہیں بتاتے تم لوگ ہنسو گی کہ اتنی سی بات پر غصہ۔'' ہم نے تو صاف دامن بچانا چاہا لیکن ہمارے اس طرح بہانے بنانے سے سب تجسس کے بے لگام جھولے پر سوار لمبی لمبی پینگیں لینے لگے۔

''اچھا سنو۔'' ہم نے پینترا بدلا اور ہلکا سا

pklibrary.com

بیت گیا، کبھی سہیلیاں بھی دور نہیں پردیس میں جا بسیں۔ بچے بھی بڑے ہوکر اپنے، اپنے کاروبارِ زندگی میں اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ ہمارے ساتھ صرف زاہد (بیٹے) کی فیملی ہے اور اب ہمیں شکر دان بھرنے سے ذرا سی بھی الجھن نہیں ہوتی۔ اب تو عادت سی ہو گئی۔ کبھی، کبھی سوچتے ہیں کہ ہم کم فہم نے اتنی سی بات کو الجھن یا کوفت کیوں بنا لیا تھا۔ گھر میں یوں بھی اب بچوں نے کام سنبھال لیا ہے ہمیں تو ''آرام ہی آرام ہے پیارے۔'' ہم صرف کسی خاص، خاص موقع پر کچن کا رخ کرتے۔ زاہد اور طوبیٰ کو میٹھے کا بہت شوق ہے۔ تو ہم اکثر موسم کے میٹھے بنا دیتے۔ ان کا اصرار ہوتا کہ امی کے ہاتھ کی سویٹ ڈش بہت ہی مزے دار ہوتی ہے اور سچی بات یہ ہے کہ ہم بھی میٹھے کے شوقین، تو یوں ہم اب سویٹ ڈش بنانے کی حد تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔ کیا کریں بچے کام ہی نہیں کرنے دیتے۔

''اب آپ آرام کریں، ساری زندگی کام ہی کیا ہے۔'' زاہد نے پیار کرتے ہوئے کہا۔ لیکن ہم تو اب کام کے بہانے ہی ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں سو اس لیے شکر دان بھرنے سے ہمیں ذرا برابر الجھن یا پریشانی نہیں ہوتی۔ زاہد اور طوبیٰ جتنی دیر آفس کی تیاری کرتے ہم کچن میں چلے جاتے ان دونوں کو دم کی ہوئی چائے پسند ہے تو الیکٹرک کیٹل سے ابلا پانی کیتلی میں ڈال کر دم لگاتے۔ خوب صورت نازک سی ٹی کوزی سے ڈھانپ دیتے۔ اتنی دیر میں بچے آجاتے۔ بس اسی طرح زندگی کی دھنک شام ڈھل رہی ہے۔ بچے خوش ہیں تو ہم بھی ان کی قطرہ، قطرہ محبت کو اپنے اندر اتار رہے ہیں۔ الحمدللہ صحت کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ ہمیں بچوں کی بیماری سے بہت وحشت ہوتی ہے۔ تو بس ایک ڈگر پر حیات رواں ہے۔ کبھی ہم سوچتے ہیں کہ اتنے معمولی سے کام کے لیے ہم کیوں اتنی ٹینشن لیتے تھے، یہ تو ایک بے ضرر سی جنبش تھی اب تو ہم کسی چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے بھی ترستے ہیں۔ پہلے چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بوجھ لگتا تھا اور آج ہم فنکھارے۔

''دراصل ہمیں جب خالی شکر دان میں شکر بھرنا پڑتی ہے تو بہت غصہ آتا ہے۔ شادی سے پہلے جب امی کہتیں جاؤ کچن سے شوگر پاٹ میں شکر بھر کر لاؤ تو بہت تنک مزاجی دکھاتے، امی کے گھر میں ہمارا اس چھوٹی سی بات پر الجھنا چل گیا اور یہ تنبیہہ بھی کہ چائے کے برتن لگانے سے پہلے شکر چیک کر لیا کرو۔ جب شادی ہوکر سسرال آئے تو یہ خوشی تھی کہ اب شکر دان بھرا ملے گا۔ آخر گھر میں چھوٹی نند بھی ہے یا شاید پتیلی میں ہی چائے کی پتی، دودھ، شکر ڈال کر بنائی جاتی ہو لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو۔ ابھی چند دن ہی شادی کو گزرے کہ ساس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

''اوہو اس میں تو چینی ہی نہیں۔ عدیلہ بیٹا شکر دان اٹھانا۔'' اب جو دیکھا تو شکر ندارد۔

''عدیلہ کچن میں ڈبا رکھا ہے اس میں سے بھر لاؤ اور پہلے چیک کر لیا کرو تاکہ میز سے اٹھنا نہ پڑے۔'' ہم نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

''جی اماں۔'' لیجیے یہاں بھی یہ ''الجھتی'' ذمے داری ہماری ہی ٹھہری۔ لیکن اب عادت سی ہوتی جا رہی ہے لیکن دل میں ضرور الجھتے ہیں۔ ہر دوسرے دن خود ہی چینی کا پاٹ بھر دیتے ہیں اور دل میں ناراضی کی اٹھتی لہر کو دبا جاتے ہیں۔'' ہم نے اپنی بات ختم کی تو سب ہنسنے لگے۔

''چھوٹی سی بات لیکن اہم۔'' عائزہ نے بڑی پتے کی بات کی۔ ''کام چاہے چھوٹا ہو یا بڑا سب کو اس میں اپنا حصہ ڈالنا چاہیے۔ ایک ہی شخص ہے جہاں میں کیا؟ کبھی نند بھی اٹھ کر جا سکتی ہے کہ ''بھابی آپ بیٹھیں میں ابھی شکر بھر کر لاتی ہوں بھئی برا ماننے اور غصے کی بات تو ہے۔ سب کو مل جل کر ہاتھ بٹانا چاہیے۔'' عائزہ کی بات اختتامی تقریر ثابت ہوئی اور یہ بیٹھک پھر کبھی کہیں ملنے کے وعدے پر اختتام پزیر ہوگئی۔

☆☆☆

زندگی کی طویل راہداریوں سے گزرتے زمانہ

کام کی تلاش میں سرگرداں رہتے، کبھی طوبیٰ سے کہتے۔

''تم کہہ رہی تھیں ٹیلر نے شرٹ خراب کر دی ہے وہ ٹھیک کرانی ہے تو تم پریشان ہو ہمیں دو ہم ابھی بیٹھے، بیٹھے ٹھیک کر دیں گے۔'' ہم نے سوچا کہ کچھ وقت تو گزرے گا لیکن طوبیٰ نے بڑی رسانیت سے ہماری پیشکش پر پانی پھیر دیا۔

''ارے نہیں اماں آپ کہاں تکلیف کریں گی آپ کی آنکھوں پر زور پڑے گا، وہ میرا پرانا ٹیلر ہے ایک منٹ میں کھڑے، کھڑے درست کر دے گا۔''

لیجیے ہماری یہ مہم ناکام ٹھہری۔ ہم تو بہانے، بہانے سے کچن کے چکر لگا لیتے کیونکہ دونوں آفس جاتے تو کک (خانساماں) کچن سنبھال لیتا ہم کبھی، کبھی بیٹھ کر اس سے باتیں کرتے اور مختلف کھانوں کی تراکیب اس کو بتاتے رہتے لیکن وہ اپنی ترکیب پر اصرار کرتا۔

''نہیں ماں جی، صاحب، بی بی ناراض ہوں گے اس میں ٹماٹر نہیں ڈالتے صاحب کو وہی کے ساتھ پسند ہے۔''

ہم دل میں سوچتے کہ زاہد کب سے ٹماٹر چھوڑ کر دہی پر آیا، وہ تو ٹماٹر کو گیند کی طرح اچھال کر پورا، پورا ٹماٹر کھا جاتا تھا۔ اس پر کتنی ڈانٹ پڑتی تھی۔ ہم سوچتے وقت کے ساتھ انسان کو بدل جانا چاہیے۔ لیکن خانساماں ہماری روز، روز کی دخل اندازی اور تنقید سے تنگ آجاتا اور ہماری شکایت کرتا ہم دیکھتے اکثر وہ اپنی ''غلطی'' بھی ہمارے کھاتے میں ڈال دیتا۔

''وہ صاحب.....'' وہ بڑی ادا سے اپنا سر کھجاتا۔ ''وہ جی ماں جی نے کہا کہ تم ایسا کرو میں تو منع کر رہا تھا۔''

''اماں آپ کیوں اپنے آپ کو تھکاتی ہیں آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ کہیں پیر مڑ گیا تو پھر کیا ہوگا پلیز اماں کہنا مان لیا کریں ناں۔'' زاہد ہماری طرف ایک نرم سی لیکن تھکی تھکی سی مسکراہٹ اچھالتا۔

وہ تو اپنی بات ختم کر کے اپنی پلیٹ میں سلاد نکالنے لگا۔ لیکن ہمارے دل و دماغ کے تار جھنجھنا

غزل

کوئی دھڑکن ابھی رکی ہوئی ہے
دل کے آنگن میں تیرگی ہوئی ہے
جس کو سب سے عزیز تر جانا
بوجھ ہم پہ وہ زندگی ہوئی ہے
تیری چاہت میں ہم وہاں ہیں جہاں
سارے عالم سے دشمنی ہوئی ہے
آج دیکھا ہے غور سے خود کو
خود سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے
تجھ کو کھو کر ہر اِک خوشی میری
رنج و آلام میں چھپی ہوئی ہے
شبِ فرقت میں آج تمثیلہ
ایک جگنو سے دوستی ہوئی ہے

تمثیلہ لطیف، لاہور

ادبی لطائف

مشہور فرانسیسی ادیب والٹیئر 1727ء میں انگلستان پہنچا تو اس نے دیکھا کہ انگریز فرانس کے سخت خلاف ہیں اور کسی بھی فرانسیسی کی جان کی خیر نہیں۔ ایک دن وہ لندن کے ایک بازار میں ٹہل رہا تھا کہ یکلخت اس کے اردگرد لوگ جمع ہو کر مخالفانہ نعرے لگانے لگے۔ والٹیئر نے ہجوم کے غیظ و غضب کی قطعی پرواہ نہیں کی اور بڑے اطمینان سے کہا۔ انگریزو! تم مجھے اس لیے مارنا چاہتے ہو کہ میں فرانسیسی ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کیا میرے لیے اتنی سزا کافی نہیں تھی کہ میں انگریز پیدا نہ ہوا۔ یہ وار کارگر ہوا اور اس ہجوم نے والٹیئر زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔

☆☆☆

البرٹ اسٹائن سے کسی نے پوچھا..... ''تیسری عالمی جنگ میں کون سے ہتھیار استعمال ہوں گے؟'' اس نے جواب دیا۔ ''زمانہ اتنی تیزی سے ترقی کر رہا ہے کہ یہ بتانا مشکل ہے البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ چوتھی عالمگیر جنگ میں کون سے ہتھیار استعمال ہوں گے۔''

''کون سے؟'' اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''پتھر'' آئن اسٹائن نے جواب دیا۔

مرسلہ: آسیہ عامر، کراچی

ہے۔ دل میں سوچا کہ آخر ہمارے بھی تو ہاتھوں، پیروں کو حرکت کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

اداس سی ایک دوپہر ہم اپنے کمرے میں کتاب پڑھ رہے تھے کہ موبائل نے آنکھیں جھپکائیں اسکرین پر عائزہ کا نام جگمگا رہا تھا۔ ہائے...... اتنے سالوں بعد دیرینہ ساتھی کی آواز کانوں میں امرت بن کر اتر گئی۔

''عدیلہ بھئی کیسی ہو، کہاں رہیں؟'' ہماری تو خوشی سے زبان ہی گنگ ہو کر رہ گئی۔ ''ہاں بھئی ہم نے تمہیں ڈھونڈ ہی لیا۔ لگن سچی ہو تو خدا بھی مل جاتا ہے تم بتاؤ بچے کیا کر رہے ہیں آج کل؟ تم کیا کرتی ہو، سارا دن اب شکر دان میں شکر بھرنے سے غصہ تو نہیں آتا۔''

اس پر ہم دونوں نے قہقہے لگائے۔

''تمہیں یاد ہے اب تک ہماری بیوقوفی کی باتیں...... بیکار ہم نے اتنی چھوٹی اور بے ضرر مصروفیت کو دل کا روگ لگا لیا تھا اب تو ہم کام کرنے کو ترستے ہیں۔ بچے کوئی کام کرنے ہی نہیں دیتے۔ ہم یہ کام بہت خوشی اور دل سے کرتے ہیں اور اپنے پاگل پن پر ہنستے ہیں اب تو ہل کر پانی پینے کی بھی اجازت نہیں۔'' ہمارے لہجے کی آسودگی سے عائزہ بہت متاثر ہوئی۔

''ارے بھئی تم تو خوش نصیب ہو۔ اتنی سعادت مند اور خدمت گزار اولاد ملی ورنہ ریٹائرمنٹ کے بعد آرام کے بجائے میری طرح بے بی سٹنگ کر رہی ہوتیں، پوتے پوتی کی خدمت کے علاوہ بہو بیٹے جاب پر ہوتے ہیں تو ان کی خدمت لیکن اس پر بھی مزاج برہم، برہم۔'' اس کے لہجے کی ترشی محسوس کر کے ہم نے باتوں کا رخ دوسری طرف موڑنا چاہا۔

''اور سب دوستوں کا حال بتاؤ، وہ کامریڈی اب کیا کر رہی ہے؟''

''وہ فصیحہ......'' اس نے گہری سانس کھینچی۔

''اس کی داستانِ غم طویل ہے۔ بیٹا ملک چھوڑ گیا، باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کوئی انقلابی نظم لکھ دی تھی، دھمکیاں ملنا شروع ہو گئیں تو والد صاحب کو بھی ذرا کی آئی ورنہ ایک دفعہ موصوف بھی منظر سے غائب کر دیے گئے تھے۔ تو فصیحہ نے بڑی منت سماجت سے بیٹے کو ملک سے باہر بھیج دیا۔ میاں بھی اپنی بیٹی کی خاطر اب خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں فصیحہ جاب کرتی ہے آن لائن۔''

''اوہ بہت افسوس ہوا چلو اب کال لمبی ہو گئی ہے گیٹ پر گھنٹی بج رہی ہے۔ پھر بات کرتے ہیں۔'' شاید وہ ابھی کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی لیکن وطنِ عزیز کی مزید تکلیف دہ باتیں سننے کی برداشت نہیں تھی اور پھر لائن کٹ گئی۔ ہم نے سوچا بچو...... یہ دل کی سیاست ہے اس کو ہنر مندی سے برتا جاتا ہے نرم رو برسات کی پھوار کی طرح...... وقت چلا پر کیسے چلا، پتا ہی نہیں چلا۔ بہے جا زمانہ بہے جا۔

کچھ دن سے ہم گھر میں یہ تبدیلی دیکھ رہے ہیں کہ کھانے کی میز اور ٹرالی میں شکر دان اب خالی ہی نہیں ہوتا، جب دیکھتے وہ لبالب بھرا ملتا۔

''یا اللہ یہ خالی کیوں نہیں ہوتا۔ یہ لوگ تو باقاعدہ شکر خورے ہیں خاص طور پر زاہد تو چائے بھی شربت کی طرح پیتا ہے۔'' ہم نے خود کلامی کی ''کیا یہ کام بھی ہم سے گیا۔ شاید طوبیٰ آفس جانے سے پہلے ہی انجام دینے لگی ہے اب اس معمولی سی جنبش سے بھی گئے۔'' ہماری چھٹی حس بیدار ہوگئی۔ ہم نے فریج کھولا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بچوں کا پسندیدہ میٹھا یعنی چنے کا حلوا جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔ ''آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ شاید دونوں میاں بیوی اپنے بڑھتے وزن سے پریشان ہو کر ڈائٹنگ پر اتر آئے، ہاں یہ ہو سکتا ہے جب ہی تو شام کو واک کا ٹائم بھی بڑھا دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ جم بھی جوائن کر لیں گے تو بہ ہے ان بچوں کو بھی کون سمجھائے چھوٹا سا ایک بچہ ہے اتنے سال شادی کو ہو گئے دوسری کوئی اولاد بھی نہیں۔'' ہم تو سوچوں کے دریا میں دور، دور بہتے چلے گئے۔ دو دن اسی سوچ بچار میں گزر گئے۔ روز ہی مایوسی ہوتی۔ آخر ہمارے ضبط کی طنابیں ڈھیلی پڑ گئیں اور تنگ آ کر ہم پوچھ بیٹھے۔

''بھئی یہ تماشا کب ختم ہوگا ہم کو پہلے ہی ہر کام سے روک دیا ہے کبھی، کبھی کوئی سویٹ ڈش بنا لیتے تھے یا پھر چائے دم دے کر تم لوگوں کے ساتھ کچھ وقت بتا لیتے تھے اب یہ فریج سے حلوا ختم ہو رہا ہے اور نہ شکردان کی شکر ختم ہو رہی ہے۔ تو کیا تم لوگ ڈائٹنگ کر رہے ہو یا پھر ہم کو اب یہ اتنا سا کام بھی کرنے کی اجازت نہیں..... سنو تم لوگ، اس طرح بیکار بیٹھ کر ہم معذور ہو جائیں گے جو ہمارے خیال میں تم لوگوں کے لیے زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔ حرکت ہی میں برکت ہے، ہلکے پھلکے کام سے تھکن نہیں ہوتی۔'' ہماری خفگی بھری تقریر سن کر زاہد تو منظر سے کھسک لیے جبکہ طوبیٰ نے بڑے رسان سے ہمارے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور ہمارے کندھے پر اپنا پیار بھرا سر رکھ دیا۔ ہم بے بسی سے اپنے ہاتھ اس کے سر پر پھیرنے لگے۔

''اماں جان ہم لوگ ڈائٹنگ ہرگز نہیں کر رہے۔ بس ذرا لائف اسٹائل تبدیل کر رہے ہیں بہت شکر اور میٹھے کا استعمال نقصان دہ ہے۔ ہاں چینی کم کر دی ہے سو جب وہ ختم پر ہوتی ہے تو میں خود ہی بھر دیتی ہوں۔''

''لیکن بیٹی، اس بہانے ہم تھوڑا چل پھر لیتے ہیں، کپڑے واشنگ مشین میں دُھل جاتے ہیں، کچن میں بھی ہمارا داخلہ ممنوع ہو گیا۔'' ہمارے لہجے کی تلخی سے وہ پریشان ہو کر سامنے سے ہٹ گئی۔ اس نے پہلی بار اس طرح سختی سے بات کرتے دیکھا تو سہم کر اس کے تاثرات حیرت زدگی میں تبدیل ہو گئے۔ ساری مسکراہٹ اچانک ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ ہم تو بالکل سٹپٹا کر رہ گئے۔ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور قدم اپنے کمرے کی طرف بڑھا دیے۔ لیکن ہم دروازے پر ہی ٹھٹک کر رہ گئے۔ زاہد اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرتا کھانے کے کمرے میں داخل ہوا پہلے اس نے مڑ کر پس منظر کا جائزہ لیا۔ ہم قدرے اوٹ میں ہو گئے۔ طوبیٰ اپنا بیگ ہلاتی اور ننھے واحد کو پکڑے زاہد سے مخاطب ہوئی۔

''زاہد، اماں تو بہت ہرٹ ہو رہی ہیں، وہ تو ناشتا کیے بغیر ہی اٹھ گئیں اب ہم ان کو کیا سمجھائیں۔ وہ تو ہماری ذرا سی تکلیف سے پریشان ہو جاتی ہیں.... بلڈ پریشر شوٹ کر جاتا ہے۔'' اس کے لہجے میں فکرمندی نمایاں تھی۔ زاہد نے رک کر پیچھے دیکھا۔

''اب اماں کو کیسے سمجھائیں کہ آج کے دور میں کسی بھی عمر میں آ کر بھی عقل آ جائے تو غنیمت ہے ہم کیا کر رہے ہیں صرف احتیاط ہی کر رہے ہیں۔'' دونوں پریشان ہو کر اپنے کاموں پر روانہ ہو گئے۔

''آ کر بات کرتے ہیں اماں سے۔'' ان کے یہ شیریں سخن سن کر ہم برآمدے میں پڑی کرسی پر جا گرے۔

''اُف یہ بچے ہماری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔'' سامنے لان میں لگے پیڑوں پر کئی پرندے چہچہا رہے تھے کچھ پرندے چہلیں کرتے بے فکری سے فضا میں پنکھ پکھرائے اڑان بھر جاتے۔ ہم سوچتے ان پرندوں کی زندگی میں کتنی بے فکری کی زندگی ہے۔ نہ صیاد کا ڈر نہ شکاری کا..... آج موسم بھی ابر آلود تھا ہوائیں بھی ہلکی، ہلکی سی سرگوشی کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ یہ موسم بھی ہمارے ملال کے موسم کو کم نہ کر سکا۔

صبح ناشتے کی میز پر ایک بھید بھری خاموشی ٹنگی تھی۔ طوبیٰ نے ہمارے لیے ٹوسٹ پر جیم لگا کر پلیٹ ہمارے آگے کھسکا دی زاہد جو جیم جیلی کا شوقین تھا۔ صرف بوائل انڈا کاٹنے سے کھانے لگا اور یہ عمل طوبیٰ نے بھی دُہرایا۔ اب طوبیٰ نے ہمارے لیے چائے بنائی شوگر پاٹ کھولا۔ اوہ نو..... آئی کانٹ بلیو پھر حیرت و استعجاب سے ہمیں دیکھا۔

''یہ کیا اماں براؤن شوگر! آپ نے کیسے جانا کہ ہم لوگ شوگر سے پرہیز کر رہے ہیں۔'' اور ہم نے مسکرا کر بچوں کی طرف دیکھا تو حیرت سے تکتے ہی رہ گئے۔ کیونکہ ان کی آنکھوں میں الفت و محبت کا سمندر ڈھاٹیں مار رہا تھا دونوں سہمے معصوم کبوتر کی طرح کھڑے تھے۔ ہم نے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا

لیلی کا ہینڈل پکڑ کر زاہد کے لیے گرین ٹی پیالی میں انڈیل دی اور لیمن کی قاش بھی سجا دی۔ دونوں اس کارروائی سے گھبرا کر ہمارے گلے آ لگے۔ طوبیٰ کی گلابی رنگت مسکرانے سے مزید گہری ہوگئی اور گالوں میں پڑنے والے ڈمپل لودینے لگے اور ہماری پلکوں کی دہلیز پر ایک جلتا دیا چمک دینے لگا اور ہم لان میں سردیوں کی پہلی ہوتی دھوپ میں آن بیٹھے۔ زاہد ہمارے پیچھے لپکا۔

"اماں آپ کو کیسے معلوم ہوگیا کہ ہم دونوں کو اب شوگر سے مکمل پرہیز کرنا ہے ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہے۔ میری شوگر تو طوبیٰ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی تو بارڈر لائن پر ہے۔" وہ ہماری جانب دیکھے بغیر ہی اپنی کہے جا رہا تھا اور اِدھر ہمارے اوسان خطا ہو گئے ہیں۔

"اوہ میرے خدا...... تو تم لوگ ڈائٹنگ نہیں کررہے، تم لوگ شوگر پیشنٹ ہو گئے ہو۔ ابھی تم لوگوں کی عمر ہی کیا ہے۔" تھوڑی دیر پہلے کے سارے شیریں سخن پھیکے پڑ گئے ذہن میں تلخی سی بھر گئی۔ ان کی صحت سے پریشان ہم نڈھال سے ہو کر کرسی پر جا گرے۔ طوبیٰ ہمارا ناشتا ٹرے میں لیے حیرت سے تک رہی تھی۔ پھر اس حالت کی گمبھیرتا سے پریشان ہو کر کہنے لگی۔

"آپ ناشتا کیے بغیر آ گئیں۔" اور اس نے ٹوسٹ جو جیلی سے لبریز تھا ہماری طرف بڑھایا۔

"یہ سب تو تم لوگوں کو مرغوب ہے۔ اب سن لو جیلی جام، گاجر کا حلوا ان سب کا داخلہ ممنوع۔" ہم آبدیدہ ہوگئے۔

ناشتے کی ٹرے ہاتھ سے لے کر ہم توسٹ کو آہستہ آہستہ حلق سے زبردستی اتارنے لگے جو ہم کو چائے کے گھونٹ کے ساتھ نگلنا پڑا۔ دل میں سوچا۔

"اپنا رنج و غم اپنی پریشانی مجھے دے دو۔"

اُف دلِ ناداں، ہم نے ایسا کب چاہا تھا کہ یوں ہو جائے۔ ہم تو اب اس بے ضرر اور معمولی سے کام کے عادی ہو گئے تھے، وہ زمانے گئے جب ہمیں شوگر پاٹ بھرنے سے الجھن ہوتی یا غصہ آتا۔ اب تو ہمیں اپنے ہاتھوں سے چھوٹے، چھوٹے کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ شاید اسی لیے بزرگ کہہ گئے ہیں کاموں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ کام کو انجوائے کر کے انجام دو کیا خبر بعد کو تم خود چاہو لیکن کر نہ سکو۔ دکھ کی تتلی اڑ کر میرے دل میں پھڑ پھڑانے لگی۔

"اُف ہم بھی ناں، بچے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ہم ذرا، ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتے ہیں۔" ہم نے دل میں اترے دکھ کو باہر نکالا موسم یا رُت بھی یکساں نہیں رہتے ابھی زندگی احتیاط اور پرہیز کے ساتھ بسر کر لیں تو آگے حیات سہل ہو جائے گی۔

باہر فضا میں خنکی چھائی ہوئی تھی۔ شیشے کے دروازے پر باریک سی دھند کی چادر تنی ہوئی تھی یہ اس بات کی علامت تھی کہ موسم تبدیل ہو چکا ہے۔ آج کے اس بھاگتے دوڑتے زمانے میں کوئی مرض اتنا مشکل نہیں ہوتا۔ ہمارے بچے تو یوں بھی احتیاط پسند ہیں۔ آج سے ان کے ساتھ، ساتھ ہم بھی احتیاط کو خوش دلی سے قبول کریں گے۔ اس سوچ کے ساتھ ہی نیلی رگوں میں دوڑتا دکھ رفو چکر ہو گیا اور ہم نے اطمینان کے ساتھ سکون کی چادر تان لی۔

دکھ اوڑھتے نہیں سمیٹے جاتے ہیں۔ ہمیں اپنی دوست فضیلت کی ایک کارآمد بات یاد آئی کہ "گھر کے بزرگوں پر احتیاط اور پرہیز کے نام پر اپنے احکامات نازل نہ کریں۔ اس طرح وہ سمجھتے ہیں کہ اب وہ اپنی مرضی سے جی بھی نہیں سکتے" جبکہ اولاد کا نقطۂ نظر ان کا آرام اور سکون ہی ہوتا ہے۔ یہ گُر کی بات ہمیں آج یاد آئی تھی۔ ہم واقعی چھوٹی، چھوٹی باتوں کو اپنے اوپر بہت طاری کرتے ہیں اور پھر پریشان ہوتے ہیں۔

دکھ اوڑھتے نہیں کبھی جشنِ طرب میں ہم
ملبوسِ دل کو تن کا لبادہ نہیں کیا

(پروین شاکر)

❀❀❀

pklibrary.com

شریعت جرم ہے؟

بشریٰ الطاف

شام کا سنہرا پن چاروں طرف بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا سورج کے اکھڑتے قدم اور سیاہی کو اپنے قدم جماتے دیکھ کر فضاؤں میں اڑتے پرندوں نے اپنے، اپنے ٹھکانوں کی راہ لی۔ کسی دور دراز گاؤں کے کھیت میں چرواہا ریوڑ لیے، کندھے پر پڑے صافے سے ماتھے کا پسینا صاف کرتے ہوئے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ شہروں کی سڑکوں پر گاڑیوں، موٹر سائیکلوں، بسوں اور ویگنوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مختصر یہ کہ ہر کسی کو اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی اور جیسے، جیسے سیاہی بڑھتی جا رہی تھی، منزل قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔

راول پنڈی کے اس چھوٹے سے محلے میں بھی کوئی اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔

وہ بھی ایک چھوٹا سا ہی محلہ تھا۔ چھوٹی بڑی ایک دوسرے سے جڑی دیواریں، گھروں کے باہر لوہے کے زنگ آلود گیٹ، جن کی اندرونی طرف لنڈے سے خریدے گئے لال پیلے پردے لٹک رہے تھے، تنگ گلیاں اور گلیوں میں بنا ڈھکن کے گٹروں سے ابھرتی ہوئی ناقابلِ برداشت بُو.....! اس بو میں دھیرے، دھیرے موت کی ناخوشگوار بُو بھی شامل ہو رہی تھی لیکن وہاں ایسا کوئی نہیں تھا جو فضا میں پر پھیلائے قضا کو دیکھ سکتا۔ جو ایک نازک بدن سے نکلتی روح کا احساس کرتا۔

رنگ اڑے دروازے کے پار بان کی چارپائی پر پڑا، وہ نسوانی وجود جان کنی کے عالم میں تھا۔ بند ہوتی موٹی سی ان آنکھوں میں زندگی ہار رہی تھی اور پھر کلمہ پڑھتے وہ گلابی لب رک گئے۔ لمحوں کے اس کھیل کے بعد وہ دبلا پتلا وجود ساکت تھا۔ وہاں ایک اور زندگی ہار چکی تھی وہاں ایک بار پھر موت جیت چکی تھی.....!

☆☆☆

''ایکسکیوزمی مس حرا۔'' کالے دوپٹے چپل میں جکڑے پیر اس پکار پر یک دم رکے۔ دل کی دھڑکنوں کو سینے کے اندر شور مچاتے دیکھ کر اس کا چہرہ شرم سے گلابی پڑنے لگا۔ بڑی مشکل سے اپنی غیر ہوتی حالت پر قابو پاتی، دھیرے سے اس نے رخ موڑا۔ سامنے ہی وہ کھڑا تھا نیلے رنگ کی گھسی ہوئی جینز کے ساتھ کالی شرٹ زیب تن کیے۔ اس کا حلیہ اس کے متوسط گھرانے سے تعلق کو بخوبی واضح کر رہا تھا۔

''مجھے آپ کا تھوڑا سا وقت درکار ہے۔'' شائستہ سے اس لہجے میں ایک التجا تھی جیسے!

''جی بولیے میں سن رہی ہوں۔'' دھیمے لہجے میں اجازت دی گئی۔

''یہاں کچھ مناسب نہیں لگتا اگر آپ کو برا نہ لگے تو ہم وہاں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔'' یہاں سے مراد اس کی کار ریڈور تھا، جس کے بیچ و بیچ وہ دونوں کھڑے تھے جبکہ وہاں سے مراد سامنے کیفے میں پڑی کرسیاں تھیں۔ سر ہلاتی وہ اس کے ساتھ کیفے کی جانب بڑھ گئی۔

اگلے دو منٹ میں وہ اپنی، اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔ دونوں کرسیوں کے درمیان پلاسٹک کی چھوٹی سی میز تھی جس پر ڈسپوزایبل پلیٹیں پڑی تھیں۔ یقیناً تھوڑی دیر پہلے وہاں سے کوئی کچھ کھا کر اٹھا تھا اور دو قدم کے فاصلے پر رکھا خالی کوڑا دان اس جامعہ کے تعلیم یافتہ طلباء طالبات کی اعلیٰ تعلیم پر نوحہ کناں تھا.....!

''آپ نے کوئی بات کرنی تھی۔'' مسلسل خاموشی سے وہ اکتانے لگی، اسی لیے خود ہی بول پڑی۔ وہ جو سوچوں میں گھرا یہاں وہاں دیکھ رہا تھا اس کی آواز پر فوراً سنبھلا۔

''ہاں.....وہ.....میں.....'' سوکھتے لبوں پر زبان پھیرتا وہ گڑبڑایا ہوا لگ رہا تھا۔ پھر ایک گہری سانس کھینچ کر، اپنی ساری ہمتیں مجتمع کرتا بالآخر وہ صاف لہجے میں بولنے لگا۔

''حرا اب ہمارے آخری سمسٹر کے بھی چند ہی دن رہ گئے ہیں، اگلے ہفتے سے چھٹیاں ہو جائیں گی پھر ہم سب بس پیپرز دینے ہی آئیں گے اور پھر نہ جانے کون کس جانب چل پڑے۔'' تمہید کے لیے بولے گئے یہ چند جملے مقابل کو الجھا رہے تھے حرا کے چہرے پر پھیلتی الجھن کو بھانپ کر داؤد نے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر اس کے لیے اپنی خواہش بیان کرنا قطعاً مشکل نہ رہا۔

''اگر میں مختصراً بات کروں تو وہ یہ ہے کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' دو سالوں سے دل میں پنپتی خواہش تھی یہ، جو آج دو لمحوں میں اس کے لبوں سے جدا ہو کر حرا کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

دو سالوں سے دو لمحوں تک کا یہ سفر کتنا کٹھن تھا، کتنا صبر آزما تھا، یہ صرف وہی جان سکتا ہے جس کے دل کو محبت کی زنجیروں نے جکڑ رکھا ہو۔ خواہش بیان ہو چکی تھی۔ شور مچاتی دھڑکنیں حرا کے جامد لبوں کو دیکھ کر تھمنے لگیں، کئی وسوسے تھے جو اس کے ذہن میں ابھر رہے

تھے۔اسی لیے ہمیشہ جھکی رہنے والی نگاہیں یک ٹک اسے گھور رہی تھیں۔پیشانی کی شکنوں سے لے کر ٹھوڑی کے گڑھے تک داؤد کی نگاہیں بڑی تیزی سے دوڑ رہی تھیں۔کافی دیر اس کی اٹھتی جھکتی پلکوں کے کھیل سے خوف کھاتا وہ کچھ پریشانی سے بولا۔

''حرا کیا آپ کسی اور سے منسوب ہیں؟'' یہ سوال نہیں تھا بلکہ کمان سے نکلا تیر تھا جو سیدھا اس کے دل پر لگا تھا۔وہ تو داؤد کے منہ سے شادی کا ذکر سن کر بے یقینی کا شکار تھی،اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جس خواب کو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی موٹی سیاہ آنکھوں میں سجا بیٹھی تھی،دو سال دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ جسے کن انکھیوں سے تکا کرتی تھی،تہجد میں اٹھ،اٹھ کر دینے والے سے جسے مانگا کرتی تھی،وہ آج خود اس کے سامنے بیٹھا اسے اس سے مانگ رہا تھا۔رب کی ایسی عطا پر وہ کچھ لمحوں کے لیے چپ کی چپ رہ گئی۔کہ داؤد کے اس سوال نے اسے احساس دلایا کہ اس کی یہ طویل خاموشی سامنے بیٹھے وجود کو تکلیف دے رہی ہے۔اس احساس کے زیر اثر وہ قدرے تیز مگر مدھم لہجے میں بولی۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' یہ چھوٹا سا جملہ داؤد کے تن من کو گل و گلزار کر گیا تھا۔

''حرا میں نے اس ایک لمحے کا دو سال انتظار کیا ہے، مجھے آپ کے ساتھ راتوں کو سستے پیکجز پر لمبی، لمبی کالز کا شوق ہے نہ محبت کے نام پر سڑکوں اور پارکوں میں اپنے پرکھوں کی عزت رولنے کا۔میرے لیے محبت سے زیادہ عزت اہم ہے،اسی لیے آپ کے والدین سے آپ کو عزت اور محبت کے ساتھ مانگنا چاہتا ہوں اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے والدین کو آپ کے گھر بھیج دوں!'' وہ بولتا جا رہا تھا بنا یہ دیکھے کہ وہ نازک سی لڑکی شرم سے بے حال ہوئی جا رہی ہے۔بے اختیار وہ وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی اسے یوں اچانک اٹھتے دیکھ کر وہ حیران ہوا اس سے پہلے وہ ایک قدم آگے بڑھاتی داؤد نے حیرت میں ڈوبا استفسار کیا۔

''آپ بنا کچھ کہے جا رہی ہیں۔اقرار یا انکار کوئی تو جواب دیں جائیں،یقین جانیں انتظار کی سوئی پر لٹکتے رہنا بہت جان لیوا ہے۔'' داؤد کے اس جذباتی پن پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرانے لگی۔اس کی مسکراہٹ میں کچھ تو ایسا تھا جو داؤد شوخ ہوا تھا۔

''کہتے ہیں کسی کی خاموشی میں اگر مسکان کا رنگ ہو تو وہ اقرار کا دوسرا انداز ہوتا ہے۔''

''اور یہ جو کوئی بھی کہتا ہے بالکل ٹھیک ہے۔'' بیگ کو کندھے پر لٹکاتی وہ مڑ کر وہاں سے بھاگنے ہی لگی تھی کہ پھر کچھ سوچ کر اس کی جانب مڑی۔

''لیکن ایک بات میں واضح کر دوں،اماں ابا کی مرضی کے بغیر آپ میرے قدموں کی گرد بھی نہیں پا سکیں گے۔'' کہتے ہی وہ وہاں سے تیزی سے نکل گئی جبکہ پیچھے کھڑا داؤد عورت کے اس روپ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔سلام تھا اس عورت کو جو نہ چاہتے ہوئے بھی کسی سے محبت تو کرنے لگی تھی لیکن وصل کی چاہ ماں باپ کی مرضی سے مشروط کر گئی تھی۔جو شرط پوری نہ ہوئی تو جدائی کا کالا پانی تو پی لے گی مگر وصل کی بنیاد ماں باپ کی عزت کی رسوائی پر نہ رکھے گی انہی سوچوں میں گھرا وہ اپنی محبت پر فخر کر رہا تھا۔

☆☆☆

میری گواہی آدھی ہے تو
میرا جرم بھی آدھا ہوگا
میرا حصہ آدھا ہے تو
میری سزا بھی آدھی ہوگی

انہوں نے جیسے ہی کھلے گیٹ سے اندر قدم رکھا، نظر سیدھی صحن کے وسط میں رکھی چارپائی پر گئی۔چارپائی کے سرہانے کی طرف اماں بیٹھی سینہ پیٹ رہی تھیں جبکہ بھابی ان کے گلے لگی دھاڑیں مار رہی تھیں۔پھپو الگ ہاتھ ملتیں منہ پھاڑے اللہ تعالیٰ سے شکوے کرنے میں مگن تھیں۔ایک ٹرانس کی کیفیت میں چلتی ....وہ چارپائی کے پاس جا کر بے اختیار بیٹھتی چلی گئیں۔

لٹھے کے مانند سفید چہرے پر موجود وہ موٹی سیاہ آنکھیں بند تھیں۔ذرا سے کھلے منہ کی وجہ سے اس کے

pklibrary.com

سفید چمکدار دانت صاف دیکھے جاسکتے تھے۔ تم نگاہوں سے کفن میں لپٹے حرا کے چہرے کو دیکھتے ہوئے ذہن کے پردے پر دو دن پہلے کا منظر لہرایا جب وہ روتی بلکتی اپنی پاکیزگی کا یقین دلا رہی تھی۔

''آپی میں قسم کھا کر کہتی ہوں، میرا اور داؤد کا کوئی ایسا ویسا رشتہ نہیں ہے بلکہ وہ تو زندگی میں پہلی بار مجھ سے امتحانوں سے ایک ہفتہ قبل مخاطب ہوا تھا۔''

''میں جانتی ہوں میری جان تیرا کوئی قصور نہیں ہے، میں سب جانتی ہوں لیکن یہ لوگ.....'' سینے میں دبی ایک آہ ان کے لبوں سے آزاد ہو کر پہلے سے بوجھل ماحول کو مزید بوجھل کر گئی۔

''لیکن آپی! اماں ابا اور بھائی تو لوگ نہیں ہیں ناں۔ یہ سب کیوں ایسی باتیں کر رہے ہیں۔'' ان کے سینے میں منہ دیے وہ مزید بلکنے لگی۔ نیا کچھ نہیں ہوا تھا، وہی صدیوں پرانا قصہ تھا بس اس دفعہ کردار نیا تھا۔

داؤد وعدے کے مطابق امتحانوں کے چند دن بعد اپنے والدین کو لے کر اس کے گھر آیا تھا لیکن اسے قسمت کی ستم ظریفی کہیں یا ان دونوں کی بدقسمتی کہ ٹھیک اسی شام حرا کی اکلوتی پھپھو نے بڑے مان سے بھائی کے سامنے جھولی پھیلائی اور حرا کو اپنے مکینک بیٹے کے لیے مانگ لیا۔ اپنوں کے مقابلے میں پرائے کی دال بھی کبھی گلی ہے جو آج گلتی پھر چاہے وہ پرائے ہزار گنا اپنوں سے بہتر ہی کیوں نہ ہوں۔ اور سب سے بڑی بات عزت کے اونچے شملے والے، ان چھوٹے گھروں کے باسی بیٹیوں کی رضا جاننے والی بے غیرتی کیونکر کریں گے۔

پھر وہی ہوا، فیصلہ پھپھو کے نبیل کے حق میں ہو گیا اور یہی جان کر حرا کی ہمت جواب دے گئی۔ ہمت ٹوٹنے لگے تو زبان کھلنے لگتی ہے۔ اس کی زبان بھی ماں کے سامنے کھل گئی۔ انجام سے انجان بند کمرے میں اس نے ماں کو بس یہ کہا۔

''اماں مجھے نبیل نہیں پسند، آپ ابو سے کہیں وہ داؤد سے ایک دفعہ مل لیں پھر جو اُن کا فیصلہ ہوگا وہی میری مرضی ہوگی۔'' بند دروازے سے کان لگائے کھڑی بھابی کے کان کھڑے ہو گئے، ماں بیٹی کو احساس تب ہوا جب غیرت کے علمبردار بھائی نے اپنی بے غیرت بہن کے شفاف چہرے پر اپنے بھاری ہاتھ کی پانچوں انگلیاں ثبت کیں۔

''ذلیل، بے غیرت، بے حیا، ہماری عزت کو رولتے تجھے ذرا شرم نہ آئی۔'' مغلظات بکتا وہ اس وقت ایک بھائی نہیں، صرف ایک مرد تھا جسے اپنی مردانگی کی تسکین ان تھپڑوں کی گونج میں مل رہی تھی۔

''میں بھی کہوں یہ اتنا بناؤ سنگار کر کے کیوں جاتی ہے، اب سمجھ آئی پڑھائی کے نام پر.....'' معنی خیز ادھورا جملہ جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ بھابی کے اس جملے سے بھیا اور بھڑک گئے جبکہ وہ تو ہمیشہ سادہ کالی چادر میں گھر سے نکلتی تھی جانے یہ کون سا سنگار تھا جو بھیا کو سلگائے جا رہا تھا۔ اچھی طرح عزت کی رسوائی کا تھپڑوں کی گونج میں ماتم کرنے کے بعد اسے ایک زوردار ٹھوکر لگا کر وہ وہاں سے نکل گئے۔

''کاش تو میری تربیت کا ہی پاس رکھ لیتی۔'' پورے تماشے کو خاموشی سے ملاحظہ کرنے کے بعد اماں آخر میں بولیں بھی تو کیا.....! حرا کو لگا زندگی کی ساری جمع پونجی آج اماں کے اس جملے میں بہہ کر ضائع ہو گئی تھی۔

☆☆☆

شام کو زہرا آپی چلی آئیں اور جیسے ہی انہیں ساری بات پتا چلی وہ تقریباً دوڑ کر حرا کے کمرے کی طرف آئیں۔

''حرا.....میری بہن.....'' تڑپ کر انہوں نے اس پر پڑا کمبل ہٹایا۔ ماتھے کو چھوا تھا یا جلتے انگارے کو ہاتھ میں لیا تھا فرق کرنا مشکل تھا۔ بخار میں تپتی سرخ رنگت لیے وہ ایک بار پھر پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔ ان کے سینے میں منہ دیے وہ گھر والوں کی بے اعتباری کی شکایت کر رہی تھی۔ اپنی بے گناہی کا یقین دلا رہی تھی۔ جب اس نے تڑپتے ہوئے کہا۔

''آپی! اماں، ابا، بھائی تو لوگ نہیں ہیں ناں تو پھر

وہ سب ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اپنی پسند کا اظہار اتنا بڑا جرم ہے کہ بنا سوچے سمجھے لمحوں میں بدکرداری کا سرٹیفکٹ آپ کے ہاتھ میں تھما دیا جاتا ہے۔'' ان کے پاس اس کو دینے کے لیے کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ جتنی دیر اس کے پاس بیٹھی رہیں، کبھی اس کے آنسو صاف کرتیں تو کبھی اسے گلے لگا لیتیں۔ درد جب حد سے سوا ہوا تو وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''چھوٹی میں اب چلتی ہوں، سلمان میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' وہ تو دو دن رہنے کے ارادے سے میکے آئی تھیں لیکن میکے والوں کے رویّے سے مسلی ہوئی بہن کو بے حال دیکھ کر برداشت ختم ہونے لگی تھی اس سے پہلے بہن کی محبت ماں باپ کے سامنے کھڑا کر دیتی، انہوں نے واپس جانا بہتر سمجھا۔ سوکھتے لبوں سے اس کا ماتھا چوم کر وہ جیسے ہی مڑنے لگیں حرا نے ان کا آنچل تھام لیا۔

''آپی آپ نے بتایا نہیں کیا واقعی پسند کا اظہار جرم ہے؟'' وہ پھر سے اپنا سوال دُہرا رہی تھی۔ جواب کوئی نہیں تھا بس ایک آنسو تھا جو ان کی پلکوں سے ٹوٹ کر گریبان میں جذب ہو گیا۔

''آپی مت جاؤ، یہ ذلت یہ رسوائی میری برداشت سے بہت زیادہ ہے، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ آپ پلیز آج نہ.....'' اور بنا اس کی سنے وہ کمرے کی تو کیا گھر کی بھی دہلیز پار کر گئی تھیں۔ کاش اس رات انہیں کوئی بتاتا کہ آج آخری بار وہ اپنی لاڈلی بہن کا چہرہ دیکھ رہی ہیں تو پھر شاید دل میں اٹھتے درد کو دبا کر رک جاتیں وہ.....لیکن موت کب خبر دے کر آئی ہے وہ تو شروع دن سے دبے پاؤں بنا خبر کیے ہی آتی ہے اور جاتے ہوئے اپنے ساتھ بہت کچھ لے جاتی ہے۔

☆☆☆

یہ ٹھیک ان کے جانے کے ایک دن بعد کی بات ہے جب حرا پیاس کی شدت سے نڈھال ہو کر دبے پاؤں کچن میں گئی۔ اسٹیل کے گلاس میں پانی ڈال کر وہ ابھی پانی پینے ہی والی تھی جب اس کی ننھی بھتیجی بولی۔

قرنطینہ

شوہر نہانے کے لیے باتھ روم گیا تھا۔ بیوی نے اس کا موبائل چیک کیا۔ کانٹیکٹ لسٹ میں ایک نام ''کورونا'' نظر آیا۔ بیوی کو حیرت بھی ہوئی اور تجسس بھی، اس نے وہ نمبر ڈائل کیا تو کچن میں خود اس کا موبائل بجنے لگا۔

اب لاکھ سمجھانے پر بھی شوہر باتھ روم سے باہر نہیں نکل رہا..... بول رہا ہے۔ ''میں قرنطینہ میں ہوں۔''

از: ساجدہ ظفر، کمالیہ

خوب صورت دعا

یا اللہ.....

عمر کا آخری حصہ۔ بہترین حصہ بنا دے

عمر کا آخری عمل بہترین عمل بنا دے

اور جب تجھ سے ملاقات کا دن ہو یا رب

تو وہ دن خوب صورت ترین بنا دے.....

الٰہی آمین.....

از: دعا گو: ہما بیگ، کراچی

مختلف ملکوں کی کہاوتیں

☆ نہ گرنا کمال نہیں بلکہ گر کر اٹھ جانا کمال ہے۔
(چینی کہاوت)

☆ ہر نیند آدھی غذا کا کام دیتی ہے۔
(جرمن کہاوت)

☆ عمدہ دوا اکثر کڑوی ہوتی ہے۔
(جاپانی کہاوت)

☆ مصیبت میں گھبرانا سب سے بڑی مصیبت ہے۔
(عربی کہاوت)

☆ پھول مرجھا جاتے ہیں لیکن کانٹے رہ جاتے ہیں۔
(برطانوی کہاوت)

مرسلہ: زرینہ خان، بہارہ کہو

''پھپھو مجھے بھی پانی پینا ہے۔'' چار سالہ ہادیہ نے بڑے لاڈ سے اس کی ٹانگیں پکڑ کر کہا تھا۔ اس کے اس معصوم انداز پر بہت دنوں بعد ایک ہلکی سی مسکان اس کے ہونٹوں پر ابھری۔ اسے گود میں اٹھا کر پانی پلایا۔ نرمی سے دونوں گالوں کو چوما۔ اس سے لاڈ کرتی وہ بھول چکی تھی کہ وہ خود پانی پینے کے لیے باہر آئی تھی۔

''پھپھو میں آپ سے ناراض ہوں۔'' ہادیہ منہ بسور کر بولی۔

''کیوں میری جان، مجھ سے کیوں ناراض ہو؟'' نرمی سے اس کی ناک دباتی وہ مصنوعی حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔

''اتنے دن ہو گئے آپ نے مجھے پیار بھی نہیں کیا اور نہ ہی کہانی سنائی۔'' اس کی شکایت سے حرا ابھی جی بھر کے لطف اندوز بھی نہیں ہوئی تھی کہ بھابی نے چیل کی طرح جھپٹ کر ہادیہ کو اس سے چھینا۔

''چھوڑو میری بچی کو، اب کیا اسے بھی اپنے جیسا بنانا ہے۔ خبردار جو آئندہ تم ہادیہ کے آس پاس بھی نظر آئیں۔ میں اپنی بچی پر ''تم جیسیوں'' کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔'' وہ اب بھی بول رہی تھیں لیکن حرا اس سے زیادہ نہیں سن سکی تھی۔ بنا اِدھر اُدھر دیکھے وہ اپنے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔ دروازے کی چٹخنی چڑھا کر وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ چکی تھی لیکن ''تم جیسیوں'' کی گردان نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ روتے، روتے نظر لکڑی کی تپائی پر رکھے اماں کے فون پر پڑی۔ تیزی سے زہرا آپی کا نمبر ملا کر اس نے بے قراری سے ہیلو کہا مگر آنسوؤں نے مزید کچھ کہنے نہ دیا۔

''حرا میری جان! میری گڑیا! کیا ہوا ہے؟ کیوں رو رہی ہو، فون کی دوسری طرف موجود آپی کو اس کی سسکیوں نے تڑپا دیا تھا۔

''حرا اب بولو بھی ہوا کیا ہے؟ کیوں میرا دل دہلائے جا رہی ہو؟'' اس کا مسلسل رونا انہیں بیچ میں ہولا رہا تھا اور پھر اپنی سسکیوں پر قابو پاتی وہ انہیں سب بتانے لگی وہ بتاتی گئی۔

بھابی نے کیا کیا کہا تھا۔

اماں نے کیسے نگاہیں پھیر لی تھیں۔

اور بھیا اور ابا کے زنانہ طعنے.....!

''صبر کر میری گڑیا، اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' آپی بھی سسک پڑیں۔

''نہیں ہوتا صبر مجھ سے، دن رات کی اس ذلت سے تنگ آ گئی ہوں، آپ نہیں جانتیں اماں اور بھابی کی گالیاں کیسے کانوں کے پردے تک چیر دیتی ہیں۔ بھیا اور ابا کے طعنے کتنی بڑی بڑی ضربیں میرے دل پر لگاتے ہیں، آپ کچھ نہیں جانتیں آپی۔ کچھ بھی نہیں.....'' خاموشی جب چبھنے لگے تو حلق میں دبی چیخوں کو باہر آنے کا رستہ مل جاتا ہے۔ وہ بھی آج چیخ رہی تھی۔

''حرا تو چپ کر، میں صبح آؤں گی۔ دیکھنا میں تیرا مقدمہ ایسے لڑوں گی کہ تو سب کی نظروں میں سرخرو ہو جائے گی۔'' کیا ہوا جو انہوں نے وکالت نہیں پڑھی ہوئی تھی۔ اپنوں کے کیس اپنوں کی عدالت میں ہی لڑنے کے لیے وکالت پڑھی ہو یہ ضروری نہیں ہوتا۔ اپنوں کی عدالت میں کیس دل سے لڑے جاتے ہیں اور دل سے لڑے جانے والے کیس کبھی کوئی نہیں ہارتا۔

''میں بچی نہیں ہوں آپی، یہ جھوٹے بہلاوے نہ دیں مجھے۔'' وہ اس وقت مایوسی کی انتہا کو چھو رہی تھی۔

''میں نے کہا ناں، میں صبح آؤں گی اور سب سے بات کروں گی۔'' پھر صبح تو آئی لیکن وہ نہ رہی ''تم جیسیوں'' کی کانوں میں گونجتی سرگوشی نے دل کا بوجھ اتنا بڑھا دیا کہ دل دھڑکنے سے ہی انکاری ہو گیا۔ رگوں میں دوڑتا خون جم چکا تھا، روح جسم سے پرواز کر گئی۔ فون بند کرنے سے پہلے اس کا کہا گیا آخری جملہ انہیں حال کی طرف واپس لے آیا۔ اس نے کہا تھا۔

''مذہبی قیود میں رہ کر پسند کے اظہار کا حق تو ہمیں شریعت بھی دیتی ہے ناں، تو پھر کیا ہمارے معاشرے میں شریعت جرم ہے آپی؟'' آنسوؤں میں ڈوبے حرا کے یہ الفاظ انہیں اب بھی اپنی سماعتوں میں گونجتے ہوئے محسوس ہوئے۔ انہیں لگا چاروں طرف بس ایک ہی جملہ

گونج رہا ہے۔

"کیا شریعت جرم ہے؟ کیا شریعت جرم ہے؟"

"ہاں شریعت جرم ہے۔" ایک، ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے وہ چلّا کر بولی تھیں۔ وہاں بین ڈالتی سینہ پیٹتی سب ہی خواتین اپنا رونا دھونا بھول کر حیرت سے انہیں تکنے لگیں۔ جنازہ اٹھانے کے لیے آنے والے مردوں نے بھی تعجب سے صحن کے وسط میں رکھی چارپائی کے سرہانے بیٹھی زہرا آپی کو دیکھا۔ جوار گرد سے بے خبر ایک ہی جملہ بولے جارہی تھیں۔

"ہاں شریعت جرم ہے، جرم ہے یہ شریعت۔" آنسو قطار در قطار ان کی آنکھوں سے نکلتے ان کے رخساروں پر بہتے جارہے تھے۔ زہرا آپی کی ایسی مجنونانہ حالت دیکھ کر رشتے کی کسی خالہ نے انہیں کندھوں سے پکڑ کر زور سے جھنجوڑا۔

"ہوش کر زہرا، ہوش کر۔ کیا اول فول بکے جارہی ہے۔" ان کے ہوش دلانے پر وہ مزید حواس باختہ ہونے لگیں۔

"یہ سب اول فول نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے۔" اب کی بار وہ پہلے سے بھی زیادہ اونچی آواز سے چلّائی تھیں۔ انہیں یوں لمحہ بہ لمحہ ٹوٹتے بکھرتے دیکھ کر ابا مردوں کے ہجوم سے نکل کر ان کی طرف آئے۔

"صبر کر میری بچی، صبر کر۔" آنسوؤں میں ڈوبے اس لہجے میں انتہا کا کرب تھا۔ اگر زہرا آپی حواسوں میں ہوتیں تو چاہ کر بھی اپنے سر پہ دھرے اس جھریوں زدہ ہاتھ کو اتنی سنگ دلی سے نہ جھٹکتیں جتنی بے رحمی سے انہوں نے اس وقت جھٹکا تھا۔ بنا کسی کی جانب دیکھے وہ عجب مجنونانہ حالت میں بولتی جارہی تھیں۔

"پتا ہے کل اس نے آخری بات مجھ سے کیا پوچھی تھی؟" سوال کرنے کے بعد انہوں نے کسی کے جواب کا انتظار نہ کیا اور خود ہی بتانے لگیں۔ "اس نے پوچھا تھا، آپی کیا شریعت جرم ہے؟ جائیں ابا اس کے پاس اور بتائیں اسے کہ شریعت جرم ہے یہاں۔" اب کی بار ان کا رخ ابا کی جانب تھا۔

"ابا بتائیں اسے کہ یہاں اپنی پسند کا اظہار کرنا جرم ہے، خود کو چاہے کتنا ہی سینت، سینت کر رکھو، ہر کسی کی گندی نظروں سے خود کو جتنا بھی بچا کر رکھو لیکن اپنی پسند سے اپنا ہم سفر چننا بہت بڑا گناہ ہے۔ بھلے اس پسند کا حق ہمیں ہمارا مذہب دیتا ہے لیکن یہ معاشرہ ایسی لڑکیوں کو پل بھر میں طوائفوں کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔ خدا کی نظر میں تم بھلے کتنے ہی باکردار ہو مگر اس دنیا کے لوگوں کی نگاہیں تمہارے سفید آنچل پر نہ دکھنے والے داغوں کو بھی دیکھ لیتی ہیں اور یہ نگاہیں تمہیں داغ دار بنا دیتی ہیں۔ کیونکہ اس معاشرے کے اپنے ہی اصول ہیں۔ خاندان اور عزت کے نام پر بنائے گئے اصول.....! اناؤں کے خول میں بند شریعت سے جدا اصول.....!" ایک لمحے کو رک کر انہوں نے ابا کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر دھیرے سے ان کا ہاتھ پکڑ کر اس چارپائی کی طرف چل پڑیں جس پر حرا کا بے سدھ وجود پڑا تھا۔ اس کے چہرے سے چادر ہٹا کر انہوں نے پھر ابا کی جانب دیکھا اور جب بولنا شروع کیا تو اب کی بار ان کی آواز دھیمی تھی۔

"آپ چپ کیوں ہیں ابا، اسے بتاتے کیوں نہیں کہ ہم لوگوں نے معاشرے اور شریعت کے بیچ ایک لکیر کھینچ رکھی ہے اور اس لکیر کو پار کرنے کی کوشش کی جائے تو پھر شریعت کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ معاشرے کے رائج کیے گئے اصولوں کے مقابلے میں شریعت کی کوئی حیثیت نہیں ہے....." انہوں نے سوکھتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر ہونٹوں کو تر کیا۔ "ابا اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ اس نے شریعت میں دی گئی اجازت کو معاشرے کے اصولوں پر فوقیت دی تھی۔" آہستہ، آہستہ ایک بار پھر ان کی آواز بلند ہونے لگی۔ آس پاس کھڑے لوگ اپنی اپنی جگہوں پر برف کی سل بن چکے تھے۔ ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو تک ٹھہرے ہوئے تھے لیکن زہرا آپی کسی کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نظریں تو بس حرا کے بند آنکھوں والے چہرے سے لے کر ابا کے جھریوں سے بھرے نم

چہرے تک مسلسل طواف کر رہی تھیں۔ وہ ابھی بول رہی تھیں کہ بھیا ان کو ٹوکنے لگے۔

''زہرا بس کر، جو.....'' الفاظ ابھی ان کے منہ میں ہی تھے کہ زہرا آپی بول پڑیں۔ انہوں نے جیسے بھیا کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔

''اس نے نہ باپ کی عزت کا شملہ سڑکوں پر رولا، نہ ماں کی تربیت پارکوں میں رسوا کی اور نہ ہی بھائی کے لاڈوں کے ہوٹلوں میں چٹخارے لیے تھے۔ یہ تسبیح کے دانوں کی طرح مقدس تھی، وضو کے پانی جتنی پاک تھی۔ اس کی چادر پر کوئی داغ نہیں تھا۔ سن رہے ہیں ناں اماں ابا آپ، میں کیا کہہ رہی ہوں۔'' ان کے یہ جملے اماں ابا کو جلتے کوئلوں پر پرچ رہے تھے۔ ان دونوں کی بوڑھی آنکھوں میں جمی برف پگھلنے لگی، آنسوؤں کی مالا آنکھوں سے ٹوٹ، ٹوٹ کر ان کی جھریوں میں جذب ہو رہی تھی۔ ابا کے چہرے پر کرب تھا بے انتہا کرب.....! سامنے کھڑی وہ اٹھائیس سال کی لڑکی ان کی بیٹی تھی اور باپ کے چہرے پر بکھرا کرب بیٹی کے دل سے زیادہ کس دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے۔

زہرا آپی کا دل بھی اس لمحے کئی حصوں میں بٹ کر ٹکڑے، ٹکڑے ہو گیا تھا لیکن نہ جانے اندر کیسی گھٹن تھی جو روتے ہوئے ماں باپ کو دیکھ کر بھی ان کی زبان پر قفل نہ لگا سکی، سینے میں بھڑکتی کیسی آگ تھی جو اتنا چیخ کر بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی شاید بہن کے مردہ وجود کی اذیت باپ کے چہرے پر پھیلی تکلیف سے کہیں زیادہ تھی۔

''یہ آنسو اب کس فائدے کے ابا! جانے والی تو چلی گئی۔'' ایک لمحے کو رک کر انہوں نے اپنی کانپتی انگلیوں سے سفید چادر کو دوبارہ اس سفید روئی جیسے چہرے پر ڈال دیا۔ ''مگر حقیقت یہی ہے کہ اس کے دل نے یوں ہی دھڑکنے سے انکار نہیں کیا بلکہ اسے آپ سب نے مل کر مارا ہے۔ اسے آپ سب کے طعنے مار گئے، آپ سب کی گالیاں اسے کھا گئیں اور یہ بیوقوف بے خبری میں ماری گئی جانتی جو نہیں تھی کہ شریعت جرم ہے۔'' بولتے، بولتے ان کی آواز دھیمی ہونے لگی، دھیمی ہوتے، ہوتے وہ اتنی مدھم ہو گئی کہ وہ بڑبڑاہٹ میں بدلنے لگی اور پھر وہ خاموش ہو گئیں۔ خاموش بالکل خاموش..... وہ شاید تھک گئی تھیں۔

اسی لیے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئیں۔ وہاں اب اگر کسی چیز کی آواز تھی تو وہ وہاں موجود لوگوں کی سسکیوں کی آواز تھی۔

انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا حرا کا کیس انہوں نے جم کے لڑا تھا۔ دل سے لڑا تھا اور شاید جیت بھی گئی تھیں لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی اور وقت گزر جائے تو جیتی ہوئی بازی بھی ہاری ہوئی لگتی ہے اور وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتی تھیں۔ اسی لیے تھکن سے بے حور وجود لیے، اپنے گھٹنوں میں منہ چھپائے وہ رو رہی تھیں۔ خیر رو تو وہاں سب ہی رہے تھے لیکن تعزیت کے لیے آئے لوگوں کو تو اگلے کئی مہینوں کے لیے ایک نیا موضوع مل گیا تھا۔ چوٹ اپنے دل پر نہ لگے تو دوسروں کا درد کسی، کسی کو ہی محسوس ہوتا ہے۔ وہاں بھی ایسے ہی بے حس لوگ تھے۔

مردہ ضمیر تماشائیوں جیسے لوگ.....!

بے رحم فرعون جیسے لوگ.....!

ایک دوسرے کے قریب کھسک کر کوئی حرا کے کردار پر سوال و جواب کر رہا تھا تو کوئی گھر والوں کی سنگدلی پر افسوس کر رہا تھا۔ غرض یہ کہ جتنی زبانیں اتنی باتیں.....!

''جنازہ اٹھائیں، دیر ہو رہی ہے۔'' کسی بزرگ کی آواز پر بھیا اور ان کے ساتھ کچھ مرد آگے بڑھے اور جنازہ اٹھاتے ہوئے کلمہ شہادت کا ورد کرنے لگے۔ وہاں تقریباً سب کے لبوں پر کلمۂ شہادت تھا جبکہ ان کی سماعتوں میں ''شریعت جرم ہے'' کی گردان ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا اس گھر کی ایک، ایک چیز چیخ، چیخ کر بول رہی ہو۔

''شریعت جرم ہے''

❁❁❁

عورت کی پریشانی

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر ہستی ہے۔۔۔ مگر یہی کمزور اور کم تر ہستی صنفِ مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروفِ تہجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار فرحین اظفر نے یہی بتانے کی کوشش کی۔۔۔۔ مسلسل ایک سے ایک منفرد، دل نشیں، دل گداز، سبق آموز اور یادگار کہانیاں تحریر کیں۔۔۔ اس ماہ کی کہانی اس سلسلے کی آخری کہانی ہے۔ یہ سلسلہ اگرچہ ختم ہوا مگر زندگی کی کہانیاں ہرگز ختم نہیں ہوئیں۔ یہ تو زندگی کے ساتھ، ساتھ چلتی رہیں گی۔

جُداگانہ اور اچھوتا موضوع لیے مصنّفہ کی ایک اور شاہکار تخلیق......

بچوں نے روشن آپا کو ہمیشہ سے اپنے گھر میں دیکھا تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ وہ گھر کی سربراہ تو نہیں لیکن منتظم اعلیٰ کہلائی جاسکتی تھیں۔

دبلی پتلی جسامت، اچھا قد، کھڑے نین نقش ان کو اصل عمر سے کافی کم بتاتے تھے۔ تصویر دیکھنے والے کو الجھن ہوتی کہ یہ عورت ہے یا لڑکی۔ صاف ستھری رنگت اور نکھری، نکھری جلد پھر دھیما اندازِ گفتگو، اس کے علاوہ تھا۔

فجر کے ساتھ صبح کا آغاز ہو جاتا۔ اس کے بعد دن کے کسی حصے میں وہ سوئی ہوئی نہیں پائی جاتی تھیں۔

رات کی نیند بھی بمشکل چند گھنٹوں پر مشتمل تھی کہ ان کی تہجد گزاری کا پورا گھرانا گواہ تھا۔

دن کے اکثر حصوں میں ان کے نام کی پکار پڑتی۔ پکارنے والا چاہے کسی بھی موڈ میں ہوتا ان کا جوابی ''جی'' ہمیشہ دھیما اور پُرسکون ہی ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ آج کی نوجوان نسل کے نمائندہ ٹیپو اور یاسر صاحب بھی، کبھی چڑ بھی جاتے تھے۔

افرادِ خانہ بہت مختصر تھے نہ بے شمار.....

سب سے بڑے اماں ابا تھے جو اپنی دنیاوی زندگی کی سب ہی ذمّے داریاں پوری کر کے اب چین کی بانسری بجاتے تھے..... یا آپس کی نوک جھوک کا باجا۔

اس کے بعد تھیں ان کی اولادیں۔ سب سے بڑی شبانہ جن کا گھر نزدیک ہی تھا۔ ان سے چھوٹے عرفان اور سب سے چھوٹے ارمان.....

شبانہ کیونکہ اکلوتی پھپھو تھیں اور تھیں بھی بہت محبت والی اس لیے بچے ان کو صرف پھپھو ہی بلاتے تھے۔ چھوٹی، بڑی کے سابقے لاحقے سے محفوظ..... عرفان بڑے ابو تھے اور ارمان چھوٹے ابو..... اسی حساب سے ان کی بیگمات چھوٹی، بڑی تھیں۔

زندگی ایک پُرسکون رواں ندی کی طرح بہتی تھی۔ جس میں کبھی، کبھی بڑے ابو کے بڑے صاحبزادے اپنی جذباتیت سے کنکر پھینک دیا کرتے۔ بڑے ابو ان کی اس جذباتیت اور جلد باز فطرت سے اکثر ہی نالاں رہتے۔ انہیں انسانیت کی خدمت کا شوق بلکہ جنون سا تھا۔ میڈیکل کا شعبہ بھی اسی لیے پسند کیا تھا کہ ڈاکٹر بننے کے بعد سب کا مفت علاج کرنا چاہتے تھے۔

''لو آج کل کون انسانیت کی خدمت کے لیے ڈاکٹر بنتا ہے۔ اتی مہنگی پڑھائی کرو۔ پیسہ جھونکو۔ دماغ کھپاؤ اور بعد میں حاصل وصول کچھ بھی نہیں.....''

اس پورے گھر میں اگر کوئی شخصیت، ممکنہ حد تک خودغرض تھی تو وہ تھیں شفو بوا.....

شفو بوا بھی ایک دلچسپ کردار تھیں۔ بیٹے بہو کا گھر چھوڑ کے نمک حلالی کرنے اس گھر کی دہلیز سے لگی بیٹھی تھیں۔ شوہر صاحب مرحوم ہوئے تو مستقل طور پر واپس آ گئیں۔ کیونکہ بیاہ کے بھی یہیں سے گئی تھیں۔ شفو بوا کا نام تو شفیقہ تھا۔ لیکن بچوں نے ہی بول بول کے شفو رکھوا دیا۔ اب ان بچوں کے بچے بھی شفو بوا ہی بلاتے تھے۔ ان کے والدین اماں ابا کے ساتھ، تقسیم کے کچھ سالوں بعد سے ہی تھے۔ یوں شفو بوا کی عمر ابا اماں سے کچھ آگے پیچھے ہی تھی۔ لیکن وہ بھی سب کی دیکھا دیکھی اماں کے ساتھ یکم اور ابا کے ساتھ میاں لگا کر کام چلا لیا کرتی تھیں۔

بوا کے اپنے ماں باپ تو اماں ابا کے بھی بزرگوں کے ساتھ انڈیا سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ تب سے اب یہ چوتھی پیڑھی ان کی نسل در نسل خدمتوں کے ساتھ پل بڑھ رہی تھی۔ دونوں حاکم و محکوم ایک دوسرے کے احسان مند تھے کہ دونوں نے اپنے، اپنے کرداروں میں رہتے ہوئے خوب ساتھ نبھایا تھا۔ یہاں تک کہ جب بوا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو پانچویں پاس کر کے گھر بٹھانا چاہا کہ میرے بعد اب میرا بیٹا آپ کا خیال رکھے گا تو بڑے ابو نے بہت برا منایا۔

''اب وہ وقت نہیں رہا بوا جی..... کہ ملازم بن کے اپنے مالکوں کی دہلیز پر عمر گزاری اور خوش، خوش رخصت ہو گئے۔ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا زمانہ ہے۔ بچہ ذہین ہے۔ اسکول چھڑا کے اس کے اوپر ظلم نہ کریں۔ ہمیں ملازم اور مل جائیں گے۔ لیکن آپ کے بیٹے کو کوئی مستقبل نہیں ملے گا۔ یہ ہم کبھی گوارا نہیں کریں گے.....''

بوا آبدیدہ ہو گئیں۔ نئی پود کے مطابق بوا نے اپنی زندگی میں دو ہی کام بے غرض ہو کے کیے تھے۔ ایک اماں ابا کی خدمت اور دوسرا یہ..... جو اُن کو کرنے نہیں دیا گیا۔ اور یوں ان کا بیٹا ماسٹرز تک تعلیم حاصل کر گیا تھا۔ تمام خرچا بڑے ابو نے اٹھایا تھا۔

اس گھر کی بنیادوں میں محبت کا بیج بویا گیا تھا۔ یہاں نفرتیں اور کدورتیں کونپل بھی نہ بننے پاتی تھیں کہ اکھاڑ کر پھینک دی جاتی تھیں۔

☆☆☆

رات بھیگ چکی تھی۔ پورے گھر پر خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ مکین اپنے، اپنے کمروں میں محوِ خواب تھے۔

باہر صحن میں لگی رات کی رانی کی مہک برآمدے سے ہو کے کھلی کھڑکی سے کمرے کے اندر تک آ رہی تھی۔ ٹھنڈی چاندنی، ہتھیلیوں پر اٹھائے خوشبودار دھیمی ہوا بڑا دلفریب پیغام لا رہی تھی۔

سونے سے پہلے ارمان بھائی کی شفا بہت محبت سے ان کے لیے گرم دودھ لائی تھی اور لاکھ منع کرنے کے باوجود انہیں گلاس خالی کرنا ہی پڑا تھا۔

وہ محبتوں اور پروا کے اس اظہار پر ہمیشہ بہت خوش ہوتی تھیں لیکن جانے کیوں اندر سے اپنا آپ خالی، خالی سا لگتا۔

آنکھیں موندتے سے تنک لبوں پر پھیلی مسکراہٹ سمٹ ضرور گئی تھی۔ لیکن اندر کے خالی پن میں ایک جگنو جگمگانے لگا تھا..... ایک، ایک کر کے اس گھر اور گھر کے مکینوں پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکتے جانے کب آنکھ لگی پتا ہی نہیں چلا.....

تنفس بڑا ہموار تھا۔

سفید جالی دار پردے ہوا کے ہلکے، ہلکے دھکوں سے لہرا رہے تھے جب اچانک.....

''چٹاخ.....'' طمانچے کی زوردار آواز گونجی۔

پہلے تنفس بگڑا پھر چہرے کے زاویے۔

بے قراری سے سر کو اِدھر اُدھر پٹخا۔ کچھ دیر یونہی..... بے خبری کی کیفیت رہی پھر..... وحشت سے آنکھ کھل گئی۔

پورا جسم پسینے میں تر بتر تھا۔ انہوں نے بے اختیار اٹھ کر داہنے گال پر ہاتھ رکھا۔

ابھی تک سرخی اور درد باقی تھا.....

☆☆☆

صبح ناشتے پر ان کی سوجن زدہ آنکھیں دیکھ کے کوئی بولا کچھ نہیں لیکن محسوس سب نے کیا..... حالانکہ اپنے تئیں وہ چاق و چوبند نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھیں۔

اماں، ابا دیر سے ناشتا کرتے تھے۔ آفس اور یونیورسٹی یا کالج چلے جانے والوں کے بعد اطمینان سے.....

اس دورانیے میں ابا اور اماں کچھ دیر آپا سے روز مرہ گھر کی باتیں بھی ڈسکس کر لیتے تھے۔ صبح، صبح کا وقت تازگی اور امیدوں سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ لیکن آج ایسا نہیں تھا۔

ناشتے کی ٹرے سامنے رکھے، وہ سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ ابا دھیرے، دھیرے لقمے لے رہے تھے۔ اماں کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔

''تم..... کچھ دن کے لیے..... شبانہ کے پاس چلی جاؤ۔'' چائے کا آخری گھونٹ بھر کے ابا نے مشورہ دیا۔

انہوں نے سرخ آنکھیں لمحے بھر کو اٹھائیں پھر جھکا لیں۔

''ماحول بدلتا ہے تو طبیعت پر اچھا اثر پڑتا ہے..... یہاں تو مستقل کاموں میں لگی رہتی ہو۔ اعصابی تھکن، جسمانی تھکن سے کہیں زیادہ ہوتی ہے.....'' کچھ پوچھا نہ بتایا۔ وہ جیسے سگے باپ کی طرح ان کی رگ، رگ سے واقف تھے۔

ان کی آنکھیں بھرنے لگیں۔ لیکن ضبط لازم تھا۔ وہ جانتی تھیں ان کے محسنوں کو اپنے اس کرب کی جھلک دکھانا جس میں وہ پچھلے کئی سال سے مبتلا تھیں اور جس کی شدت سے وہ بخوبی واقف تھے۔ مناسب نہیں تھا۔

''میں..... جانا نہیں چاہتی ابا!''

''کیوں..... دل بہل جائے گا تمہارا..... ویسے بھی تم کہیں آتی جاتی نہیں ہو..... گھر سے نکلتی نہیں ہو۔ دل بہلانے کے لیے کچھ سامان ہونا چاہیے۔ بے وجہ خود کو مصروف رکھنے سے انسان تھکتا ہے۔ اسے ذہنی سکون اور آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ شبانہ کہہ بھی چکی ہے کئی بار..... کنول کی شادی نزدیک ہے۔ اگر کام ہی کرنا ہے تو جا کے اس کا ہاتھ بھی بٹا دو اور اپنے لیے کپڑے وغیرہ بھی لے کے رکھو۔ بعد میں سب کو اپنی پڑی ہوتی ہے.....'' ان کے لب و لہجے میں کتنی فکر گندھی تھی۔ جس کے خلوص پر انہیں ذرہ برابر شک نہیں تھا۔

وہ بنا جواب دیے اٹھ کے ٹرے میں خالی کپ اور پلیٹ ترتیب سے لگانے لگیں حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی ٹرے میں ہی رکھے ہوئے تھے۔

ابا یا اماں کو کسی بات سے واضح انکار کرنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ راہِ فرار ہی اختیار کر لی جاتی.....

اماں تاسف سے ان کے ہاتھوں میں چھپی خفیف سی لرزش دیکھ رہی تھیں۔

وہ ٹرے اٹھا کے دروازے کی طرف بڑھیں جب پشت پر ابا کی آواز آئی۔

''کہہ دوں میں شبانہ سے.....؟''

وہ رکیں۔

''وہاں سب میری طبیعت پوچھیں گے۔ اور..... میرا..... اب کہیں اور دل نہیں.....'' چند لمحے بعد پھنسی پھنسی آواز میں بولیں۔ ان سے بات مکمل نہیں کی گئی۔ دل میں اٹھتے درد کو دبا کے وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔

پیچھے اماں..... ابا کو دیکھ کے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگیں۔

☆☆☆

شفا سے بڑی حیا کے سسرال والے شادی کی تاریخ مانگ رہے تھے۔ خوشی کا موقع تھا۔ بچے تو اور بھی زیادہ ایکسائٹڈ تھے کیونکہ تیسری نسل پہلی بار اس مرحلے میں داخل ہوئی تھی۔ حیا کی بات چیت بڑے ہی سادے انداز میں طے کی گئی تھی اس لیے اس موقع کو بھرپور انداز میں منانے کی پوری تیاریاں کی جارہی تھیں۔

بالآخر وہ مبارک دن بھی آپہنچا۔

سب کی مصروفیات عروج پر تھیں اور آپا روشن بھی خود کو سنبھال کے، سب کی خوشیوں میں خوش ہونے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

بڑے ہی ارمانوں اور دھوم دھام کے ساتھ سارے معاملات خوش اسلوبی سے نمٹ گئے۔ تین ماہ بعد کی ڈیٹ فکس ہوئی تھی۔

بچوں بڑوں کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس روز شبانہ بھی بال بچوں سمیت میکے میں رکی ہوئی تھیں۔ برسوں بعد یہ موقع آیا تھا۔

عرفان صاحب بھی اپنے بڑے بیٹے یاسر کی نسبت چھوٹے بھائی کی شفا سے کرنا چاہتے تھے اس سے اچھا موقع اور کوئی ہو نہیں سکتا تھا۔ اماں اور ابا سے وہ پہلے ہی بات کر چکے تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی اور بھاوج کے بارے میں ان کو پورا یقین تھا کہ وہ ان کو مایوس نہیں لوٹائیں گے۔ لے دے کے صرف ایک یاسر ہی تھا جس سے بات کرنی تھی جبکہ بات تو اسی کی تھی خیر انہوں نے بات کرنے کے لیے وہ دن چنا جب سب گھر والے ابھی ایک بیٹی کی خوشی منا کے تھک ہار کے کمروں میں گئے تھے۔

انہوں نے یاسر کو لاؤنج میں ہی بٹھالیا۔ اور بہت نپے تلے انداز میں بات شروع کی۔

جذباتی ڈاکٹر یاسر نے سنتے ہی انکار کر دیا۔

''لو شفا..... وہ تو میری چھوٹی بہنوں جیسی ہے۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔''

جب تک بات ہوئی نہیں تھی تب تک سب ٹھیک تھا۔ لیکن اب عرفان صاحب کو یوں لگا جیسے شفا کو ہی ان کو بہو بننا چاہیے۔ شاید یہ یاسر کے فوری اور قطعی انداز کا ردِعمل تھا۔

یاسر گھر کا بڑا اور شفا گھر کی چھوٹی تھی۔ لیکن یاسر ان کی نظر میں جذباتی اور جلد باز تھا۔ اسے شفا جیسی لڑکی ہی سنبھال سکتی تھی اگر وہ راضی ہوتا تو اس بات کی اتنی اہمیت نہیں تھی کہ ان کی عمروں میں اچھا خاصا فرق تھا۔

ارمان اور ان کی بیگم کو یاسر کے انکار سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ لیکن جانے کیوں عرفان صاحب، یاسر کے یوں ایک دم بلا سوچے سمجھے بولنے سے تاؤ کھا گئے۔

''کیا بات ہے۔ کیا کمی ہے شفا میں ہمیں بھی تو پتا چلے۔''

''میں نے کب کہا کہ کوئی کمی ہے۔''

وہ خواہ مخواہ جھنجلا رہا تھا۔ حالانکہ ابو بڑے سبھاؤ سے بات کر رہے تھے۔

''تو پھر.....؟''

''بس وہ..... وہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔''

عرفان صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کیونکہ لاؤنج میں بالکل اچانک شفا سے بڑی حیا نے قدم رکھا تھا اور اس نے یاسر کی بات سن لی تھی۔ یاسر کا مقصد شفا کی برائی کرنا نہیں تھا۔ پھر بھی انہوں نے حیا کو ایک دم جز بز ہوتے دیکھا۔

''تو..... کیا کوئی اور اچھی لگ گئی ہے صاحبزادے کو.....؟''

اب کی بار ان کا لہجہ تیز ہو گیا۔

''ابو آپ خواہ مخواہ میں میری بات کو خود سے بڑھا رہے ہیں..... میں.....''

اس نے سر اٹھایا تو حیا پر نگاہ پڑی۔ وہ یک دم چپ ہوا لیکن عرفان صاحب کا پارہ ایک دم ہائی ہو گیا۔ اور پھر بات وہ بڑھی جو بڑھنے والی تھی ہی نہیں۔ عرفان صاحب گرجنے لگے۔ یاسر بے بس سا صفائیاں دے رہا تھا۔

حیا کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہاں رکے یا جائے۔ اس کی پوزیشن الگ آکورڈ ہو گئی تھی۔

ایک، ایک کر کے گھر کے افراد جمع ہو گئے۔ اس گھر کے در و دیوار کو اس شور شرابے کی عادت نہیں تھی۔ یہاں تو بس ہنسی، قہقہے یا قلقاریاں گونجتی تھیں۔

حیا تب تک دبی، دبی آواز میں خود ہی بڑے ابو کو چپ کرانے کی اپنی سی کوشش کر رہی تھی۔

''کیا شور شرابہ ہے یہ..... عرفان۔'' بالآخر ہنگامہ ابا کی آواز سے تھما۔

''کوئی شور نہیں ہے ابا جان..... آپ جا کے سو جائیں۔''

''جب کوئی بات نہیں ہے تو کیوں اس وقت ہنگامہ کیا۔ اور کوئی بات تھی بھی تو صبح بھی کہی جا سکتی تھی۔ آدھی رات کو سب گھر والوں کو پریشان کیوں کیا۔''

ان کی آواز میں ٹھہراؤ بھی تھا اور تنبیہ بھی.....

''مجھے کیا پتا تھا کہ یہ ناہنجار، ایسی بات کرے گا۔''

یاسر کو سب کے سامنے باپ کا اسے ناہنجار کہنا سخت برا لگا۔

مایوسی تو گناہ ہے

صرف بے اولاد

گھرانے متوجہ ہوں۔

انسان کو کسی بھی صورت رب تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ اکثر گھرانوں میں صرف اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اُداسی، پریشانی، ہر وقت کے گھریلو جھگڑے اور پھر علیحدگی تک بات پہنچ جاتی ہے۔ آپ مایوس نہ ہوں انشاء اللہ آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں ہم نے کستوری عنبر و دیگر ہربلز سے ایک ایسا خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے کہ جس کے استعمال سے انشاء اللہ آپ کے ہاں بھی ایک صحت مند خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آپ آج ہی فون کریں اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوالیں۔

المُسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)

ضلع حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

اس نے منمنا کے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن ابا نے چپ کرا دیا۔

سب سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ عرفان صاحب کو اس کی بات اتنی نہیں لگی تھی جتنا حیا کی موجودگی بری لگی۔ حالانکہ وہ اسی گھر میں رہتی تھی۔ جب دل کرے جہاں دل کرے آ جا سکتی تھی لیکن اس کے سامنے ان کی بات کھل جانا انہیں کھل گیا تھا۔

''چلو سب اب جاؤ۔ سوؤ جا کے..... جو بھی بات ہو صبح کر لینا۔''

ابا نے سب کو سمیٹا تو سب پُرسکون ہونے ہی لگے تھے کہ یاسر نے سب کے سروں پر بم پھوڑ دیا۔

''ابا! میں آپ سب کے سامنے ابھی اسی وقت یہ بات کر رہا ہوں کہ شفا مجھے پسند نہیں ہے۔ میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں اور شادی بھی اسی سے کروں گا۔ کوئی مجھ پر دباؤ نہ ڈالے۔''

اکثریت کا منہ اس کی بات پر کھلا رہ گیا۔ یہی وہ جذباتیت تھی جس سے عرفان صاحب چڑتے تھے۔

بات بے تکی نہیں تھی لیکن جس بے ڈھنگے انداز میں کی گئی۔ ان کے جسم کا سارا خون سمٹ کے چہرے پر آ گیا۔

ارمان، شفا کی ماں، وہ خود اور سب سے بڑھ کے شفا..... کس، کس کی بے عزتی کا خیال انہیں جھنجھنا کے رکھ گیا۔

''بکواس بند کرو۔ ابھی اسی وقت.....'' انہوں نے اتنا گرج کے کہا کہ شبانہ بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ کے بھائی کی طرف لپکیں۔

''یہ بکواس ہے یا نہیں لیکن سچ یہی ہے کہ میں.....''

''اب اگر تم نے ایک لفظ بھی کہا تو.....'' بڑے ابو بے اختیار اسے مارنے کو بڑھے۔ خواتین کی چیخیں نکل گئیں۔ ابا اور ارمان نے بے ساختہ انہیں روکا۔

ابھی وہ اور پتا نہیں کیا کہتے اور کرتے کہ دھڑام کی آواز پر سب کی نظروں کی سمت بدلی۔

آپا روشن سب کے درمیان فرش پر بے سدھ پڑی تھیں۔

ابا کی بات منہ میں رہ گئی۔ سب ہڑبڑا کے ان کی طرف لپکے۔ جن کے اکڑے ہوئے جسم میں نیلاہٹ بڑھ رہی تھی اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

''ہائے میری بچی.....'' اماں کی چیخ نکل گئی۔

☆☆☆

تقریب کا دوسرا دن چھٹی کا تھا لیکن ویسا نہیں جیسا ہونا چاہیے تھا۔

ایک عجیب سا کھچاؤ اور کھسیاہٹ سب کے انداز میں تھی۔ حالانکہ رونق تھی، شور تھا۔ لیکن وہ زندہ دلی اور بے پروائی نہیں تھی۔

رات کی بچی ہوئی بریانی اور کڑاہی، تافتان اور شیرمال تل کے کھائی جا رہی تھی۔ دودھ پتی کی خوشبو تھی۔ رات کی تقریب پر تبصرے بھی تھے لیکن جیسے رکے، رکے سنبھل، سنبھل کے کہ کہیں بات کا رخ اس طرف نہ چلا جائے جس سے سب بچنا چاہ رہے تھے۔

بڑے ابو نے اپنے کمرے میں ناشتا کیا تھا اور یاسر بھی ٹیبل تک نہیں آیا۔ شفا اور حیا البتہ موجود تھیں۔

شفا کی نظریں بھی جھکی، جھکی تھیں۔

''شفو بوا..... ذرا یہ ناشتے کی ٹرے، روشن کے کمرے میں دیں آئیں۔''

چھوٹی بہو پسینہ پسینہ ہو کر کچن سے نکلیں اور ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑے ہو کے ہوا کھانے لگیں۔

''اللہ معاف کرے روشن نے ایسی عادت ڈال دی ہے کہ ذرا سی دیر چولہے کے آگے کھڑا ہونا پڑے تو بس..... حالت بری ہو جاتی ہے۔''

اماں، ابا لاؤنج میں اپنے پسندیدہ تخت پر بیٹھ کر ناشتا کرتے تھے۔ اماں نے سنا تو وہیں سے بولیں۔

''دودھ بھیج دیتیں ٹھنڈا کر کے..... ابھی اس سے کہاں کھایا جائے گا کچھ بھی.....''

ان کی آواز میں کوئی ہوکا بھرا تھا۔

''جی دے دیا ہے اماں.....!''

اب وہ خود کلامی کرتی ہوئی کرسی پر بیٹھ رہی تھیں۔

''نصیب کے کھیل ہیں سارے، روپ کی روئے بھاگ کی کھائے..... پتا نہیں بیچاری نے کس ناکردہ کی سزا بھگتی ہے ساری زندگی.....''

☆☆☆

انہوں نے عرفان بھائی کو اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔ ایسا زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا کہ وہ خود کسی کے پاس جانے کے بجائے، اسے کمرے میں بلوا رہی تھیں۔ اور وہ بھی گھر کے بڑے کو.....

انہوں نے پہلے ہی دن سے اپنا مقام یہاں نوکروں جیسا ہی متعین کیا تھا۔ کوئی کچھ بھی کہے خود کو درجے میں ایک دو زینے نیچا ہی رکھتی تھیں۔ لیکن آج ہمت نہیں تھی کہ خود سے چل کے جا سکتیں۔

پورا جسم شدید اینٹھن سے دکھتا تھا۔ گردن کی رگیں تک، مانع نکلتے ہوئے کراہ رہی تھیں۔ بات کرنے کی سکت نہ تھی کیونکہ زخمی زبان اجازت نہیں دیتی تھی۔ چہرے پر سوجن تھی کہ آئینے میں اپنا عکس پہچانا نہیں جاتا تھا۔

وہ رونا نہیں چاہتیں کہ بہت رو چکی تھیں۔ ساری زندگی بھر پتا نہیں کس، کس کی یاد میں آنسو بہائے تھے۔ اور اب جو زندگی پچھلے بیس بائیس سالوں سے گزار رہی تھیں اس میں آنسو بہانا بنتا تو تھا۔ لیکن شکوے کے نہیں شکر گزاری کے.....

عرفان بھائی کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے تیزی سے نم آنکھیں صاف کر کے اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹی رہیں روشن..... مجھے پتا ہے آپ ابھی بہت تکلیف میں ہیں۔''

ان کی آواز کی شگفتگی مفقود تھی۔

''مجھے آپ کو یوں بلانا اچھا نہیں لگا لیکن.....''

عرفان بھائی نے ہاتھ اٹھا کے ان کو روکا۔

''زندگی بھر سے ہماری ایک آواز پر آتی رہی ہیں آپ..... کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں آپ کے بلانے پر نہیں آؤں گا۔''

انہوں نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔ دل اُن کی بات پر احسان کے بوجھ سے جھکا جا رہا تھا۔

''کہیے..... میں منتظر ہوں۔ جو کہنا ہے بے جھجک کہیے..... یوں سمجھیں کہ یہاں آپ کے سوا کوئی موجود نہیں.....''

روشن نے خود کو تولا۔ ان کی نظروں میں آج فجر کے وقت کا منظر گھوم رہا تھا۔

یاسر ان کی طبیعت پوچھنے آیا تھا۔ جب واپس جاتے، جاتے رک گیا تھا اور پلٹ کر ان سے صرف ایک ہی بات کی تھی۔

''ابا کو سمجھائیں آپا! صرف آپ ہی ان کو سمجھا سکتی ہیں۔ کیونکہ میرا مسئلہ آپ سے زیادہ بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔''

وہ حیرت زدہ بے جان سی اس کی شکل دیکھتی رہ گئی تھیں۔

اس گھر کے بچوں کو کب اور کیسے ان کے ماضی کا علم ہوا انہیں ہوا تک نہیں لگی۔

آج ان کی دلی تکلیف، جسمانی تکلیف سے کہیں زیادہ تھی۔ حالانکہ اس نے کوئی طعنہ نہیں دیا تھا۔ بلکہ شاید ان سے مدد ہی طلب کی تھی۔ لیکن جانے کیوں، زخم کچے، کچے سے ہو گئے تھے۔

''کیا سوچ رہی ہیں روشن.....؟''

انہوں نے چونک کے عرفان بھائی کو دیکھا۔

''مجھے آپ سے یہ کہنا ہے بھائی کہ.....'' وہ لمحے بھر کو رکیں۔

اتنا آسان بھی نہ تھا کچھ کہنا.....

نہ وہ یاسر کی ماں تھیں نہ باپ..... ان کا تو اس گھر کے مکینوں سے کوئی رشتہ ہی نہ تھا سوائے خدا ترسی اور شاید انسیت کے..... جو جانور کو پالنے سے بھی ہو جاتی ہے۔

خون اور خون کا رشتہ..... اتنے بھاری بانٹوں کے ہوتے ہوئے کیا دوسرے پلڑے میں رکھے انسیت اور خدا ترسی، توازن برابر کر سکتے تھے.....

لیکن بات تو کرنی تھی۔

ایک کوشش..... ہاں صرف ایک..... کوشش.....

کسی اور کو اس زندگی سے بچانے کی، جو اُن کے لیے آج تک ایک بھیانک خواب کے سوا اور کچھ بھی نہ تھی۔

''آپ یاسر کے اوپر دباؤ مت ڈالیں۔''

انہوں نے بہت تحمل سے بات کہی۔ عرفان بھائی نے اسی تحمل سے سنی۔ کمرے میں اب بھی ٹھنڈک اور سکون کا راج تھا۔

''بات یہ ہے روشن کہ آج سے پہلے آپ نے کبھی کسی معاملے میں ہمیں تو دور کی بات اپنی بھابیوں تک کو کوئی مشورہ بنا مانگے نہیں دیا..... تو کیا میں یہ سمجھوں کہ کسی اور نے آپ کو.....''

''مجھ سے کسی نے نہیں کہا اور میں آج بھی آپ کو مشورہ نہیں دے رہی نہ میں خود کو اس کا اہل پاتی ہوں..... میں صرف درخواست کر سکتی ہوں لیکن یہ میری درخواست بھی نہیں ہے..... آپ اسے التجا سمجھ لیں.....''

انہوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کے، ان کے سامنے جوڑ دیے..... عرفان بھائی بوکھلا سے گئے۔

''یہ آپ کیا کر رہی ہیں اور کیوں..... روشن خدارا ایسا مت کریں۔ مجھے شرمندہ مت کریں.....''

''اور آپ یاسر کو وہ زندگی گزارنے پر مجبور نہ کریں جو میں نے گزاری ہے.....'' وہ سسک اٹھیں۔

''لاحول ولا..... کیسی بات کر دی آپ نے روشن.....! بھلا وہ کیوں آپ جیسی زندگی گزارے گا۔''

روشن کے پاس اس بات کے جواب میں کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن وہ بولیں تو بس اتنا.....

''مرد بہت بااختیار ہوتے ہیں۔ لیکن جب ان سے ان کی اپنی پوری زندگی کے، سب سے اہم معاملے میں اختیار چھینا جائے تو پھر وہ مرد نہیں رہتے..... یا تو پتھر بن جاتے ہیں یا حیوان.....''

انہوں نے عرفان بھائی کو کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

وہ کچھ دیر خاموشی سے وہیں بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ پھر اسی خاموشی سے اٹھ کے چلے گئے۔

روشن نے ان کو جاتا دیکھ کے آنکھیں موندیں تو دو آنسو ڈھلک گئے۔

بند آنکھوں کے پیچھے پردے پر کوئی فلم چل رہی تھی۔

☆☆☆

سولہ سال کی عمر میں وہ تیس سالہ مرد سے بیاہی گئی تھیں۔ صرف اس لیے کیونکہ ابو کو ڈاکٹر نے جس وقت کینسر کی تشخیص کے بعد بمشکل سال بھر کی زندگی کی پیش گوئی کی اس وقت، ان کی کل متاع سولہ سالہ روشن ہی تھی۔

ان کو خود بھی نہیں پتا تھا کہ بیوی کے چلے جانے کا روگ وہ اندر ہی اندر اس طرح پال رہے ہیں۔

جو لوگ اُن کو دوسری شادی کے مشورے دیتے رہتے تھے وہ یقیناً ان کے خیر خواہ ہی تھے لیکن بیٹی کا خیال تو کسی کو چھو کے بھی نہیں گزرا تھا۔

جب ایک جوان ہوتی لڑکی کی ذمے داری کاندھوں پر آن پڑنے کا خدشہ ہوا تو بہت سوں نے کندھے جھٹک دیے۔

ان کی شادی محض دو مردوں کے درمیان خلوص اور محبت کی ثابت قدمی کا مظاہرہ اور معاہدہ تھا۔ اور ان دو مردوں میں سے ایک ان کا باپ اور دوسرا ان کا سسر تھا۔

اس معاہدے کے دونوں فریق، وہ تھے جو اپنی زندگی گزار چکے تھے اور جن کے متعلق فیصلہ کیا جا رہا تھا ان دونوں میں سے کوئی بھی اس میں شامل نہیں تھا۔

روشن کے پاس فیصلے کا کوئی اختیار تھا نہ سمجھ بوجھ، جس کے پاس اختیار نہیں تھا۔ اس کی چلنے نہیں دی گئی۔ یا اسے بے بس کر دیا گیا۔ جس بھی طرح.....

شادی کے بعد کا پورا سال ابو کی خدمت اور ان کی متوقع جدائی کا سوچ، سوچ کر ہلکان ہونے میں گزرا..... نہ انہیں نئی زندگی کی سمجھ آئی، نہ شریکِ حیات اور اپنی ذمے داریوں کی۔

گھر..... جو اُن کے خیال میں ہمیشہ کے لیے اب ان کا گھر بن چکا تھا۔ گھر والی کوئی بات نہ تھی۔ اس گھر میں رہنے والی عورتیں ان کو دیکھ کے ناک بھوں چڑھاتیں..... اس نادیدہ لڑکی کا ذکر کرتیں جسے ان کی

جگہ اس گھر میں آنا تھا اور ان کے آجانے کی وجہ سے، اس نے ملنا جلنا ختم کر دیا تھا۔

شوہر کسی پتھر کے بت کی طرح برتاؤ کرتا۔ نہ اپنی ذمے داری کی کوئی فکر نہ ایک جیتی جاگتی لڑکی کی نفسیات سے کوئی لگاؤ..... جو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنا سائبان جھڑتا دیکھ رہی تھی۔ اور بے پناہ خوفزدہ تھی کہ آج نہیں تو کل بالآخر اسے کھلے آسمان تلے آجانا تھا۔

اس کی امیدوں کا مرکز، اس کا اصل سہارا اس دنیا میں صرف ابو ہی تھے۔ جو قطرہ، قطرہ گھل رہے تھے۔ وہ کسی سے کہہ سکتی تھی نہ ہاتھوں سے پانی کی طرح ٹپکتے لمحوں کو قید کر سکتی تھی۔

اِک، اِک پل، ابو کی ایک، ایک سانس کے ساتھ جیسے اس کی اپنی زندگی بھی کم ہوتی جاتی تھی۔

اس کڑے وقت میں جس کو اس کی ڈھارس بننا چاہیے تھا۔ وہ اسے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے اجنبی بن جاتا..... یہی وجہ تھی کہ جب ابو نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موندیں، تب تک اس کی گود میں ننھا سا پھول کھل چکا تھا۔

سسرال میں لے دے کے ایک سسر ہی تھے جن کی وجہ سے اسے اس گھر میں سر چھپانے کی جگہ ملی تو وہ بھی اب سب کے طعنے سن، سن کے دُبک چکے تھے۔

روشن کی اپنی پرفارمنس ایک بہو کے لحاظ سے بالکل ہی بوگس رہی۔ کسی نے اس کی ذہنی کیفیت، اس کے دل کی حالت، اس کے خوف اور نفسیاتی الجھن کو سمجھنا تو دور کی بات جاننے کی بھی کوشش نہیں کی۔

وہ ماں بننے کے بعد بھی سنبھل نہیں سکی۔

دنیا میں اس کا کوئی سگا قریبی رشتہ نہ تھا۔ جو اس کی بات سنتا، اسے اس بھنور جیسی زندگی کو پُرسکون کرنے کا کوئی گُر بتاتا۔ یا شوہر کو اپنا بنانے کی کوئی ترکیب کر دیتا۔

وہ سب سے ناپسندیدہ اور غیر ضروری فالتو فرد تھی۔ جسے گھر کا فرد کوئی سمجھتا ہی نہ تھا۔ ساس نالاں، نندیں بیزار، دیور بدکردار، سسر شرمندہ اور شوہر بے خبر۔

اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے کیا کرے۔

بچہ روتا، کرلاتا، نہ اس سے سنبھالا جاتا۔ نہ اسے چپ کرایا جاتا۔ ہر چھوٹے بڑے کام کی ذمے داری اور بہتات میں اس نے مجبور ہو کے اسے فیڈر پر ڈالا تو اس ہر وقت کے رونے سے نجات ملی..... بچے کو چپ کرانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ دودھ اور پانی سے بھری بوتل اٹھاؤ اور منہ میں ٹھونس دو..... معصوم بچہ اپنی معصوم ماں کی توجہ کو ترستا ہوا دادی کی گود میں جا پڑا۔

حیرت انگیز طور پر انہوں نے اسے مرغی کی طرح پروں میں چھپا لیا۔ جتنی عداوت بہو سے تھی اس سے دُگنی محبت اپنی نسل سے.....

اس کا نہانا دھونا کھانا پینا، پرورش سب انہوں نے اپنے ذمے لے لی۔

وہ شکر ادا کرتی یہ نہیں جانتی تھیں کہ سر پر چھت تو پہلے ہی نہیں تھی۔ اب اس کے پیروں کے نیچے کھدائی ہو رہی تھی۔ اور وہ بے خبر، آنکھیں بند کیے، باورچی خانے میں پناہ ڈھونڈ کے بیٹھی تھی۔

اکلوتی نند کا بیر اسے سمجھ آتا تھا کیونکہ بھائی کی زندگی میں آجانے کی وجہ سے اس کی اپنی لگی لگائی وٹے سٹے کی منگنی ٹوٹ گئی تھی۔ سالوں کا رشتہ اسی طرح آناً فاناً ختم ہو گیا تھا۔ جیسے وہ آناً فاناً اس گھر میں آئی تھی لیکن اکلوتا دیور کیوں اس کی جان اور عزت کا دشمن بن گیا تھا۔ وقت بے وقت بے دھڑک کمرے میں گھسا چلا آتا۔ کبھی کچن میں اسے اکیلا دیکھ کے نزدیک آجاتا۔ ذومعنی فقرے سرگوشی کی صورت میں کانوں میں انڈیل کر اس کی وحشت زدہ شکل کا حظ اٹھاتا۔

گھر والوں کا اس کے ساتھ بے رحمانہ رویہ دیکھ کے شاید وہ بھی اسے مفت کا مال سمجھ بیٹھا تھا۔

وہ لاکھ سر پٹختی لیکن جان نہیں پاتی تھی..... یہ سب کچھ ایک سلسلہ تھا۔ اسے ڈرانے کا کڑی در کڑی سلسلہ..... اسے بیزار کر کے نہیں..... خوفزدہ کر کے اس جگہ سے بھگانے کا.....

اسی جہنم جیسے تپتے ماحول میں دو سال کا عرصہ

لرزا اور اس کے سسر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔
اس کو معلوم ہوا۔ اصل میں وہ اب بے سہارا ہوئی تھی۔

☆☆☆

لاؤنج میں ٹی وی چلنے کی آواز آ رہی تھیں۔ آج تیسرے روز وہ کمرے سے باہر نکلی تھیں۔
دو دن کے سکون سے انہیں یہ تو اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ جو مسئلہ یاسر اور شفا کی وجہ سے شروع ہوا تھا۔ وہ ان کی ایک ادنیٰ سی کوشش کے سبب ختم ہو گیا تھا۔
کچھ لوگ اللہ کا تحفہ ہوتے ہیں دنیا میں......
اتنے سلجھے ہوئے، پُرسکون اور مہربان کہ لگتا ہی نہیں کہ یہ کبھی زندگی میں کسی کے لیے بھی کوئی مسئلہ بن سکتے ہیں۔
اس گھر کے لوگوں کی اکثریت خداوند کا تحفہ تھی۔ یا کم سے کم ان کے لیے ثابت ہوئی تھی۔
وہ دھیرے سے آگے بڑھ کے صوفے پر بیٹھیں تو ٹی وی پر نظریں جمائے ہوئے شفا چونک گئی۔
''ارے آپا! آپ کیسی ہیں۔ باہر کیوں آ گئیں کچھ چاہیے تھا تو آواز دے دیتیں یا مجھے مسڈ بیل دیتیں میں آ کے پوچھ لیتی۔'' وہ فکرمندی سے مسکراتے ہوئے اٹھ کے ان کے برابر میں آ بیٹھی۔
''کچھ نہیں چاہیے تھا مجھے، آرام بھی کتنا کروں گی۔ تھک گئی تھی اس لیے آ گئی......''
''بھوک تو نہیں لگی آپ کو...... جوس پئیں گی...... پچھلے دنوں سے آپ نے ٹھیک سے کچھ کھایا بھی نہیں ہو گا ناں ...میں دودھ کا شربت بنا کے لاتی ہوں۔''
''اوہو۔ بیٹھی رہو آرام سے...... میں کوئی مہمان ہوں کیا۔ خود لے لوں گی۔'' آواز میں اب بھی نقاہت تھی۔
''اب آپ سے روٹی کھائی جا رہی ہے......؟ اور یاسر بھائی نے جو ٹیوب دیا ہے ناں۔ پابندی سے لگائیں۔'' روشن مسکراتے ہوئے اس کے بھولے معصوم اور شفاف چہرے کو دیکھتی رہیں۔ کتنی تازگی، معصومیت اور خلوص تھا وہاں...... کومل سی نازک جلد کِھلی ہوئی تھی۔ نہیں سراپا، کنوار پن میں سمٹا ہوا تھا۔
انہوں نے کسی سوچ میں ڈوب کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔
''تم کتنی پیاری بچی ہو شفا......''
ان کا ذہن ادھیڑ بن میں چلا گیا۔ اس عمر میں وہ ماں بن چکی تھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے، روکھے بال،... بے رونق چہرہ...... ڈولتا، سوکھا پھیکی، بے کشش سراپا......
''اللہ تمہیں۔ ہر غم سے بچائے رکھے، آمین۔''
آنکھیں ڈبڈبانے ہی لگی تھیں کہ انہوں نے اپنا رخ ٹی وی کی طرف موڑ لیا۔
جہاں کسی گھرانے پر مظالم ڈھائے جانے کے مناظر تھے...... روتی عورتیں، چیخ و پکار مچاتے بچے...... ان کا دل گھبرانے لگا۔

☆☆☆

سسر کے انتقال کے بعد کچھ ہی دنوں میں سسرال والے جو کہ اب اس کے گھر والے تھے۔ اپنے صحیح رنگ روپ میں واپس آئے۔
گھر میں اس کے شوہر کی دوسری شادی اور ختم ہو جانے والے رشتے کو دوبارہ جوڑنے کی باتیں شروع ہو گئیں۔
وہ ٹکر، ٹکر ایک، ایک کا منہ دیکھتی۔ اندر ہی اندر ڈوبتی جاتی لیکن کسی سے ایک لفظ بولنے کی مجاز نہ تھی۔
نوبت یہ آئی کہ اس کے شوہر کے متوقع سسرال والوں کا آنا جانا دوبارہ شروع ہو گیا۔
اس کی ساس اور نند اسے روز سناتیں کہ وہ اپنا کوئی اور بندوبست کرے کیونکہ اب اس گھر میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔
رفتہ، رفتہ اس کی برداشت اور ظرف جواب دے گیا۔
وہ ایسا ہی ایک دن تھا جب اس نے اپنی ہونے والی سوکن اور اس کے گھر والوں کا استقبال کرنے سے منع کر دیا اور دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ بیٹا پہلے ہی ساس کے پاس تھا۔
اسے نہیں پتا تھا کہ وہ یہ کمرے کا دروازہ نہیں

pklibrary.com

بلکہ اس گھر میں اپنی زندگی کے آخری دن کا دروازہ بند کررہی ہے۔

پورا دن گزر گیا۔ وقفے، وقفے سے دروازہ پیٹا گیا لیکن اس نے تب ہی کھولا جب باہر سے شوہر کی آواز آئی۔

اسے کیا معلوم تھا کہ پیچھے اس کا پورا سسرال کھڑا ہے۔

دروازہ کھلتے ہی اس کے منہ پر زوردار تھپڑ پڑا۔

وہ بری طرح پیچھے کی طرف لڑکھڑائی۔ اس کے بعد اس پر ٹھڈوں کی بارش کردی گئی۔

اسے کہاں، کہاں کتنی ضربیں لگیں۔ اسے معلوم نہ تھا۔ اسے گھسیٹ کے کمرے سے باہر لایا گیا وہ تب تک ہوش میں تھی۔

دھندلی آنکھوں اور چکراتے سر کے ساتھ، اس نے اپنی واحد متاعِ حیات کو دیکھا۔

وہ ننھی سی جان اس کا بیٹا دونوں بانہیں اس کی طرف پھیلائے بری طرح رو رہا تھا۔

''میرا بیٹا.....''

اس کے منہ سے پکار نکلی بھی تو اپنے بجائے اپنی اولاد کے لیے۔

وہ تڑپ کر اس کی طرف بڑھی جب کسی نے اسے پیچھے سے گھسیٹ کر دروازے کی طرف دھکیلا..... شور شرابا، ہنگامہ بپا تھا۔

وہ اپنے بیٹے سے لپٹنا چاہتی تھی۔ اسے چومنا چاہتی تھی۔ اسے گود میں لینا چاہتی تھی۔ لیکن اسے کوئی موقع نہیں دیا گیا۔

سب گھر والے بشمول اس کے شوہر کے، اس کے پیچھے تھے۔ وہ منتیں کررہی تھی۔ مار کھا رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی، رو رہی تھی۔ لیکن جانے کیسے شقی القلب لوگ تھے، جن پر اس کے کسی واسطے کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اس کا پتھر دل شوہر، پتھر نہیں رہا تھا۔ وہ انسان بھی نہیں رہا تھا۔ حیوان بن گیا تھا۔

اس نے انسانی روپ میں درندے پہلی بار دیکھے تھے۔ پور، پور سلگتا ہوا جسم اور نیم جان حالت میں مزید

خوب صورت باتیں

☆ جتنے ہم اللہ سے راضی ہوں گے اتنا ہی وہ ہم سے راضی ہوگا۔

☆ دوسروں کے دکھ درد کو ایسے محسوس کرو جیسے تم دوسروں سے توقع رکھتے ہو۔

☆ چھین کر کھانے والوں کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا اور بانٹ کر کھانے والے کبھی بھوکے نہیں رہتے۔

☆ عجب طرح سے زندگی بسر کرتے ہم، ہاتھ منہ تو صاف کرلیتے ہیں لیکن سارا میل دلوں میں جمع کرلیتے ہیں۔

☆ توبہ کا خیال خوش بختی کی علامت ہے کیونکہ جو اپنے گناہوں کی سنگینی کو نہ سمجھے وہ بدقسمت ہے۔

☆ اپنے نصیب پر قانع رہو کیونکہ قسمت سے کم اور قسمت سے زیادہ کسی کو نہیں ملتا..... جو تمہارے مقدر میں ہے مل کر رہے گا لیکن جو دعاؤں سے سرفراز رہتے ہیں انہیں وہ بھی ملتا ہے جو قسمت میں نہیں لکھا ہوا اسی لیے دعا مانگنے اور دعا دینے کا حکم ہے۔

☆ خالی مادی ضرورتیں پوری کردینے سے رشتے نبھائے نہیں جاسکتے۔ اصل چیز تو اس احساس کا پیدا ہونا ہے جو ضرورت مند کے دل کو سکون دے دے۔

☆ لوگوں کے میزان میں آپ کی ایک غلطی آپ کی تمام اچھائیوں پر پانی پھیر دیتی ہے اور اللہ کے میزان میں آپ کی ایک نیکی آپ کے تمام گناہوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ندامت کا ایک آنسو آپ کے دل و دماغ کی صفائی کرنے کے لیے ابر باراں کے مانند ہے۔

☆ اچھے سے اچھے پھول کی مہک بھی کچھ دن بعد ختم ہوجاتی ہے لیکن اچھے اخلاق اور اچھے سلوک کی مہک انسان کی موت کے بعد بھی رہتی ہے اور نسلوں میں منتقل ہوتی ہے۔

☆ زندگی کی تاریکیاں بھی وہی دور کرتا ہے جو ہر تاریک رات کے بعد ایک روشن صبح کا نور فروزاں کرتا ہے۔ سبحان اللہ.....

مرسلہ نگار: فصیحہ آصف خان..... ملتان

مردانہ ضربیں کھانے کی ہمت نہ بچی تو بیچ صحن میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہوگئی۔

☆☆☆

اگلی بار جب آنکھ کھلی تو انہوں نے خود کو اس کاشانہ محبت میں پایا۔ درمیان میں ان پر کیا گزری انہیں کچھ پتا نہ تھا۔

ابا نے ان کو آدھی رات کو سڑک کنارے سے اٹھایا تھا۔ جب وہ کام کے سلسلے میں دوسرے شہر سے واپس آرہے تھے۔ تب سے اب تک وہ اس گھر میں تھیں۔

وہ کون تھیں۔ کہاں سے آئی تھیں اور ان پر کیا بیتی تھی۔ انہوں نے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔

ابا چاہتے تھے کہ ان کے شوہر سے بات کریں۔ لیکن وہ سنتے ہی ان کے قدموں میں گر گئی تھیں۔

وہ مر کے بھی اس گھر میں دوبارہ نہیں جانا چاہتی تھیں۔ جہاں سے ان کو دھکے مار کے نکالا گیا تھا۔ جو لوگ گھر کی عزت کو بے ہوشی کی حالت میں سڑک کنارے چھوڑ گئے تھے۔ وہ مار کے کہیں گاڑ بھی سکتے تھے۔ ان کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔

وہ واپس جانے کی بات پر ایسے بلک کے روئی تھیں کہ ان کی آہ و بکا نے اماں کا دل چیر کے رکھ دیا۔ وہ ان کی اولاد کی عمر کی تھیں۔ بالکل ایسا لگا جیسے شبانہ ان کے قدموں میں گری رو رہی ہیں۔ انہوں نے فی الفور فیصلہ کرلیا۔

روشن کسی بے سہارا عورتوں کے ادارے میں جانے کو تیار تھیں لیکن اس وحشیوں کے پنجرے میں نہیں.....

"کہیں نہیں جاؤ ہیں تم..... یہیں رہو گھر میں..... ہمارے ساتھ ہمارے پاس..... غضب خدا کا... کیسی قرب قیامت ہے۔ پھول جیسی بچی کا کیا حشر کردیا۔"

شفو بوا ان کے آنے سے اول اول کچھ جز بز ہوئی تھیں۔ کیونکہ وہ اتنی جلدی ان کی کہانی پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھیں۔

"ارے بیگم کوئی چھان پھٹک تو کروائیں۔ پتا نہیں۔ سچی بول رہی ہے یا گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ اتنی سی عمر میں ماں بھی بن گئی جنے کیا کہانی ہے۔"

"ہم کروائیں گے چھان بین۔ تب تک ذرا اسے سانس تو لینے دو۔"

آنے والے شب و روز میں اس کے سچ کی تحقیق بھی ہوگئی۔ اور ابا کی طرف سے خلع کا کیس بھی دائر کیا گیا۔ آفرین تھی ان فرشتہ صفت لوگوں پر.....

تمام بھاگ دوڑ میں کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ روشن اپنے بیٹے کو پانے کے لیے بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ نہ آواز سنی تھی نہ شکل دیکھی تھی۔ ان کے اندر سے زندگی کی ہر تمنا ختم ہو چکی تھیں۔ وہ عورت سے صرف ایک ماں بن گئی تھیں۔ ان کی بھوک پیاس اب فقط ان کی اولاد تک تھی۔

کورٹ کچہری بھی ہوئی ان کو خلع بھی مل گئی۔ لیکن اپنے بچے کی شکل دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ عدالت میں ان کے کیس کو غیر ضروری گھسیٹا گیا۔ شوہر اور اس کے گھر والوں کی طرف سے بے ایمانی کا ہر حربہ آزمایا گیا۔ ان کو مخبوط الحواس ٹھہرایا گیا۔ ان کے کردار تک پر کیچڑ اچھالا گیا۔ اپنے ہی چھوٹے بھائی کے ساتھ کردار کشی کی گئی۔

وہ دیور جو گھر میں اسے ڈراتا، دھمکاتا تھا.... بہ نفس نفیس خود بیان دینے آیا کہ اس کی بھابی کا کردار ٹھیک نہیں تھا۔ انہیں ذہنی مریضہ بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گی یہاں تک کہ دو سال گزر گئے۔

دو سال بعد جب پہلی بار انہوں نے اپنے بیٹے کا سامنا کیا تو اتنا بدل چکا تھا اور اتنا انجان تھا کہ ان کی صورت تک دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔

اس نے باپ کی گود نہیں چھوڑی۔ انہوں نے زبردستی گود میں لے کے پیار کرنا چاہا تو خوفزدہ ہو کے رونے لگا لیکن روشن کے قریب تک آنے کو رضامند نہ ہوا۔

ایسے وقت میں اس ماں کے دل کی کیا حالت تھی۔ وہ بری طرح بے بس ہونے کے بعد بدحواس بھی ہوگئیں انہوں نے چیخنا چلانا شروع کردیا۔ وہ بری طرح روتے ہوئے اپنے بیٹے کو پکارتی رہیں..... اپنے

بال نوچتی رہیں۔ جس سے ان کے ذہنی توازن خراب ہونے پر مہر ثبت ہوگئی اور وہ اپنے بیٹے کی کسٹڈی کا کیس ہار گئیں۔

گھر واپسی پر اُن کی حالت بگڑ چکی تھی۔ وہ نہ صرف اپنے حواسوں میں نہیں تھیں بلکہ کسی کو صحیح طرح پہچان بھی نہیں پا رہی تھیں۔

گھر آ کے انہیں پہلی بار مرگی کا دورہ پڑا تھا۔

☆☆☆

دن پر دن گزرتے چلے گئے۔

زندگی بہت بہتر صورتِ حال میں سامنے آئی۔

اب خیال رکھنے والے لوگ تھے۔ محبت سے رکھتے تھے محبت جتاتے تھے۔ لیکن وہ جو ایک پیاسی ممتا ان کے اندر، ہڑک رہی تھی اس کی پیاس بجھانے کا کوئی راستہ تھا نہ روزن.....

اور ممتا کو جب کوئی راستہ نہ ملا تو اس نے بیماری میں ڈھونڈ لیا..... وہ اسی گھر کے..... اپنے محسنوں کے بچوں سے بھی اپنی ممتا ٹھنڈی نہ کر سکیں۔

انہوں نے ان بچوں کے لاڈ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی..... اسکول کی تیاری سے لے کر لوری تک خود سنائی، نہلانا، دھلانا، مالشیں، کھانا کھلانا، ان کے ساتھ کھیلنا۔ ٹیوشن کے وقت ساتھ جانا..... وہ فل ٹائم کیئر ٹیکر تھیں۔ لیکن ماں نہیں تھیں تو بس نہیں تھیں۔

اسی لیے باپ بیٹے کے درمیان بولنا نہیں چاہتی تھیں۔

اسی لیے ذرا سی بات بڑھنے پر طبیعت خراب کر بیٹھی تھیں۔

اسی لیے عرفان بھائی کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

اور اسی لیے اپنا مقدمہ لڑنے کو یاسر کو پورے گھر میں ان کے علاوہ اور کوئی نہ ملا۔

انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔ اب دل کا بوجھ کم سے کم روح کے بوجھ سے ہلکا تھا۔

شام ڈھل رہی تھی۔ عصر کی اذان ہوئے وقت ہو چلا تھا۔ انہوں نے وضو کر کے نماز ادا کی اور ہلکے پھلکے ذہن کے ساتھ باہر آ گئیں۔

شفا پھر ٹی وی چلا کے بیٹھی فکرمندی سی اسکرین کو گھور رہی تھی۔ صبح والا منظر پھر سامنے تھا۔

باوردی فوجی چند عورتوں اور بچوں کو گھسیٹ رہے تھے۔ زمین پر گرا کے ان کو بے بس کر رکھا تھا۔ گھٹنوں تلے گردنیں دبی ہوئی تھیں۔ دھواں چیخ و پکار.....

''یہ..... یہ کون سی جگہ ہے شفا؟''

انہوں نے بے چین ہو کے پوچھا۔

''یروشلم ہے آپا..... مسلمانوں کے ساتھ اتنا ظلم.....'' وہ نم آنکھوں سے بتانے لگی۔

''بند کر دو اس کو شفا..... آپا ڈسٹرب ہو رہی ہیں۔'' اندر آتی حیا نے شفا کو ٹوکا۔ شفا نے جلدی سے ٹی وی بند کر دیا۔

حیا نے ان کے آگے چائے کا کپ رکھا۔

وہ پتھرائی ہوئی سی ایک جانب دیکھ رہی تھیں۔

''بالکل ایسی..... ایسی ہی جگہ تھی وہ جہاں میں تھی۔'' انہوں نے خود کلامی کی۔ شفا اور حیا کا منہ کھلا رہ گیا۔

''یہی ہوا تھا میرے ساتھ۔ گھر چھین لیا تھا۔ میرا بیٹا..... وہ بھی چھین لیا..... میرا سب کچھ لے گئے وہ..... ایسے ہی ٹھوکروں پر رکھ کر..... بالکل ایسے ہی نکالا تھا مجھے وہاں سے.....''

لڑکیوں کے لیے ان کے منہ سے ماضی کی بات سننا بالکل نیا تھا۔ وہ سب، سب کچھ جانتے تھے لیکن ان کی دل آزاری سمجھ کے ذکر نہیں کرتے تھے۔

''بالکل ایسا ہی منظر تھا اس جگہ..... میں رو رہی تھی، چیخ رہی تھی۔ اور وہ سب مجھے وہاں سے نکال رہے تھے۔ میں بھی وہاں تھی۔ میرے ساتھ بھی یہی کیا گیا وہاں پر۔''

''کس جگہ..... کہاں سے آپا.....؟''

شفا گھبرا گئی۔

''یروشلم سے.....''

ان کے جواب نے شفا کو سُن کر دیا۔ اور روشن آپا بے جان ہو کر حیا کے بازوؤں میں جھول گئیں۔

❁❁❁

تم میری ہی رہنا

شاہین ملک

عزیز صاحب سے فاروق صاحب کے پرانے تعلقات تھے پھر جب عزیز صاحب کی بیٹی کی شادی طے پائی تو محدود آمدنی کے سبب مہندی، مایوں کی تقریبات کے لیے جگہ کا انتخاب مسئلہ ہی ہوگیا۔ ننھیال، ددھیال میں سفید پوشوں کی اکثریت تھی زیادہ سے زیادہ ایک سو بیس گز کے مکانات والے رشتے دار اپنے ہی کنبوں کے لیے ناکافی تصور کیے جانے لگے تھے۔ تب ہی تو تایا جان نے ابا جی سے اجازت لے کر اپنے فلور کے لاؤنج، بالکونی کے وسیع حصے اور برآمدوں میں ان کی بیٹی کی شادی کے انتظامات کرنے کی ٹھانی تھی۔

یہ گھر ''فاروق ولا'' وسیع رقبے پر بنا ہوا بہت کشادہ اور ہوادار تھا۔ ابا جی نے ہی بالکونیوں کے اطراف خوب صورت سے آرچ بنائے تھے جس میں پارٹیشن کچھ ایسی تھی کہ تایا جان اور چچا جی کے پورشن ساتھ بھی تھے اور علیحدہ، علیحدہ بھی لگتے تھے ... اور برقی قمقموں کی آرائش نے ماحول کو مزید سحر انگیز بنا دیا تھا۔

''غریب اس مہنگائی کے دور میں نہ جانے کتنی صعوبتوں سے بیٹی کی شادی کر رہے ہیں، ہمیں ان سے تعاون کرنا چاہیے۔'' زوبیا کا کمرا بالکونی کے

pklibrary.com

مقابل تھا جسے دولھا والوں کے بیٹھنے کے لیے آراستہ کیا جاچکا تھا۔ زوبیا کے زیرِ استعمال صوفہ کم بیڈ کو صوفے میں بدل دیا جاتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی کیا گیا۔ شام ہی سے امی نے اس کی کتابوں کو کپڑوں کی الماری میں رکھوا دیا تھا۔ استری کے اسٹینڈ کو بھی فولڈ کر کے اسٹور روم میں رکھوا دیا تاکہ نشستوں کی تعداد بڑھ سکے اور کمرے میں گنجائش نکل آئے۔

''سارے بچوں سن لو..... مہمانوں کے سامنے لباس اٹھائے یا کاسمیٹکس اٹھائے نہ پھرنا..... یہ ہمارے اپنے گھر کی تقریب نہیں..... کچھ بھی پہنو مگر کپڑے اور اپنی چیزیں تالوں میں بند کر کے سمیٹ کے جانا..... سب تایا جان کے پورشن میں یا فرازی کے کمرے میں چلے جائیں..... ٹی وی دیکھیں، کیرم کھیلیں، لوڈو یا انٹرنیٹ مگر شور نہ کریں۔ آواز نہ آئے کسی کے لڑنے بھڑنے کی۔'' امی نے کہہ دیا تھا۔ ''تمہارا کیا ارادہ ہے صبح سے ساڑی پہننے کی ریہرسل کر رہی ہو.....؟'' وہ خاص کر زوبیا کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''ساڑی ہی پہنوں گی کوئی تصویر ہی نہیں ہے میری، فرازی بھائی نے نیا موبائل لیا ہے جس کا کیمرا بہت اچھا ہے..... اور..... اور.....''

''اچھا، اچھا بس جاؤ تیار ہو اور واش روم ماسی سے صاف کروالینا تو لیا بھی بدل دینا.....'' وہ یہ ہدایات دے کر نیچے تایا جان کے فلور پر چلی گئیں چند ساعتوں بعد زوبیا، امی کی جارجٹ کی ساڑی پہنے سیلفیاں لے رہی تھی۔ پھر جب وہ نیچے آئی تو ایک نئی شخصیت میں ڈھلی ہوئی دکھائی دی۔ گم صم سی یہ لڑکی تائی

جان کے ساتھ گھر کے چھوٹے موٹے کام نبٹا رہی تھی۔

”ڈیئر کزن چپ کیوں ہو؟ تمہیں تو کام کرتے وقت بڑبڑانے کی عادت ہے۔“ تایا جان کے بڑے بیٹے فرازی نے زوبیا سے شرارتاً کہا۔

”کام کے وقت صرف کام...... آپ بتائیے یہ گاڑی کی چابی لے کر کہاں کی تیاری میں ہیں۔“ شوخ و شنگ زوبیا بھی چپ رہنے والوں میں سے کہاں تھی۔

”مٹھائی والے سے مٹھائی اٹھانی ہے، پھولوں والے سے گجرے لینے ہیں، تمہاری تائی جان نے کہا ہے کہ لڑکیوں کو ساتھ لے لو مگر تم تو مصروف ہو۔“

”نہیں، نہیں اگر تائی جی نے کہا ہے تو جانا بنتا ہی ہے، کوئی ایسی مصروفیت نہیں چلیں چلتے ہیں، طلحہ، تانیہ اور زبیر کو بھی لے لیں۔“

”ہاں، ہاں بارات پوری جانے کو تیار ہے، واپسی پر آئس کریم کا بھی پروگرام ہے۔“ اب کے طلحہ کی آواز گونجی تھی جو تولیا کندھے پر ڈالے گیلے بالوں کے ساتھ وہاں سے گزر رہے تھے۔

”آج تو گنے کا رس ہی پئیں گے۔“ فرازی نے گویا فیصلہ سنایا۔

”پتا تھا...... آپ پیسے بچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ہم خواہ مخواہ سمجھ بیٹھے کہ کوئی شاندار ڈیل کی آفر کریں گے۔“ اب کے طلحہ نے جواب دیا۔

”جاؤ جا کے گاڑی میں بیٹھو سب......“ فرازی بھائی کا حکم تو یوں بھی سر آنکھوں پر تصور کیا جاتا تھا۔

”کیا زیادہ پیسے دے دیے ہیں تائی جی نے؟“ زوبیا جو دھیرے، دھیرے چل کر آرہی تھی۔ فرازی سے پوچھ رہی تھی۔

”اوہ ساڑی والی بی بی...... آم کھانے سے مطلب رکھو۔“ پتا نہیں وہ کیوں جھلا سے گئے تھے۔

”اب آپ کا موڈ کیوں آف ہو رہا ہے، آپ نے تو خود بلایا ہے ہمیں۔“ زوبیا کو ان کا اندازِ گفتگو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

”بھئی طلحہ ہماری لڑکیاں بھی بالی ووڈ کی فلمیں اور ان کے ڈرامے دیکھ، دیکھ کر ساڑی پہننا سیکھ رہی ہیں۔ ہم نے بھی آج زوبیا کو اس لیے ساتھ لے لیا ہے تا کہ انہیں بھی گاڑی میں بیٹھنے، اترنے اور چلنے کی پریکٹس ہو جائے۔“ وہ شوخ ہو رہے تھے یا اس کا بگڑتا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہے تھے بھلا طلحہ کو مخاطب کر کے ساڑی کا قصہ کیوں بیچ میں لا رہے تھے۔

”بھائی وہ عورتیں نہ کھانے پکاتی ہیں نہ گھر کے دوسرے کام کرتی ہیں، زیادہ سے زیادہ سیندور لگا کے کلائیاں چوڑیوں سے بھر کے اور بھاری زیورات پہن کر ڈرائیونگ بھی کر لیتی ہیں۔ ہمارے ہاں اتنی بنی سنوری عورتیں ڈرائیو کریں تو گاڑیوں سمیت ہی اغوا ہو جائیں۔“

اب گویا طلحہ کے کھلونے میں چابی بھر دی گئی تھی۔ وہ اور طلحہ دیر تک ہنستے رہے۔

”فرازی بھائی آپ سے یہ امید نہیں تھی......“ اب کے ان کی چھوٹی بہن تانیہ نے روٹھنے والے انداز میں کہا۔

”ڈیئر سسٹر میں نے تو بات برائے بات کی تھی۔ لوگوں سے کہو سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں......“ وہ بیک مرر سے زوبیا کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ کر بولے تھے۔ تانیہ نے دھیرے سے زوبیا کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھر دیا اور وہ دونوں لبوں ہی لبوں میں مسکرائیں اتنے میں پھولوں کی دکان آگئی۔ فرازی نے اپنا وزیٹنگ کارڈ دکھایا، اپنا پیکٹ اٹھایا، بقیہ رقم ادا کی اور پیکٹ پیچھے بیٹھی لڑکیوں کو تھما دیے۔ اتنے میں ایک لڑکا گاڑی کے قریب آیا۔ وہ بھی گجرے بیچ رہا تھا۔ پتا نہیں فرازی کو کیا سوجھی دو گجرے اس سے لیے اور سو کا نوٹ تھما دیا...... طلحہ کی خوش بیانی بھی جاری تھی اور دونوں گجرے ڈیش بورڈ پر رکھ دینے کا مطلب بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ خود انہوں نے تو ہیڈ فون لگا کے شاید گانے سننے شروع کر دیے تھے۔

اتنے میں زوبیا کے موبائل پر مٹھائی والے سے ٹوکرا اٹھانا یاد دلانے کا پیغام آیا تھا۔ زوبیا نے مناسب

pklibrary.com

یہی سمجھا کہ اپنا سیل فون فرازی بھائی کو دے دے، کیونکہ وہ تو کسی کی بات کا اب جواب دے ہی نہیں رہے تھے۔ میسج پڑھ کے انہوں نے زوبیا کو فون لوٹایا اور پوچھا۔ ''تمہیں راستہ پتا ہے شیریں کدہ کا؟''

اس نے بتایا اور چند سیکنڈوں میں یہ لوگ دکان کے سامنے تھے۔

''کیوں، ناں رس ملائی یا ربڑی کھالی جائے۔'' طلحہ نے سب کی رائے لی۔

''چپکے بیٹھے رہو..... ہر وقت میٹھا کھانے کی سوجھتی ہے تمہیں..... وقت دیکھو کیا ہوتا جارہا ہے۔'' فرازی کو وقت کی اہمیت کا احساس بھی تھا اور طلحہ کے بڑھتے ہوئے وزن کا بھی خیال آگیا۔

''کیا ہوا بھائی.....؟ وقت کی اہمیت کا احساس ہے مجھے آپ جب تک مٹھائی ڈگی میں رکھوائیں، میں اتنے میں ربڑی یا رس ملائی نکلوالوں گا۔'' تانیہ اور زوبیا کو ان کے چہرے پر آنے والے قوسِ قزح کے رنگوں کو بھانپتے ہی ہنسی آگئی۔

''ہنسو، ہنسو اور شہ دو اس پیٹو کو.....''

''ٹھہرو اٹالین آئس کریم کھاتے ہیں..... یہ مٹھائیاں شٹھائیاں تو..... گھروں میں چلتی ہیں۔'' فرازی نے سب کو آئس کریم پارلر جانے کی واقعی شاندار آفر دے دی تھی۔ اب یہاں لڑکیوں نے ایک، ایک اسکوپ جبکہ طلحہ، زبیر اور فرازی کپ بھر کے دو، دو تین، تین اسکوپ کھا رہے تھے۔ واپسی پر سب ہشاش بشاش تھے۔

وہ گھر پہنچے تو ایسا لگا جیسے اپنے گھر نہ آئے ہوں..... راہداریوں میں ہی لوگ انہیں گلے لگانے اور معانقہ کرنے لگے۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ نشستیں بھری گئی تھیں۔

''یہ تو کوئی چالیس پچاس افراد نہیں لگتے امی.....'' زوبیا نے کچن میں آکر امی سے کہا۔

''ہمیں تو یہی کہا تھا کہ آدھے رشتے دار ناراض بیٹھے ہیں مگر لگتا ہے ایسے موقع پر سب من گئے ہیں جب ہی تو ایسی بھیڑ لگی ہے مگر تم منہ نہ بسورنا..... مل لیں؟ دیکھ لی سب نے ساڑی تمہاری اب جاؤ کپڑے تبدیل کرلو.....'' امی نے فرمان جاری کیا مگر زوبیا بولی۔

''نہیں ابھی تو میں نے آپ کے اور ابو کے ساتھ تصویر نہیں بنوائی۔ ابو کو کیسے بلاؤں..... زبیر کو بھیجتی ہوں۔'' اور وہ فرازی بھیا کے کمرے میں چلی گئی۔ کیسرا انہی کا استعمال کرنا تھا اور آئس کریم کا تازہ، تازہ احسان بھی تھا اس لیے بھی وہ بڑے احترام سے تصویر بنوانے کی فرمائش کررہی تھی۔

''ویسے امی اتنے زیادہ رشتے دار ہیں ناں ان کے، مٹھائی اور پھول ہم کیوں لارہے ہیں۔'' تانیہ بھی شکوہ کررہی تھی۔

''تمہارے ابو نے کام بانٹنے کا کہہ دیا تھا ناں اور بچوں سنو یہ وہی عزیز صاحب ہیں جو بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی میں افسر رہے، ہمارے آپ کے بزرگوں کی زمین پر لینڈ مافیا قبضہ کرکے بیٹھی تھی..... اگر لیز کی فائلیں یہ دفتر سے نہ نکلواتے تو آج ہم اس عالیشان کوٹھی میں بھلا بیٹھے ہوتے..... یہ رشوت بھی نہیں لیتے..... غریب آدمی ہیں۔ اس پُرآشوب دور میں چار جوان بیٹیوں کے ساتھ عزت نفس بچا کے بیٹھے ہیں، اگر ہم ان کے کام آجائیں تو کیا برا ہے..... تم بچے نہیں سمجھو گے، جاؤ اپنے کمرے میں ٹی وی شی وی دیکھو.....'' اور امی کھانا لگوانے کے انتظامات کرنے لگیں۔

''امی ان کے جانے کے بعد صفائیاں کون کرے گا؟'' طلحہ نے امی اور تائی جان دونوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''وہ اپنی کام والی ساتھ لائے ہیں اور میں نے بھی ہاجرہ کو روکا ہوا ہے رات دو بجے تک گھر صاف ملے گا تمہیں.....'' تائی جی نے بچوں کو تسلی دی۔

''ورنہ زوبیا اور تانیہ تو ہیں ہی گھر میں.....'' اب کے فرازی نے براہ راست چوٹ کی..... زوبیا تو وہاں اس وقت موجود نہیں تھی۔ تانیہ کی تیوریوں پر بل مزید پڑ گئے تھے۔ یہ فرازی کی چچا زاد تھی اور عمر میں چھ برس چھوٹی بھی تھی۔ اس لیے بڑے بھیا کا لحاظ کرکے رہ گئی۔

''امی میں نے کپڑے بدل لیے ہیں..... مجھے کھانا دے دیں..... صبح مجھے کالج بھی جانا ہے۔'' تانیہ نے کمرے میں موجود ہر فرد کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''سب اکٹھے ہو جاؤ، طلحہ کو بھوک نہیں زوبی پھر دوست کے یہاں چلا گیا۔ فرازی تم کہو کھانا نکال دوں۔''

''ہم اپنا کھائیں گے ہمیں ان کی بریانی سے کوئی مطلب نہیں.....'' فرازی نے امی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ٹھیک ہے مگر کھانا بھی تو تمہارے تایا جان نے پکوایا ہے بھئی ہماری ہی طرف سے ہے۔'' تائی جان نے پہلی بار انکشاف کیا۔

''اچھا.....'' سب بچوں کی آواز کورس میں گونجی۔

''ان لوگوں کی رسمیں ہو چکی ہیں..... اب کھانا کھلے گا تو تمہیں بلا لوں گی..... کچن سے ہی آ کے لے جانا.....'' امی نے فیصلہ سنا دیا۔ گھر کے مرد لاؤنج میں عزیز صاحب کے مہمانوں کی تواضع کر رہے تھے۔

فضا میں لوگوں کی آوازوں کا شور مدھم سا تھا..... ورنہ شادی ہالوں میں تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیا کرتی..... لوگ تایا جان کی فراخ دلی اور مہمانداری کے احترام میں بھی شور و غل نہیں کر رہے تھے ورنہ مہندی اور مایوں کی تقاریب میں ڈھولک کی تھاپ یا ساؤنڈ سسٹم پر فلمی گانوں کا شور نہ ہو یہ تو ہم لوگوں کے مزاج ہی میں نہیں.....

زوبیا نے کمرے سے باہر جاتی امی اور تائی جی کو برآمدے میں بلا کر ساڑی میں تصویر بنوا ہی لی۔

''اور ہمارے ساتھ؟'' فرازی بھائی نے شکوہ کیا اور نا معلوم کیوں یہ کہہ کر خود اُن کے ماتھے پر پسینے کے ننھے، ننھے قطرے جمع ہو گئے تھے۔ وہ خود شرمندہ سے ہو گئے کہ کیا کہہ بیٹھے..... زوبیا ٹین ایج میں تھی اور وہ گھر کے بڑے بچے، جنہیں ایم بی بی ایس کیے ہوئے دو برس ہو گئے تھے۔ اور اب وہ سرجن بننے جا رہے تھے۔

''آؤ ناں تم سب گروپ میں آؤ.....'' زوبیا کی امی نے جنہیں چچی امی کہا جاتا تھا سب بچوں کو بلایا۔ زوبیا احتیاط سے ایک جانب کو ہو گئی پیچھے سے تانیہ آئی دکھائی دی تو فرازی نے اسے اپنے پہلو میں کھڑا کر لیا اب زوبیا مطمئن سی تھی۔ طلحہ نے تصویر لے کے دوسری بار خود کو گروپ میں شامل کر لیا۔

یہ تقریب یقیناً رات گئے ہی ختم ہونی تھی۔ زوبیا اور تانیہ پہلے ہی ایک کمرے میں بستر پر قبضہ کر چکی تھیں۔ یہ دونوں بہنیں اگلے دن چاہ کر بھی کالج نہ جا سکیں اور دن چڑھے جب آنکھیں ملتے ہوئے انھیں تو ایک دوسرے سے کہہ رہی تھیں۔

''ہائے اللہ نیند ہی پوری نہیں ہوئی۔'' ناشتے کی میز پر آتے آتے زوبیا کو خیال آیا کہ اگر ان کے اپنے گھر کی ایسی کوئی تقریب ہوتی تو ان کا ردِعمل کیا ہوتا۔

اگلے دن شام کو تایا جان کے فلور پر جانے کا اتفاق ہوا۔ فرازی بھائی اسپتال جا چکے تھے اور آٹھ گھنٹوں کی یہ ڈیوٹی اب دس گھنٹوں پر محیط ہونے لگی تو تائی جی کچن سے پکاریں۔

''بیٹا ذرا اپنے بھائی کی تو خبر لو..... اسپتال جا کے گھر لوٹنا بھول ہی جاتا ہے۔''

وہ بولی تو کچھ نہیں مگر سوچنے لگی۔ ''نئے، نئے ڈاکٹر ہیں ناں کچھ زیادہ ہی کمیٹڈ ہیں۔'' نمبر ملایا تو فون بند جا رہا تھا۔ اس نے میسج کر دیا اور تائی جی کو بتا دیا۔

''فون تو بند ہے اسپتال ہی میں مصروف ہوں گے آ جائیں گے۔''

''بیٹا تم ایک کام کرنا پتا کرتی رہنا، میں اتوار بازار جا رہی ہوں..... تم اسے کھانا نکال دینا جو بھی وہ کہے اور دیکھو مچھلی کی بریانی بنائی ہے آج..... دل چاہے تو کھا لینا یا اوپر لے جانا، تانیہ کو بھی پسند ہے.....'' وہ سمجھا دیں۔

''کیا امی بھی آپ کے ساتھ جا رہی ہیں؟'' زوبیا نے اس لیے بھی پوچھا کہ تائی کی غیر موجودگی میں امی ہی ان کے بیٹوں کے کھانے پینے کا خیال رکھا کرتی تھیں۔

''ہاں بیٹا..... کیوں تمہیں کچھ چاہیے؟''

''نہیں..... نہیں ایسے ہی پوچھ لیا..... دیر مت

لگا ئے گا اور یہ ہاجرہ کام کرتی کیا؟"

"ہاں، دیکھو ناں رات ڈھائی بجے جھاڑو لگا کے جھاڑ پونچھ کے قرینے سلیقے سے ہر چیز ٹھکانے پر رکھ کے سوئی ہے۔ ناشتا کر کے ابھی تو گئی ہے۔ پھر اسی لیے تمہاری امی نے اوپر کا کام نہیں کرایا...... اب تم دونوں بہنیں صفائی کر لینا......" وہ اسے بڑے دلار سے دیکھ رہی تھیں۔

"اچھا ناں کرلیں گے اور کچھ......"

"اور یہ کہ کاش میری ایک ہی سہی مگر بیٹی بھی ہوتی۔" وہ حسرت سے فرش کو دیکھنے لگیں۔

"دو، دو شیطان اس گھر میں موجود ہیں، یہ کافی نہیں......" وہ ہنس کر تایا جان کی طرف آ گئی۔

وہ سہ پہر کی فلائٹ سے لاہور جا رہے تھے۔ فون پر بات کرتے دیکھ کر وہ واپس اوپر چلی گئی۔ امی اسے زینے سے اترتے ہوئے ملیں۔

"گھر میں ذرا ڈسٹنگ وغیرہ کر لینا۔ شاید بازار میں دیر... ہو جائے یا ہم سہیلیاں لنچ پر چلی جائیں تم فرازی، طلحہ اور زبیر کے کھانے کا خیال رکھنا...... فرازی آیا کہ نہیں......؟"

"کہاں...... فون بند تھا میسج کر دیا ہے اب دیکھیں، دیکھتے بھی ہیں کہ نہیں......"

"ہاں وہ بچہ ایسا ہی ہے۔" اور وہ زینہ اتر گئیں۔

☆☆☆

اس شادی سے فراغت کے بعد چونکا دینے والی ایک خبر سننے کو ملی تھی اور وہ تھی زوبیا کے لیے عزیز صاحب کے خاندان سے رشتے کا سندیسہ آنا، گھر والوں کی پنچایت بیٹھا کرتی مگر فیصلہ نہیں ہو سکا۔ دو چار روز بعد گھر میں چہل پہل نظر آئی تو فرازی نے بھی چچی امی سے پوچھ لیا۔

"کون آ رہا ہے آج...... یہ اہتمام کس لیے؟"

سردیوں کے دن تھے وہ گاجر کا حلوا بنا رہی تھیں۔

"بیٹا زوبیا کے رشتے کے لیے جو لوگ آئے تھے ناں ان کی ایک بیٹی عمرہ کر کے لوٹی ہے۔ بس یہ دوپہر کے کھانے کا اہتمام ہے۔

"میرے لیے بھی کچھ بچا کے رکھیے گا، میرا مطلب ہے حلوا......" فرازی نے بے تکلفی سے کہا۔

"ہاں...... ہاں کیوں نہیں میرے بچے پہلے، اچھا بریانی نکال دوں تم نے کھانا تو نہیں کھایا ہوگا۔"

"ہاں کھایا تو نہیں، طلحہ نے کہا اوپر ہو آؤں تو اوپر ہی آ گیا۔ تھوڑی سی نکال دیں بریانی......" وہ کھانے کی میز کے گرد بے تکلف ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر اٹھے اور فریج سے پانی کی بوتل نکال کر باہر رکھ دی۔

"یہ آپ لوگ سردیوں میں بھی ٹھنڈا پانی پی رہے ہیں۔" وہ سوچ کر رہ گئے چچی سے کچھ کہہ نہ سکے۔

"اور سنو بیٹا ذرا پتا تو کرو آئل کمپنی میں مارکیٹنگ ہیڈ ہے۔ خاصا دین دار اور محنتی ہے۔ اپنے بچے کی تو سب تعریف ہی کرتے ہیں۔ بیٹی دینی ہے اجنبی لوگ ہیں، تحقیقات تو کرنی ہی ہوگی۔ تمہارے چچا نے ساری ذمے داری مجھ پر ڈال دی ہے۔ میری مدد کرو بیٹا......" چچی امی نے ڈش میں بریانی نکال کر پلیٹیں اور چمچ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ چچی امی کے چہرے پر خوشی اور حیرت کے جگنو رقصاں تھے، ایک لمحے کو وہ اپنی بھوک پیاس بھول کے صرف انہیں دیکھتے رہ گئے۔ ماں کی محبت بھی کیا چیز باقی ہے۔ وہ ان جگنوؤں کو دیکھ کر فکر مند بھی ہو گئے۔

"تصویر ہے آپ کے پاس، کوئی ایڈریس وغیرہ؟" انہوں نے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے چچا کی اردو لغت میں تصویر اور دیگر معلومات کا کاغذ رکھ کر آئی ہوں، شیلف سے دیکھ لینا۔" اور وہ پھر کچن میں چل دیں۔ اتنے میں زوبیا کا وہاں سے گزرا ہوا تو انہوں نے اسے آواز دی۔

"یہاں آنا کزن...... کھانا کھا لیا کیا؟"

"جی...... جی......"

"سلاد نہیں بنائی کیا......؟" وہ بات کیسے شروع کریں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"بنائی ہے ناں...... میں لاتی ہوں...... یہ دیکھیے

pklibrary.com

میں نے سجائی ہے۔'' وہ خوشدلی سے بولی۔

''میں احتیاط سے ایک کھیرے اور ٹماٹر کی قاش اٹھا لیتا ہوں تمہاری آرائش خراب نہ ہو جائے..... آخر کو اہم مہمانانِ گرامی تشریف لا رہے ہیں.....'' وہ خوش بھی تھے اور مذاق کے موڈ میں بھی..... وہ جواباً کچھ نہ کہہ سکی۔

''تم نے تصویر دیکھی یا کبھی آمنا سامنا بھی ہوا ہے؟'' وہ بظاہر سکون سے کھانا کھا رہے تھے۔

''جی..... جی ہاں جی وہ آئے تھے ناں اپنی امی کے ساتھ..... تو سامنے آنا پڑا.....'' وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بات کر رہے تھے جیسے دوا کا نسخہ لکھ رہے ہوں۔ اپنے ہی کسی خیال میں غرق..... وہ کھڑے مسالے اور چکن کی ہڈی کو الگ کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا وہ کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ پتا نہیں زوبیا کو اپنا آپ عجیب سا لگنے لگا۔ خواہ مخواہ کی شرمندگی یا بڑے کزن کے حدِ ادب کا لحاظ رکھنا کٹھن لگ رہا تھا۔

''آپ کو کچھ اور لادوں بھائی؟'' وہ کسمساتے ہوئے بولی۔

''نہیں بس کھا چکا..... آج رات کی ڈیوٹی ہے..... زیادہ کھالیا اسپتال میں نیند آئے گی..... اس لیے ابھی کھالیا.....'' وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

''تم..... پہلے سے تو نہیں واقف ہو ناں.....؟ اگر ہو تو..... بتا دینا گڑیا.....''

زوبیا نے لپک کے برتن اٹھائے اور کچن میں جانے کو مڑی تو بولے۔

''میری بات کا جواب نہیں دیا تم نے.....''

''نہیں جانتی..... بالکل بھی نہیں جانتی بھائی.....'' وہ کامل یقین سے بولی تاکہ انہیں شبہ نہ رہے کہ وہ پہلے سے ان صاحب کو پسند کرتی رہی ہوگی..... اپنے بارے میں ان کا تفتیش کرنا اچھا بھی لگ رہا تھا اور نہیں بھی۔

کوئی تین بجے سہ پہر کے قریب چار خواتین اور ایک نوجوان بچی آئیں۔ کھانے کی میز پر اچار، چٹنی، رائتہ، سلاد اور کراکری کی ترتیب پہلے ہی سے کی جا چکی تھی۔ مرد ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ زوبیا اور تانیہ دونوں بہنیں خاطر مدارات میں آگے، آگے تھیں۔ فرازی گھر سے جانے لگے تو چچا جان کے کمرے سے گلا کھنکھارنے کی..... آواز سن کر اندر آ گئے۔ علیک سلیک ہوئی اور انہوں نے لغت سے تصویر اور ایک کاغذ نکال کر فرازی کے ہاتھ میں تھمایا۔

''دیکھو..... کیسا ہے؟ اور ذرا پتا بھی لگانا ہے..... کسی آئل کمپنی میں ہے، سماجی کاموں میں پیش، پیش رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی تمہاری تنظیم پیشنٹ ویلفیئر کے لیے کام کیا ہو، جیسا کہو گے ویسا ہی کریں گے۔'' ان کے ہاتھوں کی حرارت سے بھرا لمس اعتماد کا جواز تھا۔ وہ بڑے بھائی کی اس پہلی اولاد کو بہت عزت دیتے تھے اور جانتے تھے کہ یہ بچہ پورے خاندان کے بچوں کے لیے گائڈ سے کم نہیں اور اس کے مشورے بھی صائب ہوئے ہیں یہ تعصب بھی نہیں رکھتا۔

''جی اچھا.....'' اتنا کہہ کر وہ سلام کر کے گھر سے نکل گئے۔

اتنے میں تانیہ دو کپ چائے اٹھائے ٹرے ابو کے کمرے میں لائی۔

''دوسری کس لیے.....؟'' ابو نے پوچھا اور خود ہی اندازہ کر لیا کہ یہ اپنے کزن فرازی کے لیے لائی ہوگی۔

''فرازی جا چکے بیٹا.....'' اور وہ میز کے کونے پر کپ کھسکا کر رکھنے لگی۔

''کوئی بات نہیں ہم تو ہیں ناں..... ہم پی لیں گے۔'' اور وہ شوخ لڑکی دوسرا کپ واپس اندر لے گئی..... ابو مسکرانے لگے۔

☆☆☆

اسپتال کی زندگی اور معمولات وہی تھے۔ فرازی ENT ڈیپارٹمنٹ میں تھے اور ان کے دوست سلطان احمد گردوں کے امراض سے متعلق شعبے کے آر ایم او تھے۔ یہ لوگ ایسوسی ایشن کے آفس میں آتے جاتے ملتے تھے۔ پیشنٹ ویلفیئر سوسائٹی کا ہر ممبر وہاں ڈیوٹی سے پہلے یا بعد میں گھنٹے دو گھنٹے کے لیے ضرور جاتا تھا۔ آج ان کے دل میں کھد بدی ہو رہی تھی۔ انہوں نے

والٹ سے تصویر نکالی اور پہلی بار اطمینان سے دیکھا۔ گندمی رنگت، خشخشی فرنچ کٹ داڑھی، دن کے وقت دھوپ میں کھنچی ہوئی تصویر تھی اس لیے دھوپ کا چشمہ لگائے یہ صاحب اسے برے نہیں لگے۔ منسلک کاغذ پر فریم میں ان کے عہدے، فیملی کے دیگر افراد، گھر کے پتے اور والدین سے متعلق معلومات درج تھیں۔

انہوں نے سلطان سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ اس کے ماموں اسی آئل کمپنی میں ملازم تھے یوں اچانک ہی فرم کا پتا چلا۔ فرازی خوش ہوگئے کہ اب اطمینان سے فیملی کے بارے میں معلومات مل سکیں گی۔ اس سے پہلے کبھی اس کے ماموں کا تذکرہ بھی نہیں سنا تھا۔ سلطان احمد نے وہیں بیٹھے، بیٹھے ماموں جان کو کال کردی اور رشتے سے متعلق بات بتا کر ان صاحب کا پتا کروانے کا پوچھا اور انہوں نے شام کو گھر آنے کا وعدہ کرلیا پھر وہ بولے۔

''ایسا کرو ان صاحب کا نام اور عہدہ ایس ایم ایس کردو میں یہاں سے دیکھتا ہوں مگر کچھ وقت لگے گا۔''

اگلے روز فرازی اسپتال سے لوٹے تو چچا جان کے کمرے میں گئے..... وہ انہیں دیکھتے ہی بولے۔

''طبیعت تو اچھی ہے؟ یہ چہرے کی تھکن اور آنکھوں کی سرخی..... ٹھہریں کہاں ہے آپ کا تھرما میٹر.....؟'' انہوں نے آگے بڑھ کر دراز سے ان کا فرسٹ ایڈ بکس کھولا اور اگلے ہی سیکنڈوں میں بخار کا پتا چل گیا تھا۔

''کیا محسوس کررہے ہیں..... گلے میں درد ہے.....؟'' وہ ان کی کیفیت کو سمجھ رہے تھے اور چچا جان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں دوا لاتا ہوں اور ٹیسٹ کے لیے چلتے ہیں۔ آج کل بخار کو سنجیدگی سے لینا چاہیے..... آپ جانتے ہیں ناں کورونا پھیل رہا ہے۔'' وہ کچھ کہتے، کہتے رکے تو چچا جان کی آنکھیں بھر آئیں۔

''یہ نفسیاتی سا تاثر ہے خبریں بہت دیکھ رہے ہیں ناں آپ..... سنسنی پھیلی ہوئی ہے ملک میں.....

نقش قدم

قائداعظمؒ کئی دفعہ علی گڑھ آئے اور میں نے انہیں دور و نزدیک سے کئی بار دیکھا۔ اکثر بھیڑ کی وجہ سے مجھے ان کی تقریر کھڑے ہو کر سننا پڑی مگر دو ایک تقریریں میں نے ان کے قدموں میں بیٹھ کر بھی سنی ہیں۔ ان دنوں ان کے قدموں میں بیٹھنے کے لیے مقابلہ ہوتا تھا مگر آج ان کے نقشِ قدم پر چلنے والا ایک بھی نظر نہیں آتا۔

روبینہ منظور، راول پنڈی

اقتباس از: آوازِ دوست

ہم سخن نہ کوئی

مسافر، قلی سے..... ''بھئی مجھے ایسے ڈبے میں بٹھانا جہاں بات کرنے والا کوئی نہ ہو۔''

قلی..... ''آپ فکر نہ کریں، میں آپ کو جانوروں کے ڈبے میں بٹھادوں گا۔''

افسانچہ

کتنے اچھے دن تھے جب تم میرے پاس تھے مجھے کسی قسم کی فکر نہیں تھی۔ اور میں سکون کی زندگی گزار رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھا کرتی تھی لیکن شاید تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تمہاری جدائی کے باعث میری حالت ابتر ہوگئی تھی۔ میرا دل ہر وقت بے کل اور بے چین رہنے لگا۔ میرے ذہن سے تمہاری یاد ایک لمحہ بھی محو نہیں ہوتی تھی اور میں تمہاری جدائی کا غم سہہ نہیں پارہی تھی کہ ایک دن اچانک تم مجھے مل گئے۔ اے میرے پیارے کرایے کے مکان میں تجھے ڈھونڈتے، ڈھونڈتے تھک گئی تھی۔

از: رفعت بشیر، پشاور کینٹ

پتے کی بات

گفتار کی لغزش عام سہی
کردار کا ضامن کون بنے
ہر قوم کی عظمت گھٹتی ہے
جب لوح و قلم بک جاتے ہیں

از: حرا، نیو کراچی

حالانکہ معمولی بخار ہے؟ شاید گرمی بڑھنے اور ٹھنڈا پانی پینے سے گلے کی تکلیف ہوئی ہوگی..... فی الحال یہ پینا ڈول لیجیے میں کپڑے بدل کے آتا ہوں..... آپ بھی تیار ہو جائیں اسپتال چلتے ہیں.....'' ڈاکٹر فرازی اپنے چچا کو کہہ کر اپنے پورشن میں چلے گئے۔

امی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں..... طلحہ کی ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ فرازی کو دیکھتے اور دل ہی دل میں دعا دے کر وہ ان کے لیے ناشتا بنانے لگیں۔

''امی جی صرف پورج (دلیہ) دیجیے گا اور ایک کپ چائے، چچا جان کو بخار ہے میں انہیں ٹیسٹ کے لیے لے جا رہا ہوں.....'' انہوں نے ایک ہی سانس میں اپنی بات مکمل کی اور واش روم میں چلے گئے۔

''کتنا بخار ہے تشویش کی بات ہے کیا.....؟'' وہ ناشتے کی میز پر آئے تو امی نے پوچھا۔

''ہے تو لیکن ٹیسٹ بہت ضروری ہے..... آج ہمیں آئسولیشن وارڈ میں ٹرانسفر کیا گیا ہے۔ کورونا کا تو ایک بھی مریض نہیں آیا مگر ہم ٹیسٹ کر رہے ہیں بخار اور کھانسی میں مبتلا لوگوں پر توجہ دی جا رہی ہے۔ گھر میں بھی زوبیا اور طلحہ کو بھی ٹیکسٹ میسج کر دیے ہیں۔ آپ نے بھی گھر سے باہر کہیں نہیں جانا ہے۔ سپر مارکیٹوں سے آن لائن، سبزی، پھل، گوشت جو منگوانا ہو منگوالیں اور یہ ہاجرہ ماسی کا آنا بھی بند کر دیں۔ کوئی بھی باہر نہ جائے۔ دن میں دو بار غسل کر لیں..... بار، بار ہاتھ دھوئیں اور کوئی بھی تکلیف محسوس ہو مجھے کال کریں، میں اپنے سینئرز سے مشورہ کر کے بتاؤں گا۔ گھر میں لیموں اور شہد ہے۔ چائے کافی کی عادت کم کر کے لیموں پانی کی عادت ڈالیں..... یہ وبا عمر اور جنس نہیں دیکھتی۔ میں چار ماسک تو لے آیا ناں، بازار میں مل ہی نہیں رہے تھے شام تک چار، چھ اور لے آؤں گا..... اور امی ہو سکتا ہے میں چچا جان کو اسپتال میں داخل کروالوں مگر ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔ ٹیسٹ کی رپورٹ آجائے تو پھر دیکھتے ہیں۔ ہم سب کو اللہ محفوظ رکھے۔ آج اس وبا کا ہی نہیں میرا بھی کڑا امتحان ہے۔'' چائے پینے تک ان کی آنکھیں ڈبڈبا سی رہی تھیں۔

امی ساکت ہوئی بیٹھی تھیں اور انہوں نے چونک کر کسی آہٹ کو محسوس کیا۔ زوبیا اور چچی جان سامنے سے آرہی تھیں۔ فرازی نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا یہ بچہ تھا ہی بڑا ذہین۔

''بھائی..... ٹی وی پر تو اچھی خبریں نہیں آرہیں کورونا بڑھتا جا رہا ہے کیا؟'' زوبیا نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ہمارے اسپتال میں تو ابھی کوئی مریض نہیں ٹیسٹ ہو رہے ہیں مگر احتیاط بہت ضروری ہے تم نے میسج پڑھ لیا.....'' وہ چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''جی..... اور ابو کو بھی تو حرارت ہے آپ انہیں اسپتال لے جا رہے ہیں۔'' زوبیا کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

''ہاں، تو جب طبیعت خراب ہو تو ڈاکٹر کے پاس ہی جاتے ہیں ناں..... فکر کی کیا بات ہے بھئی..... ٹیسٹ کروالیں گے باقی یہ چار ماسک ہیں..... برآمدوں میں صفائی کے وقت، سبزی والا اگر آجائے تو باہر جاتے وقت اسے لازماً لینا ہے، باقی ہاتھ دھونا اور دوسری احتیاطی تدابیر تو بتائی ہی جا رہی ہیں۔ آپ میں سے کوئی کہیں باہر نہ جائے نہ کوئی ہمارے ہاں آئے۔ یہ دعوتیں، یہ ملنا ملانا دو چار مہینوں بعد کر لیجیے گا۔'' وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑے ہوئے اور واش روم چلے گئے۔

''شکر ہے مہینے بھر کا تو سودا ہے گھر میں مگر رمضان شریف کے بعد مزید چیزیں درکار ہوں گی۔'' چچی امی فکرمند ہو رہی تھیں۔

''اب یہ سپر مارکیٹوں والے پتا نہیں کیسا سودا لائیں..... اپنی مرضی سے خریدنا تو اور بات ہوتی ہے۔'' امی بھی نئی صورتِ حال کو قبول نہیں کر رہی تھیں۔

''ایک دن ماسک لگا کے چلے جائیں گے۔ لوگوں سے فاصلہ رکھ کر چلیں گے۔ ہینڈ سینی ٹائزر تو بھرے پڑے ہیں گھر میں مگر یہ وائرس تو پتا نہیں کب تک چلے..... مرد بھی گھروں میں بیٹھنے لگے ہیں اب تو خرچہ بڑھے گا ہی.....''

''خرچے کی تو فکر نہ کریں مگر اب تو ہم کچن ہی کے ہو کے رہ جائیں گے۔ پہلے تو یہ بچے باہر سے کھانا منگوا لیتے تھے اب تو وہ سلسلہ بھی بند ہوا۔'' دیورانی، جیٹھانی آپس میں خانگی معاملات پر اظہارِ خیال کر چکیں تو انہیں فرازی گلوز۔ اور ماسک پہنتے نظر آئے وہ چچا جان کو اسپتال لے جا رہے تھے۔ شاید انہوں نے بزرگ خواتین کی کچھ باتیں سن لی تھیں جب ہی تو کہہ رہے تھے۔

''کیا فائدہ میڈیسن پڑھنے کا میں تو گھر والوں کا بھی خیال نہیں رکھ پاتا..... آپ لوگوں نے چچا جان کے بخار کو محسوس نہیں کیا، وہ پین کلر بھی نہیں لے رہے تھے چلیے اب احتیاط کیجیے گا ہم اسپتال جا رہے ہیں۔ مجھے نائٹ میں پھر وہاں جانا ہوگا.....'' وہ دونوں خاموش رہیں۔ اس وبا کی تباہ کاریوں کا شروع میں اندازہ ہی نہیں تھا۔

دو روز پہلے گھر میں خواتین کی دعوت کا اہتمام ہوا تھا، چچا جان سے ملنے تو ان کے ایک دفتر کے ساتھی ہی آئے تھے اور یہ دونوں گھر میں بیٹھے کام کرتے تھے، یوں بھی اپنا کاروبار تھا۔ ایک تعمیراتی منصوبہ شروع کیا تھا تو وہاں بھی تایا جان ہی سائٹ پر جاتے تھے۔ چچا تو دمے کے مریض تھے اس لیے انہیں تو تایا جان نے کبھی وہاں نہیں بلایا۔ وہ خود بھی ماہر تعمیرات تھے اس لیے دونوں کی معاونت سے ہی کاروبار چل رہا تھا۔ فرازی نے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ دنیا میں ایک خطرناک وبا پھوٹی ہے جو انفلوئنزا کی ایک شکل ہے مگر جس کی حفاظتی دوا بھی تجویز نہیں ہو سکی اور رفتہ، رفتہ سب دیکھ رہے تھے کہ پورا پاکستان ہی نہیں پوری دنیا کورونا وائرس کی لپیٹ میں آنے لگی تھی۔ طلحہ کا ایڈمیشن آسٹریلیا میں ہوا تھا اور وہ آرکیٹیکچر کے دو سمسٹر کر کے آیا تھا اور اب ائر پورٹ بند ہونے لگے۔ تعلیمی ادارے بند ہو گئے اور اب وہ آن لائن لیکچرز کی تیاری کر رہا تھا۔ نہ زوبیا آئی بی اے جا سکتی تھی اور نہ ہی تانیہ اور زبیر کالج جا رہے تھے۔ گھروں میں قید ہونے کی بار، بار ہاتھ دھونے اور باہر کے لوگوں سے ملنا ملانا ختم کرنے کی یہ صورتِ حال نئی بھی تھی اور بوجھل پن بھی حد سے سوا ہوا تھا۔

امی اور تائی جان سے تو صبر نہ ہو سکا انہوں نے ڈرائیور کو ایک روز بلا کے گھر میں دو مہینے کا راشن ڈال لیا مگر اپنی مرضی سے بیکری جانے اور طرح، طرح کے پکوان خریدنے کی حسرت ہی رہی بازاروں میں تو ہو کا عالم تھا۔ ہر دکان بند اور اکا دکا راہ گیر جو کہیں بھولا بھٹکا نکل آیا وہی دکھائی دے رہا تھا..... چچا جان کو پورے ایک دن کے لیے اسپتال روکا گیا۔ ان کا ٹیسٹ منفی آیا تو بھی گھر کے ڈاکٹر فرازی نے اسپیشلسٹ کی خدمات حاصل کیں..... گھر واپسی پر راستے میں انہوں نے کہا۔

''بس میری دونوں بیٹیاں اپنے گھر کی ہو جائیں پھر مجھے کوئی فکر نہیں..... اب یہ جو وبا آ گئی ہے تو ہر کام چار چھ مہینوں پر ٹل گئے سمجھو.....'' یہ وہ نہیں ایک باپ کا کرب بول رہا تھا۔

''اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی..... آپ کاہے کو فکر کرتے ہیں سب کام وقت پر ہو جائیں گے۔ آپ نے گھر جا کے احتیاط کرنی ہے، وہ میں سب کو بتا دوں گا۔'' فرازی نے جو آج خود بھی حد سے زیادہ تھکے ہوئے تھے بے ربط سے انداز میں اپنی بات مکمل کی۔

دو روز یقین اور بے یقینی کے عالم میں گزرے..... چچا جان کا ٹیسٹ نیگٹو آیا تھا مگر ساتھی ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ ایک اور ٹیسٹ کرنا ضروری ہے۔ فرازی نے طلحہ کو میسج کر دیا تھا کہ ''چچا جان کا ٹیسٹ کلیئر آیا ہے مگر چونکہ یہ دمے کے پرانے مریض ہیں اس لیے گھر پر احتیاط کرنی ہوگی۔ ان کا بخار دن میں دو بار چیک ہوگا۔ بلڈ پریشر، شوگر سب نارمل ہونے چاہئیں..... اور ان کے کمرے میں بلا ضرورت پورا کنبہ نہ اکٹھا ہو..... یہ لاؤنج میں آئیں اور سب کے ساتھ بیٹھیں..... مقوی غذائیں کھائیں گے اور گھر کے اندر ہی واک کرتے ہوئے بھی ماسک پہنے رہیں گے۔ انہیں کوئی مسجد نہ جانے دے..... اب مرد بھی کچھ عرصے کے لیے گھروں ہی میں نمازیں پڑھیں گے۔

ان کے سامنے کوئی مایوسی والی بات نہیں کی جائے..... سنسنی خیز خبروں سے پرہیز ضروری ہے کیونکہ یہ اسپتال میں افراتفری اور لوگوں کو... واویلا کرتا دیکھ کر آئے ہیں۔ کمزور دل والے مریض نہ ہوں تب بھی افسردگی اور پژمردگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ راستے بھر پوچھتے آئے ہیں کہ کہیں مجھے کورونا تو نہیں ہو گیا۔ تم مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے..... ایسا نہیں ہے طبیعت زیادہ بگڑتی تو کیا اسپتال میں نہ داخل کر لیتے..... دمے کے مریض ہیں اس لیے خطرے میں ہیں مگر کورونا کا شکار نہیں ہیں۔'' فرازی نے اہل خانہ کی تسلی کرائی..... اس روز وہ دیر تک چچا جان کے کمرے میں رہے اور پھر سونے چل دیے۔

گھر میں اب سب ایک دوسرے کا خیال رکھنے لگے تھے۔ آخر یہ ایک ڈاکٹر کا گھر بھی تھا۔ تایا جان نے پھر سگریٹ کو ہاتھ نہ لگایا۔ سودا سلف بھی آن لائن آرڈر کیا۔ گھر کی خواتین کہتی رہ گئیں کہ چلے جاتے ہیں مگر فرازی کے ہوتے ہوئے تمام تر احتیاطی تدابیر تو اختیار کرنی ہی تھیں۔

طلحہ نے اپنے کمرے میں نیٹ فلیکس پر ELITE سیریز دیکھنا شروع کر دی تھی۔ چچا جان بڑے پاکستانی ڈراما سیریلز دیکھ رہے تھے یا اپنا اردو کا اخبار پڑھ لیتے۔ تعمیرات کا سلسلہ تو رکا ہوا تھا وہ اپنی زیر تعمیر بلڈنگ کی ویڈیو دیکھ کر افسردہ ہو جاتے مگر پھر وضو کر کے استغفار کی تسبیح کرنے لگتے۔ گھر میں ہر بچہ پنج وقتہ نمازی ہو گیا تھا۔ آن لائن پڑھائیوں کے سلسلے بھی شروع ہو گئے تو سب مصروف ہو گئے۔ گھر میں پکے کھانے بھی شوق سے کھائے جانے لگے۔ تائی اور چچی مل جل کر کبھی ریشمی کباب تو کبھی لبنانی باربی کیو کرنے لگیں۔ ماسک لگائے دستانے پہنے بچے چھتوں پر رات گئے تک بیٹھے ان پکوانوں سے لطف اندوز ہوتے اور پھر ڈاکٹر صاحب کے گھر آنے سے پہلے، پہلے ہر وہ نشانی دھو ڈالتے اور اپنے، اپنے کمروں میں دُبک جاتے۔ فرازی کی ڈیوٹی جب رات کی ہوتی بھی تو وہ دوپہر تک ہی گھر لوٹتے۔ یوں ظہرانے پر انہیں یہ مرغن کھانے پیش کیے جاتے تو انہوں نے آہستہ، آہستہ حیران ہونا چھوڑ دیا۔ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں طلحہ اور زبیر (زوبی) کے چٹورپن سے تو واقف ہی تھے اور یہ بھی اندازہ تھا کہ گھر میں چار خواتین ایسی ہیں جنہیں کوکنگ چینل سے کھانا پکانے کا چسکا بھی لگا ہوا ہے اب اور بیکاری میں کیا کریں..... آج انہوں نے مغلئی ڈش دیکھ کر امی سے کہا۔

''بہت دن ہو گئے آپ نے چھلکے والی مونگ کی کھچڑی نہیں بنائی.....'' امی فوراً اپنی جگہ سے اٹھیں اور دال کا ڈبا کھول کر دیکھنے لگیں کہ مقدار میں ٹھیک ٹھاک ہے بھی کہ نہیں.....

''میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ آپ فوراً بنانے کھڑی ہو جائیں.....'' فرازی کو اپنے کہے پر ندامت سی محسوس ہوئی۔

''کوئی بات نہیں، میں شام تک بنالوں گی..... یہ بچے روغنی کھانے پسند کرتے ہیں ناں اس لیے بھی بنالی اور زوبیا نے لچھے دار پراٹھے اور نان بنانا سیکھ لیے ہیں ناں اس لیے بھی.....'' وہ اپنی صفائی پیش کر رہی تھیں یا بیٹے کا موڈ ٹھیک رکھنا چاہتی تھیں۔

''نان کیسے..... وہ تو تندور میں بنتے ہیں کیا ابو نے پچھواڑے میں تندور پھر آباد کرا دیا۔''

''ہاں بیٹا پہلے تو ہاجراں روٹیاں لگا دیتی تھی اب زوبیا یہ کام کرنے لگی۔ ہاجراں کی تو چھٹیاں چل رہی ہیں ناں..... اور تو اور اب طلحہ بھی اس کے ساتھ، ساتھ ہوتے ہیں باقی سارے فاصلے پر کھڑے ان دونوں کو تندور میں روٹیاں لگاتے دیکھتے ہیں۔ بڑا چمٹا بھی خان چاچا تندور والے سے لے آئے ہیں۔ ان کا تندور تو ساڑھے چھ بجے بند ہو جاتا ہے۔'' اور فرازی دیر تک مسکراتے رہے۔

''ان لوگوں سے کہیں پڑھائی میں بھی دلچسپی لیں۔ حالات معمول پر آتے ہی کام کا بوجھ بڑھ سکتا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے بیٹا مگر تم اپنی صحت کی بھی فکر کرو، تمہیں وہاں حفاظتی سامان اور کپڑے تو ملتے ہیں

ہاں..... ٹی وی پر تو ڈاکٹروں کو احتجاج کرتے دکھایا گیا ہے..... اب تو تم فورسز کی طرح محاذ پر ہو.....'' امی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

''ملتا ہے بالکل ملتا ہے..... ہمارے ٹیسٹ بھی ہوئے ہمارے وارڈ میں کوئی ڈاکٹر پوزیٹو نہیں تھا۔ اس لیے کہ ہمیں بروقت پی پی آئیز مل گئی تھیں۔'' ڈاکٹر فرازی نے اپنی امی کی ڈھارس بندھائی۔

''اور جس کے گھر میں دعائیں دینے والے اتنے لوگ موجود ہوں اسے ڈرنا زیب نہیں دیتا۔'' انہوں نے اپنی بات مکمل کی تو مڑ کے دیکھا چچی امی، زوبیا، تانیہ اور زبیر سب ہی تو کھڑے تھے۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ سب ان کی بات سے متفق بھی تھے اور مرعوب بھی دکھائی دے رہے تھے۔

''باہر جانے کو بہت جی کرتا ہے کب سے برگر نہیں کھایا اور نہ لزانیا.....'' زبیر نے کشن اٹھایا اور صوفے میں دھنس کر بیٹھ گیا۔ یہ فرازی کا سب سے چھوٹا بھائی باہر کے کھانوں کا کچھ زیادہ ہی شائق تھا۔

''یوں تو نہ کہو لزانیا پرسوں بنایا تھا زوبیا نے اور کیا شاندار بنایا تھا تم لوگوں نے منٹوں میں ڈش صاف کی تھی۔'' تائی جی نے زبیر کو یاد دلایا۔

''جی ہاں مگر برگر نہیں بناتی وہ.....'' اور زبیر کا یہ کہنا سب کو ہنسا گیا۔

''وہ بھی بن جائے گا..... کوئی اور فرمائش؟'' زوبیا نے اس کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، فی الحال اتنا ہی.....'' وہ اپنی بات شاید مکمل نہیں کر پایا تھا کہ ڈاکٹر فرازی بول اٹھے۔

''کوئی فرمائش ور مائش نہیں' زوبیا نے اس سال گریجویشن مکمل کرنی ہے..... آپ لوگوں نے اسے تندور میں روٹیاں لگانے اور لزانیے بنانے میں لگا دیا ہے۔'' فرازی بڑے تھے اور رعب داب والی شخصیت کی تو یوں بھی خاندان میں بڑی ساکھ ہوتی ہے۔ کسی نے ان کی بات کا برا نہیں مانا.....

''ویسے بیٹا اپنی مرضی سے ہر کام میں ہاتھ ڈالتی ہے۔ میں بھی کہتی ہوں کہ پہاڑ جیسا دن گزارنے کے بعد اگر تھوڑا بہت گھر کا کام کر لے تو آئندہ دوسرے گھر میں یہ ہنر کام آئیں گے۔''

''میں پڑھتی بھی ہوں بھائی..... ایسا نہیں کہ ہر وقت کچن میں لگی رہوں.....'' زوبیا نے بات کلیئر کر دی۔

چائے اور کافی کا دور چلا اور فرازی اسپتال کی باتیں بھی کرتے رہے۔

نماز سے فراغت کے بعد امی کچھ دیر تک دعائیں پڑھا کرتی تھیں۔ فرازی کچھ دیر بعد ان کے قریب آئے۔

''امی جی ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

''ہاں کہو.....'' امی نے تسبیح ایک طرف رکھ کر اشارہ کیا۔

''زوبیا کے رشتے کا پتا چلایا ہے یہ امید وار تو اچھے کردار اور خلاق کا ہے مگر اس کا ایک بڑا بھائی گردوں کا ڈاکٹر بھی ہے..... آپ نے مجھے اس کا تو بتایا نہیں تھا۔ چچی امی نے بھی ذکر نہیں کیا۔ خیر میرے دوست سلطان، یورولوجسٹ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان کے ماموں جو آئل کمپنی میں ہیں ان کے مطابق یہ خاصے وضع دار اور پروفیشنل آدمی ہیں۔ اپنے حلقے میں با اصول اور اچھے کردار کی وجہ سے مقبول بھی ہیں..... ان کے دو صاحبزادے اور تین بچیاں ہیں۔ بڑا بیٹا گردوں کے امراض اور ان کا ماہر ہے اور لاہور میں پریکٹس کرتا ہے۔ امی آپ کو یاد ہے کچھ عرصہ پہلے اخباروں میں ایک ڈاکٹر کی گردے نکالنے اور بیچنے کے گروہ سے متعلق خبریں آئی تھیں' طارق بھی اس گروہ کا سرغنہ بتایا جاتا ہے۔ چھوٹا ایم بی اے ہے اور وہ بھی اسی آئل کمپنی میں ایک دیانت دار افسر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ چچا جان کو میں یہ سب تفصیلات کیسے بتاؤں..... پہلے ہی ان کی صحت ٹھیک نہیں رہتی..... پتا نہیں چچی امی کا ردِعمل کیسا ہو.....؟''

''میرے خیال میں تو جب تک کورونا کی وبا چل رہی ہے خاموشی اختیار کرنی چاہیے..... زندگی تو ویسے ہی تھمی ہوئی ہے معمولات ٹھیک ہو جائیں تو بتاتے

ہیں، چھپانے سے بھی کیا حاصل.....؟'' امی بھی حوصلہ دے رہی تھیں۔

''ہاں میں سوچتا ہوں کہ اگر میری اپنی سگی بہن ہوتی تب میں کیا کرتا.....؟ ایسے خاندان میں کیسے رشتہ کیا جاسکتا ہے۔'' فرازی نے بڑی ہمدردی سے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا۔ ''لیکن پھر یہ خیال آتا ہے کہ اصل امیدوار تو شریف النفس ہے۔ اسے بھائی کے کیے کی سزا کیوں دی جائے.....؟'' فرازی نے کہا۔

''بہرحال آپ اپنے کسی رویے سے ظاہر نہ کیجیے گا کہ آپ کو کچھ پتا ہے۔'' فرازی نے اب کے امی کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔

''میں تم سے کہنے والی تھی گپ شپ میں کبھی منہ سے کچھ نہ نکل جائے..... دنیا ختم تو نہیں ہوگئی اور زوبیا کی عمر 23 برس ہی تو ہے۔ ہمارے طلحہ سے آٹھ مہینے چھوٹی ہے۔ پڑھائی مکمل کرلے تو کیریئر بھی بن سکتا ہے.....'' امی نے پُرامید نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔

''کس کا کیریئر بن سکتا ہے؟'' عین اسی لمحے طلحہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھے گا۔

''تمہاری بات ہورہی تھی عجیب و غریب یہ وائرس آگیا اور تمہیں تعلیم چھوڑ کے وطن آنا پڑا..... ہم سب چاہتے ہیں کہ تم پڑھ لکھ لو تو..... فیملی بزنس کو آگے بڑھاؤ..... یہ فرازی صاحب تو ڈاکٹر بن گئے، لڑکیوں میں اب تانیہ سے امید ہے شاید آرکیٹکٹ بن جائے۔''

''بس امی جی ہر طرف امید پر دنیا قائم ہے، ایسا وائرس آیا ہے کہ پہلے تو ڈاکٹر اور پیرامیڈیکل اسٹاف ہی محفوظ رہ لیں تو بڑی بات ہے۔'' طلحہ نے دکھ بھرے لہجے میں بڑے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو طلحہ وہ بھی امی کے سامنے.....'' فرازی کو چھوٹے بھائی پر غصہ آرہا تھا۔

''اچھا نہیں کرتا..... یہ بتائیں، آپ کو پرسنل پروٹیکشن کے لیے ضروری سامان بروقت ملتا ہے، آپ کو طویل اوقات میں ڈیوٹی کرنے پر مجبور تو نہیں کیا گیا..... انسان کتنی دیر تک اپنی قوتِ مدافعت پر بھروسا کرسکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے آپ یہ میڈیسن چھوڑیں اور بزنس کیجیے..... جس میں کم از کم رسک تو کوئی نہیں.....'' طلحہ نا معلوم کب سے کرنٹ افیئرز کے پروگرام دیکھ کر بھرا بیٹھا تھا۔

فرازی بڑی خاموشی سے اس کی بات سن رہے تھے۔ امی کو غصہ آرہا ہے یہ بھی وہ دیکھ رہے تھے اور پھر بڑے اطمینان سے بولے۔

''نہیں بھائی اس محاذ پر تو ہم ڈٹ کر موت اور بیماریوں کو شکست دینے کی ٹھان چکے ہیں..... بزنس آپ کیجیے میرا ذہن ایسا بنا ہی نہیں۔''

کلاسیکل تھیم کے اس گھر میں محرابی گزرگاہوں اور برآمدوں میں رات کی رانی، دن کا راجا، موتیا اور بوگن ویلیا کے پودوں نے پیاری سی مہکار بسا کر رکھ دی تھی جیسے ٹھنڈک، سکون اور شانتی سی اتر آئی ہو..... مگر یہ تو گھر کے مکین جانتے تھے کہ اس عالمی وبا کے آنے کے بعد طبیعتیں کس قدر بوجھل تھیں..... گھر میں تایا جان نے دو تین جگہوں پر سنگی (پتھریلی) اور لکڑی کی بینچیں نصب کرائی ہوئی تھیں..... جب تک شامیں ٹھنڈی ہوتیں، سورج اپنی تمازت گم کرتا یہ بینچیں خواتین اور بچوں کا مسکن بن جاتیں..... وہ لوگ کمروں سے باہر آکر کھلی فضا میں اٹھتے بیٹھتے..... آج زوبیا بھی اپنا سیل فون لے کر اسی جگہ آبیٹھی تھی۔ کورونا کے لاک ڈاؤن (تالا بندی) میں انسٹاگرام، یوٹیوب، نیٹ فلیکس اور دیگر سوشل میڈیا ہی انسانوں کے دوست ہوگئے تھے۔ اسی دوران کب طلحہ پشت پر آکر اس کی یہ سرگرمی نوٹ کرنے لگا۔ اسے آہٹ بھی نہ ہوئی۔ وہی چند ساعتوں کے بعد بولا۔

''اچھا..... تو کزن بیوٹی بلاگرز سے میک اپ کرنا سیکھ رہی ہیں۔'' وہ مسکراتا ہوا بھلا لگا۔

''اور کیا کروں..... ایسا لگتا ہے سارے کام کرلیے اور جو نہیں کرنے تھے ظاہر ہے کہ دل اچاٹ ہوگیا اس تنہائی سے وہ کل پر چھوڑ دیے۔''

''اور وہ کل کب آئے گی پوچھا اس سے؟''

''کبھی تو آئے گی کام چور تو نہیں ہوں میں..... یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے..... فرازی بھائی کدھر ہیں؟'' زوبیا نے بات کا رخ پلٹ دیا۔

''مجھے بھی اُن کی فکر ہو رہی ہے۔ رات کو ڈھائی تین بجے ہوں گے جب اسپتال سے لوٹے، باتھ لیا۔ پتا نہیں کچھ کھایا یا نہیں۔ فجر تک تو میں جاگ رہا تھا پھر میری آنکھ لگ گئی اور وہ تکیہ لے کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ جاتے، جاتے کہہ گئے ''میں خود کو Isolate کر رہا ہوں تم اُدھر نہ آنا اب سو جاؤ۔'' طلحہ نے اپنی بات مکمل کر لی اور سامنے والی نشست پر بیٹھ گیا۔

''شاید اسپتال میں ان سے یہ کہا گیا ہوگا..... خود ڈاکٹر ہیں ان کا بھی تو ٹیسٹ ہوا ہوگا ناں۔'' زوبیا نے سیل فون ایک جانب رکھ دیا۔

''کیا، کیا سوچا ہوا تھا..... اس کورونا کی وجہ سے زندگی ہی تھم کے رہ گئی۔'' طلحہ کو اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکنے کا دکھ ہونا فطری تھا۔

''جی اور پتا نہیں کب زندگی قید سے آزاد ہوگی اور دنیا نارمل حالت کی طرف بڑھے گی۔ کتنے ہی کام ہوتے، ہوتے رک گئے۔'' زوبیا نے ایک عام بات کی تھی مگر طلحہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''تمہیں اپنے رشتے کی فکر ہو رہی ہے شاید.....'' وہ درشت لہجہ اختیار کر گیا۔

''نہیں..... نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔'' وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر بولی۔

''اور کیا مطلب تھا؟ چچی جان کو الگ تمہاری شادی کی فکر ستا رہی ہے۔ فرازی بھائی الگ لڑکے کے خاندان کی معلومات کراتے پھر رہے ہیں..... چچا میاں کی صحت کی فکر ہے کسی کو..... نہ ہوتے فرازی بھائی ڈاکٹر تو پتا نہیں کیا ہوتا۔''

''طلحہ پلیز بس کریں..... سب نیچرل باتیں ہیں..... میں بیٹی ہوں..... ابو کی فکر کسے نہیں..... آپ کی ناراضی کی وجہ؟''

''میں نہیں ہونے دوں گا یہ رشتہ۔ نہیں ہونے دوں گا کسی اور کی۔ یاد رکھنا زوبیا لاکھ فرازی بھائی نہیں تب بھی نہیں۔''

''گھر میں سب کزن میرجز کے خلاف ہیں، خاص کر فرازی بھائی، تایا جان اور شاید تائی بھی کیونکہ یہی حقیقت ہے۔ سائنس ہے، اسے کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے۔'' زوبیا نے ہمت کر کے بات مکمل کر لی۔

''فرازی بھائی بھی تو پھپھو کی سائرہ کو پسند کرتے ہیں جو ڈیسنٹ ہے گھنٹوں اُن سے باتیں کرتے ہیں۔''

''طلحہ..... میڈیسن ایک مشترکہ دلچسپی کا شعبہ ہے ان کا..... دونوں اپنے پروفیشن کی معلومات شیئر کرتے ہوں گے۔ کزن سے گھنٹوں باتیں کرنے کا ایک ہی مطلب نہیں لیا جانا چاہیے۔ کبھی گھر میں انہوں نے ظاہر تک نہیں کیا پسندیدگی کا، آپ اتنی بڑی بات ابھی نہ کیجیے۔ دونوں خاندانوں کی طرف سے بھی کوئی جھکاؤ یا دباؤ والی بات نظر نہیں آتی۔'' زوبیا نے اپنی بات کہہ تو لی مگر طلحہ کے چہرے کا رنگ اب بھی سرخ تھا۔

''ایک بات اور..... یہ رشتہ میری کسی وابستگی یا انسیت کی وجہ سے نہیں آیا جو میری اولین ترجیح بنا ہو، مجھے ابھی MBA بھی کرنا ہے۔ میں ذہنی طور پر ابھی تیار ہی نہیں کسی رشتے کے لیے۔''

''تم خوب پڑھو..... میں بھی اپنی تعلیم مکمل کر کے فیملی بزنس میں آسکا تو ٹھیک ورنہ باہر ہی کام کر لوں گا بس تم میری ہی رہنا کیا سمجھیں؟'' اس کی آنکھوں میں امید کے دیے ہی نہیں شبنم کے موتی بھی تیر رہے تھے۔

''وہی جو آپ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' زوبیا ہنس دی تاکہ صورتِ حال مزید گمبھیر نہ ہو۔

جب تک وہ بینچ سے اٹھ کر کھڑی نہ ہوئی وہ اسے التفات بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پہلی بار زوبیا کو وہ بہت اچھا لگا۔ اپنا، اپنا تو ہمیشہ سے لگتا تھا۔ بچپن اسی جگہ ایک ساتھ گزرا تھا۔ عمروں میں بہت فرق بھی نہیں تھا مگر جب سے وہ قد نکال کے امی کے برابر کھڑی ہوئی تھی کچھ امی کے کہنے پر اور کچھ خود اس کے اندر سے شرم و حیا پھوٹنے لگی تھی۔ فرازی بھائی نے سارے گھر

والوں کو یخ ٹھنڈا پانی پینے سے منع کر رکھا تھا مگر آج اس کا دل چاہ رہا تھا گلاس بھر کے پانی پیے مگر امی نے فریج میں پانی کی کوئی بوتل رکھی ہی نہیں تھی اور ڈسپنسر بھی آن نہیں تھا کہ وہیں سے وہ ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر لیتی طوعاً و کرہاً سادہ پانی ہی پی کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ مغرب کی اذان تک وہ کمرے ہی میں قید رہی۔ شام کی چائے کا وقت بھی گزرنے لگا تو امی نے اسے پکارا۔

''کہاں ہو بھئی کیا آج چائے نہیں بنے گی؟''

''میرا خیال تھا آپ تائی جی کے ساتھ پی چکی ہوں گی۔'' زوبیا نے کچن کا رخ کیا۔

''میں گئی نہیں ان کی طرف، سپیارہ پڑھ رہی تھی وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔'' نماز سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے نیوز چینل لگا لیا۔ اتفاق سے اس وقت کورونا سے جاں بحق ہونے والے ڈاکٹرز کی خبر چل رہی تھی۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ گھر میں دو ڈاکٹر موجود تھے۔ نند کی بیٹی سائرہ کہنے کو تو ڈینٹسٹ تھی مگر واسطہ تو اسپتال سے پڑتا تھا اِدھر فرازی تو ENT ہی کے شعبے سے وابستہ تھے۔

''اللہ سب بچوں کو، مریضوں کو اپنی امان میں رکھے۔ میرے اللہ ہم پر رحم کر دے۔'' وہ گڑگڑا کر دعا کر رہی تھیں۔

دو دن بعد عزیز صاحب کے یہاں سے کال آئی، وہ خاتون زوبیا کی امی سے رشتے کی بابت بات کر رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ''ہم آپ کو بچے سے متعلق تفصیل دے کے گئے تھے کیا آپ نے پتا کروا لیا، اب ہم کب باقاعدہ رشتہ لے کر آئیں۔'' چچی گھبرا گئیں انہوں نے لاک ڈاؤن کا بہانہ کر کے دو چار روز میں بتانے کو کہا اور اب وہ کتنی ہی دیر سے سوچ رہی تھیں کہ فرازی کو کتنی خوشی ہوئی تھی رشتے کا سن کر مگر اس نے پھر کوئی پیش رفت ہی نہ کی۔ نہ جانے کیا فیصلہ کیا اور کیا کرنا چاہیے۔ زوبیا کے ابو اور ان کے جیٹھ تو اب گھر ہی کے ایک کونے میں ہوم آفس بنا کے بیٹھے ہوئے تھے۔ باہر تو فرازی ہی جاتے یا پھر باہر سے ماسی اور آن لائن گروسری والے آیا کرتے۔ یہ عورتوں کے کام تھے ہی نہیں۔ فرازی نے اب تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ جیٹھانی کے پاس گئیں اور ان سے خاتون کی کال کا ذکر کیا۔ انہوں نے اس صورتِ حال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''فرازی جاگتا ہے تو پوچھتی ہوں اس نے کچھ بتایا نہیں اصل میں انہی دنوں وائرس آ گیا تھا۔ ڈاکٹر لوگ اس میں لگ گئے تم دیکھ رہی ہو اسے ہمارے درمیان اٹھنے بیٹھنے کی فرصت تک نہیں رہی، ہر وقت کورونا سوار رہتا ہے اس کے سر پر۔''

''جی بھابی نیچے بھی ان کا ٹمپریچر اور بلڈ پریشر دیکھنے آتا ہے تو زیادہ بات نہیں کرتا بس احتیاطی تدابیر ہی کا کہتا رہتا ہے۔ پانچ مہینے ہونے کو آ رہے ہیں، زندگی رک سی گئی ہے۔ دیکھیے رمضان اور عید بھی اسی کی نذر ہو گئے۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ بھی دوسری بیماریوں کی طرح اب انسانوں کے درمیان ہی رہے گا۔ ہمیں ہی طرزِ زندگی بدلنا ہو گا۔ زندگی کے کام تو کرنے ہی ہیں بچوں کی ذمے داریاں بھی ہمارے سر پر ہیں۔'' وہ فکرمند نظر آ رہی تھیں بیٹیاں دو ہوں، ایک ہو یا سات، ماؤں کی فکریں اسی طرح حد سے سوا ہوتی ہیں۔

دوپہر میں جب فرازی جاگے اور کھانے کی میز پر آئے تو امی نے رشتے کا تذکرہ شروع کیا۔ طلحہ لاؤنج میں نیٹ لیکس پر ترکی ڈراما دیکھ رہا تھا۔ اس نے آواز دھیمی کر دی مگر اس کی توجہ مکمل طور پر اسکرین پر تھی۔

''کیا بتاؤں میں تمہاری چچی کو..... وہاں سے جواب مانگا جا رہا ہے۔ شام تک جواب دے دو پھر جو ان کی رائے ہے ویسا کر لیں۔''

''امی..... میں نے آپ کو بتایا تھا ناں..... ہاں کی تو پھر گنجائش رہتی ہے کوئی؟'' وہ بولے۔

''بیٹا کل تمہاری امی نے جو بات بتائی، میں تو حیران ہوں سن کر..... ایسے لوگوں میں رشتہ کرنا مناسب کیسے ہو گا..... چلو بھائی صاحب سے مشورہ کرتے ہیں۔'' ابو نے کہا۔

''ابو میرے خیال میں چچا جان نے بڑی آس لگائی ہوئی ہے، وہ مایوس ہوں گے اور میں نہیں چاہتا کہ جب تک وہ صحت یاب نہ ہو جائیں انہیں افسردہ کرنے والی کوئی بات بتائی جائے۔'' فرازی نے گھبرا کر ابو کو دیکھا۔

''دمہ آج کل تو نارمل ہے بخار بھی نہیں اور کھانسی بھی بلغم والی نہیں۔ دوا تو چل رہی ہے پھر بھی اگر تم مناسب نہیں سمجھتے تو زلیخا سے کہہ دیتے ہیں۔'' انہوں نے بھابی زلیخا کا نام لے کر رائے دی۔

''جی ہاں ان سے کہا جا سکتا ہے..... پھر بھی میرے پروفیشن میں دانش کے بڑے بھائی ڈاکٹر فیضان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔''

''ہو سکتا ہے زلیخا اور بھائی صاحب اس بات پر معترض نہ ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بڑے بھائی سے قطع تعلق کر چکا ہو۔'' امی نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔

''تم بیٹا ساری صورتِ حال ان سے بیان کر دو پھر جو وہ چاہیں فیصلہ کر لیں۔ زوبیا کی عمر ہی کیا ہے اور پڑھ بھی اچھا رہی ہے۔ سلیقہ شعار ہے۔ پروفیشن اور گھر کو اچھی طرح سے manage کر سکتی ہے پھر اتنی جلدی کیوں کی جائے شادی میں۔'' ابو نے اپنا ووٹ زوبیا کے بیلٹ بکس میں ڈال دیا تب ہی زوبیا کا ذکر سن کر طلحہ نے ٹی وی آف کیا اور میز کی جانب چلا آیا۔

''صاحب زادے آن لائن کلاس لے لی آپ نے؟'' ابو نے طلحہ کو آتے دیکھا تو موضوع بدل لیا۔

''جی پاکستانی وقت کے مطابق صبح 4:30 بجے ہوتی ہے۔ ابو پاکستانی بچوں کو اگلے مہینے واپس بلانے کی خبریں بھی آ رہی ہیں۔'' وہ گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے بتا رہا تھا۔

''فی الحال نہیں..... ابو اسے واپس نہ بلا لیں۔ باہر تو ہیلتھ رسکس بہت ہیں۔'' فرازی نے رائے دیتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں رسکس تو سارے یہاں ہیں کورونا کی سیاست سے ہی فرصت نہیں لوگوں کو..... آپ اپنی طرف ہی دیکھ لیں کتنے نڈھال اور ناامید سے نظر آ رہے ہیں باہر ڈاکٹرز کو مکمل ایس او پیز ملتی ہے۔''

''صاحب زادے! آپ زیادہ نہیں جانتے بہتر ہے کہ اپنی پڑھائی ہی پر توجہ رکھیں۔'' فرازی نے بڑا بن کر چھوٹے بھائی کو چپ کرانا چاہا۔ ابو مسکراتے ہوئے کھانا کھانے لگے اور فرازی تیار ہونے اپنے کمرے میں چل دیے۔

''وہ سمجھدار بچہ ہے تم اپنی رائے ذرا کم دیا کرو سمجھے۔''

واک کرتے ہوئے گفتگو کرنے سے اجتناب کیجیے

واک کرتے ہوئے چیونگ گم چبانا یا میوزک تو سنا جا سکتا ہے لیکن واک کرتے ہوئے ''ٹاک'' کرنا ہرگز درست نہیں۔ کیونکہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں فعل انجام دینا خطرناک قسم کی تکلیف یا بیماری پیدا کرنے کے باعث بن سکتے ہیں۔ حالیہ ریسرچ کے مطابق گفتگو کرنے اور سانس لینے کے عمل کو دماغ کا ایک ہی مخصوص حصہ کنٹرول کرتا ہے۔

لہٰذا کسی ایک عمل پر زیادہ توجہ مرکوز ہونے کے باعث دوسرے عمل سے توجہ خود بخود ہٹ جانا فطری سی بات ہے جو چوٹ لگنے کے امکانات میں اضافے کا باعث بن سکتا ہے۔ واک کرتے ہوئے موبائل پر گفتگو کرنے والوں کے لیے یہ یقیناً ایک بری خبر ہے کیونکہ ایک ہی وقت میں دو مختلف سرگرمیاں انجام دینے کی وجہ سے سینٹرل نروس سسٹم (central Nervous system) موصول ہونے والے پیغامات کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے جس کی بنا پر معدے کے پٹھے ریڑھ کی ہڈی کی حفاظت کرنے میں ناکام ہو سکتے ہیں اور یہ صورتِ حال یقیناً کمر کی تکلیف پیدا کرنے کے ساتھ اسے ناکارہ بنانے کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

از: فضہ بتول، بہارہ کہو

امی نے طلحہ کے رویے کو ناگواری سے محسوس کیا تھا۔

شام کو نیچے دالان میں بزرگوں کی بیٹھک سجی اور زوبیا کے رشتے کی بابت بات چیت ہونے لگی۔ چچی امی اور چچا جان دونوں فرازی کی معلومات سن کر پریشان سے ہو گئے تھے۔ فرازی خود تو اسپتال جا چکے تھے۔ چچی امی نے کہا۔

''میں صبح فرازی سے بھی ایک مشورہ کرلوں پھر فیصلہ کروں گی۔''

''اس بات کو ختم ہی کر دیا جائے۔'' چچا جان بولے۔

''ایک بچے کی غلطی یا جرم کی سزا دوسرے بچے کو دینا ٹھیک نہیں ہوگا۔ ماں باپ تو شریف النفس اور نستعلیق ہیں۔ دوسرا بچہ تو اچھی جاب پر بھی ہے اور دین دار بھی ہے۔ اس نے عمرہ بھی کرلیا ہے والدین کو حج بھی کرا دیا ہے۔ دو بہنوں کی شادی میں بھی والد کا ہاتھ بٹا دیا ہے اور کیسے ہوتے ہیں سعادت مند بچے۔'' تائی کہہ رہی تھیں۔

''ابھی وہ چھوٹی ہے BBA کیا ہے اس کا MBA بھی ہو جانے دیں کوئی کیریئر بھی بن جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ رشتے تو اور بھی آئیں گے۔'' تایا جان کا کہنا تھا۔

اس طرح عجیب کھچڑی سی پک رہی تھی۔ فرازی کے آنے تک یہ لوگ اپنی محفل برخاست کر کے روزمرہ کے کاموں میں جت گئے تھے۔ فرازی آئے تو فریش ہو کر چچا جان کے کمرے میں گئے۔ ٹمپریچر ٹھیک تھا۔ نبض بھی نارمل مگر چپ، چپ سے تھے جیسے کسی سوچ کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبے ہوں اور فرازی نے آکر پریشان کر دیا ہو۔

''کیا بات ہے چچا جان..... موڈ ٹھیک نہیں..... آپ نے ارطغرل غازی کی نئی قسط دیکھی یا 60 دہائی کے آشا بھونسلے کے گانے نہیں سنے آج؟'' وہ انہیں مسکراتا دیکھنا چاہتے تھے۔

''آج کسی چیز میں دل نہیں لگا..... زوبیا کے رشتے کی تفصیل سنی دکھ ہوا بیٹا، میں تو سمجھا تھا بڑا گوہرِ نایاب مل رہا ہے مجھے.....'' چچا جان نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

فرازی کا دل چاہا کہ انہیں دلاسا دے اور کوئی اچھی بات کرے مگر اچھی بات کیا ہو سکتی تھی یہ سمجھ سے باہر تھا۔

''آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں..... اگر جی مانتا ہے تو ہاں کر دیں، نہیں مانتا تو بھی ہماری زوبیا بہن کی کون سی عمر نکلی جا رہی ہے اچھے رشتے بھی آئیں گے..... اسے پڑھنے کا شوق ہے پڑھ بھی لے گی۔''

''تم سب ایک ہی بات کرتے ہو..... اب تمہاری چچی تم سے مشورہ کرنے کو بے چین ہے بار، بار گھڑی دیکھ کر تمہارے آنے کا وقت پوچھ رہی ہیں جاؤ اسے مطمئن کرو، تو بات ہے۔'' اب چچا جان مسکرا دیے۔

''جی میں ملتا ہوں..... ابھی تو فریش ہو کر آپ کے پاس آ گیا۔'' فرازی نے کہا۔

''ہاں، ہاں تم تو ڈاکٹر ہو بھئی..... اپنا خیال نہیں رکھو گے تو ہمارا کیسے رکھو گے۔'' چچا جان مسکرا دیے۔ وہ فرازی کو دیکھ کر کھل سے جاتے تھے اور آج بھی ان کا موڈ اسی لیے بہتر ہوا تھا۔

سیڑھیوں پر پہلا قدم رکھتے ہی چونکے۔ طلحہ، چچی جان سے کہہ رہا تھا۔

''میں یہ رشتہ نہیں ہونے دوں گا اگر فرازی بھائی اس کے حق میں ہوں تب بھی نہیں..... زوبیا میری ہے اور میری ہی رہے گی۔ میں آج امی اور ابو سے بھی کہہ چکا اور سن لیں آپ بھی۔'' وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ بالکل بچوں کی طرح جس طرح بچپن میں اپنی کوئی چیز کسی کی دسترس میں جاتا دیکھ کر تلملا اٹھتا تھا اور پورے زور سے اپنا کھلونا لے کر بھاگ جاتا تھا۔ فرازی کو اس کا بچپن یاد آ رہا تھا۔ مگر اب وہ جوان سال تھا زوبیا سے چند ماہ بڑا مگر تعلیم ادھوری، مستقبل غیر محفوظ، لاابالی پن الگ، یہ سب ہوتے ہوئے اتنا بڑا فیصلہ اکیلے تن تنہا کر چکا تھا۔

''طلحہ بہت بڑا ہو گیا ہے امی۔'' اور وہ ساری روئداد سنانے لگے جو وہ چچی امی کے فلور پر سن کر آ رہے تھے۔

''ہم سب کزن میرجز کے مخالف ہیں مگر وہ نہیں مانتا۔ ضدی ہے میں کیا کروں اس لڑکے کا؟'' امی نے

زچ ہو کر کہا۔

''کچھ بھی کریں اسے پڑھنے دیں..... اگر پڑھ لے گا سنجیدہ ہو گا تو دیکھا جائے گا۔ ابھی تو گھر میں محصور ہے۔ سامنے زوبیا ہی نظر آ رہی ہے اور عمر بھی ایسی ہی ہے۔ اگر باہر نکلے گا دنیا دیکھے گا تو ازدواجی تعلق کے لیے اس کا نظریہ بھی تبدیل ہو گا اور ممکن ہے کہ پھر کوئی اور لڑکی اسی شدت سے بھا جائے۔'' فرازی نے کٹلس اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو ناں زلیخا اور بھائی صاحب یہ نہیں کہیں گے کہ اصل جوڑ تو فرازی سے بنتا ہے اگر کرنی ہے تو بڑے بیٹے سے کریں جو اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔'' امی نے بھولپن میں بڑی گہری بات کر دی تھی۔

''امی..... میں ابھی کہاں پیروں پر کھڑا ہوں نہ میں زوبیا یا کسی لڑکی میں دلچسپی ہی رکھتا ہوں۔ مجھے اسپیشلائزیشن کے لیے باہر جانا ہے، میں تو اپنی تعلیم کے پیسے اکٹھے کر رہا ہوں مجھے تو بھول جائیں۔'' فرازی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''مجھے پتا نہیں کیوں ایک دم سے سائرہ اچھی لگنے لگی ہے تمہاری پھپو مان جائیں گی بیٹا، اگر کو تو.....'' امی پھر بولیں۔

''نہیں..... بالکل بھی نہیں..... میں تو ابھی شادی کے لیے سنجیدہ ہوں ہی نہیں۔ یہ کورونا تو لمبا چلنے والا ہے اور پتا نہیں آگے کیا ہو گا میں رہوں گا بھی یا نہیں۔'' فرازی نے ہنستے ہوئے آخری جملہ ادا کیا اور امی کی آنکھیں بھر آئیں۔

''کیا بات ہے..... آپ کو زوبیا پسند نہیں؟'' فرازی نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی۔

''نہیں، وہ بات نہیں..... مگر تم ڈاکٹر ہو اور ڈاکٹر آج کل محاذ پر جنگی کیفیت میں ہیں۔ میں تمہیں کھونا نہیں جھیل سکوں گی۔''

''امی ساجی دوری کا احساس نہ ہوتا تو اس بات پر آپ کے گلے لگتا، آپ کو پیار کرتا۔'' فرازی نے شوخی بھرے لہجے میں کہا۔

''بھائی آج تو ایسی او پیز کور ہنے ہی دیں لگ جائیں گلے کہ پھر یہ ملاقات ہو نہ ہو۔'' طلحہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔

''صاحب زادے، آپ یہ کیا فرمان جاری کرتے پھر رہے ہیں نیچے سن کر آ رہا ہوں۔'' انہوں نے طلحہ کو مسکراتی آنکھوں سے دیکھا۔

''بھائی میں سنجیدہ ہوں اور آنے والے اچھے وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''تو پھر بیٹے جی صبر سے کام لیجیے..... چچا جان، چچی اور زوبیا سے پہلے اپنے ابو، امی سے اجازت لی آپ نے۔ یہ کوئی بچوں والی بات نہیں کہ فلاں کھلونا دلا دیجیے اچھا لگ رہا ہے۔'' فرازی نے چھوٹے بھائی کو ہلکے پھلکے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

چند برس بعد کی آس پر ایک ایسے رشتے کے لیے نہ کرنا چچی اور چچا جان کے لیے امتحان تو تھا مگر وہ یہ جانتے تھے کہ طلحہ مستقبل میں کچھ ذمے دار نہیں ہو سکتا۔ چچی جان نے اب کی مرتبہ بھی فرازی ہی سے طلحہ کے بارے میں رائے پوچھی یہ کتنی عجیب بات تھی مگر یہ ہو گئی۔

''دیکھ لیجیے بچہ آپ کے ہاتھوں میں پلا بڑھا ہے اور زوبیا کے لیے سنجیدہ بھی بہت ہے۔'' فرازی مسکرا کر کہہ رہے تھے۔

''تو پھر دانش کی امی کو منع کر دوں؟'' وہ ہنس دیں۔

''جیسے آپ کی مرضی..... مگر ایک اور بات بھی سن لیجیے۔ ان دونوں کے نکاح سے پہلے بلڈ ٹیسٹ کرواؤں گا۔ اگر اونچ نیچ ہوئی تو قصہ ختم سمجھیے۔'' فرازی نے ڈاکٹر بن کر اپنے خاندان کو مستقبل میں پیش آنے والی ہر بری صورت حال سے بچا لینا چاہا تھا۔ بڑوں کے بھی مائنڈ سیٹ ہونے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اب طلحہ بلڈ ٹیسٹ کلیئر کرانے کی دن رات دعائیں کرتا پھر رہا تھا اور چچا، چچی قدرے پُرسکون ہو گئے تھے۔ فرازی نے ڈاکٹر ہونے کی ذمے داری ادا کر دی تھی۔

❁❁❁

ناولٹ

آپا

غزالہ عزیز

شام کا جھٹپٹا لمحہ لمحہ اردگرد کے ماحول میں پھیل رہا تھا۔ شاہ خاور بھی رختِ سفر باندھنے کی تیاری میں مصروف تھا۔ پرندے اپنی، اپنی منزل کو اڑان بھر رہے تھے۔ صحن میں لگے انواع واقسام کے پودوں اور بالخصوص نیم کے تناور درخت کے پتوں سے ٹکراتی سرسراتی ہلکی، ہلکی ہوا فضا میں تھوڑی خنکی پیدا کررہی تھی اور وہ اردگرد کے فسوں خیز ماحول سے بے نیاز برآمدے میں رکھے تخت پر بیٹھا صحن میں لگے نیم کے اس پیڑ کو ٹکٹکی باندھے تک رہا

تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ قریباً پندرہ برس قبل اس نے آپا کے ساتھ مل کر اپنے چھوٹے، چھوٹے ہاتھوں سے ایک ننھے سے پودے کو لگایا تھا۔ اور سالوں اس کی کسی نومولود کی طرح پرورش اور دیکھ ریکھ کی تھی۔ تب کہیں جا کر آج وہ ننھا سا پودا بھرپور تناور درخت بن کر اپنی راحت آمیز ٹھنڈی اور مصفا چھاؤں فراہم کر رہا تھا۔

اس درخت کے ساتھ اس کی زندگی کی بہت سی یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ جو بہت تلخ بھی تھیں اور شیریں بھی..... مگر اسے صرف وہ کڑا وقت ہی یاد رہ گیا تھا۔ جس کی سختی جھیل کر شاید وہ بھی ایک سخت چٹان کے مانند پتھریلے وجود کا مالک بن جاتا..... لیکن آپا کی نرم آغوش، ان کی بھرپور توجہ و محبت اور پُرخلوص ساتھ نے اسے نرمی سے پگھلا کر موم بنا دیا تھا۔ لیکن وہ کڑا وقت زندگی کے کچھ خوشگوار پہلوؤں کے باوجود جو اس کی ذات سے منسلک تھے، اسے بھولتا ہی نہیں تھا۔ آج پندرہ سال بعد جب وہ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ آپا کی مسلسل توجہ، محنت اور خلوص کی گرمی سے ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ جس کی چھاؤں میں بیٹھنے کا سب سے زیادہ حق آپا کا ہی بنتا تھا۔ اور وہ یہی سب سوچ کر آیا تھا کہ آپا کو اب ان کی عمر بھر کی قربانیوں اور خلوص بھری محبتوں کا خراج ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ سو وہ انہیں اپنے ساتھ ایبٹ آباد لے جائے گا۔ جہاں اس کی پوسٹنگ ہوئی تھی۔ لیکن آپا کی ''شرط'' نے اسے ماضی کے تکلیف دہ منظروں میں دھکیل دیا تھا۔ ہاں اسے سب یاد تھا ذرا، ذرا.....

☆☆☆

قیامت سی قیامت تھی..... اگر قیامت برپا ہونا کسی بہت بڑے حادثے یا سانحے کے ہو جانے کو کہتے ہیں تو وہ دردناک لمحہ ان کے سروں پر آن پہنچا تھا۔ موت پیچھے رہ جانے والوں کو ہمیشہ بہت بے رحم اور ظالم لگتی ہے۔ اور یہ ظلم اس نے خود پر جھیلا تھا۔ ابا بہت زیادہ بیمار ہو گئے تھے۔ حالانکہ بیماری بہت بڑی نہ تھی۔ صرف بخار ہی ہوا تھا جو شاید نمونیا میں بدل گیا تھا۔ محلے کے ڈاکٹر سے ان کا علاج بھی چل رہا تھا۔ لیکن گزرتے لمحوں اور دنوں کے ساتھ ابا کی طبیعت میں سدھار نہیں آ رہا تھا اور آپا نے پریشان ہو کر کراچی میں مقیم بڑے بھیا کو فون کر دیا تھا تاکہ وہی آ کر ابا کو کسی بڑے اسپتال میں داخل کروا کر مناسب علاج کرواتے۔ وہ دس، بارہ سالہ احمر کے ساتھ ابا کو لے کر اکیلی کیا، کیا کرتیں..... لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ جس شام بڑے بھیا اپنی بیگم کے ساتھ لاہور پہنچے تھے۔ ابا کی حالت پہلے سے زیادہ بگڑ چکی تھی۔ قضا کا فرشتہ اپنے راہی کو اپنے پروں میں سمیٹ کر ساتھ لے جانے کو پرواز کے لیے اڑان بھر چکا تھا۔ بس کچھ دیر یا لمحوں کی بات تھی۔ اور وقت کے وہ دردناک لمحے منحوس سایہ بن کر گھر کے در و دیوار پر پھیلتے جا رہے تھے۔ عجب سوگوار سی فضا تھی..... بڑے بھیا اور بھابی اندر کمرے میں جانے کن مذاکرات میں مصروف تھے۔ حالانکہ آپا اور وہ تو چاہتے تھے کہ فوری طور پر ابا کو کسی بڑے اسپتال لے جایا جائے۔ آیا بیڈ پر لیٹے نیم جاں ابا کا سر اپنی گود میں رکھے سرہانے بیٹھی آیات قرآنی کا ورد کر رہی تھیں اور وہ بیڈ کراؤن کے ساتھ لگا کھڑا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ ابا کی روح قفسِ عنصری سے پرواز بھرنے کو تھی۔ مگر دم ابھی حلق میں اٹکا تھا۔ جانکنی کا عالم تھا۔ شاید جب جسم سے جان نکلنے لگتی ہے۔ روح بدن سے کھینچی جاتی ہے تو انسان ایسے ہی اذیت اور کرب میں مبتلا ہوتا ہو۔ یہ تو موت کی اذیت سہنے والا ہی جانتا ہوگا۔ مگر آپا تو ابا کی یوں بگڑتی حالت دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھی تھیں۔ وہ ابا کا سر تکیے پر رکھ کر ان کا ہاتھ احمر کے ہاتھ میں دے کر بدحواسی سے بڑے بھیا کے کمرے کی جانب بھاگی تھیں۔ اور وہ آنے والے بے رحم لمحوں سے بے خبر ابا پر جھکا خوفزدہ لہجے میں کانپتی، لڑکھڑاتی زبان سے بس ایک ہی جملہ ادا کرتا جا رہا تھا۔

''ابا آنکھیں کھولیں..... کیا ہو رہا ہے آپ کو..... آپا بس ابھی ڈاکٹر کو بلوا لیتی ہیں..... آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔''

اس نے ابا کی کھلتی بند ہوتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا تھا۔ مگر ابا کی متلاشی نگاہیں

شاید آپا کو ہی تلاش رہی تھیں۔ وہ وقتِ رخصت صرف انہیں ہی دیکھنے کے متمنی تھے۔ زیست کے آخری لمحوں میں جب ابا کی روح جسم سے آزاد ہو کر افق کی جانب پرواز کرنے کو تھی۔ اس وقت انہیں ابا کے پاس ہونا چاہیے تھا مگر وہ بدحواس ہو چکی تھیں۔ اگر ہوش مند ہوتیں تو کبھی ان آخری لمحوں میں ابا کو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا چھوڑ کر ڈاکٹر کو بلوانے کے لیے بڑے بھیا کو آوازیں دیتی نہ بھاگتیں..... ابا کے پاس ہی بیٹھی رہتیں مگر انہیں کیا خبر تھی۔ موت تو گھات لگائے بیٹھی ہے۔ ان کے ابا کے پاس سے ہٹتے ہی اپنا وار کر ڈالے گی۔ کاش وہ وہاں سے اٹھ کر نہ جاتیں۔ تو وہ آخری لمحے جو ان کی زیست کے باقی تھے۔ اس وقت اپنی بند اور کھلتی آنکھوں سے آپا کے وجود کو تلاشتے نہ رہ جاتے۔ جانے آپا کو ادراک کیوں نہ ہو سکا کہ ابا کو اب کسی طبیب کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ وہ تو آخری دم تک بس یہی سمجھتی رہیں کہ ابا ٹھیک ہو جائیں گے۔ وہ اپنی دن رات کی تیمارداری سے بالآخر انہیں ٹھیک کر لیں گی۔

شاید آپا کو نہیں پتا تھا کہ تقدیر کے آگے سب تدبیریں بالآخر ناکام ہی ٹھہرتی ہیں..... ہوتا وہی ہے جو ازل سے انسان کے نصیب میں لکھ دیا جاتا ہے۔ زمین پر اس نے کتنے ماہ و سال، کتنے دن، لمحے بسر کرنے ہیں۔ یہ سب طے شدہ ہے۔ ابا کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ وہ پلٹ، پلٹ کر آپا کو آوازیں دیتا رہا۔ اور آپا روتی، کرلاتی بڑے بھیا کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں جو اس وقت نہ جانے کہاں تھے..... اور جب وہ بڑے بھیا کو ڈھونڈنے ..... میں کامیاب ہوئیں تو دس سالہ احمر کی دلدوز چیخوں نے انہیں دہلا کر الٹے پاؤں ابا کے کمرے کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ احمر کی گود میں سر رکھے ابا ابدی نیند کی وادی میں اتر چکے تھے۔ آخری سانسوں میں انہیں صرف آپا ہی کا انتظار تھا تب ہی تو آپا کے کمرے میں واپس پہنچتے ہی ابا نے آنکھیں موند لیں۔

ننھے احمر نے موت کو کبھی اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی روتے لرزتے ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ اور بت بنی آپا کھڑے قد سے ڈھے گئی تھیں۔ جب ہوش میں آئیں تو ابا اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے کو تیار تھے۔ بڑی مشکل سے رشتے دار خواتین نے آپا کو سنبھالا تھا اور وہ پھر زیرِ لب قرآنی سورتوں کا ورد کرتی جاتیں اور آنکھیں سمندر بنی اشک بہاتی جاتی تھیں۔

بڑے بھیا شادی کے کچھ عرصے بعد ہی کراچی شفٹ ہو گئے تھے۔ جہاں بیوی کا سارا میکا آباد تھا۔ بڑے بھیا نے وہیں اپنے سالے کے ساتھ اپنا بزنس سیٹ کر لیا تھا۔ اور پیچھے کمزور و ناتواں ابا، آپا اور دس سالہ احمر کے ساتھ اکیلے رہ گئے تھے۔ احمر کی پیدائش پر ہی اماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ آپا نے ہی ننھے بھائی کو سنبھالا تھا۔ گھر کے ساتھ ابا اور بھائی کی دیکھ بھال کی ذمے داری اٹھالی تھی۔ اپنی پڑھائی چھوڑ کر پرائیویٹ ہی گریجویشن کیا تھا۔ البتہ اتنے سالوں میں بڑے بھیا نے پلٹ کر پیچھے رہ جانے والوں کی خبر تک نہ لی تھی۔ یا پھر بھابی نے ہی اپنے بکھیڑوں میں الجھا کر انہیں کچھ یاد رہنے ہی نہیں دیا تھا کہ وہ پیچھے سگے خونی رشتوں کو..... بے سہارا چھوڑ آئے ہیں۔ جوان بہن، بوڑھا باپ اور چھوٹا بھائی۔ کیا انہیں بڑے بیٹے کی سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور اِدھر ابا کی غیرت نے بے حس اور خود غرض بیٹے کی خوشامد کرنا گوارا نہ کیا۔ حالانکہ اب اس عمر میں انہیں سہارے کی ضرورت تھی مگر شاید خون کا سفید ہو جانا اسی کو کہتے ہیں۔

وہ رات گئے تک آپا کی گود میں سر چھپائے سسکتا رہا تھا پھر جانے کب اسے نیند آ ہی گئی تھی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ جب اس کی آواز ہلکے سے شور کی آوازوں سے کھلی تھی۔ وہ آپا کو اپنے پاس نہ پا کر گھبرا کر اٹھ کر بیٹھا تو اندازہ ہوا کہ آوازیں ابا کے کمرے سے آ رہی تھیں۔ نیند سے جاگنے پر اسے اکیلا پن محسوس کر کے خوف سا محسوس ہوا تو اٹھ کر وہ ابا کے کمرے کی طرف بڑھا۔ جہاں بڑے بھیا، بھابی اور آپا تینوں نفوس کی بیٹھک لگی تھی۔ دونوں تیز، تیز آوازوں میں آپا سے جانے کس معاملے پر بحث کر رہے تھے۔ گھر میں اپنا شرعی

حصہ تو بڑے بھیا، ابا کی زندگی میں ہی یہاں سے جاتے ہوئے وصول کر چکے تھے۔ اب بحث مباحثے کا موضوع بھلا کیا ہوسکتا تھا۔ احمر سب جاننے کو کمرے کی دہلیز پر چپ چاپ آرکا تھا۔

''ہاں تو اس میں اتنی پریشانی والی کیا بات ہے..... تم اکیلی تھوڑی ہو، احمر تمہارے ساتھ ہے ناں..... اور پھر اوپری منزل پر کرایے دار بھی تو موجود ہیں۔ اچھے بھلے مالس، شریف لوگ ہیں..... تم دونوں کا خیال رکھیں گے۔ ہمیں بھی ڈھارس رہے گی کہ تم اکیلی نہیں ہو..... اور پھر میں بھی پندرہ دن یا مہینے بعد ادھر کا چکر لگالوں گا۔ رہی بات خرچے پانی کی تو ابا کی پنشن (جو اب تم دونوں کو ملے گی) اور گھر کے کرایے کی رقم کافی ہوگی۔ تم دونوں کے اخراجات کے لیے۔ پھر بھی اگر ضرورت پڑے تو فون کر کے مانگ لینا مجھ سے۔''

آپا روہانسے چہرے کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھیں۔ جنہوں نے آپا کے پہاڑ جیسے بھاری مسائل اور فکروں کا چٹکیوں میں حل بتا دیا تھا۔ اور وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ انسانوں کو جینے کے لیے صرف روٹی، پانی اور ہوا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ رشتوں کے ساتھ کی حاجت بھی ہوتی ہے جو اسے معتبر بناتی ہے۔ اور ابا کے جانے کے بعد تو آپا اور احمر کو بڑے بھیا کے ساتھ کی پہلے سے زیادہ ضرورت تھی۔ لیکن ہمیشہ کے خودغرض اور بے حس بڑے بھیا جان بوجھ کر آپا کی پریشانی اور فکرمندی کو ان دیکھا ان سنا کر رہے تھے۔ آپا بس جیسے خاموش ہی بیٹھی رہ گئیں اور کمرے کے باہر دہلیز پر کھڑے احمر کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ بڑے بھیا اتنی رات گئے آپا کے پاس بیٹھے کیا معاملات طے کر رہے ہیں۔ ابھی تو ابا کو گزرے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے۔ اور پھر ان کی اگلی بات سن کر احمر کو پتا چلا کہ وہ ابا کے سوئم کے بعد واپس کراچی جانے کی بات کر رہے تھے۔ آپا نہ جانے بڑے بھیا کو کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جسے وہ سمجھنا ہی نہیں چاہ رہے تھے۔ وہ دور کھڑا تھا اور آپا بڑی دھیمی آواز میں بات کر رہی تھیں..... احمر کو ٹھیک سے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ مگر جب آپا روہانسے لہجے میں ذرا اونچی آواز میں بولیں تو احمر کو سب سمجھ میں آنے لگا۔ وہ اب التجائی لہجہ اختیار کیے کہہ رہی تھیں۔

''لیکن بھائی جان..... احمر تو ابھی بچہ ہے۔ وہ کیا خاک میرا سہارا بنے گا۔ اسے تو ابھی خود ایک مہربان اور مضبوط سہارے کی ضرورت ہے جو اسے ابا کی کمی کا احساس نہ ہونے دے۔ اور وہ سہارا آپ ہی بن سکتے ہیں..... اس لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ گھر کے دونوں پورشن کرایے پر چڑھا کر مجھے اور احمر کو اپنے ساتھ ہی کراچی لے چلیں۔'' آپا نے بڑی لجاجت سے کہا تھا۔ جانے اتنی بہادر، حوصلے مند اور مضبوط نظر آنے والی آپا کو کیا ہوگیا تھا۔ ابا کے جانے کے بعد احمر کو وہ ایک کمزور، بزدل اور سہمی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ نند کی بات سمجھتے ہی بھابی نے فوراً ناگواری سے بھویں چڑھاتے ہوئے شوہر کو دیکھا۔ اور وہ تو شاید بھابی کے ابرو کے سارے اشارے، کنائے، لہجے کے اتار چڑھاؤ سب سے بخوبی واقف تھے۔ اس لیے ان کی زبان سے ادا ہوئے لفظوں کے بغیر ہی ان کا مدعا سمجھ کر آپا کو تیوریوں پر بل ڈال کر دیکھنے لگے۔ مگر آپا نے اپنے تئیں ایک آخری کوشش کی تھی۔ اس بار ان کا لہجہ پہلے سے زیادہ ملتجیانہ تھا۔

''میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں بھائی جان..... احمر ابھی صرف دس، گیارہ سال کا ہی ہے۔ اسے جوان ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں کافی وقت درکار ہے۔ اور رہے کرایے دار تو وہ سگے خونی رشتوں کا نعم البدل کبھی نہیں بن سکتے۔ پھر وہ شریف بھی ہیں تو کیا..... ہیں تو پرائے ناں..... آپ بس واپس یہاں شفٹ ہوجائیں یا پھر ہم دونوں کو اپنے ساتھ لے جائیں۔''

اور ان کا ایک ہی تقاضا سن کر بڑے بھیا نے آنکھیں چڑھا کر ماتھے پر ہی رکھ لیں۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا آمنہ..... میں اپنا جما، جمایا کاروبار، گھر بار اور بچوں کی اسکولنگ

سب چھوڑ چھاڑ کر یہاں تم لوگوں کے پاس واپس آجاؤں..... تاکہ تم دونوں کا اکیلا پن دور کرسکوں اور اپنے بچوں کا مستقبل داؤ پر لگادوں..... دماغ ابھی اتنا خراب نہیں ہوا ہے۔ رہی بات تمہاری اور احمر کی تو نہ تم دودھ پیتی بچی ہو اور نہ وہ احمر کوئی ننھا بچہ ہے۔ دو چار سال میں داڑھی، مونچھ نکل آئے گی تب کہاں بچہ رہے گا وہ..... جوان مرد بن جائے گا اور پھر میں نے کہا تو ہے، میں یہاں آتا جاتا رہوں گا۔ خیر خبر رکھوں گا تم لوگوں کی۔ آخر پہلے بھی تو تم لوگ میرے بغیر اتنے سالوں سے رہتے رہے ہو..... اب ایسا کیا ہوگیا ہے۔ ابا مرے ہیں، میں تو زندہ ہوں ناں..... میرا خون ابھی سفید نہیں ہوا ہے۔'' بڑے بھیا نے چمک کر کہا تھا اور آپا بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے چپ ہوئی تھیں۔ جیسے اب کچھ نہ بولیں گی۔ اور دور کھڑے غصے سے گھورتے احمر کو لگا تھا کہ آپا کو چپ نہیں رہنا چاہیے بولنا چاہیے تھا۔ پہلے ابا زندہ تھے، وہ کمزور اور بیمار ضرور تھے مگر بڑے بھیا کی طرح بے حس، خودغرض اور مفاد پرست نہ تھے۔ جنہوں نے خود شادی رچا کے بوڑھے باپ اور جوان بہن کے ساتھ چھوٹے بھائی کو حالات کے رحم و کرم پر تنہا چھوڑ دیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پہلے بہن کے فرض سے سبکدوش ہوتے۔ ابا بیماری اور ناتوانی کے باوجود دونوں بچوں کے لیے مضبوط سہارا اور سائبان تھے۔

شاید خون کا سفید ہونا اسی کو کہتے ہیں۔ وہ یہ صرف سوچ سکا تھا محسوس کرسکا تھا مگر لفظوں کو ترتیب اور زبان دینے سے قاصر تھا۔ اس نے باری، باری آپا کے دکھی اور بڑے بھیا کے خشونت بھرے، بے پروا، بے تاثر چہرے کو دیکھا۔ پھر بھابی کو جن کا چہرہ بے حد پُرسکون اور بے فکر نظر آرہا تھا۔ انہیں فکر کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہ بازی جیت چکی تھیں۔ بڑے بھیا تو صرف مہرے تھے جو بیوی کے ایک اشارے پر دن کو رات اور رات کو دن کہنے کو اپنا دین، ایمان گردانتے لیکن سگے خون کی ایسی بے حسی و بے مروتی آپا سے سہی نہیں گئی۔ اور وہ بے آواز آنسو بہانے لگیں۔ جسے دیکھ کر وہ تڑپ کر انہیں چپ کرانے اور دلاسا دینے کے لیے آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ بھابی جلدی سے اٹھی تھیں۔ مبادا بڑے بھیا، بہن کے آنسو دیکھ کر پگھل کر نرم پڑ جائیں۔ وہ بھیا کے ساتھ آ کھڑی ہوئیں۔ بظاہر ملائم لہجے میں فکرمندی سے بولیں۔

''چلیں..... اب اس بحث کو ختم بھی کردیں۔ کافی رات ہوگئی ہے۔ آپ بھی صبح کی بھاگ دوڑ میں گھن چکر بنے ہوئے تھے۔ تھک گئے ہوں گے۔ مجھے بھی سخت نیند آرہی ہے۔ کچھ دیر آرام کرلیں..... پھر صبح سویم کے انتظامات بھی آپ کو ہی دیکھنے ہوں گے۔'' بھابی باقاعدہ ہاتھ پکڑ کر بڑے بھیا کو وہاں سے لے کر کمرے سے باہر کی جانب بڑھی تھیں۔ وہ بھی کچھ بولے بغیر ان کے ساتھ چل پڑے تھے..... اور کمرے سے باہر دہلیز پر کھڑے احمر کو ساری باتیں ٹھیک طرح سے سمجھ نہ آنے کے وجود آپا کو بے بسی سے روتے دیکھ کر بڑے بھیا سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ ان کے قریب آنے سے پہلے ہی وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ تب وہ آپا کے پاس آیا تھا۔

''بڑے بھیا کیا کہہ رہے تھے..... کہاں جانے کی باتیں کررہے تھے؟'' وہ آپا کے قریب آیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھا۔ اس سے آپا کا یوں رونا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اور اس کی آواز سن کر آپا نے گھبرا کر اپنے سامنے کھڑے ننھے بھائی کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں رونے سے لال ہو رہی تھیں۔ آپا نے جلدی سے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ پھر خود کو سنبھالتے ہوئے فکرمندی سے بولیں۔

''تم یہاں کیوں آگئے ہو، تم تو سو رہے تھے۔ اتنی رات گئے یہاں کیا کررہے ہو۔'' آپا نے خود کو اور اپنے لہجے کو بھرپور نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

''آپا..... میری آنکھ کھلی تو آپ میرے پاس نہیں تھیں۔'' جواباً وہ روہانسے لہجے میں بولا تھا۔ ''میں تو آپ کو دیکھنے آیا تھا۔ آپ تو جانتی ہیں مجھے اکیلے میں نیند نہیں آتی ہے، ڈر لگتا ہے، پہلے تو ابا کے ساتھ سویا کرتا تھا۔'' اس نے رسانیت سے کہا اگر آپا اس سے کچھ چھپانا

چاہتی تھیں تو وہ بھی انہیں جتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ سب کچھ جان گیا ہے جو آپا اس کے معصوم کچے ذہن پر پڑنے والے برے اثر کا سوچ کر چھپانا چاہتی تھیں۔ حالانکہ شعور کی پختگی کا تعلق کبھی، کبھی عمر کے بڑے چھوٹے ہونے سے نہیں ہوتا۔ بلکہ حالات، انسانی رویے اور سلوکِ انسانی شعور کو وقت سے پہلے پختہ کردیتے ہیں۔ مگر وہ یہ سب کچھ سوچ کر چپ رہا تھا۔ آپا جلدی سے ابا کے بیڈ پر سے اٹھی تھیں۔ اور اسے اپنے بازو کی اوٹ میں لے کر نرمی سے بولیں۔

''ہاں..... میں ذرا تہجد کی نماز کے لیے اٹھی تھی۔ اس لیے یہاں آگئی تھی۔ تاکہ روشنی سے تمہاری نیند خراب نہ ہو..... چلو..... اب آکر سو جاؤ..... میں تمہارے پاس ہی رہوں گی۔ تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اور وہ ان کی بات سن کر بولنا چاہتا تھا کہ آپ کو بھی کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں، آپ کا خیال رکھوں گا۔ آپ کا سہارا بنوں گا۔ مگر وہ خاموش رہا تھا۔ ان باتوں اور تسلیوں سے بہلانے کے لیے وہ ابھی بہت چھوٹا تھا۔ سو خاموشی سے آپا کے ساتھ چل دیا۔

اور کچھ دیر بعد آپا کے کمرے میں بیڈ پر لیٹا وہ سوچ رہا تھا کہ موت تو بڑے، بڑے سنگدل اور سخت دل لوگوں کے دلوں کو نرم اور گداز کردیتی ہے۔ پھر بڑے بھیا کا دل کس پتھریلی مٹی سے بنا ہوا تھا۔ جسے ان نازک حالات میں سگے خونی رشتوں کی بے بسی بھی پگھلا کر نرم نہ کرسکی تھی۔

ابا کے سوئم والی رات ہی بڑے بھیا، بیوی کو لے کر واپس کراچی سدھار گئے تھے۔ اور پیچھے ڈری سہمی ایک اکیلی لڑکی رہ گئی۔ جو باپ کی زندگی میں اتنی مضبوط اور بہادر بن گئی تھی کہ ان کی بیماری کے دنوں میں گھر کے اندر، باہر کے سارے کام اور ذمے داریاں اکیلے نبھاتے ہوئے کسی سے ڈرتی تھی اور نہ جھکتی تھی۔ مگر آج وہی بہادر لڑکی اسے بہت کمزور، ناتواں اور بزدل دکھائی دے رہی تھی۔ بڑے بھیا نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود نہ ہی آپا کی روئی، روئی سوجی آنکھوں پر تسلی اور دلاسے کا نرم پھاہا رکھا۔ نہ ہی چھوٹے بھائی کی معصوم بچپن کی معصومیت پر..... جب سر پر کسی سرپرست یا ولی کا سایہ نہ رہے تو معصوم چہرے وقت کی کڑی دھوپ میں جھلس کر کس طرح کملا جاتے ہیں۔ احمر اس کی مثال سامنے تھا۔ مگر آپا کی پرورش اور تربیت نے اسے ایسا بننے نہیں دیا تھا۔ حالات کی سختی، زمانے کی بے اعتنائی، رشتوں کی بے حسی اور زندگی کی کٹھنائیوں نے اس ڈری سہمی لڑکی کو پھر سے بہادر، مضبوط اور نڈر بنا دیا۔ وہ دس، گیارہ سالہ احمر کے لیے مضبوط سہارا، نگہبان اور پُرسکون چھاؤں دینے والا سائبان بن گئیں۔ اپنی خزاں رسیدہ زندگی کو بہار و گلزار میں بدلنے کے بجائے چھوٹے بھائی کے لیے شجرِ سایہ دار بن کر کھڑی ہوگئیں۔

☆☆☆

ماہ و سال کی گردش میں چند سالوں کا اضافہ ہوا تھا۔ اور وہ نیم کے ننھے پودے کی طرح پروان چڑھ کر تناور اور مضبوط درخت کی طرح ایک کامیاب انسان بن کر سامنے آیا تھا۔ جو آپا کی محنت و قربانیوں کا ثمر تھا۔ وہ برآمدے میں رکھے تخت پر بیٹھا صحن میں لگے نیم کے گھنے پیڑ کو دیکھ رہا تھا۔ جسے چند سالوں پہلے اس نے آپا کے ساتھ مل کر اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ اور اس سایہ دار درخت کے ساتھ اس کی زندگی کی کتنی یادیں جڑی تھیں۔ جن میں کچھ تلخ بھی تھیں... جن کی تلخی وہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر نہیں بھولا تھا۔ اسے سب یاد تھا۔ اور آج وہ آپا کی قربانیوں کی بدولت اس مقام پر تھا۔ سی ایس ایس کا امتحان اعلیٰ نمبروں اور پوزیشن سے پاس کر کے وہ فارسٹ ڈیپارٹمنٹ میں فارسٹ آفیسر کی حیثیت سے فائز ہوا تھا۔ اور اب اسے ایبٹ آباد کے... پُرفضا مقام پر بطور فارسٹ آفیسر پوسٹ کیا گیا تھا۔ اور پوسٹنگ کے بعد وہ آپا کو اپنے ساتھ لے جانے آیا تھا تاکہ ان کی عمر بھری کی ریاضتوں کا ثمر اپنی محبت، توجہ اور خدمت سے ادا کرسکے۔ لیکن اس کی خواہش جان کر

انہوں نے بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے ایک کڑی شرط عائد کردی تھی جیسے وہ کسی بھی صورت قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے آپا کے سامنے صاف انکار کردیا تھا۔ جواباً اسے سمجھانے اور قائل کرنے کے بجائے آپا نے جذباتی بلیک میلنگ کا سہارا لیتے ہوئے اس کے ساتھ ایبٹ آباد جانے سے منع کردیا۔ مجبوراً اسے آپا سے اپنی بات منوانے کے لیے اہل سے مدد لینے کے بارے میں سوچنا پڑا تھا۔ وہی تھی جو اس مشکل کو سلجھانے میں آپا کو راضی کرنے کے لیے پل کا کردار ادا کرسکتی تھی۔ جانتا تھا وہ شروع سے آپا کی فیورٹ ہے۔ اور آپا اس کی کوئی بات کوئی خواہش رد ہی نہیں کرسکتی تھیں۔ آپا سے کوئی سگا خونی رشتہ نہ ہونے کے باوجود انسانیت، ہمدردی، محبت اور خلوص کا ایسا بے لوث گہرا رشتہ ان سالوں میں پروان چڑھ چکا تھا۔ جس کی مضبوط جڑوں نے آپا کے نرم دل کو پوری طرح اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ اہل ان کے کرایے دار محسن احمد کی بیٹی تھی۔

''کیا ہوا..... ایسے کیا دیکھ رہی ہو.....؟'' احمر نے اپنی جانب خاموشی سے تکتی اہل کو دیکھ کر کہا تو وہ جواباً شکایتی لہجے میں گویا ہوئی۔

''دیکھ رہی ہوں..... تم پہلے سے کتنا زیادہ بدل گئے ہو۔'' اہل کی بات سن کر وہ یک دم شرارتی.... موڈ میں آیا تھا۔

''اچھا..... کیا واقعی میں پہلے سے زیادہ ہینڈسم ہو گیا ہوں۔'' احمر نے شوخی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو جواباً اہل نے اسے گھور کے دیکھا۔

''ہینڈسم تو تم ہمیشہ سے ہی ہو۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد اس گھر میں تمہیں دیکھا ہے۔ مگر تم اتنے ظالم اور کٹھور نکلو گے۔ اس کی امید نہیں تھی مجھے۔ میرے دل کے سارے رازوں کے امین ہونے کے باوجود تم اپنی زندگی میں مجھے یکسر فراموش کر بیٹھے۔ جیسے میں تمہاری زندگی میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔'' اہل نے منہ سے تو کہا کچھ نہیں مگر دل میں ضرور سوچا تھا۔ جو اس کے لیے اہل کی محبت اور نرم جذبوں کو سمجھ کر بھی انجان بنا بیٹھا تھا اور احمر اس کی خاموشی کو ہی اس کی رضامندی سمجھا تھا۔ اسی لیے یقین دہانی کو سوالیہ انداز میں گویا ہوا۔

''تم آپا کو سمجھاؤ گی ناں..... وہ تمہاری بات اچھی طرح سمجھتی ہیں، مانتی بھی ہیں..... کیونکہ تمہیں ہمیشہ سے اپنی بات منوانی آتی ہے۔ اور مجھے یقین ہے..... تم سمجھاؤ گی تو وہ اپنی ضد چھوڑ دیں گی۔'' اہل ان کے کرایے داروں کی بیٹی ضرور تھی۔ مگر اتنے سالوں میں اپنائیت اور خلوص کے رشتے میں بندھ کر وہ ایک دوسرے کے اچھے برے حالات سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ اسی بنا پر تو اہل کے والدین نے آپا (آمنہ) کو کبھی اس گھر میں اکیلا اور بے یارو مددگار ہونے کا احساس تک نہیں ہونے دیا تھا۔ محسن احمد اور سائرہ آپا نے بالکل بڑے بزرگوں کی طرح ان کی ہر مشکل وقت میں ڈھارس بندھائی تھی۔ اہل بھی جوان ہونے پر ساری سچائی جانتی تھی اسی لیے اسے آپا اور احمر سے بہت انسیت اور لگاؤ پیدا ہوگیا تھا جو شاید سگے خونی رشتوں سے بڑھ کر ہی تھا۔ اہل اپنی سوچوں میں گم تھی، احمر مزید بولا۔

''میں ساری تیاری مکمل کر کے آیا ہوں..... وہاں آفس کی طرف سے بہت خوب صورت کاٹیج (گھر) ملا ہے مجھے..... آپا ساتھ چلیں گی تو وہ اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ مل کر اچھی سی سیٹنگ کرلیں گی۔ لیکن اگر وہ نہ مانیں تو میں وہاں اکیلا کیا کروں گا..... پلیز اہل..... تم آج ہی آپا سے بات کرو..... اور انہیں ہر حال میں راضی بھی کرنا ہوگا۔'' احمر نے آخری جملہ بڑے مان سے کہا تھا۔ لہٰذا ہمیشہ کی طرح اہل کو اس کی معصوم صورت پر ترس آگیا تھا۔ وہ اسے ٹینشن میں مبتلا کیسے دیکھ سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے تم ٹینشن مت لو..... میں آپا سے ضرور بات کروں گی بلکہ انہیں راضی بھی کرلوں گی۔ کیونکہ تم پر سب سے زیادہ حق ان ہی کا بنتا ہے۔ انہوں نے تمہارے لیے بہت قربانیاں دی ہیں..... لیکن احمر..... تم اور آپا یہاں سے چلے جاؤ گے تو میں کیا کروں گی۔ میرا کیا ہوگا احمر..... تم نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔''

آخری جملہ کہتے اس کا انداز اور لہجہ شکایتی ہی نہیں روہانسا بھی ہوگیا تھا۔ کیونکہ احمر تو صرف اپنی اور آپا کی بات کررہا تھا۔ اس کی فیوچر پلاننگ میں اہل کا تذکرہ تو کہیں نہیں تھا۔ مجبوراً اسے ہی ڈھیٹ بن کر جتانا پڑا تھا۔ کیا کرتی، اس سے محبت جو کر بیٹھی تھی۔ بچپن کا ساتھ اور پسندیدگی وقت گزارنے کے ساتھ محبت میں جو بدل چکی تھی۔ احمر اس کے جذبات سے کسی حد تک آگاہ تھا۔ مگر اس کی طرف سے بالکل واضح اظہار نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی اس نے اہل کے ساتھ مل کر مستقبل کے پلان بنائے تھے۔ جبکہ آج کل گھر میں اہل کے رشتے کی باتیں ہورہی تھیں۔ امی، ابو اس کی شادی کرکے اپنے بڑے بیٹے کے پاس سعودیہ شفٹ ہونا چاہتے تھے۔ اہل کا بڑا بھائی فراز وہاں ان کو بلوانے کے سارے انتظامات کرچکا تھا۔ اسی لیے اہل کے ماں، باپ اس کے لیے کوئی معقول رشتہ تلاش کررہے تھے۔ بس اس بات نے اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین وقرار برباد کردیا تھا۔ اور آج احمر کے سامنے وہ چپ نہیں رہ سکی تھی۔ بس مبہم لفظوں میں سمجھایا تھا۔ اب اس کے سامنے اپنی محبت کا اظہار تو نہیں کرسکتی تھی۔ وہ انٹرنیٹ کے جدید دور میں جینے کے باوجود مشرقی اور بے حد وضع دار لڑکی تھی۔ جسے اپنے جذبات و احساسات کا بھرم رکھنا زیادہ عزیز تھا۔ اور احمر اب بھی جان کر انجان بننے کی کوشش کررہا تھا۔ صرف اسے تنگ کرنے کے لیے، اس لیے بات کو مزاح کا رنگ دیا تھا۔

''تمہارا کیا ہوناں ہے یار..... تم یہاں اپنے امی، ابو کے ساتھ مزے سے رہنا۔ پورے گھر کی مالکن بن کر اور کبھی کبھار انکل، آنٹی کے ساتھ ایبٹ آباد بھی آجانا۔ میں تمہیں پورا ایبٹ آباد گھماؤں گا۔ بہت خوب صورت علاقہ ہے۔ سمجھوز مین پر جنت کا ٹکڑا ہے۔'' احمر نے جان بوجھ کر اس کی بات کو نہ سمجھنے کا تاثر دے کر مزاح میں اڑا دیا تو وہ بھی جل بھن کر وہاں سے اٹھ گئی۔ مگر جانے سے پہلے اسے جتانا نہیں بھولی تھی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم..... ایبٹ آباد بہت خوب صورت علاقہ ہے۔ میں ایبٹ آباد گھومنے پھرنے ضرور آؤں گی۔ لیکن شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ۔ کیونکہ امی، ابو آج کل بڑی سنجیدگی سے میرے لیے رشتے دیکھ رہے ہیں۔ اور ہوسکتا ہے عنقریب میری شادی بھی کردیں۔ پھر تم شوق سے ایبٹ آباد میں اپنے گھر پر میری دعوت کردینا۔''

اس کی بات پر احمر ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگا تھا۔ اور وہ ناراضی سے اسے گھورتی اوپری منزل کے برآمدے کی غصے میں دو تین سیڑھیاں اترتی دھپ، دھپ کرتی وہاں سے واک آؤٹ کرگئی۔ تب احمر کا ہونقوں کی طرح کھلا منہ بند ہوا تھا۔ اس کی شادی کا سن کر سارا مزاح اور مذاق دھرا رہ گیا تھا۔ وہ تو آپا کو ساتھ لے جانے آیا تھا۔ اہل کے بارے میں تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ لیکن اہل کے بغیر وہاں وہ کیا کرتا..... اس سے جدائی کا تصور ہی انتہائی مشکل تھا۔ پھر وہ اسے چھوڑ کر یہاں سے اکیلا کیسے جاسکتا تھا۔ بس اسی خیال کے آتے ہی وہ وہاں سے تیزی سے اٹھ کر نچلی منزل کی طرف بھاگا تھا تاکہ دیر ہونے سے پہلے ہی آپا کے سامنے اپنے دل کی اولین خواہش کا اظہار کرسکے۔ باقی آگے کے سب معاملات آپا نے خود طے کرلینے تھے..... اسے یقین تھا۔ آپا اس کی پسند جاننے کے بعد اس کی اس آرزو کو ہرگز نہیں ٹالیں گی۔

دوسری جانب اہل اپنے کمرے میں آکر احمر کی..... بے پروائی بلکہ بے حسی پر آنسو بہا رہی تھی۔ وہ تو اتنا حساس اور پُرخلوص تھا پھر اس کے دل کے حال سے بے خبری کیوں ظاہر کررہا تھا۔ اسے رہ، رہ کر احمر پر غصہ آرہا تھا۔ اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ہوا جو احمر نے اس کے سامنے اپنی پسندیدگی کا برملا اظہار نہیں کیا مگر وہ جانتی تھی.. محبت کا روایتی اظہار نہ ہونے کے باوجود ان دونوں کے درمیان ایک ان کہا خاموش معاہدہ تھا۔ محبت کا ان دیکھا بندھن جو ان کے دلوں کے تاروں سے جڑا تھا۔ اور اب جب وہ اپنی زندگی میں کامیابیوں کے سفر پر آگے بڑھ رہا تھا۔ زندگی کو ایک واضح سمت میں پڑاؤ دینے کا وقت آیا تو وہ اہل کے وجود کو یکسر فراموش کر بیٹھا ہے۔

امل کو اپنی محبت بلکہ خالص جذبوں کی یہ بے قدری بے آواز رُلا رہی تھی۔ اسی لیے وہ احمر کے بارے میں اتنا الٹا سیدھا اور منفی سوچنے پر مجبور ہوگئی جبکہ دوسری طرف احمر جو بے حس تھا اور نہ احسان فراموش اسے سب یاد تھا۔ بڑے بھیا کے جانے کے بعد امل اور اس کے ماں باپ اور بھائی نے مل کر ان کا کتنا ساتھ دیا تھا۔ زندگی کے ہر کڑے وقت اور مشکل میں ان کا خیال رکھا تھا۔ مورل سپورٹ بھی دی تھی۔ بالکل اپنوں کی طرح اپنائیت کا احساس بھی دلایا کہ وہ اکیلے نہیں ہیں۔ احمر کو سب کچھ یاد تھا۔ اسی لیے آپا کے پاس بیٹھا اپنے دل کی کتھا نہایت عاجزی سے ان کے گوش گزار کررہا تھا۔ حالانکہ آپا اس سے عمر میں کافی بڑی تھیں۔ لہٰذا ایسے۔ معاملات میں..... امل کے حوالے سے اپنے دل کا حال کہنے میں اسے آپا کے سامنے جھجک بھی محسوس ہورہی تھی۔ لیکن وہ جانتا تھا۔ آپا بڑے ٹھنڈے مزاج اور سلجھے ہوئے، مہربان دل کی مالک تھیں۔ لہٰذا ساری شرم وحیا بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے اپنے دل کی خوشی کا اظہار مناسب لفظوں میں ان کے سامنے کردیا۔ جواباً آپا ہولے سے مسکرائیں تو وہ ان کے جوابی ری ایکشن سے قدرے مطمئن ہوا۔ اور اب ان کا جواب سننے کے لیے بے تابی سے انہیں دیکھنے لگا۔

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے احمر..... تم نے تو میری مشکل آسان کردی ہے۔ ورنہ میں تو سوچ رہی تھی کہ اپنی مرضی اور پسند سے تمہاری زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے کہیں میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہ کر بیٹھوں..... کیونکہ امل تو مجھے بھی بہت پسند ہے اور میں بہت پہلے ہی اسے تمہاری لائف پارٹنر کے طور پر پسند کرچکی تھی۔ بس تمہاری تعلیم ختم ہونے اور جاب شروع ہونے کا انتظار کررہی تھی تاکہ محسن بھائی سے تمہارے لیے امل کا ہاتھ مانگ سکوں۔''

آپا کے جواب نے اسے سرتاپا نہال کردیا تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ سکون وطمانیت کی ایک لہر سی اس کے دل ودماغ میں اتر گئی تھی۔ آپا اپنے پہلے سے طے کیے ہوئے پلان اس سے شیئر کررہی تھیں۔ اور وہ چہرے سے اپنی بے پایاں خوشی ظاہر کیے بغیر اچھا بچہ بنا بیٹھا دل ہی دل میں سرشار ہوا جارہا تھا۔

''اور اب تو تم ماشاء اللہ سے برسرِ روزگار بھی ہوچکے ہو۔ اللہ کے کرم سے اپنا گھربار اور ترقی بھی مل گئی ہے۔ اب میں دیر نہیں کروں گی۔ آج ہی محسن بھائی کے پاس جاکر تمہارے اور امل کے رشتے کی بات کروں گی۔ میں تو بس تمہاری رضامندی جاننے کی منتظر تھی۔ مجھے کیا پتا تھا، امل کے معاملے میں ہم دونوں کا انتخاب ایک ہی ہوگا۔ وہ واقعی بہت پیاری لڑکی ہے۔ مجھے تمہارے لیے ایسی ہی پُرخلوص پیاری سی اور بے لوث لڑکی کی خواہش تھی۔'' اور احمر نے ہلکے سے جھینپ کر سامنے بیٹھی آپا کے دونوں ہاتھوں کو محبت وتشکر بھرے انداز سے تھام لیا تھا۔ وہ اس کے لیے دنیا کی سب سے معتبر اور محترم پیاری ہستی تھیں۔ وہ ان کی مرضی اور خوشی کے لیے اپنی ہر خوشی قربان کرسکتا تھا لیکن اللہ کے کرم سے اس کے دل کی خوشی آپا کی بھی اولین خوشی ثابت ہوئی تھی۔ پھر وہ خدا کا شکر گزار اور آپا کا احسان مند کیوں نہ ہوتا۔ بچپن سے آج تک انہوں نے اس کی ہر خوشی اور آرزو کا خیال رکھا تھا۔ لہٰذا اب بہت ضروری ہوگیا تھا کہ وہ اپنی عقیدتوں اور محبتوں کا اظہار بھی آپا کے سامنے کردے۔

''بہت شکریہ آپا..... آپ واقعی مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ جب ہی تو میرے مزاج اور میری ذات کو اتنی اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ میری پسند ناپسند، میری خوشی، خواہش سب کا پہلے ہی آپ کو خیال رہتا ہے۔ اور اب امل کا انتخاب کرکے آپ نے ثابت کردیا ہے کہ آپ میری آپا نہیں..... میرے لیے ماں جیسی عظیم ہستی ہیں۔ جو اپنی اولاد کے دل کے ہر حال سے باخبر ہوتی ہے۔ شاید آپ کو بھی پہلے سے میرے دل کی خواہش کی خبر تھی۔ تب ہی تو میرے لیے امل کو پسند کیا ہے۔'' آپا کی رضامندی جان کر احمر سرشار سا وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اور پھر چند دنوں بعد بڑی خاموشی سے امل اور احمر کا رشتہ بھی پکا کردیا گیا۔ آپا کی خواہش جان کر امل کے

ماں، باپ نے رسمی سا سوچنے کا وقت نہیں لیا تھا۔ آپا کے خلوص پر فوراً ہاں کردی تھی۔ انہیں اہل کے لیے ایسے ہی قدردان لوگوں کی خواہش تھی۔ جو بنا کسی کوشش کے پوری ہوگئی تھی۔ دوسرے انہیں اپنے بیٹے کے پاس بھی جانا تھا۔ سو احمر کے واپس ایبٹ آباد جانے سے پہلے اہل اور احمر کا نکاح طے کردیا گیا تھا۔ جس سے اہل کو بے خبر رکھا گیا تھا۔ اور احمر کو اپنے نکاح سے زیادہ اہل کی چند دن بعد آنے والی سالگرہ کا شدت سے انتظار تھا۔ جس پر وہ اسے زندگی میں پہلی بار نہایت شاندار تحفہ گفٹ کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی سرپرائز کے طور پر..... اور وہ دن آج آگیا تھا۔ آج وہ اہل کو پرپوز کرنا چاہتا تھا۔ ذرا رومینٹک اور خوب صورت انداز میں..... جس کے لیے اس نے گھر سے باہر کسی پارک یا ریسٹورنٹ کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس کی تربیت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ کسی باعزت گھرانے کی لڑکی کو شادی سے پہلے کسی پارک یا ہوٹل میں لے کر گھومتا پھرے۔ اس لیے اس نے گھر کے پچھلے حصے میں بنے باغیچے کا انتخاب کیا تھا۔ جہاں اکثر اہل پائی جاتی تھی۔ جب وہ بہت اداس ہوتی تھی اور اب تو وہ احمر سے ناراض بھی تھی۔ جسے اب تک احمر نے منانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اس لیے وہ اسے سارے گھر میں ڈھونڈنے کے بعد باغیچے میں خاموشی سے چلا آیا تھا۔ جہاں اہل واقعی اداس بلبل بنی اپنی من پسند جگہ بیٹھی تھی۔ گھر والوں نے ابھی اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اور احمر کو یک دم سامنے دیکھ کر اہل نے مزید روٹھ کر منہ پھلا لیا تھا۔ جبکہ اس نے دل میں سوچا تھا کہ آج اہل کی سالگرہ ہے۔ آج وہ اسے زیادہ تنگ نہیں کرے گا۔ اس لیے وہ اس کے پھولے ہوئے چہرے اور برہم مزاج کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑے دوستانہ لہجے میں بولا۔

''ارے..... تم آج کے دن بھی اتنی اداس اور سنجیدہ سی صورت بنائے بیٹھی ہو..... آج تو خوشی منانے کا دن ہے۔ اور تم یہاں اکیلی آج کا دن ہی بھولے بیٹھی ہو۔''

احمر کی مبہم بات سن کر اہل نے ساری ناراضی بھول کر گڑبڑا کے اسے دیکھا۔ جانے وہ کس دن اور کون سی خوشی کی بات کر رہا تھا۔

''کہیں آج احمر کی سالگرہ تو نہیں ہے۔ اور اگر اسے پتا چل گیا کہ مجھے یاد ہی نہیں تو وہ مجھ سے کتنا ناراض ہوگا۔'' اہل نے فوراً ہی دل میں سوچا پھر گھبرا کر جھولے سے اتر کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

''اب چپ کیوں ہو..... بول کیوں نہیں رہی ہو..... تم آج کا دن کیسے بھول سکتی ہو اہل.....؟''

احمر نے سچویشن کو ڈرامائی بناتے ہوئے اسے تھوڑا ستانے کی کوشش کی تھی۔ کیا کرتا اہل کو تنگ کر کے اسے مزہ جو آتا تھا۔

''اچھی طرح یاد ہے، آج تمہاری سالگرہ کا دن نہیں ہے۔ اس لیے مجھ پر بھول جانے کا الزام لگا کر مجھے بیوقوف بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اس بار بگڑنے کے بجائے احمر کو جتاتے ہوئے برجستہ بولی تھی۔ سوچنے، سمجھنے کا وقت ہی کہاں تھا۔ اہل نے چمک کر کہا تو وہ..... بے ساختہ مسکرا گیا۔

''لیکن تمہاری سالگرہ کا دن تو ہے ناں.....'' اور احمر کی اگلی بات سن کر وہ بے ساختہ خوش ہونے کے بجائے ہونقوں کی طرح سامنے کھڑے احمر کو دیکھنے لگی۔

''دیکھ لو..... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اب تم مجھ پر بھول جانے کا الزام ہرگز نہیں لگا سکتی ہو۔ اس لیے وش بھی کر رہا ہوں..... ہیپی برتھ ڈے مائی ڈیئر..... اہل.....''

''ڈیئر۔'' اس لفظ سے تو وہ اسے کم ہی پکارتا تھا۔ اور آج اس کا لہجہ بھی بڑا دوستانہ تھا۔ اور چہرے پر محبت کی نرم سے روشنی بھی پھیلی تھی۔ آنکھوں میں چمکتے جگنوؤں سی لپک تھی۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ احمر کو اس کی ناراضی کا گماں ہوا تو آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ کر ہلایا تھا۔ جو یقین و بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔

''کیا ہوا اہل..... کیا اب بھی ناراض ہو مجھ سے..... سالگرہ کی مبارک باد دے رہا ہوں..... اور آج تو گفٹ بھی بہت پیارا لایا ہوں تمہارے لیے۔ دیکھو گی تو خوشی سے دیوانی ہو جاؤ گی۔''

اہل اس کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کر کے ٹرانس کی

کیفیت سے باہر آئی جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہو۔ چہرے پر ایسا ہی غیر یقینی سا تاثر تھا۔ احمر نے فوراً اپنا ہاتھ اس کے بازو پر سے ہٹایا تھا۔ اور اہل کو اپنی جون میں واپس آنے کے لیے صرف چند لمحے لگے تھے۔ جواباً وہ بے پروائی سے بولی۔

''پہلے گفٹ دکھادو...... گفٹ پسند آگیا تو شکریہ بھی ادا کردوں گی۔ تم ہر سال گفٹ کے نام پر پھول ہی دیتے ہو اور پھر چاہتے ہو کہ بندہ شکریہ بھی ادا کرے۔ واہ بہت اچھے۔'' اہل نے اس کی ایکٹنگ سے مرعوب ہوئے بغیر شکایتی لہجے میں کہا تو جواباً ہنستے ہوئے احمر نے ہاتھ میں پکڑا انگیجمنٹ رنگ باکس جس کے اوپر گلاب کی خوب صورت تازہ کلی بھی رکھی گئی تھی۔ ہاتھ کو اپنی بیک سے سامنے لاتے ہوئے اہل کی جانب بڑھا دیا تھا۔ جسے دیکھ کر اب پھر سے گم صم ہونے کی باری اہل کی تھی کیونکہ احمر کی آنکھوں میں بڑے خوب صورت جذبے مچل رہے تھے۔ لفظوں میں بھی انوکھا سا دلفریب تاثر ابھر آیا تھا۔ اہل نے دھڑکتے دل کے ساتھ احمر کے ہاتھ میں پکڑے گفٹ باکس کو دیکھا تھا۔

''کھول کر دیکھ لو...... تمہیں واقعی بہت پسند آئے گا۔ اور تم شکریہ بھی پورے دل سے ادا کرو گی۔''

احمر کی گہری ہوتی مسکراہٹ پر اہل نے جلدی سے گفٹ باکس تھام لیا تھا۔ اور پھر بنا اس کی طرف دیکھے باکس کھولنے لگی۔ اندر سے جگمگاتی ڈائمنڈ رنگ دیکھ کر جیسے وہ خوشی اور حیرت کے مارے گنگ سی ہوگئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی...... احمر اسے اس سالگرہ پر اتنا قیمتی اور اہم تحفہ دے گا۔ ورنہ ہر سال تو وہ صرف پھول ہی گفٹ کرتا تھا۔ اور وہ کنجوس ہونے کا طعنہ دے کر وصول کر لیتی تھی۔ مگر آج کے گفٹ نے پچھلے سارے گزرے برسوں کی کسر پوری کردی تھی۔ اور وہ ڈائمنڈ رنگ دیکھ کر نا سمجھی سے احمر کو دیکھنے گئی جیسے کہنا چاہتی ہو۔ اس رنگ دینے کا مطلب کیا ہے۔

''یہ کیا ہے احمر......؟''

احمر نے اس کی ناسمجھی کو سمجھتے ہوئے دو قدم آگے

غزل

ہر پیراہن کو اطلس و کمخواب کردیا
تو نے تو مجھ کو ذرّے سے مہتاب کردیا

دل کو طلب تھی کوئی مجھے ٹوٹ کے چاہے
تو نے تو میری روح کو سیراب کردیا

لفظوں میں ترے اِک نشہ سا ہے میرے دوست
بنجر سی زندگی کو بھی شاداب کردیا

آنکھوں کے راستے سے وہ اس دل میں بس گئے
پر چین و سکون ساتھ ہی نایاب کردیا

عمرِ رواں کا انتساب کر کے میرے نام
سب مشکلوں کا بند تو نے باب کردیا

کلام: شگفتہ شفیق، کراچی

سب کے لیے

ایک کشتی ہو کنارے مجھے منظور نہیں
حُسن بس مجھ کو سنوارے مجھے منظور نہیں
میری دنیا کا ہر اِک شخص ہے پیارا مجھ کو
صرف کچھ لوگ ہوں پیارے مجھے منظور نہیں

کاوش: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

بڑھ کر اس کے عین سامنے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوتے اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے کہا۔

''منگنی کی انگوٹھی ہے اور کیا ہے...... اور میں نے تمہیں دینے سے پہلے آنٹی سے اجازت لے لی ہے۔ تمہیں قبول ہے تو پہن لو...... کیونکہ میں تمہیں باقاعدہ پرپوز کرچکا ہوں...... کیا تم مجھ سے شادی کرو گی اہل......؟'' اور اس کے لبوں سے محبت کے اتنے کھلے اظہار پر وہ خوشی کے مارے دیوانی سی ہوگئی۔ پھر احمر کی مسلسل مسکراتی آنکھوں سے جھلکتی محبت پر جھینپ کر

کھسیاتے ہوئے خود کو کمپوز ڈ کر کے بولی تھی۔
''اگر امی، ابو نے قبول کر لیا ہے تو میں کیوں واپس کروں گی۔ مجھے بھی قبول ہے۔'' امل نے بے پروائی کا اظہار کرتے ہوئے نروٹھے پن سے کہا تو وہ بے ساختہ دلکشی سے ہنسنے لگا۔ امل نے جواب ہی ایسا دیا تھا کہ جس پر وہ پھر سے شرارت پر آمادہ ہو گیا۔
''قبول ہے تو تم نکاح والے دن کہنا۔ ابھی یہ منگنی کی انگوٹھی پہن لو تا کہ نکاح سے پہلے منگنی کی رسم تو ادا ہو جائے۔'' اور اپنی جلد بازی میں بولے جملے کو سمجھ کر وہ واقعی محجوب سی ہو گئی۔ احمر اس کی کیفیت سے بھرپور لطف اٹھا کر اسے تنگ کر رہا تھا تو اس نے بھی اسے سبق سکھانے کے لیے ہاتھ میں پکڑا رنگ باکس واپس احمر کی جانب بڑھا دیا تھا۔ چہرے پر پوری سنجیدگی کا تاثر تھا اور اس بار گھبرانے کی باری احمر کی تھی۔ اس کے مسکراتے لبوں کو بریک لگی تھی۔ اب وہ ہونقوں کی طرح سامنے کھڑی سنجیدہ چہرہ لیے امل کو دیکھ رہا تھا۔ پھر ڈرتے، ڈرتے گویا ہوا تھا۔
''یہ کیا ہے امل......'' احمر کو لگا وہ منگنی کی انگوٹھی واپس کر رہی ہے۔ اسی لیے گھبراہٹ اس کے چہرے سے عیاں تھی......جس سے حظ اٹھاتے امل بڑے پُرسکون لہجے میں بولی۔ بالکل احمر والے انداز اور لہجے میں......
''منگنی کی انگوٹھی ہے......اور کیا ہے......تم اپنے ہاتھ سے پہناؤ گے......تب ہی تو منگنی کی رسم ادا ہو گی۔''
اور امل کے جواب پر احمر کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ اس نے بغیر کچھ کہے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے رنگ باکس لے کر رنگ امل کے ہاتھ کی انگلی میں پہنا دی۔ مبادا کہیں امل کا ارادہ ہی بدل جائے......اور ساتھ ہی گلاب کی کلی کو امل کے بالوں میں اڑسا۔ جس پر امل نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ پھر دونوں بے ساختہ سکون اور طمانیت سے مسکرا دیے تھے۔ جس میں تشکر کی بھی آمیزش تھی۔
''تم نے شکریہ تو ادا کیا نہیں......میں نے اتنا اچھا گفٹ دیا ہے۔'' احمر نے کچھ یاد آنے پر کہا تو وہ ...... بے ساختہ بولی تھی۔

''شکریہ میں ضرور ادا کروں گی۔ لیکن آمنہ آپا کا......جنہوں نے تم سے شادی کے لیے مجھے پہلے سے پسند کر رکھا تھا۔ ورنہ تم نے تو ہمیشہ صرف ستایا ہی ہے۔ اور اتنے دنوں سے انجان بنے مجھے تنگ کر کے خوش ہو رہے تھے۔'' امل بے نیازی سے جواب دے کر وہاں سے چلی گئی۔ اور پیچھے احمر کھسیا کر بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہ گیا۔ اسے جواب میں نہلے پر دہلا جو ملا تھا۔

☆☆☆

امل نے آمنہ آپا کو سمجھانے کی پوری کوشش کی تھی۔ کیونکہ احمر نے اسے کہا تھا۔ ورنہ وہ اس معاملے میں آپا سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ خالص ان کا پرسنل اور فیملی میٹر تھا۔ بس احمر کی ناراضی کا سوچ کر حامی بھر بیٹھی تھی تو آپا سے سرسری بات بھی کر لی تھی۔ جواباً آپا نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ یہ معاملہ احمر کے ساتھ مل کر خود ہی نبٹا لیں گی۔ اس لیے امل نے انہیں ساری بات بتا کر آپا سے معذرت کر لی تھی۔ لہٰذا آپا کے اپنی ضد پر قائم رہنے کی وجہ سے اسے ایک بار پھر سے آپا کو سمجھانا پڑا تھا۔ وہ انہیں ہر صورت قائل کرنا چاہتا تھا۔
''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپا......آپ ایسا کیسے کر سکتی ہیں......کیا آپ سب کچھ بھول چکی ہیں، فراموش کر چکی ہیں۔ میں آپ کو ایسا ہرگز کرنے نہیں دے سکتا۔ آپ کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا۔'' جذبات اور غصے کی کیفیت میں اسے اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ ورنہ آپا سے اس نے زندگی میں پہلے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ آپا کو بھی اس کی ذہنی کیفیت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اس لیے اس کے تند لہجے کو نظر انداز کرتے رسانیت سے بولیں۔
''میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے احمر......اور میں یہ بھی جانتی ہوں، تمہیں میرا یہ فیصلہ کبھی پسند نہیں آئے گا۔ اور تم اسے کبھی قبول بھی نہیں کرو گے......اسی لیے میں نے تمہارے ساتھ ایبٹ آباد نہ جانے کا سوچا ہے۔ اگر تم میرے فیصلے کو من وعن قبول کر لو گے تو میری ضد بھی ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا اب فیصلہ

تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' آمنہ نے دوٹوک لہجے میں اسے باور کرایا تھا۔ وہ کم عمر تھا، جذباتی تھا۔ اس لیے اس کے ظرف کا پیمانہ تنگ پڑ رہا تھا۔

''لیکن آپ وہ سب کچھ کیسے بھول سکتی ہیں۔ جو کچھ بڑے بھیا نے سالوں پہلے ہمارے ساتھ کیا تھا۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ ''میں تو ان کا وہ بے رحمانہ سلوک آج تک نہیں بھولا ہوں۔ نہ ہی ان کی بے حسی و..... بے پروائی کو اب تک فراموش کر سکا ہوں۔ وہ ہمارے ہی نہیں ابا کے بھی مجرم و قصوروار ہیں۔ پھر آپ کیسے ابا کی بے بسی و اکیلے پن کی اذیت اور بیچارگی سے بھری موت کو بھول سکتی ہیں۔ جس وقت ابا کو بڑے بھیا کے سہارے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ وہ اپنے سسرال والوں کا ساتھ دے کر ان کے ساتھ خوشیاں منا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے فرض و ذمے داری میں صرف بیوی، بچوں کی خوشی کا خیال کیا تھا۔ بوڑھے باپ اور تنگ دست کمزور بہن، بھائی کا ساتھ نہیں دیا۔ ان کی بے حسی، خود غرضی اور مفاد پرستی نے ابا کو وقت سے پہلے موت کے منہ میں دھکیل دیا..... ورنہ ابا کوئی ایسی موذی بیماری میں بھی مبتلا نہ تھے۔ جو اُن کی موت کا باعث بن جاتی۔ سگے خونی رشتے کی بے پروائی اور بے حسی نے ابا کو جیتے جی مار دیا۔ اور آج آپ سب کچھ فراموش کر کے پرانے بلکہ مردہ ہو چکے رشتوں کو جوڑنے کی بات کر رہی ہیں۔ ان کا سہارا بننے کی بات کر رہی ہیں۔ جنہوں نے برسوں پہلے ہم سے اپنا ہر رشتہ ناتا توڑ دیا تھا۔ بے سہارا کر دیا تھا۔''

احمر آج ان کے سامنے جیسے پھٹ پڑا تھا۔ اس کا لہجہ تند و تیز ہونے کے بعد ابا کے ذکر پر دکھ اور غم سے بھرا ہوا تھا مگر وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اور اس کی باتیں سن کر ماضی کے گزرے دنوں کا کرب اور اذیت آمنہ کے چہرے سے بھی چھلکنے لگا۔ مگر وہ ہمیشہ سے ضبط کرنے کا سلیقہ جانتی تھیں بلکہ لہجے میں ٹھہراؤ اور تحمل مزاجی کے ساتھ درگزر کر دینا ان کی فطرت کا خاصہ تھا۔ وہ تینوں ایک ہی ماں باپ کی اولاد تھے۔ مگر مزاج اور ظرف کے پیمانے میں آپا کا پلڑا سب سے بھاری تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی تھیں، انہیں سب یاد تھا۔ مگر کیا کرتیں..... ان کا خون سفید نہیں ہوا تھا۔ جو سگے خونی رشتے کو آزمائش و پریشانی میں مبتلا دیکھ کر بھی نظر انداز کر دیتیں۔ نہ ہی وہ بڑے بھیا کی طرح بے حس تھیں۔ جنہوں نے غیروں پر بھروسا کر کے زندگی کا سب سے بڑا دھوکا کھایا تھا۔ جس سالے کے ساتھ مل کر پارٹنر شپ پر کاروبار کیا تھا۔ اسی نے کاروبار میں خسارہ دکھا کر بڑے بھیا کو نہ صرف کاروبار سے..... بے دخل کیا بلکہ ان کے گھر پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اور وہ کچھ نہیں کر سکے تھے۔ سوائے چپقی بیوی کو لعن طعن کرنے کے..... جوان ہوتی اولاد کے سامنے بیوی کو چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ شاہینہ بھابی کو بھی اپنی زیادتیوں کا احساس ہو گیا تھا۔ شاید انسان ٹھوکر کھانے کے بعد ہی سنبھلتا ہے۔ شاہینہ بھابی کو بھی اپنی غلطیوں، کوتاہیوں اور بے حسی کا اعتراف بالآخر کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ بے حسی، مفاد پرستی اور خود غرضی کا یہ لبادہ تو انہوں نے صرف سسرالی رشتوں کے لیے اوڑھا ہوا تھا۔ اپنے سگے خونی رشتوں کے لیے تو وہ آنکھ بند کر کے خون بھی پانی کی طرح بہانے کو تیار تھیں۔ جس کا خمیازہ وہ بھگت چکی تھیں۔ اب آنکھوں کو کھرے، کھوٹے کی پہچان ہوئی تو فون کر کے برسوں بعد نند (آمنہ آپا) کو فون کر کے معافیاں مانگی جا رہی تھیں۔ ساتھ ہی اپنے گھریلو خستہ حالات کا بھی ذکر کیا تھا۔

بڑے بھیا کاروبار ختم ہونے کے بعد کسی گارمنٹ شاپ پر سیلز مین کی جاب کر رہے تھے۔ کرایے کے چھوٹے سے گھر میں تین بچوں کے ساتھ رہائش پزیر تھے۔ آپا نے فون پر بھابی کی زبانی یہ ساری کتھا سن کر ان کے مسائل کا سادہ سا حل پیش کر دیا تھا۔ جسے جان کر احمر ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ اسے آپا کی یہ اعلیٰ ظرفی اور درگزر کر دینے والی خوبی زندگی میں پہلی بار بہت بری لگی تھی۔ وہ اپنے بچپن کی محرومیوں کو ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ اسی لیے کسی کو معاف کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ مگر احمر کے یاد دلانے پر ماضی کی ساری اذیتیں، کرب بن کر آپا کے چہرے سے بھی جھلکنے لگی تھیں۔ جب وہ کچھ

لمحوں کے توقف کے بعد بولیں تو ان کے لہجے میں بھی کرب بہت نمایاں تھا۔

''کچھ نہیں بھولی ہوں احمر..... انسان شاید خوشی و طمانیت کے دنوں کو جلدی فراموش کر دیتا ہے۔ لیکن دکھوں اور غموں کو سدا اپنے سینے سے لگا رکھتا ہے۔ جن کی کسک مرتے دم تک انسان کے ساتھ رہتی ہے اور میرے جیسے حساس دل کے مالک لوگوں کے دلوں میں تو ایسے دکھ، گہرے گھاؤ، اور ناسور پڑ جاتے ہیں جو کبھی بھلائے نہیں بھولتے۔ مگر میں کیا کروں..... قدرت نے میری فطرت ہی ایسی بنائی ہے۔ میں چاہے کچھ نہ بھولوں، چاہے معاف بھی نہ کروں لیکن یہ تو کبھی نہیں بھلا سکتی کہ بڑے بھیا، ابا ہی کا خون ہیں۔ ہم تینوں سگے رشتے میں بندھے ہیں اور خونی رشتے زمین پر بنائے نہیں جاتے۔ اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم چاہ کر بھی ان سے انحراف نہیں کر سکتے۔ اس لیے تم بھی مان لو، بڑے بھیا ابا کی ذات کا حصہ ہیں۔ ان کی اولاد ہیں، وہ آج بھی ہمارے خاندان میں شامل ہیں۔ آج وہ حالات کی ستم ظریفی کے پھیرے میں آ کر آزمائش و پریشانی میں مبتلا ہیں۔ انہیں ہمارے ساتھ اور سہارے کی ضرورت ہے۔''

''سہارے کی ضرورت تو اس وقت ہمیں بھی تھی آپا..... مگر انہوں نے ہمیں بے سہارا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے آج یہ سب ان کے برے اعمالوں کا نتیجہ ہے۔ جو وہ اس آزمائش میں مبتلا ہیں۔ انسان دنیا کی کھیتی میں جو کچھ بوتا ہے اسی کی فصل کاٹنی پڑتی ہے۔ ببول کی فصل اگا کر گلاب کا پھل تو انعام میں نہیں ملے گا۔ وہ بھی اپنے کرموں کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ لہٰذا انہیں کاٹنے دیجیے گا کیونکہ میں آپ کی طرح کشادہ دل اور اعلیٰ ظرف نہیں ہوں۔ جو آسانی نے سب کچھ بھلا کر معاف کر دوں۔ بچپن سے لے کر آج تک جو محرومی اور اذیت میں نے سہی ہے۔ اب اس کا احساس سزا کی صورت بڑے بھیا کو بھی جھیلنا چاہیے۔ اگر ہم ان جیسے لوگوں کو آسانی سے معاف کر دیں گے تو دنیا میں ''مکافاتِ عمل'' کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اگر سب ہی برے لوگوں کو ان کے برے اعمالوں پر خونی رشتوں کا فائدہ دے کر معاف کر دیا جائے تو پھر دنیا میں دوسرے لوگوں کو عبرت کا سبق کیسے مل سکے گا۔ معاشرتی روایتوں کی اصلاح کیسے ہو سکے گی۔ لوگ تو یہی سوچ کر گناہوں اور برے اعمالوں میں مبتلا رہیں گے کہ بعد میں معافی مانگ کر سرخرو ہو جائیں گے۔ اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ کسی بھی انسان کو اس کے برے اعمالوں کی سزا دیے بغیر آسانی سے معاف کر دیا جائے۔''

احمر کے خیالات جان کر آپا ڈر سی گئی تھیں۔ مانا کہ وہ کچھ غلط نہیں کہہ رہا تھا مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ... سب انسان ہیں اور غلطیاں گناہ ہم جیسے انسانوں سے ہی سرزد ہوتی ہیں۔

''آپ مجھے غلط مت سمجھیں آپا..... میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اگر بندے کو اس کے برے عمل کی سزا نہ ملے تو وہ بار، بار اپنے ان ہی اعمالوں کا اعادہ کرتا رہتا ہے۔ آخر سزا و جزا کا تصور یوں ہی تو ہم انسانوں کے لیے پیش نہیں کیا گیا ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے آپا..... جو برا عمل کرتا ہے، سزا بھی پاتا ہے۔ لہٰذا اس قدرتی قانون میں ردو بدل نہ کیا جائے۔ یہی ہم انسانوں کے حق میں بہتر ہے۔'' احمر کے اندر برسوں کی محرومی سے پکنے والے لاوے کو آج زبان ملی تھی تو وہ صبر نہیں کر سکا تھا۔ حالانکہ صبر و برداشت کی تلقین تو آپا نے اسے بچپن سے کی تھی۔ پھر بھی وہ شکوہ کر رہا تھا۔

''خدا نہ کرے احمر..... جو میں قدرت کے بنائے اصولوں میں تبدیلی کی گناہ گار ٹھہروں..... تمہارے سب دلائل اپنی جگہ درست سہی مگر قدرت نے ہی صلۂ رحمی، معاف اور درگزر کرنے کا درس دیا ہے۔ اور پھر ہم سب انسان ہیں۔ جو خطا کا پتلا ہے، لہٰذا ہم انسانوں کی خطاؤں پر سزا دینے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں کسی بھی دوسرے انسان کو اس کے کسی بھی اچھے، برے عمل کی سزا دینے والے۔ اللہ پاک نے یہ اختیار ہم

انسانوں کو نہیں دیا ہے، اس لیے تم بھی خود کو گناہ گار مت بناؤ..... رہی بات سزا و جزا کے تصور کی تو انسان کو اس کے برے کاموں کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے۔ کبھی جلدی اور کبھی دیر سے۔ یہی قدرت کا قانون اور انصاف ہے۔ اب اس سے کون عبرت کا سبق لیتا ہے۔ کون نہیں..... یہ ہر انسان کا اپنا شعور ہے۔''

وہ، آپا کی کسی بات سے کبھی انحراف کر ہی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے حرف بہ حرف درست کہا تھا۔ وہ بس اسے ہر حال میں قائل کرنا چاہتی تھیں۔

''اور مجھے اپنی تربیت پر پورا بھروسا ہے احمر..... تم میری تربیت کا بھرم اور مان ضرور رکھو گے۔ سب کچھ بھول کر ان لوگوں کو معاف کر دو گے۔'' آپا نے پورے یقین سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بے بسی سے انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر یہ ان کی پرورش و تربیت ہی کا اثر تھا جو وہ آپا کی کہی کسی بات سے اختلاف نہیں کر سکا تھا۔ بس صرف اتنا کہا تھا۔

''آپ بہت اعلیٰ ظرف اور کشادہ دل ہیں آپا..... مگر میں شاید اتنے سالوں کی اذیتوں کو چند لمحوں یا دنوں میں بھلا دینے پر قادر نہیں ہوں۔ آپ انہیں معاف کر دیں۔ میں ابھی نہیں کر سکوں گا۔ تاکہ بڑے بھیا کو احساس ہو سکے۔ جن رشتوں کو انہوں نے خونی رشتوں پر ترجیح دے کر اپنا حقیقی اور مخلص رشتہ سمجھا تھا۔ آج انہوں نے ہی آستین کا سانپ بن کر ڈس لیا ہے۔ مگر حقیقی مخلص خونی رشتوں نے پھر بھی ان کو آزمائش کے وقت تنہا نہیں چھوڑا۔ آپ خوشی سے یہ گھر اُن کے حوالے کر دیں۔ جس کا وہ شرعی و قانونی حصہ برسوں پہلے وصول بھی کر چکے ہیں۔ میں منع نہیں کروں گا۔ لیکن انہیں معاف ہرگز نہیں کروں گا۔'' احمر نے منہ پھلاتے ہوئے کہا تھا وہ واقعی جذباتی حد تک خاصا نڈھال ہو چکا تھا۔ لہٰذا اسے منانے کے لیے سدا کی نرم مزاج آپا کو تھوڑی سختی دکھانی پڑی تھی۔

''ٹھیک ہے..... اگر تم میرے فیصلے کو راضی، خوشی تسلیم کرنا نہیں چاہتے تو میں بھی تمہارے ساتھ ایبٹ آباد نہیں جاؤں گی۔ تم شادی کے بعد اکیلے ہی امل کو لے کر وہاں چلے جانا۔''

آپا نے گھر کی نچلی منزل کو بڑے بھیا کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور اوپری منزل کو نئے کرایے داروں کو دینے کا سوچا تھا تاکہ بعد میں احمر کو ضرورت ہو تو وہ یہاں آ کر گھر کا اوپری پورشن استعمال کر سکے۔ بس اسی بات پر احمر مزید روٹھ گیا تھا۔ انہوں نے اپنا اور احمر کے حصے کا حق بھی بڑے بھیا کی فیملی کو دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ تڑپ کر ان کے بے تاثر چہرے کو دیکھتا اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اور شکوہ کیے بنا نہ رہا تھا۔

''آپ جانتی ہیں، میں آپ کے بغیر کہیں بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ آپ کی گود میں سر رکھ کر ہمیشہ جنت کی ٹھنڈک محسوس کی ہے۔ پھر میں اپنی جنت سے دور رہ کر کیسے وہاں خوش رہ سکوں گا پیاری آپا.....'' احمر نے روہانسے لہجے میں کہا تو آپا نے نرمی سے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر ماتھا چوما تھا۔

''تو پھر میری بات مان لو چندا..... بڑے بھیا اور بھابی کو معاف کر دو۔ انہوں نے اپنے حصے کی سزا جھیل لی ہے، شرمندہ اور نادم بھی ہیں، پچھتا بھی رہے ہیں۔ اب تم بھی ظرف کو بڑا کرو..... انہیں معاف کر دو۔ کیونکہ معاف اور درگزر کرنا اللہ پاک کے نزدیک بہترین عمل ہے۔'' جواباً احمر نے ان کے ہاتھوں کو تھام کر آنکھوں سے لگایا تھا۔

''ٹھیک ہے آپا..... میں نے انہیں معاف کیا۔ اللہ کی رضا کی خاطر..... آپ کی محبت کی خاطر..... میں نے انہیں معاف کیا۔'' بالآخر احمر نے ہار مان لی تھی۔

''اللہ تمہیں اس کی جزا دے گا احمر..... اور میری دعا ہے..... تم ہمیشہ شاد و آباد رہو..... ترقی کرو، کامیابیاں پاؤ..... اللہ تمہیں ہر آزمائش سے دور رکھے، آمین۔''

جواباً احمر ان کے پُرنور چہرے کو عقیدت سے دیکھنے لگا اور آپا بیٹے جیسے چھوٹے بھائی کے بے ریا چہرے کو دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

❁❁❁

صراطِ عشق

دلشاد نسیم

موجِ صبا، اے جانِ سحر میں یہاں پہ ہوں
تُو آ کے میرے دل میں اتر میں یہاں پہ ہوں
کیوں بے کلی سے پھر رہا ہے تُو گلی گلی
اے آسماں کے چاند اتر میں یہاں پہ ہوں

انسان کی خود مختاری... اس کے قلِ کُل ہونے کا غرور بسا اوقات فریب کے تانے بانے بُننے لگتا ہے... اور یہ تانے بانے ریشم کے نہیں، مکڑی کا جال ہوتے ہیں... مگر اس بات کو سمجھنے تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے...

"صراطِ عشق" ایسے ہی خود ساختہ، فریبی تانوں بانوں سے بُنی ایک کہانی ہے... جو کہیں، کہیں سے سچ بھی ہے اور کہیں پر زیبِ داستاں کے لئے کورے کاغذ پر رنگین لفظوں سے کشیدہ کاری کرنے کی جسارت بھی کی ہے...

یہ ارادوں اور خوابوں کے ٹوٹنے کی کہانی ہے...

محبت میں جینے اور محبت میں مرمٹنے کی کہانی...

محبت کی اگلی حد... جب محبوب پاس نہیں مگر آنکھ اس کے خواب دیکھنے لگتی ہو... وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے، جاننے لگتی ہو...

ممتا کی آفاقی محبت... دنیاوی محبوب کی فرقت کی کسک... کچھ ملنے اور بہت کچھ کھونے کا المناک قصہ ہے... یہ داستانِ عشق...

اس پل صراطِ عشق پہ لایا ہے مجھ کو عشق
اب پھونک پھونک کر مجھے رکھنا ہے ہر قدم

pklibrary.com

pklibrary.com

آج سب بہت خوش تھے۔

باؤ جی کے دل کی مراد بر آئی تھی۔ ارزش احمد نے مقابلے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور اسے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔

بے جی صبح سے سفید حویلی کے گول کمرے میں اپنے منقش تخت پر ہلکے آسمانی سادہ جوڑے میں ملبوس بیٹھی مبارکیں وصول کر رہی تھیں۔ آسمانی شیفون کا دوپٹا سر پر سلیقے سے جما ہوا تھا مگر کبھی کبھی ہوا اس کو چھوتی تو وہ لہراتا اس میں جان سی آ جاتی۔ ایسی ہی جان بے جان مرجھائی ہوئی بے جی میں بھی پڑ چکی تھی۔ پچپن سال کی بے جی اپنی عمر سے کئی سال بڑی دکھتیں۔ بڑے عہدوں کے بڑے چلن ہوتے ہیں۔

خود باؤ جی ساٹھ سال کے بھی نہ تھے لیکن پنچایت میں اپنی دھاک بٹھانے کے لیے کبھی سر کے سفید بالوں کی پروا کی نہ داڑھی کو رنگا ان کے انداز میں جلال کے ساتھ، ساتھ وقار بھی تھا۔ مقابل ہمیشہ سر جھکا کر بات کرتا۔

ارزش احمد ٹھہرا آج کا لڑکا اس کو اس شان و شوکت سے دلچسپی تھی نہ اسے اس کی خواہش تھی۔ وہ تو سی ایس ایس بھی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر باپ کی آرزو پیروں کی زنجیر بن گئی۔ قریب تھا کہ وہ گھر سے بھاگ جاتا۔ اسے حویلی چاہیے تھی نہ حویلی کی یادداشتیں۔ جس رات اس نے کہا کہ اب صبح گھر سے جانے کے بعد وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ وہ کیا گھر ہے جہاں اسے اتنی سی آزادی نہیں کہ اپنی مرضی سے اپنا کیریئر ہی چن سکے۔

اسی رات اس کی حسین باوقار ماں کو دل کا پہلا دورہ پڑا۔ دورہ اگرچہ بہت شدید نوعیت کا نہیں تھا لیکن غنودگی میں وہ ارزش احمد کو پکارتی رہیں۔ اسے جب ڈاکٹر نے بلایا اور پوچھا۔

''ارزش احمد کون ہے؟''

ارزش نے خوف زدہ ہو کر ڈاکٹر کو دیکھا کہ جانے یہ کیا کہنے والا ہے۔

''پیشنٹ آپ کو یاد کر رہی ہیں۔'' ڈاکٹر مسکرایا۔

''ماں اور اولاد کا رونِ ازل سے ہی درد کا رشتہ ہے۔ تکلیف ماں کو ہو تو بھی وہ اپنے لاڈلے بچے کو آواز دیتی ہے اور اگر بچہ بیمار ہو تو..... بس لبوں پر ماں۔'' ارزش مسکرایا۔

''بے ہوشی میں بھی آپ ہی کو بلاتی رہی ہیں۔''

باؤ جی نے قطعی برا نہ منایا۔ ارزش احمد آئی سی یو میں آ گیا۔

بے جی کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ وہ سفید رنگ نہیں پہنتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں۔ ''میرے سر کا سائیں سلامت رہے میں کیوں پہنوں یہ رنگ۔''

اس وقت وہ خود سفید ہو رہی تھیں۔

''بے جی۔'' ارزش بچوں کی طرح ماں کے گلے لگ گیا۔ آنکھوں میں نمی محسوس ہو رہی تھی۔ ماں کا چہرہ بھی دھندلا گیا تھا۔

''کیا ہو گیا تھا بے جی؟'' ارزش نے سرگوشی کے انداز میں شکوہ کیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ بے جی کا نرم ملائم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما اور صرف اتنا ہی پوچھ سکا۔

بے جی کی آنکھوں سے آنسو نکلے اور تکیے میں جذب ہو گئے۔

''میں نے خواب دیکھا۔ تو مجھے چھوڑ کر جا رہا ہے۔'' ارزش رونا بھول گیا۔

''بے جی خواب میں دیکھا اور دل کا دورہ سچ مچ پڑ گیا۔''

''اور.....'' کے بعد کا جملہ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

''اگر تم نے کہیں جانے کا ارادہ کرلیا ہے تو میں تمہیں روکوں گی نہیں۔'' بے جی مسکرادیں۔

ارزش خاموش ہی رہا۔ دل کا چور لپک رہا تھا۔ سر اٹھا رہا تھا۔ ارزش نادم تھا۔ اسے تو اس بات کا احساس بھی نہیں تھا کہ ماں نے اپنے دل میں اسے ایسے رکھا ہوا ہے کہ بچ نکلنے کا راستہ ہی کوئی نہیں۔

''آپ ایک دو دنوں میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ پھر گھر چلیں گے۔'' پھر بے جی کے انجکشن کا وقت ہو گیا تھا سسٹر آ گئی تھی۔ باہر باؤ جی اور بے جی کے بھائی ولایت احمد تھے۔ جواب ڈاکٹر کی اجازت سے ایک، ایک کر کے اندر جا رہے تھے۔

ولایت احمد سے ارزش کو خاص انس تھا۔ وہ عمر میں اس سے کافی بڑے تھے لیکن وہ باتیں جو ادب اور لحاظ کی وجہ سے باؤ جی سے نہ کر پاتا ولایت احمد سے کر لیتا۔ وہ پختہ ذہن کے سنجیدہ بردبار شخص تھے ان کی باتوں میں عجیب کشش تھی۔ جیسے لفظ نہ ہوں چھوٹے، چھوٹے مقناطیس رکھے ہوں۔ انسان کو اپنی طرف کھینچنے کا سارا ہنر جانتے ہوں۔

☆☆☆

جس شام بے جی گھر آئیں اور پورے گاؤں میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ مامی رضوانہ بھی ولایت ماموں کے ساتھ خبر گیری کے لیے آئی تھیں اور وہ بھی جس کی پلکوں کے نیچے لاکھوں، کروڑوں جگنو جلتے تھے۔ نین تارہ اس کے ماموں کی بیٹی لیکن ولایت ماموں کی نہیں۔ نین جب پانچ سال کی تھی اس کے ماما، بابا ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے اس کو ولایت ماموں اور رضوانہ مامی نے بہت محبت سے پالا تھا۔ وہ چھوٹے ماموں وقار احمد کی بیٹی تھی۔

نین تارہ انتہائی مشرقی لڑکی تھی چوڑی دار پاجامے کرتے، بڑا سا دوپٹا نازک سی پازیب والے سفید پیروں میں کولہاپوری یا کبھی کبھی کھسا پہنا ہوتا۔ ارزش بے جی کے پیر اپنے زانو پر رکھے ہلکے ہاتھوں سے مسلسل دبا رہا تھا۔ بے جی کو دلی سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

''تو کب سے شروع ہیں امتحان؟'' ولایت ماموں نے ارزش کو مخاطب کیا۔ وہ انہی امتحانوں کی بات کر رہے تھے جس سے وہ بھاگ رہا تھا۔

''دو ماہ ہیں ابھی۔'' اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

دونوں کے درمیان صرف ماموں بھانجے والی بات نہیں تھی۔ سو ولایت نے ارزش کے ایک جملے سے اندازہ لگا لیا۔

''وقت ہو تو میرے پاس آنا۔''

ارزش مسکرا دیا۔ گویا آ جائے گا۔

شام ہوئی سب چلے گئے۔ نین تارہ کی آنکھوں کے سارے چراغ اس کی آنکھوں کے اندر ہی جلتے اس نے کبھی ارزش سے کچھ نہیں کہا مگر ایک دھڑکن اسے دیکھ کر ضرور گم ہو جاتی تھی۔ اس کا کتنا جی کرتا، ارزش اس سے کچھ کہے۔ کوئی بات، موسم کی ہی چاہے کوئی بات تو کرے۔

ارزش بھی کیا کرتا۔ اس کی اپنی الجھنیں بہت تھیں۔ رات جب ملازمہ نے بتایا بے جی نے سوپ پی لیا ہے تو وہ باپ بیٹا بھی کھانے کے کمرے میں آ گئے۔

''مجھے تمہاری ماں نے بتایا کہ اس نے خواب میں دیکھا، تم گھر چھوڑ کر جا رہے ہو؟''

ارزش کو پانی پیتے، پیتے پھندا لگنے ہی والا تھا کہ اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''وہ تو خواب کی بات ہے ناں۔''

''تمہاری ماں کے خواب جھوٹے نہیں ہوتے۔''

ارزش نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔

''لیکن میری خواہش ہے یہ خواب جھوٹا ہو۔''

ارزش نے ہاں یا نہ کچھ بھی نہ کہا۔ وہ سوچ رہا تھا مقابلے کا امتحان..... سی ایس ایس۔ جانے کیا ہو۔ اگر میں فیل ہو گیا تو باؤ جی کا سر پورے گاؤں والوں کے سامنے جھک جائے گا اور میں پاس ہو ہی نہیں سکتا۔''

''اماں سے دعا لیا کرو۔ پاس ہو جاؤ گے۔'' وہ حیرت سے باپ کو دیکھنے لگا۔

پھر بے دلی سے لقمہ اٹھا کر منہ میں رکھا اور چبانے کا عمل شروع کر دیا۔ وہ اس محفل کو ذہنی طور پر برخاست کر چکا تھا۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ میں جو سوچتا ہوں سب کو کیوں اور کیسے پتا چل جاتا ہے۔ ماں کی دعا میں بے شک بہت طاقت ہوتی ہے لیکن اسے پڑھنا تو پھر بھی پڑے گا ہی۔ صرف دعاؤں سے کام چلتا ہوتا تو آج سارے بچے ڈاکٹر، انجینئر اور سی ایس ایس آفیسر ہوتے۔

وہ دیکھ رہا تھا باؤ جی بول رہے ہیں۔ لیکن کیا؟ اس نے کان نہیں دھرے، کھانا کھا کر باؤ جی سے اجازت لے کر وہاں سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

کل اسے ولایت ماموں سے ملنے جانا تھا۔ ارزش نے ایک گہری سانس لی۔ وہ بھی پاکستان اور پاکستان میں رہ کر اس کی خدمت پر لیکچر دیں گے، وہ بدمزہ ہونے لگا۔

ماڈرن طرز سجاوٹ سے آراستہ حویلی جس کے انتہائی کونے میں رائٹنگ ٹیبل پر دنیا جہان کی کتابیں اور اخبار رکھے تھے۔ پولیٹیکل سائنس اس کا مضمون تھا اور یہ مضمون اس کے باؤ جی کا پسندیدہ مضمون تھا۔ ارزش نے کتابوں سے ایسے آنکھیں چرائیں جیسے کبھی نہ دیکھنا ہو۔ وہ اپنے بیڈ روم میں آ چکا تھا۔

خاموش کمرے میں گھڑی کی ٹک ٹک وقت گزرنے کا احساس تو دلا رہی تھی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اور وہ جو کہتے ہیں سولی پر بھی نیند آ جاتی ہے۔ آ جاتی ہو گی کسی پہر سو اسے بھی آ گئی۔ صبح ہوئی تو ولایت ماموں کے گھر جانا اس کے ذہن پر سوار تھا۔ دن ماں کے ساتھ گزار کر وہ شام کو ولایت ماموں کی طرف چلا گیا۔ سیاہ شلوار قمیص پر سیاہ واسکٹ پہنے ہوئے اس کی گندمی رنگ کھل رہی تھی۔ ویسے بھی نین تارہ کئی بار کہہ چکی تھی کہ ارزش پر سیاہ رنگ خوب بجتا ہے۔ سیاہ کھیڑیوں میں اس کے پاؤں کی رنگت اور بھی خوب صورت ہو جاتی۔ شاید اسی لیے ارزش سیاہ رنگ اور سیاہ کھیڑی جان بوجھ کر ماموں کے ہاں پہن کر جاتا۔

''ماموں کہاں ہیں؟''

نین ہی اس کو ریسیو کرنے گیٹ تک آئی تھی۔ اس نے پہلا سوال ہی یہ کیا۔

''معلوم ہے تم انہی سے ملنے آئے ہو۔'' نین نے سادگی سے شکوہ کیا۔

ارزش شرمندہ ہو گیا۔

''تم کیسی ہو؟''

''تمہارا انتظار کر رہی تھی۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔''

''انتظار میں انسان جیسا ہوتا ہے۔ میں ویسی ہوں۔''

کبھی، کبھی وہ اس موڈ میں نہیں ہوتا تھا کہ اس کی پہیلیاں سننا اور ان کو حل کرنا۔ وہ جھنجلا گیا۔

''تم سیدھا جواب نہیں دے سکتی ہو۔''

نین کو یقیناً برا لگا تھا۔ اس نے آرام کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''بیٹھو، میں بابا کو بتا کے آتی ہوں۔''

وہ چلی گئی۔ مگر ارزش بیٹھا نہیں۔ وہ سوچ رہا تھا ولایت ماموں کو کیسے قائل کرنا ہے۔ اسے یہ سب کچھ نہیں پڑھنا... بس باہر جانا ہے۔ نئی دنیاؤں کی تلاش کرنی ہے۔ گھومنا ہے۔ پھرنا ہے۔ زندگی جینی ہے۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ سامنے سے پُروقار انداز میں چلتے ہوئے ولایت ماموں آگئے تھے وہی پُرتپاک انداز وہی شفیق مسکراہٹ، ارزش بغلگیر ہوا تو اس کے اپنے انداز میں پہلی سی وارفتگی نہیں تھی۔ ولایت احمد مسکرادیے۔

''پریشان ہو؟''

''نہیں۔'' ارزش جانتا تھا وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

''تمہاری چھمی (گلے لگنا) میں محبت کی گرمی کم ہے۔'' انہیں اللہ نے بڑی سعادت دی تھی۔

''ماموں جان میں اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔'' اس نے بغیر کسی پس وپیش کے کہہ دیا۔ ''اور تمہاری مرضی کیا ہے؟'' وہی مسکراہٹ، زیر کردینے والی۔ مگر ایسا صرف وہ ہی سوچتا تھا ورنہ وہ تو سب کے لیے بہت شفیق تھے۔

''کم سے کم سرکاری ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔''

''میں کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ تم امتحان دے دو۔''

''اگر فیل ہوگیا تو؟''

''تو۔ دوبارہ دے دینا۔ تین بار کا چانس تو ہوتا ہے ناں۔''

''ماموں جان۔'' وہ مسکرادیے۔

''دیکھو تم گھر سے جانا چاہتے تھے۔ جاسکے؟ نہیں ناں۔ اب تم پیپر نہیں دینا چاہتے مگر دو گے۔ بھاگ نہیں سکتے تو دے دو پیپرز سکون سے۔''

اور واقعی اس نے سکون سے پیپر دے دیے۔ سوچا اگر فیل ہوگیا تو ہزار غریبوں کو مفت کھانا کھلائے گا لیکن اس کو نہیں معلوم تھا۔ باؤ جی نے اس کے پاس ہونے پر اس سے بھی بڑی منت مان رکھی ہے۔ اس کے ہزار لوگوں والی منت پر اللہ میاں ایک بار تو مسکرا ہی دیے ہوں گے۔ جس روز رزلٹ آیا بے جی آسمانی رنگ کا سوٹ پہنے شیفون کا دوپٹا سر پر لیے کوئی نورانی آسمانی مخلوق لگ رہی تھیں۔

ارزش بہت خوش نہیں تھا۔ مگر سب خوش تھے۔ اسے خوش ہونے کی ایکٹنگ کرنی پڑ رہی تھی۔

''تم خوش نہیں ہو؟'' نین تارہ نے بھی اس کی جھوٹی خوشی کے اظہار کو پہچان لیا۔

''تمہیں پتا تو ہے، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''یہی سہی۔ لیکن اداکاری کا جوہر بھی تمہارے پاس نہیں ہے۔'' ارزش نے نین کو گھورا۔

''ڈپٹی کلکٹر صاحب۔ بڑے بڑے لوگوں سے اب تو ملنا پڑے گا آپ کو۔ میری مانیں تو کوئی اداکاری کا تربیتی کورس کرلیں۔''

''فضول باتیں مت کرو۔'' ارزش اکتا رہا تھا۔

''ویسے میں نے بھی سوچ لیا ہے۔ تمہاری آن بان دیکھ کر جی للچا گیا ہے۔''

''مطلب؟''

''میں بھی سی ایس ایس کروں گی۔''

''گڑیا گڈے کا کھیل نہیں ہے یہ۔'' ارزش نے مذاق اڑایا۔

''اس لیے تو کرنا ہے۔ میری کون سی اب گڑیا گڈے کے کھیل کی عمر رہ گئی ہے۔''
نین ہنس دی تھی۔

☆☆☆

سب خوش تھے بے جی تین ماہ بعد کمرے سے باہر آئی تھیں۔ سب کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ باؤ جی بات بے بات قہقہے لگا رہے تھے۔
''دیکھا یہ ہوتی ہے ماں کی دعا۔ ہو گیا ناں کامیاب۔''
ارزش نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ دل بہت مچلا کہ کہے میری اپنی کوشش اور محنت بھی ہے مگر بے جی کے معصوم چہرے پر فاتحانہ چمک تھی، ارزش خاموش رہا۔ اسے یقین سا ہو گیا کہ اس کی ماں کی دعا ہی لگی ہے۔
رات بے جی کے پیر دباتے، دباتے اس نے بہت محبت سے کہا۔
''بے جی اگر آپ کی دعا نہ ہوتی تو میری محنت پر پانی پھر جانا تھا۔''
''پانی کیسے پھرتا۔ تو نے اتنی محنت کی ہے۔ کیا میں جانتی نہیں۔''
''آپ تو سب کچھ جانتی ہیں بے جی۔ وہ بھی جو خواب میں آجاتا ہے۔''
بے جی مسکرا دیں۔
ارزش بھی ہنس دیا۔

☆☆☆

آدھا راستہ طے ہوا ہے
آدھا رستہ باقی ہے
جانے کیا، کیا جھوٹ پکار
جانے کیا، کیا باقی ہے
اور کچھ، کچھ روشنی بھی
آدھا سورج ڈھل گیا ہے
یعنی آدھا باقی ہے

ارزش ٹریننگ کے لیے اکیڈمی جا چکا تھا۔ بہت خاموش دن تھے۔
''اکیڈمی ہے یا جیل..... کوئی رابطہ نہیں۔'' شام کو پودوں کو پانی دیتے، دیتے نین تارہ نے سوچا۔ گملوں میں موتیا اور رات کی رانی کی کلیاں مہک رہی تھیں۔ پودوں کو پانی دے کر نین تارہ نے موتیا کے پھول توڑے اور دوپٹے کے کونے میں رکھنے لگی۔ گجرا بنایا اور بے جی کو دینے کے بہانے حویلی چلی آئی۔ بے جی کے بالوں میں گجرا لگا کے دوپٹا سر پر اوڑھا دیا۔
''بہت خوشبو دار ہیں۔'' بے جی نے مسکرا کے نین تارہ کے نرم و نازک ہاتھ تھامے اور چومنے کی غرض سے قریب کیے۔
''دیکھو تو کیسی خوشبو آرہی ہے۔''
نین تارہ مسکرا دی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی نمی تھی۔
''جاؤ ارزش کے کمرے سے ہو آؤ۔''
نین تارہ نے ڈر کے دیکھا۔

''آپ نے کیسے جانا کہ میں اس کے کمرے میں جانا چاہتی ہوں۔''
''تمہاری آنکھوں کی نمی نے بتایا ہے۔''
نین تارہ نے سر جھکا لیا۔
''پھر آجانا میرے پاس ہم دونوں ارزش کی باتیں کریں گے بہت ساری۔ جانتی ہو۔ محبت کا مزاج ایک سا ہے۔ پودا چاہے کسی کے دل میں پھوٹے۔ یہ محبت ہر وقت اسی کا ذکر چاہتی ہے۔ اپنے ہونے کا غرور چاہتی ہے۔ تم ہو آؤ اس کے کمرے سے۔''
اور نین تارہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھ آئی۔ ارزش کا کمرا اس کے جانے کے بعد بھی ویسا ہی تھا۔ صاف ستھرا جیسے وہ ابھی ابھی تیار ہو کر نکلا ہو۔ ایسی خوشبو جیسے اس کے لباس سے آتی تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد کافی دیر تک اس کی یاد سے آتی تھی۔ ایسی ہی خوشبو سے پورا کمرا مہکا ہوا تھا۔
نین تارہ نے لمبی سانس لی اور اپنے اندر ساری خوشبو بھر لی۔ اس کے ہاتھوں سے خود بھی خوشبو آرہی تھی۔ محبت کے مزاج جیسی۔ جیسے پھولوں کو ایک بار چھو لو تو ہاتھوں سے نہیں جاتی خوشبو اسی طرح ایک بار محبت کو محسوس کر لو تو زندگی سے نہیں جاتی۔

☆☆☆

یونیورسٹی کی لائبریری میں نفسیات کے تمام موضوعات کی ہیلپنگ بکس سامنے رکھے نین تارہ اپنے رجسٹر پر پنسل سے اسکیچ بنا رہی تھی۔ اس کو پنسل اسکیچنگ کا جنون تھا۔ اور اس کی یہ صلاحیت خداداد تھی۔ اب بھی اس بے جان اسکیچ میں اس نے پنسل سے جانے کیسے شیڈ دیا کہ آنکھیں روشن ہو گئیں اور جب آنکھیں روشن ہوئیں تو وہ مسکرا دی۔ اسے لگا پنسل کا یہ اسکیچ اب اس سے باتیں بھی کرنے لگے گا۔ ٹھیک اسی وقت صدف نے آکر اس کا موڈ خراب کر دیا۔
''ابھی آنا تھا تمہیں۔''
صدف نے اسکیچ دیکھا اور کتابوں کے ڈھیر کو۔
''آنا تو واقعی نہیں چاہیے تھا۔ تم اپنے محبوب سے باتیں جو کر رہی تھیں۔''
''دیکھو مجھے دیکھ رہا ہے ناں ارزش۔ ہو بہو۔ وہی ہے ناں..... اس کے بالوں کا انداز، آنکھوں کی چمک۔ مجھے دیکھنے کا انداز ایسا ہی ہے۔''
''جب سے موصوف اکیڈمی گئے ہیں تم پاگل ہو گئی ہو۔''
نین تارہ ہنس دی۔ وہ جب بھی ہنستی اس کی آنکھوں میں نمی ہلکورے لینے لگتی۔ لگتا اب روئی کہ تب۔ مگر وہ کمال مہارت سے سارا نمکین پانی اپنے حلق میں انڈیل لیتی۔
''تمہیں پتا ہے میں نے سوچا ہے کہ میں بھی ایسی ایسی کروں گی۔''
''سنو یہ ہمارے تمہارے بس کی بات نہیں۔ بہت پڑھنا پڑتا ہے۔ اور تم ہو کہ ارزش کے اسکیچ سے بھی باہر نہیں نکل پاتیں۔''
''اس سے وعدہ کیا ہے۔''
''برابری کرنا چاہتی ہو؟'' صدف حیران ہوئی۔
''نہیں، ہمیشہ ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ ہر پل، ہر لمحہ۔''
''وہ سنا ہے ناں تم نے کہ

لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے''

نین تارہ نے مسکرا کے صدف کو دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

اکیڈمی کی دنیا عجیب تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ کوئی کم ہی گھر والوں کو یاد کرتا۔ ان کے سامنے نئی دنیا نئی روشنیاں تھیں۔ ان کو پلٹ کر راستے دیکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ سوائے عبداللہ کے۔ جانے وہ کس زلف گراہ گیر کا اسیر تھا کہ رہا ہو ہی نہ پاتا۔ سب ہی اس کا مذاق اڑاتے اور وہ ہنستا رہتا اور جب اس کو بہت تنگ کیا جاتا تو وہ سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتا۔

''تم سب کیا جانو محبت کیا ہوتی ہے۔''

اور پھر سب کے بیان چلتے۔

کوئی کہتا۔ ''حماقت۔''

کوئی کہتا۔ ''پاؤں کی زنجیر۔ ایک حد سے آگے جانے ہی نہیں دیتی۔''

راشد نے کانوں کو ہاتھ لگا کے کہا۔ ''کولہو کا بیل'' بنا دیتی ہے یہ بس ایک ہی درخت کے ساتھ گول، گول گھومتے رہو۔ آنکھوں پر پٹی باندھے۔''

''محبت۔ کچھ بھی نہیں کہتی۔'' یہ ارزش تھا۔ نین تارہ جس کے اسکیچ بنا، بنا کے اپنے سائڈ ٹیبل کی دراز بھر رہی تھی۔

''یہ ایک ایسا ناپائدار عمل ہے کہ جب تک سامنے ہو محسوس ہوتا ہے اور جب نظروں سے دور ہو جاؤ، اپنی تپش کھو دیتا ہے۔ محبت پر میرا کوئی ایمان نہیں ہے۔'' یہ کسی دل جلے کی آواز تھی۔

''کیونکہ یہ نصیب والوں کو ملا کرتی ہے۔'' عبداللہ نے گہرے انداز میں کہا۔

''نصیب انسان خود بناتا ہے۔ ارادوں کی مضبوطی کے ساتھ، محنت کے ساتھ۔'' ارزش نے میز پر اپنا بھاری بھرکم مکا مارا۔

''تو کیا سمجھتا ہے تیرا یہاں تک آنا، تیرا ارادہ تھا؟''

''نہیں، میری محنت۔ میری محنت کے ارادے نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا۔''

''بیوقوف یہ نصیب ہے کہ تو یہاں تک پہنچا۔ بہت سے لڑکوں نے محنت کی۔ ارادے کیے مگر یہاں تک نہیں پہنچے۔''

عبداللہ جرح کے موڈ میں تھا۔

''دیکھو عبداللہ، یہاں تک پہنچنے کے لیے کچھ چیزیں بہت ضروری ہیں جیسے فیملی بیک گراؤنڈ، میری فیملی میں کئی سول سرونٹس میں جن کی وجہ سے مجھے گائڈنس بھی ملی اور اچھے نمبر بھی ملے پھر میرا اکیڈمک کیریئر اور انٹرویو۔ کون سی بات میرے حق میں نہیں تھی۔''

''بہت خوش نصیب ہے تو۔'' عبداللہ دلنوازی سے مسکرایا۔

''چل تو نصیب، نصیب کھیل۔ مگر میں اپنا نصیب خود بناؤں گا۔ دیکھنا۔'' ارزش ہنس دیا۔

اگر ارزش احمد اس وقت نہ ہنستا تو شاید بحث بہت آگے نکل جاتی۔

☆☆☆

سردیوں کی خوب صورت رات تھی اور اس بار ارزش نے باؤ جی کے بار، بار فون کرنے پر حویلی جانے کا سوچ ہی لیا تھا۔ شہر میں رہتے ہوئے بھی دو ماہ سے وہ گھر نہیں گیا تھا۔ سب ہی جایا کرتے تھے کوئی ہفتے بعد کوئی دو ہفتے بعد۔ عبداللہ گوجرانوالہ سے آیا تھا مگر اس کو جانے کی سب سے زیادہ جلدی ہوئی۔

لاہور کی سردیاں بہت دلکش ہوتی ہیں۔ مال روڈ کی لمبی سڑک پر پیدل چلتے، چلتے عبداللہ اور ارزش احمد نے گہری سانس لی۔ منہ سے نکلنے والا دھواں رات کے گہرے کہرے میں مدغم ہوگیا۔

''یہ بات کوئی نہیں جانتا۔ پر کبھی، کبھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔'' عبداللہ نے اچانک عجیب سی بات کی۔

''کون سی بات؟'' ارزش نے پریشان ہوکر عبداللہ کو دیکھا۔

''زینب۔ میری محبت۔'' عبداللہ شاید رو دینے کو تھا۔

''کسی اور کو چاہتی ہے؟'' عبداللہ نے ہلکا سا وقفہ دیا تو ارزش احمد بے تابی سے بول پڑا۔

''کاش ایسا ہی ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔''

''کیوں پریشان کر رہا ہے بتاناں۔ کیا بات ہے۔''

''اسے برین ٹیومر ہے۔'' عبداللہ اس ایک لفظ کو کہتے، کہتے سیکڑوں بار مرا۔

ارزش سناٹے میں آ گیا۔ اسے گمان تک نہیں تھا کہ ایسا بھی ممکن ہے۔ اتنی چھوٹی سی عمر کی لڑکی جس کا دل بقول عبداللہ پیار کا سمندر ہے۔ دماغ میں کینسر لے کے پھر رہی تھی۔

''وہ بہت ذہین ہے۔ مجھے اکثر اس کی ذہانت سے خوف آتا وہ بھی سی ایس ایس کرنا چاہتی تھی میرے ساتھ۔ لیکن اچانک اس کے سر میں شدید درد ہوا چکر آئے وہ بے ہوش ہوگئی۔ میں ہی اسپتال لے کے گیا تھا۔''

عبداللہ نے مال روڈ کو دھندلا دیا۔

اس عمر میں جب انسان مستقبل کے حسین خواب دیکھنے میں مصروف ہوا سے درد کی پہچان نہیں ہوتی۔ یا پھر جس نے درد سہانہ ہو۔ وہ کیا جانے۔ جب چوٹ لگتی ہے تو درد کیسے حملہ کرتا ہے۔

''شکر ہے زینب سانس لیتی ہے۔ مسکراتی ہے۔ لیکن اب وہ پڑھ نہیں سکتی۔ کسی چیز پر concentrate نہیں کر سکتی۔ اس کی خواہش تھی میں اکیڈمی جوائن کروں۔ میں نے کر لی۔ تو اس دن نصیب سے منکر ہو رہا تھا ناں۔ تو مجھے دیکھ لے نصیب کی الجھنیں سمجھ میں آنے لگیں گی۔''

ارزش خاموش رہا۔ کچھ لمحے لگے اس درد اور دھندلے مال روڈ کو اپنے اندر اتارنے کے لیے۔ پھر اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اس میں سے ایک عبداللہ کو دی اور ایک خود ہونٹوں میں دبا کر ہاتھ کی آڑ سے پہلے لائٹر کی مدد سے عبداللہ کی سگریٹ سلگائی پھر اپنی اور خاموشی سے واپس اکیڈمی کی طرف آ گئے۔

☆☆☆

حویلی میں جیسے چراغاں تھا ارزش جو آنے والا تھا۔ باؤ جی نے ولایت ماموں کو بھی دعوت دی تھی۔ سب ہی وقت سے پہلے آ گئے۔

غلام گردش کو سرخ اور زرد پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ارزش نے سات بجے آنے کا کہا تھا۔ بڑے سے لان میں جہاں بے جی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا کرتی تھیں اور شام کو تازہ ہوا اور موسمی پھولوں کو محسوس کیا کرتی تھیں، وہ حسب معمول وہاں آ کر بیٹھیں تو نظر گیٹ کی طرف تھی۔

بالوں میں نین تارہ کا بنایا موتیے کے پھولوں کا گجرا، ہلکے رنگ کے مخصوص سادہ سے لباس میں سر پر دوپٹا اوڑھے بے جی بہت مقدس لگ رہی تھیں آج تو رضوانہ بیگم بھی بے تاب تھیں۔

نئے ماڈل کی سیاہ کار بڑے سے گیٹ سے داخل ہوئی تمام منتظر نگاہیں گیٹ سے آتی کار رکنے اور اس کا دروازہ کھلنے اور ارزش کے باہر نکلنے کے لمحوں میں تھک سی گئیں۔ ارزش نے ماں کو دیکھا سب کچھ بھول کے وہ بے تابانہ دوڑا، بے جی اٹھ گئیں اور بڑھ کر ارزش کو گلے سے لگایا۔ ماتھے پر پیار کیا۔ آنکھوں میں اس کا روپ بھر کے بولیں۔

میں یہی ایبل تو ہونا چاہتا ہوں لیکن ہو نہیں پاتا۔
موٹے فریم والی عینک آج کل کا فیشن ہے لیکن اللہ جانتا ہے ایسی ہی عینک میری نانی پہنا کرتی تھیں۔ میں نانی کی عینک کو بطور فیشن کیسے پہن لوں؟
آپ نے کبھی لال رنگ کی پینٹ پر گہرے پیلے رنگ کی شرٹ اور پاؤں میں نیلے بوٹ دیکھے ہیں؟ کہتے ہیں یہ بھی فیشن ہے۔
میں نے ایک فیشن ایبل دوست سے پوچھا تھا کہ میرے لیے کوئی ہلکا پھلکا سا فیشن تجویز کرو۔ اس نے غور سے میرا جائزہ لیا اور کہنے لگا۔ ''تم بال کھڑے کرلو۔''
میرے کان کھڑے ہو گئے۔
''وہ کیوں؟ میں کوئی......''
اس نے جلدی سے میری بات کاٹی۔ ''یقین کرو، کچھ کچھ فیشن ایبل لگو گے، چھوڑو یہ ڈریس شرٹس اور فارمل ڈریسنگ، کچھ مختلف نظر آؤ۔''
میں نے خوش ہو کر اس سے درخواست کی کہ وہ خود ہی میرے بال سیٹ کروا دے۔
موصوف مجھے ایک زنانہ نما مردانہ پارلر پر لے گئے۔ واپسی پر میں نے شیشہ دیکھا تو کانپ گیا۔ میرے بال کانٹوں کی طرح کھڑے تھے۔ اپنے گھر کی گلی کا موڑ مڑتے ہی ایک محلے دار کی نظر پڑ گئی۔ پہلے تو آنکھیں پھاڑے میرے بال دیکھتا رہا۔ پھر قریب آ کر اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے بولا۔ ''بھائی سے لڑائی ہوئی ہے؟''
میں ہونٹ سکیڑ کر سیلفی بھی بنانا چاہتا ہوں لیکن مجھ سے موبائل ہی ٹھیک سے نہیں پکڑا جاتا۔ پتا نہیں لوگ کیسے ایک ہاتھ سے موبائل سیدھا کر کے سیلفی بنا لیتے ہیں۔ میں نے تو جب بھی سیلفی بنانے کی کوشش کی موبائل پر نیا گلاس پروٹیکٹر لگوانا پڑا۔
میں جھینگے اور کیکڑے بھی کھانا چاہتا ہوں تاکہ شکل سے نہ سہی۔ کھانے سے ہی فیشن ایبل نظر آؤں لیکن پتا نہیں کیوں کسی چائنیز ریسٹورنٹ جاتے ہوئے راستے میں کسی چھوٹے سے ہوٹل پر دال ماش اور تندور کی تازہ روٹیاں دیکھتا ہوں تو غش پڑ جاتا ہے اور پھر میرے لیے آگے جانا مشکل ہو جاتا ہے۔
میں بات، بات پر انگریزی بھی بولنا چاہتا ہوں تاکہ یک دم سامنے والے پر حاوی ہو جاؤں لیکن یہاں بھی بڑی مشکل پیش

''ایک شہر میں رہ کر اتنی دیر سے آئے ہو۔''
''بے جی، آپ سب کی خواہش پوری کرنے گیا ہوا ہوں۔ یقین کریں میرا کوئی شوق نہیں ہے وہاں جانے اور رہنے کا۔''
ارزش نے کندھے سے تھام کر بے جی کو نرمی سے بٹھایا۔
''ناشکری کی باتیں نہیں کرتے۔'' رضوانہ بولیں۔ یا پھر انہوں نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔
''ارے مامی جی آپ بھی آئی ہیں۔''
نین تارہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ محبت کی اتنی توہین...... اس نے جب سے محبت کی تھی۔ خود کو نین تارہ سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ بس اب وہ محبت بن گئی تھی۔ اب اگر ارزش اس کو نہ دیکھتا تو اس کو دکھ تو ہونا ہی تھا۔
جانے حویلی کے کس کونے میں جا چھپی۔ ارزش نے ایک دو بار اِدھر اُدھر دیکھا تھا لیکن نین تارہ دکھائی نہ دی۔ وہ بیٹھک میں آ گیا۔ جہاں باؤ جی اور ماموں ولایت اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ دونوں سے بغلگیر ہو کر محبتیں لے کر جب وہ اپنے کمرے میں آیا جیسے ہی اس نے کمرے کی بتی جلائی، نین تارہ تیزی سے باہر نکلی۔ ارزش نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''یہاں کیوں آ گئی تھیں؟''
''تمہیں اس سے کیا، میں کہیں بھی جاؤں۔''
''تو کہیں بھی جاؤ۔ پر یہاں کیوں۔ میرے کمرے میں؟''
''اگر تمہیں اعتراض ہے تو یہاں نہیں آیا کروں گی۔''
وہ بھاری دل کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

لگا۔ میجر نے رائے پوچھی تو میں نے جلدی جلدی انگریزی کے لہجے میں کہا۔ "Taste has come"
اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اب میں اس جاہل کو کیا سمجھاتا کہ میرا مطلب ہے۔ ''مزہ آگیا۔''
مردانہ کانوں میں بالی پہننا بھی فیشن ہے، بغیر جرابوں کے بوٹ پہننا بھی فیشن ہے، شرٹ کا اوپر سے دوسرا بٹن کھلا رکھنا بھی فیشن ہے حالانکہ پہلے یہ لفنگا پن کہلاتا تھا، کھانے پینے سے لے کر بول چال، گھر کی بناوٹ، چہرے کے تاثرات، بالوں کی تراش خراش تک ہر چیز فیشن کی محتاج ہو کر رہ گئی ہے۔
ایک فیشن شو میں تو میں نے ایسے ماڈل لڑکوں کو بھی دیکھا جنہوں نے ''غرارے'' پہن رکھے تھے۔ غرارے مجھے بھی پسند ہیں لیکن صرف گرم پانی کے۔ مجھے لگتا ہے میں کبھی فیشن ایبل نہیں بن سکوں گا، یہ دکھ مجھے کھاتا جا رہا ہے۔
میں ٹنڈ کروا کے اپنے بازو پر ''ٹیٹو'' بنوانا چاہتا ہوں۔ ٹی شرٹ اور شارٹ کے نیچے جوگر پہن کر کانوں میں ہینڈز فری لگا کر، ہاتھ میں منرل واٹر کی بوتل پکڑ کر شاپنگ کرنا چاہتا ہوں۔ باتھ ٹب میں نہانا چاہتا ہوں۔ کڑوی کسیلی کافی پینا چاہتا ہوں۔ بلکہ یہ سب تو کچھ نہیں، میں تو کانٹے سے چائے پینے کا بھی پروگرام بنا رہا ہوں لیکن تا حال کامیاب نہیں ہو رہا۔
جتنا فیشن ایبل ہونے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی روایتی زندگی میں دھنستا چلا جاتا ہوں۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ بیکری میں میرا ہاتھ چاکلیٹ کی طرف اٹھ جائے لیکن دوسری طرف کریم رول بھی رکھے ہوتے ہیں۔
دل لوٹ جاتا ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجیے۔ کلیجا دھک سے رہ جاتا ہے۔ پھر میں، میں نہیں رہتا تم ہو جاتا ہوں۔
کسی فوڈ چین سے سات سو روپے کا برگر کھالوں تو گھر پہنچتے ہی پیٹ بھر کر کھانا کھاتا ہوں۔
سو طے ہوا کہ میں فیشن سے کوسوں دور ہوں۔
میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ میں صرف اسی صورت میں فیشن ایبل بن سکتا ہوں اگر میں کسی کی پروا نہ کروں۔
یہ طریقہ بھی میں آزما کر دیکھ چکا ہوں، ایک دفعہ اس نے مجھے فیشن ایبل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے سختی سے تاکید کی کہ کل میرے ہاں کھانے پر صرف جینز اور ٹی شرٹ پہن کر آنا۔
میں نے ایسا ہی کیا لیکن جب وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ لوگ جوتے بھی پہن کر آئے ہوئے تھے!

''پاگل ہے۔'' ارزش نے ہنس کے زیرِ لب کہا۔
''عجیب ہوتی ہیں لڑکیاں بھی۔ پتا ہی نہیں چلتا کس بات پر خفا ہوں گی اور کس سے مان جائیں گی؟''
اس نے کمرے کا طائرانہ جائزہ لیتے لیتے سوچا۔ ہر شے اس قدر ترتیب سے رکھی تھی کہ اس نے نظروں ہی نظروں میں کمرے کو آرگنائز رکھنے والوں کو داد دی۔
بابا نجم ان کا پرانا ملازم تھا۔ ارزش کا بچپن ان کے کندھے پر سواری کر کے گزرا تھا۔ اب انہوں نے ارزش کی ساری زندگی کا ہی جیسے ٹھیکا لے لیا تھا۔ اس کے کپڑے، جوتے، کتابیں، ملنے جلنے کا حساب تک بابا نجم رکھا کرتا تھا۔
الماری کھولی تو ہر لباس اہتمام سے ہینگر میں ٹنگا ہوا تھا۔ حویلی میں کھانے کا وقت نو بجے کا تھا اور یہ ازل سے چلا آ رہا تھا۔ سب کو تو جیسے کھانے کے کمرے میں پہنچنا ہی تھا۔ وہ بھی نہا کر فریش ہو کر کھانے کے کمرے میں آ گیا۔ سب موجود اور وہ خفا، خفا نین تارہ بھی وہیں تھی۔ ارزش کو شرارت سوجھی کئی خالی کرسیاں چھوڑ کر وہ نین تارہ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اور نین تارہ کی امید کے بالکل برخلاف ایک، ایک پکوان کے لیے اس کو کہتا رہا۔
''ذرا قورمہ تو دینا۔''
''چاولوں کی ڈش دے دو۔''
''اچھا اس ڈونگے میں کیا ہے؟'' اس نے آمنے سامنے رکھے ڈونگے کی طرف اشارہ کیا۔
''دم کا قیمہ۔''
نین تارہ کے بجائے بے جی نے کہا۔
''نین بیٹا ارزش کو قیمہ دو اور ارزش یہ اسی نے بنایا ہے۔'' رضوانہ ہنس کر بولیں۔

''اسی لیے تمہارے سامنے رکھا ہے کہ تم سب سے پہلے اسے کھاؤ۔''
ارزش نے شرارت سے نین تارہ کو دیکھا۔
''ارے تو پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں سب سے پہلے اسی کو کھاتا۔''
نین تارہ نے سب کا لحاظ کیا خاموشی سے قیمہ ارزش کی پلیٹ میں ڈال دیا اور خود اٹھ کر چلی گئی۔
''کب تک ہو؟'' ولایت ماموں نے پوچھا۔
''بس کل کا دن اور.....''
''تو کل رات کا کھانا ہماری طرف کھائیں آپ سب۔''
''کیوں نہیں۔'' میاں جی نے تکلفاً بھی انکار نہیں کیا۔
''لیکن مامی جی، نین تارہ سے کہیے گا ایسا ہی قیمہ بنائے پھر۔ بہت مزے کا ہے۔''
اس نے جان بوجھ کر کہا۔ وہ جانتا تھا یہ بات مامی جی کے ذریعے اس تک پہنچ جائے گی۔
اور واقعی رضوانہ نے نین تارہ کو بتایا کہ ارزش نے فرمائش کی ہے قیمے کی۔ نین سے خوشی چھپانا مشکل ہو رہی تھی۔
''بڑا اچھا لڑکا ہے۔ جی کرتا ہے تمہارا ہاتھ مانگ لوں لیکن دنیا داری کی زنجیر ہے پیروں میں۔'' نین تارہ نے سنا اور خاموش رہی۔
''ہم لڑکی والے جو ہیں۔ پتا نہیں بھائی صاحب اور آپا جان کا کیا ارادہ ہے۔''
''امی جو بھی اُن کا ارادہ ہوگا۔ سو ہوگا یہ بتائیں کھانا کیا بنانا ہے؟''
رضوانہ ہنس دیں۔
''تم اسے زیادہ جانتی ہو۔ جو اسے اچھا لگتا ہے بنالو۔''
نین تارہ نے سر ہلایا اور اپنے کمرے میں آگئی۔ ابھی کل ہی اس نے ایک اسکیچ بنایا تھا۔ سوچا تھا وہ جب بھی آئے گا اسے فریم کر کے دے گی۔ لیکن اب فریم کا وقت نہیں ہے سو اس نے یارڈ بورڈ پر بہت سلیقے سے اسکیچ چپکا دیا۔ تصویر میں آنکھوں کی لپک ایسی تھی کہ جہاں، جہاں جاؤ لگتا ارزش دیکھ رہا ہے۔ نین تارہ کتنی دیر تک ارزش کی تصویر دیکھتی رہی پھر مسکرا دی۔
''جب کوئی یہ کہتا ہے کہ نین تارہ تم زیادہ جانتی ہو ارزش کو.. تو میرا دل فخر سے بھر جاتا ہے میں مغرور سی ہو جاتی ہوں۔ خود تسلیم کرنا اور بات ہے کسی اور کا یقین کرنا اور یہاں سب کو میری اور تمہاری محبت کا یقین ہے ارزش.....'' نین تارہ نے تصویر سے باتیں کیں پھر اسے سائڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیا۔

☆☆☆

رات کا جانے وہ کون سا پہر تھا جب ارزش کو کال آئی۔ پہلے کی گھنٹیاں شاید اس نے سنی ہی نہیں مگر اب مسلسل بجتی ہوئی گھنٹی نے اس کو جاگنے پر مجبور کر ہی دیا۔ ارزش نے فون دیکھا۔ عبداللہ کی کال تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل دہل گیا۔ اور وہی ہوا عبداللہ کی سسکیاں رک نہیں رہی تھیں۔
''کیا ہوا؟''
ارزش نے سانس روک لی کہ جانے کیا جواب آتا ہے۔
''زینب نہیں رہی۔''
ارزش نے گہری سانس لی گویا اس کو معلوم تھا کہ ایسا ہی ہونے والا ہے۔ ایسا ہونا ہی تھا۔
''تو.....'' ارزش کے لفظ تک کپکپا گئے پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔

''کل ظہر کی نماز کے بعد تدفین ہے۔ میری زینب مٹی اوڑھ لے گی ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے۔''

''میں آرہا ہوں۔'' ارزش نے فون رکھا اور ایک ہی جست میں بستر سے نکل گیا۔

اس کی نظر دیوار گیر گھڑی پر پڑی رات کے تین بج رہے تھے یوں تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ جا بھی سکتا تھا لیکن بے جی، باؤ جی ان سے ملے بغیر کیسے چلا جاتا۔

اس نے موبائل پر فجر کی نماز کا وقت تلاش کیا اور پھر سے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کے کانوں میں عبداللہ کی باتیں گونجنے لگیں۔

''زینب سانس لیتی ہے۔ مسکراتی ہے۔ لیکن اب وہ پڑھ نہیں سکتی۔''

''تو اس دن نصیب سے منکر ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ لو۔ نصیب کی الجھنیں سمجھنے لگو گے۔''

ارزش نے سر کو جھکا لیا۔

''اس کی زندگی ہی اتنی تھی۔ موت اور زندگی کا اختیار تو صرف مالکِ کون و مکاں کے پاس ہے۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ کیا کر سکتے ہیں۔'' کتنی دیر تک وہ سوچتا رہا یہاں تک کہ اس کے اپنے سر میں درد شروع ہو گیا لیکن حیرت ہے ابھی تک صرف چار بجے تھے۔ چونکہ سردیوں کا موسم تھا اس لیے نماز کا وقت بھی دیر سے ہوتا تھا۔ اذان ہوتی تو باؤ جی اٹھتے۔ بے جی جاگتیں اور وہ ان کو خدا حافظ کہہ کے زینب کو مٹھی اوڑھانے جاتا۔ عبداللہ اور زینب کو اس نے اس رات اتنا سوچا کہ اس کو لگنے لگا زینب نے اس کے کمرے میں دم توڑا ہے۔ عبداللہ زینب کا سرد ہاتھ تھامے مسلسل گریہ کر رہا ہے۔ ارزش، عبداللہ کو گلے سے لگا کے تسلی اور صبر کی تلقین کرنا چاہ رہا تھا مگر عبداللہ تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ پا رہا تھا۔

اچھا ہوا جو اس کی آنکھ لگ گئی لیکن بہت برا ہوا جو اس نے خواب کا وقت بھی زینب اور عبداللہ کو دیکھنے میں گزار دیا۔ اذان ہوئی تو اس کی آنکھ ایسے کھلی جیسے اس نے الارم لگا رکھا ہو۔

ماں سے ملا۔ باؤ جی سے بات کی اور چلا گیا۔

اس دن پتا نہیں کیوں باؤ جی کا دل بھر آیا۔ نماز پڑھ کے وہ بے جی کے کمرے میں آ گئے۔ بے جی نماز کے بعد کلام پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں۔ باؤ جی نے ٹوپی میز پر رکھی اور آرام دہ کرسی پر بیٹھ کے دکھ سے بولے۔

''حمیدہ بیگم۔''

ان کی آواز میں کچھ ایسا تھا جو حمیدہ بیگم نے اپنی اٹھائیس سال کی شادی شدہ زندگی میں محسوس نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کلام پاک پر ساٹن کی ڈوری سے نشانی لگائی اور قرآن پاک بند کر کے پوری طرح سے ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''جی!''

''آج پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ ارزش گیا ہے تو دل بھی بیٹھ سا گیا ہے۔''

حمیدہ بیگم کے چہرے کے نور میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا جیسے ساکت پانی میں کنکر دائرے بناتا ہے۔

''خیر کی بات کریں ارزش کے باؤ جی۔ بتا رہا تھا ناں اس کے دوست کے خاندان میں کسی کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''کہہ تو رہا تھا لیکن۔'' وہ بولتے، بولتے خاموش ہو گئے۔

''سوچا تھا اس بار آئے گا تو اس کو بہت زور سے جپھی لگاؤں گا۔ سینے سے بھینچ کے۔ ماتھے پر پیار کروں گا۔ اس کے ہاتھ آنکھوں سے لگاؤں گا۔ زندگی کا کیا بھروسا۔ کہیں ایسا نہ ہو یہ آرزو میں دل میں ساتھ ہی لے کے چلا جاؤں....''

''اللہ نہ کرے۔'' حمیدہ بیگم نے تسلی کی خاطر جلدی سے کہا۔

''اس بار آیا تو کہہ دوں گی۔ پہلے آپ سے ملے پھر میں ملوں گی۔'' صلاح الدین نے پھیکی سی ہنس، ہنس کے روشن چراغوں کو نور کا اجالا کرنے والی عورت کو دیکھا۔

''تیرا دل نہیں کرتا بیٹا پاس رہے۔''

''میرا دل کرتا ہے۔ بڑا دل کرتا ہے۔'' بے جی کی آواز بھاری ہوگئی۔ انہوں نے کھنکھار کے گلا صاف کیا اور عام سے لہجے میں بولیں۔

''ماں کا دل اللہ نے کسی رحمت کی گھڑی میں بنایا ہے' یہ بس وہ چاہتا ہے جو اللہ بھی چاہتا ہے۔''

''مثلاً..... کیا چاہتا ہے؟'' صلاح الدین کو دلچسپی سی ہوئی۔

''اولاد ماں باپ سے پیار کرے، مہربان رہے۔ سیدھے راستے پر چلے۔ ہر ایک کی عزت کرے۔ کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے ہمارا سر شرم سے جھک جائے۔ اللہ بھی تو اپنے بندوں سے ایسی ہی مہربانی چاہتا ہے۔ چاہے وہ خود اس کی ذات سے ہو چاہے اس کے بندوں سے۔''

''ولایت کیا سوچے گا؟'' صلاح الدین نے گھبرا کے کہا۔

وہ صلاح الدین جو پنچایت میں بیٹھا ہو تو لوگ اس سے آکر پوچھتے ہیں۔ ''ہمارا کیا ہوگا میاں جی؟''

''ولایت کو چھوڑیے۔ نین تارہ کا سوچ رہی ہوں۔ اس کا دل بہت نازک ہے۔ ابھی دنیاداری کو سمجھتا نہیں۔''

واقعی نین تارہ کا محبت بھرا دل دنیاداری کے ہر پینترے سے ناواقف تھا۔

''ارزش کو چاہیے کہ نین تارہ کا دل نہ توڑے۔ یہ ٹھیک نہیں۔''

''ہوں۔'' صلاح الدین کی کرسی زور، زور سے ہل رہی تھی۔

''صبح ہوتے ہی پیغام پہنچا دوں گا اور معذرت بھی۔'' صلاح الدین کے لہجے میں بے کسی تھی۔ بے بسی۔ خواہش نہ پوری ہونے کی بے بسی۔

بے جی نے دوبارہ قرآن پاک کھول لیا تھا۔

☆☆☆

کہتے ہیں کوئی انسان آرزو سے پاک نہیں' خواہشات زندہ وجود کی علامات ہیں۔ ہر شخص صاحبِ آرزو ہے اور یہ آرزو، یہ خواہش انسان کو خود سے باندھے رکھتی ہے ایسے کہ وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ یہ بے بسی کا حصار انسان کو اس طرح جکڑ لیتا ہے جیسے مکھی، مکڑی کے جالے میں پھنس جاتی ہے بظاہر نازک تاروں والا جال لگتا نہیں کہ کسی کی جان لے سکتا ہے مگر لے لیتا ہے۔ ایسے ہی آرزوئیں بظاہر بہت نازک، خوب صورت ریشمی دکھتی ہیں مگر انسان کو ادھ موا کر دیتی ہیں۔ نین تارہ اپنی الماری کھولے کھڑی تھی جب اس کو پتا چلا کہ ارزش نہیں آرہا۔

''بھئی ولایت احمد صاحب مجھے یہ رشتہ منظور نہیں، ایک تو ارزش آیا نہیں اس پر ماں کا کورا انداز۔ نین تارہ کا دم نہ گھٹ جائے تو کم ہے۔'' رضوانہ تو آگ بگولہ ہوگئیں۔

''اس کے دوست کے خاندان میں کسی کی وفات ہوگئی ہے اس لیے اس کو جلدی میں جانا پڑا۔''

''کیا تھا ایک فون آپ کو بھی کر دیتا۔ آپ کہتے ہیں وہ آپ سے بہت محبت کرتا ہے۔''

''جس سے محبت کرتا ہے اس کو بھی کب بتایا۔'' نین تارہ نے ماں کی بات سن کر سوچا۔

''اور ہو سکتا ہے یہ میرا گمان ہی ہو۔ میرا گمان مجھے غلط راستے دکھا رہا ہو۔ میں سوچتی ہوں کہ وہ مجھے چاہتا ہے۔ حالانکہ بات اس کے برعکس ہے۔ وہ نہیں۔ میں اس کو چاہتی ہوں ہاں یہ تو سچ ہے۔''

نین تارہ کی الماری کا پٹ کافی دیر ہوئی بند ہو چکا تھا۔ پلاؤ کے لیے یخنی بن چکی تھی مگر اب پلاؤ نین تارہ نہیں

ملازمہ بنا رہی تھی۔

☆☆☆

ارزش تدفین سے پہلے پہنچ گیا تھا مگر اس میں زینب کا آخری دیدار کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ویسے بھی اس نے اس سے پہلے بھی کب اس کو دیکھا تھا۔ البتہ عبداللہ کھڑا رہا۔ زینب کا چہرہ تو کیا پورا وجود ڈھکا ہوا تھا۔ کلمہ لکھی سبز شہنیل کی چادر نے جسدِ خاکی کو ڈھانک رکھا تھا۔ اب وہ دنیا اور دنیاداری کے جھگڑوں سے دور تھی۔ بالکل بے نیاز۔

پھر وہ وقت بھی آ گیا جب اس کو لحد میں اتار دیا گیا۔ ارزش صرف عبداللہ کو سنبھالنے کی نیت سے آیا تھا اور اچھا ہوا وہ آ گیا۔ وہ رات قیامت کی تھی۔ ارزش قیامت کو پل، پل گزرتا محسوس کر رہا تھا۔ چاند کی چودھویں تھی، ہلکی خنکی بار، بار بدن کو ٹھنڈ کا احساس دلا رہی تھی لیکن عبداللہ ساکت و جامد بیٹھا بے آواز آنسو بہا رہا تھا۔

''بس۔ اب بس کر دے رونا دھونا میرے دوست۔'' ارزش پریشان ہو رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں تو بھی یہی سوچ رہا ہوگا کہ مرد روتے اچھے نہیں لگتے۔ لیکن یار یہ ابدی ہجر کے آنسو ہیں' ان کو بہنے دے۔ اگر یہ نہ بہے تو شاید میرا سینہ پھٹ جائے گا۔''

ارزش کیسے روکتا۔

رات گزر رہی تھی۔

ہجر قطرہ قطرہ آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

شاید رات کی معراج یہی ہے۔ اس کو لوگ جاگ کر مناتے ہیں چاہے عشقِ حقیقی ہو۔ چاہے مجازی، محبت کی کسک سونے نہیں دیتی۔ رات اپنے دامن میں بے پناہ قیمتی خزانے چھپائے آتی ہے۔ رات رحیم بھی ہے اور حبیب بھی خود اپنی ذات میں مرہم.....

صبح ہوئی تو... ان کے لیے صبح ہوئی جو سو کر اٹھے تھے اور جو سوئے ہی نہیں تھے ان کے لیے بس تاریکی چھٹ کر روشنی ہوئی تھی۔ سو غم تھا۔

وہی روایتی انداز۔ کھجور اور املی کی گٹھلیاں پڑھی جا رہی تھیں۔ سیپارے ہاتھوں میں ہل رہے تھے۔ ساتھ، ساتھ وجود بھی..... ارزش احمد سب کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

مسجد میں سیپارے اور کھجور، املی کی ملی جلی گٹھلیوں پر سورۂ اخلاص کا ورد کرنے والوں کی فروٹ سے تواضع کی گئی اور جاتے ہوئے بھنے چنے اور کھانے کی کشمش ملے پیکٹ تقسیم کیے گئے۔ پڑھنے والوں میں بچے بڑے بوڑھے سب شامل تھے۔

وہ کوئی اسّی سال کا بوڑھا تھا جس نے جھگڑ کر دوسرا پیکٹ بھی عبداللہ کے کسی رشتے دار بانٹنے والے لڑکے سے مانگا۔ عبداللہ نے اشارہ کیا۔ لڑکے نے پیکٹ دے دیا۔ وہ لڑکا روتا ہوا عبداللہ کے گلے لگ گیا۔ تب ارزش کو پتا چلا وہ لڑکا خرم ہے زینب کا چھوٹا بھائی۔

''لوگ کیسے سنگدل ہیں۔'' اس کی سسکیاں، ہچکیاں تھمیں تو بولا۔

''اپنی موت بھول گئے ہیں۔ میری پیاری بہن۔ کیا عمر تھی اس کی 22 سال اور یہ شخص.....''

عبداللہ نے مدبر ہو کر اس کی پیٹھی تھپتھپائی۔

''میری اکلوتی بہن۔ میں نے اپنے ہاتھ سے اس کی قبر پر مٹی ڈالی۔ عبداللہ بھائی آج مجھے اللہ میاں پر بہت غصہ آ رہا ہے بہت زیادہ۔'' دکھ سے اس کا چہرہ سخت مگر سرخ ہو رہا تھا۔ عبداللہ نے اس کو لپک کر گلے سے لگا لیا۔

''استغفار پڑھو بیٹا بُری بات ہے اللہ کے گھر بیٹھ کر اللہ ہی سے غصہ ہو رہے ہو؟''

''میری پریوں جیسی بہن۔ مجھ سے چھین لی..... آخر کیوں؟''

عبداللہ کے ہونٹ کانپے۔ ہلکی سی تھرتھراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے آنسوؤں کو ضبط کیا اور محبت سے خرم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''خود ہی تو کہہ رہے ہو پریوں جیسی تو پھر وہ دنیا میں کیسے رہتی۔ بھلا کیسے؟'' اب عبداللہ کا حوصلہ بھی جواب دے رہا تھا۔ ارزش نے محسوس کرلیا۔

''چلو آؤ گھر چلتے ہیں۔''

عبداللہ اور خرم ہلکے، ہلکے قدم اٹھاتے چل دیے۔

ارزش ان کے ساتھ ان جیسے ہی قدم اٹھا رہا تھا۔ سست سست سے۔ مسجد گھر سے دور نہیں تھی پیدل کا راستہ تھا تو تینوں پیدل ہی چل پڑے تھے۔

☆☆☆

شام ہوئی تو ارزش کو سب کچھ یاد آنے لگا۔ نین تارہ۔ ولایت ماموں۔ رضوانہ مامی اور باؤ جی۔ بے جی۔

''عبداللہ دیکھ یار جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب آگے دیکھو۔ زینب اتنی ہی عمر لکھوا کے آئی تھی۔''

''ہاں، میرے نصیب میں اس کا اتنا ہی ساتھ تھا۔''

ارزش کا جی چاہا۔ کچھ اور کہے لیکن وہ وقت کی نزاکت دیکھ رہا تھا۔

''جب بات نصیب کی ہے تو اللہ تعالیٰ نے کچھ اور بھی لکھا ہوگا۔ نصیب کی کتاب بند تھوڑی ہوگئی ہے۔''

عبداللہ نے شاکی سے انداز میں ارزش کو دیکھا۔

''برا مت مان میرے دوست۔ بے جی کہتی ہیں جو بھی ہوتا ہے اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے تو جب ہم اللہ کو مانتے ہیں تو اس کی مرضی کو کیوں نہیں سمجھتے۔''

عبداللہ کے دل پر ارزش کی بات نے اثر دکھایا وہ مسکرایا۔ گو مسکراہٹ پھیکی تھی مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے وہ کم از کم مسکرایا تو۔

ارزش نے ڈیرے پر آتے، آتے عبداللہ سے کہا۔

''میں گھر جا رہا ہوں۔ بے جی انتظار کر رہی ہوں گی۔ باؤ جی بھی۔''

''تجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی؟''

عبداللہ نے پوچھا۔

کچا پکا سا راستہ جس پر عبداللہ کی فورویل ست رفتاری سے چل رہی تھی۔ وہ اسے شہر جانے والی بس تک پہنچا رہا تھا۔ اس سے کہیں مست رفتاری سے وقت چل رہا تھا۔ ارزش نے کلائی پر پہنی قیمتی گھڑی کو دیکھا۔ عبداللہ کی بات کو نظر انداز کیا۔

''یار گاؤں میں وقت بہت مشکل سے نہیں کٹتا؟''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔''

''کیا سوال تھا تیرا؟''

''جب کوئی بات کو نظر انداز کرے ناں تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ وہ موضوع کو ٹال رہا ہے۔''

''یار جب محبت ہوگی سب سے پہلے تجھے ہی بتاؤں گا۔ وعدہ۔''

''تو پھر محبت کرلے۔ دل کی زمین نرم ہو جائے گی۔''

عبداللہ نے موڑ کاٹا۔
''محبت کے اس حال کے بعد بھی تو مجھے محبت کرنے کا مشورہ دے رہا ہے؟''
''ہاں۔ تجھے نہیں معلوم جب انسان..... انسان سے محبت کرتا ہے تو اللہ سے اس کا لگاؤ گہرا ہو جاتا ہے۔ سجدے میں سر جھکتا ہے تو اٹھنا بھول جاتا ہے۔ پرندوں کا شور، شور نہیں ثنا لگنے لگتی ہے۔''
ارزش احمد ہنس دیا۔ جیسے عبداللہ دیوانہ ہو گیا ہو۔
اور جب وہ بس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے عبداللہ کی ساری باتیں سوچیں۔
اس کو نین تارہ کا خیال آیا۔ خیال تو ارزش کو اس وقت بھی آیا تھا جب وہ کچی پکی سڑک پر عبداللہ کی فورویل میں بیٹھ کر اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے نین تارہ اچھی لگتی تھی۔ مگر محبت..... بہت سوچا تو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا اسے نین تارہ سے محبت ہے؟ اگر ہے تو کتنی.....؟
کم سے کم اتنی تو نہیں کہ وہ بے ساختہ کہہ دے نین تارہ میری محبت ہے یا پھر اتنی..... جتنی وہ کرتی ہے۔ کتنا مشکل ہے... سوال اور اس کا جواب بھی۔
''محبت تو سنا ہے سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ ہو جاتی ہے بس..... اور جب ہوتی ہے تو وہی ہوتی ہے۔ ہوش میں بھی، حواس میں بھی، سوچ میں بھی، خیال میں بھی۔ محبوب سامنے ہے تو بہار ہے روٹھ جائے تو بہار بھی خزاں ہو جاتی ہے۔ ہجر آنکھوں کی روشنی چھین لیتا ہے ایک خوشبو کا احساس روشنی واپس لے آتا ہے۔'' ارزش نے جھرجھری لی۔
''میں ایسی محبت سے باز آیا۔ مجھے اگر محبت ہوئی تو مجھے حواسوں کے ساتھ رہنا ہے۔ چاہے وہ نین تارہ کی محبت ہو یا کسی اور کی۔'' اس کی راہ میں تو کبھی بے جی اور باؤ جی کی محبت حائل نہ ہوئی تھی۔ ''فارغ لوگوں کا کام ہے شاید یہ۔'' اس نے بے دلی سے سوچا۔
اکیڈمی بھی جانا تھا مگر اس کی کچھ ضروری چیزیں اور سب سے اہم اور قیمتی چیز اس کے کمرے کی چابی حویلی میں تھی۔
اس نے حویلی میں خبر نہیں دی تھی کہ وہ آ رہا ہے۔ اس کو برا لگتا تھا کہ بے جی سارے ملازموں کو الرٹ جو کر دیا کرتی تھیں۔ وہ ٹھہرا شہری لڑکا اس کو یہ پروٹوکول بالکل اچھے نہیں لگتے تھے۔
وہ حویلی پہنچا۔ حویلی میں جیسے جان سی پڑ گئی۔
اس وقت بے جی مغرب کی نماز پڑھ کر بیٹھی تھیں۔ باؤ جی مردانے میں تھے۔ بے جی نے فوری طور پر جہانگیر کو مردانے میں بھیجا۔ باؤ جی کو جمی ہوئی نشست برخاست کرنے میں آدھا گھنٹا لگ گیا باؤ جی آئے تو بے جی نے آنکھوں، آنکھوں میں یاد دلایا کہ ان کی ایک آرزو ادھوری سی ہے جو اُن کے قدموں میں پڑی ہے۔ اس کو پوری کر لیں۔ مگر جانے کیسی جھجک تھی باؤ جی اپنی بانہیں وا نہیں کر سکے۔
جیسے وہ اپنی ماں کی موت پر دھاڑیں مار کے رونا چاہتے تھے پر رو نہیں سکے تھے۔ اسی طرح وہ بیٹے کو گلے لگا کر زوردار جھپی لگانا چاہتے تھے پر نہیں لگا سکے۔
بے جی خوش ہوتی ہیں کہ وہ عورت ہیں مرد نہیں۔ ورنہ دل پر وزنی وزنی پتھر رکھنا کوئی آسان کام ہے بھلا۔ نین تارہ کو بھی پتا چل گیا کہ ارزش آ گیا ہے۔
رضوانہ سوالیہ انداز میں نین تارہ کو دیکھ رہی تھیں کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ نین تارہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ ہی کوئی تاثر دیا۔ اس کو گلہ تھا جو کہ جائز تھا۔
ولایت احمد البتہ بھانجے سے ملنے کو بے تاب ہو گئے۔
''مجھے افسوس کے لیے جانا ہے۔''

''کس کے؟'' رضوانہ تنک کر پوچھ بیٹھی۔
''اس کے دوست کی.....''
''بس کردیں ولایت صاحب۔ اتنا نہیں سر پر چڑھائیں کہ آپ کی شناخت ہی ختم ہو جائے۔''
''یہ تم کیا کہہ رہی ہو رضوانہ..... حسنِ سلوک سے شناخت ختم نہیں ہوتی۔''
''کون سا حسنِ سلوک، کیسا حسنِ سلوک؟'' رضوانہ چیخیں۔
''اصولی طور پر ارزش کو معذرت کرنے کے لیے یہاں آنا چاہیے اس نے ہمارے گھر آنا تھا۔ آپ نے اسے کھانے پر بلایا تھا اور.....''
ابھی جملہ رضوانہ کے منہ میں تھا کہ بانو بی بی آ گئیں۔
''صاحب، ارزش صاحب آئے ہیں۔''
ولایت احمد کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا۔
رضوانہ پھکی پڑ گئیں۔
نین تارہ سپاٹ انداز میں کھڑی تھی۔ ارزش آ گیا۔ ماموں سے گلے ملا۔ مامی کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ مامی کو لامحالہ سر پر ہاتھ پھیر کے دعا دینی پڑی۔ جب تک اس نے واپس سر اٹھایا۔ نین تارہ جا چکی تھی۔
''میں افسوس کے لیے آ رہا تھا۔''
ولایت نے بات شروع کی۔
''کون تھا..... کس کا انتقال ہوا تھا؟''
''میرے دوست کی منگیتر۔ کینسر ہو گیا تھا اسے۔''
رضوانہ نے بے ساختہ ''اوہ'' کہا۔ ''پھر تو جوان ہو گی۔''
''جی بائیس، تیئس سال کی تھی۔''
''اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔'' ولایت نے دکھ سے کہا۔
''آمین۔'' ارزش زیرِ لب بولا اور پہلو بدلا۔
''کل صبح جانا پڑا۔ بس بتانا تھا۔ اصل میں عبداللہ میرا جگری یار ہے اس کو میری بہت ضرورت تھی۔ ورنہ یہ گستاخی کبھی نہ کرتا۔ بتانا تھا جانے والی۔''
ارزش نے سنجیدگی سے کہا۔ دروازے کے ساتھ چپکی نین تارہ کو دکھ ہوا کہ وہ خواہ مخواہ خفا ہو کر کمرے سے باہر آ گئی ہے۔
''کھانا لگواؤں؟'' رضوانہ نے پوچھا۔
''میرا خیال ہے نین تارہ کھانے کا کہنے لگی ہو گی۔'' ولایت احمد نے کہا۔
''نہیں ماموں، میں بے جی کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔ آپ سب سے معذرت کرنے آیا ہوں۔ کل اکیڈمی جانا ہے۔''
سب خاموش ہو گئے۔
''آپ سب چلیں ناں میرے ساتھ۔ مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ کچھ وقت اور اکٹھے گزار لیں گے۔''
کسی نے انکار نہیں کیا سب خاموشی سے اٹھ گئے۔

☆☆☆

رات کھانا کھا کے سب گول کمرے میں بیٹھ گئے اونچی، اونچی منقش کرسیوں پر جہانگیر سب کو سلیقے سے قہوہ ڈال کر پیش کر رہا تھا۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے۔'' بالکل اچانک نین تارہ نے کہا۔ حالانکہ وہ مسلسل اسے نظر انداز کر رہی تھی۔
''مجھ سے؟'' ارزش بری طرح چونکا۔
اس بار نین تارہ نے جواب دینے کے بجائے اسے غور سے دیکھا۔
''کہو۔'' ارزش نے مسکرا کے کہا۔
''آؤ۔'' وہ چل دی، ارزش نے نین تارہ کے پیچھے جانے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب اپنی باتوں میں مشغول تھے۔ کسی نے ان کی طرف نہیں دیکھا۔ نین تارہ چلتے، چلتے گارڈن میں آ گئی۔ مسلسل خاموشی سے ارزش کو الجھن ہو رہی تھی۔
گارڈن کے بیچوں بیچ کھڑی نین تارہ نے ارزش کی آنکھوں میں جھانکا۔
''مجھے تمہاری بنا بتائے جانے والی بات اچھی نہیں لگی۔''
''مجبوری تھی۔'' ارزش نے عام سے لہجے میں کہا۔
''مجبوریاں جب ہوا کرتی تھیں۔ جب سوشل میڈیا ایکٹو نہیں تھا۔ اب تو لوگ منٹ، منٹ کی خبر دوسرے کو دے رہے ہوتے ہیں۔ اگر دینا چاہیں تو۔''
ارزش نے کوئی بات بنانی چاہی۔ مگر نین تارہ کی بات جاری تھی۔
''کیا تم یہ رشتہ توڑنا چاہتے ہو؟''
اتنی بڑی بات کس آسانی سے نین تارہ نے کر دی تھی۔ ارزش حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔
''اوکے۔''
اس نے لمبی گہری سانس لی۔
''توڑ دو۔''
ارزش جھنجلا گیا۔ اس پر نہیں کہ اس نے یہ بات کیوں کی۔ اس بات پر کہ وہ ہار کیوں گیا۔
''تمہارے لیے مشکل ہوگا کہنا۔'' نین تارہ کا لہجہ سپاٹ تھا۔
''تمہارے لیے نہیں ہوگا؟'' ارزش نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''نہیں۔'' نین تارہ کا لہجہ بہت تیکھا تھا۔
''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''
''صحیح کہہ رہی ہوں۔ میں نے تم سے محبت کی ہے اور محبت کرنے والے منجدھار نہیں کنارہ چاہتے ہیں اب تمہاری مرضی ہے کنارے لگا دو یا مجھ سے کنارہ کر لو۔''
نین تارہ کہہ کر جانے لگی تو ارزش نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''مجھے سوچنے کا وقت دو۔''
نین تارہ کی آنکھیں چمکیں۔ یقیناً وہ نمی تھی جو چاند کی روشنی میں ستارہ لگنے لگی تھی۔
''کہ کیا میں ایسی لڑکی کے ساتھ رہ سکتا ہوں جو مجھے میرے دوست کے مشکل وقت میں ساتھ دینے پر راضی نہیں؟''
''بات یہ نہیں ارزش۔ بات وہ ہے جس کو تم سمجھ نہیں رہے۔ تم نے مجھے نظر انداز کیا ہے۔ میں کسی کے لیے اہم ہوں یا نہیں۔ تمہارے لیے اہم رہنا چاہتی ہوں۔''
''چند ماہ بعد ہماری اکیڈمی ختم ہو جائے گی۔ میں کچھ اور مصروف ہو جاؤں گا پھر کیا کرو گی؟''
نین تارہ نے کچھ نہیں کہا۔

pklibrary.com

''کل جارہا ہوں۔''
''خیر سے جاؤ۔'' وہ چلی گئی۔
ارزش کو اس کا انداز اچھا نہیں لگا۔ اس کو پوچھنا چاہیے تھا کہ دوست کو کیسا پایا ہے کوئی تفصیل کوئی تسلی، اس نے کچھ بھی نہیں پوچھا۔
عجیب ہوتی ہیں یہ لڑکیاں بھی۔
ارزش نے گھر واپس آکر بیگ پیک کیا اور نین تارہ کی باتیں سوچتا رہا۔
''اتنی پیاری لڑکی ہے، مجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ عزت کرتی ہے۔ پھر مجھے کس چیز کی تلاش ہے۔ ہر خوبی ہے اس لڑکی میں اور مجھے کہیں کہیں لگتا بھی تھا کہ شاید میں اسے چاہتا ہوں پھر اب کیا ہوا۔'' صبح فجر کی نماز کے بعد وہ بے جی کے پاس آگیا۔
بے جی اپنی مخصوص چوکی پر نماز کے بعد تسبیح کر رہی تھیں۔ اسے دیکھا تو تسبیح ایک طرف رکھ کر فجر میں پڑھے سارے درد اس کے چہرے پر پھونک کر محبت سے بولیں۔
''کب نکلنا ہے؟''
''آٹھ بجے۔''
''خیر سے جاؤ۔''
''بے جی آپ مجھ سے ناراض ہیں؟''
''کس بات پر؟'' بے جی نے حیرت سے پوچھا۔
''میں چلا گیا تھا رات اچانک کسی کو بنا بتائے۔''
''میں سمجھ گئی تو کیوں پوچھ رہا ہے؟'' بے جی مسکرا دیں۔
''کیوں؟'' ارزش نے مسکرا کے پوچھا۔
''تارہ ناراض ہے تم سے اس لیے ناں۔''
ارزش نے ہنس کے سر جھکا لیا۔
''دیکھو میری جان، محبت کے ہزاروں رنگ ہیں۔ ان میں سے ایک رنگ وہ ہے جو نین تارہ کا رنگ ہے۔ اس میں جتنی ٹھنڈک ہے اس سے زیادہ تپش ہے۔''
''اس کو ناراض تو نہیں ہونا چاہیے تھا ناں؟''
''وہ ناراضی بھی محبت کی ہے۔''
''آپ اس کی طرف داری کریں گی؟''
''کیونکہ ہم دونوں کا مرکز ایک ہی ہے۔ ارزش احمد۔ وہ بھی تمہیں دیکھ کر جیتی ہے میں بھی۔'' بے جی ہنس دیں۔
باؤ جی آگئے۔ بات ادھوری رہ گئی۔ باؤ جی نے بتایا ولایت شادی کا کہہ رہا تھا۔
''ابھی تو میری اکیڈمی چل رہی ہے۔'' ارزش گھبرا گیا۔
''کہہ دیا ہے میں نے۔ تم فکر مت کرو۔''
ارزش سکون کی سانس بھر ہی رہا تھا کہ اس کو باؤ جی کی آواز آئی۔
''مگر اکیڈمی ختم ہوتے ہی یہ فرض ادا ہو جائے گا۔''

(جاری ہے)

''اماں تو مجھے نئی پریوں جیسی فراک کب لے کر دے گی؟'' منی نے حسرت بھری نظروں سے نفیسہ سے سوال کیا۔

''دیکھ منی تنگ نہ کر، لے دوں گی۔'' نفیسہ نے کرخت لہجے میں کہتے ہوئے بیٹی کو گھورا اور پھر سے آلو کی ترکاری بنانے لگی۔

''اماں میری ساری دوستیں نئے کپڑے، جوتے، پنیں اور پرس بھی لے آئی ہیں۔ عید آنے میں بھی تو تھوڑے ہی دن رہ گئے ہیں۔'' وہ رک کر اپنی انگلیوں کی پوروں پر حساب لگانے لگی۔ ''ایک، دو، تین۔''

نفیسہ اس کی گنتی کی آواز کو نظر انداز کر کے ٹوٹی پھوٹی دیگچی جو ''باجی'' نے اسے باہر پھینکنے کو دی تھی کہ اب ان کے کسی کام کی نہیں رہی تھی لیکن یہی دیگچی نفیسہ کے خوب کام آ رہی تھی۔ اس نے تھوڑے سے گھی میں پیاز براؤن کرنے ڈالی اور لہسن پیسنے لگی۔

''اماں عید میں صرف سات دن رہ گئے۔'' منی کا حساب آخر کار مکمل ہو ہی چکا تھا۔

''پتا ہے مجھے منی سات دن بچے ہیں۔'' نفیسہ نے ہاتھ روک کر منی کی آنکھوں میں پلتی ہزاروں خواہشوں کو دیکھا مگر ان خواہشوں کو پوری کرنے کی سکت اس میں نہیں تھی۔

''تو پھر اماں جب تمہیں پتا ہے، اتنے تھوڑے دن

عید ہم سب کی

عنبرین ابدال

pklibrary.com

بچے ہیں تو پھر تو مجھے نئے کپڑے کب دلائے گی؟'' منی کی آنکھوں میں خواہشوں کی جگہ آنسوؤں نے لے لی تھی۔

''منی تجھے سنائی نہیں دے رہا مجھے تنگ مت کر، جا یہاں سے جا کر اندر بھائی کے پاس بیٹھ جا۔ دادی سے سپارہ پڑھ لے۔'' لہجے میں کرختگی اور سختی سہی مگر دل تو ماں کا تھا ناں۔ نرم، موم جیسا۔ جو اپنے بچوں کی حسرتوں پر پگھل رہا تھا مگر وہ بھی کیا کرتی جب سر پر شوہر کا سایہ نہ ہو اور اپنے غربت کے سبب منہ موڑ چکے ہوں۔ ایسے میں جو محنت مزدوری وہ کر سکتی تھی کر رہی تھی۔ وہ ایک گھر میں صفائی اور برتن دھونے کا کام کرتی تھی اور اس کی بیگم صاحبہ روز ہی اسے ٹال دیتی۔ آج دوں گی، کل دے دوں گی تنخواہ۔

''بھیک تو نہیں مانگ رہی میں۔ اپنی محنت کی کمائی کا ہی تو سوال کیا تھا مگر باجی.....'' وہ دل گرفتگی سے سوچ کر رہ گئی۔ ''یا اللہ تو ہی مسبب الاسباب ہے تو ہی کوئی وسیلہ بنا دے۔'' اس نے نظریں اوپر کر کے نیلے آسمان کو دیکھا اور بے دلی سے ہانڈی بنانے لگی۔

''کل ہی باجی سے کہوں گی کچھ بھی ہو تجھے پیسے دے دیں تاکہ بچوں کو کچھ چیزیں تو لا دوں۔ وہ خوش اور مطمئن ہو جائیں گے۔'' اس نے خود کو تسلی دی۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

''دیکھ منی کون ہے؟'' نفیسہ نے آواز لگائی۔

مگر منی سے پہلے ہی کاکے نے بنا پوچھے لکڑی کا دروازہ کھول دیا۔

''اماں پھوپی آئی ہے۔'' کاکے نے چھوٹے سے باورچی خانے کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔

''لو جی آ گئی مصیبت۔'' نفیسہ نے بڑبڑا کر غصے سے ہانڈی کا ڈھکن دیگچی پر پٹخا اور آنچ دھیمی کر کے کچن سے باہر چلی آئی۔ جگہ، جگہ سے پھٹی میلی چیکٹ چادر سے ہاتھ صاف کرتی نفیسہ کا رخ چھوٹے سے مٹی کے بنے کمرے کی جانب تھا۔

''السلام علیکم آپا۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے اپنی بڑی اور اکلوتی نند کو سلام کیا اور حیرت سے شاہدہ کے ہاتھوں میں پکڑے ڈھیروں ڈھیر شاپروں کو دیکھا۔

شاہدہ اس کے سلام کا جواب انتہائی بے رخی سے دے کر اپنی ماں کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ آئے آصف نے تو ممانی کو سلام کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔

نفیسہ گہری سانس لے کر منی اور کاکے کا ہاتھ تھام اپنے ساتھ کچن میں لے آئی۔

''اماں اندر جانے دو ناں۔'' منی کسمسائی۔

''چپ کر کے بیٹھی رہ۔'' نفیسہ نے اسے ڈپٹا۔ وہ جانتی تھی شاہدہ ماں کو اپنی اور بچوں کی عید کی خریداری دکھانے کے لیے آئی ہے اور چیزیں دیکھ کر منی اور کاکے نے پھر سے بے قرار ہو جانا تھا۔

''اماں تمہارے گھر میں مہمانوں کو چائے پانی پوچھنے کا رواج نہیں ہے کیا؟'' شاہدہ نے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہا۔

''اے ہے، روزہ نہیں ہے تیرا۔'' زہرا بیگم نے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر حیرانی سے استفسار کیا۔

''لو نانی تم بھی کیا بات کر رہی ہو۔ ہمارے گھر میں روزہ رکھنے کا کوئی رواج نہیں۔'' آصف نے بے ڈھنگے پن سے کہا اور ہنسا۔

''چپ کر اپنے دانت اندر کر۔ ناہنجار۔... بے غیرت کہیں کا۔'' شاہدہ کو اس وقت آصف کی بات اور ہنسی دونوں ہی سخت ناگوار گزری تھیں۔ اسی لیے اس نے آصف کی کمر پر دھموکا جڑا۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔

''کیا ہے اماں اتنی زور سے مارنا ضروری تھا..... اب تم خود ہی گھر آ جانا میں جا رہا ہوں۔'' وہ منہ بنا کر سر جھٹکتے ہوئے بولا اور جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا۔

''ارے ماں سے اتنا سامان کہاں اٹھایا جائے گا، رک جا۔'' شاہدہ نے دہائی دی۔ مگر آصف ماں کی بات کو سنی ان سنی کرتا چھوٹا سا صحن عبور کر کے بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ شاہدہ نے سر جھٹک کر ہاتھ مارا اور ایک کے بعد ایک شاپر کھول کر ماں کو اپنی چیزیں دکھانے لگی۔

''اے شاہدہ تو اتنا کچھ اپنے پانچ بچوں اور اپنے لیے لائی ہے۔ تجھے ایک بار بھی اپنے بھائی کے بچوں کا

خیال نہیں آیا، یتیم بچے روز ماں کی جان کھاتے ہیں۔ سستی سی کوئی فراک اور ایک پینٹ بوشرٹ کا کے کے لیے بھی لے آتی، بچوں کی تو عید ہوتی ہے۔'' ضعیف دادی نے منی کی آنکھوں کی جوت بجھتے دیکھ لی تھی جو دروازے کی اوٹ میں چھپ کر کھڑی پھپھو کی چیزیں دیکھ رہی تھی۔

''ہائے، ہائے اماں تو میری سگی ماں ہی ہے ناں؟ خوش ہونے کے بجائے کیسے ہائے ڈال رہی ہے۔ جیسی ڈائن تیری بہو ہے ویسی ہی چڑیل تیری پوتی ہے اور جن تیرا پوتا ہے۔ میرے بھائی کو کھا گئی اور خود ہٹی کٹی بیٹھی ہے۔ میرا تو تیری بہو اور پوتے، پوتی کو دیکھنے کو تو کیا، نظر ڈالنے کو بھی دل نہیں کرتا۔ میں نے تجھے کتنا منع کیا تھا اس کرم جلی کو بھائی عامر کے پلے نہ باندھ مگر تب تو تجھے اور بھائی کو میں زہر سے زیادہ بری لگ رہی تھی ناں۔ اب وہ دیکھ زینت خالہ کی بیٹی کو..... کیا نصیب لکھوا کر لائی ہے۔ جاتے ہی سسرال والوں کے دن پھیر دے اس نے۔ امجد الگ ولایت جا کر سیٹ ہوگیا۔ پیسہ ہی پیسہ۔ اماں ان کے گھر تو دھن برس رہا ہے۔ عید کے بعد اب تو پورا گھر ڈھا کر نئے سرے سے بنوائیں گے اور یہ سب کچھ تیرے نصیب اور مقدر میں بھی ہو سکتا تھا مگر تب تجھے یتیم، مسکین، لاچار بھتیجی کے سوا اور بھائی کو اس منحوس کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ڈال دی ناں اس نے اپنے نصیبوں کا کالک یہاں بھی بھائی گیا مٹی کے تلے اور یہ رہ گئی ہمارے سینے پر مونگ دلنے کے لیے۔'' شاہدہ جان بوجھ کر اس کمرے کے ساتھ ہی بنے باورچی خانے میں بیٹھی نفیسہ کو دل کھول کر اور بنا بھاؤ کے سنا رہی تھی۔

''میرا تو بس چلے اسے ابھی گت سے پکڑ کر نکال باہر کر دوں مگر تیری وجہ سے چپ ہوں تو بیچ میں آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔'' شاہدہ غصے سے بولتی سامنے پڑی چیزوں کو واپس شاپروں میں منتقل کرنے لگی۔ وہ جو کہہ رہی تھی ایسا کرنے میں ایک پل بھی نہ لگاتی۔ مگر زہرا بی بی، نفیسہ کے لیے گھنا چھتنار سایہ تھی۔ ایسا سایہ جو اسے شاہدہ کے ساتھ، ساتھ باہر کی نظروں اور باتوں سے بھی بچائے رکھتا۔

بیوگی کی چادر اوڑھے جوان عورت کی جوانی اس کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے۔ ہر کوئی چوراہے پر پڑی لاوارث چیز کی طرح آتے جاتے چھیڑنا، فقرے کسنا، اشاروں، کنایوں میں معنی خیز ہنسی میں ہزاروں بھید کو نظر انداز کرنا آسان تھوڑی ہوتا ہے۔ جب تک عامر زندہ تھا۔ تب تک اس کی کل کائنات یہ تین مرلے کا مکان تھا، غربت تو تب بھی تھی مگر شکر اور صبر کی نعمت بھی موجود تھی۔

چیزوں کے لیے انتظار تو تب بھی کرنا پڑتا تھا مگر محبت کی شیرینی اس انتظار کے کڑوے پن کو محسوس نہ ہونے دیتی۔ مگر اب..... نفیسہ نے دل گرفتگی سے ہانڈی سے اٹھتے دھوئیں کو دیکھا۔ اب تو صبر اور شکر کے ساتھ انتظار کی لمبی نعمت بھی عطا کر دی گئی تھی۔

وہ عامر کے بعد اس کی بوڑھی ماں اور دونوں بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے باہر نکلی اور مسز مراد کے گھر برتن مانجھ کر صفائی ستھرائی کر کے ہر مہینے کے آخر میں اپنی محنت کی کمائی مٹھی میں دبائے گھر لے آتی۔ مہینے بھر کی ضرورتوں کو پورا کرتے، کرتے خواہش تو نظر ہی نہ آتی۔

وہ جانتی تھی، اماں کا گھر کا جوتا کب کا ٹوٹ چکا تھا۔ وہ بیچاری اسے ہی گانٹھ، گانٹھ کر پہنتیں مگر اب تو وہ پہننے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔ اس کے اور اماں کے کپڑے کتنی ہی بار دھل کر بے رنگ ہو چکے تھے اور اب پھٹنے لگے تھے وہ دل میں کتنی دعائیں مانگتی۔ اللہ گرمی کم پڑے کیونکہ جتنی گرمی پڑتی اتنا ہی پسینہ آتا اور پسینے سے بے رنگ کپڑے بودے ہو کر پھٹنے لگتے۔

''اماں بھوک لگی ہے۔'' منی نہ جانے کب واپس آکر اپنی پیڑھی پر بیٹھ چکی تھی۔ اس کے کہنے پر نفیسہ اپنے خیالوں سے چونکی اور حقیقت کی دنیا میں آگئی۔

''ہاں کیا کہہ رہی ہے؟'' نفیسہ نے ہانڈی کو چولھے سے اتارتے ہوئے استفسار کیا۔

''اماں روٹی۔'' اب کا کے نے بھی دہائی دی۔

''اچھا بناتی ہوں۔'' وہ اٹھ کر چھیکے سے آٹا اٹھا

لائی اور توا چولھے پر رکھ کر پیڑے بنانے لگی۔

''ارے نفیسہ! بوڑھی ساس کو بھی پوچھ لے یا آج مجھے بھوک سے مارنے کا ارادہ ہے۔ صبح سے ایک سوکھی روٹی کھائی ہوئی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے شاہدہ کا کہا کہیں سچ ہی نہ ہو جائے۔ مجھے بھی مار کر تجھے سکون آئے گا۔'' زہرا بیگم، بیٹی کے جانے کے بعد نفیسہ پر چلائی تھیں۔

''اماں بس لائی۔ بن گیا ہے کھانا۔'' نفیسہ نے اونچی آواز میں کہا اور جلدی، جلدی ہاتھ چلانے لگی۔

☆☆☆

''آج میں باجی سے کہوں گی کہ ہر صورت پیسے دے دیں، بچوں کی حسرتیں بڑھتی ہی جا رہی ہیں اوپر سے مہنگائی کا جن سب کچھ نگل جانے کے چکروں میں ہے۔ ہم غریب جائیں بھی تو کہاں جائیں؟'' نفیسہ بڑبڑاتی ہوئی بڑے سے براؤن گیٹ میں داخل ہوئی۔

''نفیسہ، بیگم صاحبہ گھر پر نہیں ہیں اپنے میکے گئی ہیں۔'' دروازے کے قریب ہی موجود چوکیدار نے اسے مطلع کیا۔ نفیسہ کی تو مانو جان ہی نکل گئی۔

''ایسے کیسے میرے پیسے دیے بنا میکے چلی گئیں۔ میرے بچے۔'' وہ چکرا کر رہ گئی۔

''بیگم صاحبہ کب میکے گئیں اور کیوں چلی گئیں؟'' وہ تڑپ کے چوکیدار کے قریب آئی۔

''رات ہی گئے ہیں وہ لوگ۔ بیگم صاحبہ کے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ بڑی ہی سیریس حالت ہے۔'' چوکیدار نے نفیسہ کو آگاہ کیا۔

''چھوٹی باجی اور سائر صاحب وہ تو ہیں ناں؟'' نفیسہ نے اپنے ڈولتے ہوئے دل کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''وہ بھی ان کے ساتھ ہی گئے ہیں۔'' چوکیدار نے بتا کر تو جیسے نفیسہ کی جان ہی نکال دی۔

''باجی کب آئیں گی؟'' اس نے رندھی ہوئی آواز اور رو دینے والی شکل سے دریافت کیا۔

''مجھے کیا پتا کب آئیں گے، مجھے کون سا بتا کر

''عید میں تو اتنے کم دن رہ گئے ہیں پتا نہیں کب آئیں گے؟'' وہ اب تپتے سورج سے بے نیاز جھلسا دینے والی گرمی سے بے خبر سوچتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اردگرد سے گزرتی ٹریفک، پھیری والے تیزی سے اپنی منزلوں کی جانب جا رہے تھے۔ بس ایک نفیسہ ہی تھی جس کے قدم سست سے سست تر ہو رہے تھے۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ وہیں سڑک کے بیچ بیٹھ کر دھاڑیں مار، مار کر روئے۔ آج تو وہ بڑی آس سے آئی تھی لیکن..... اس نے دکھے دل سے آسمان کی جانب سر اٹھایا۔ سورج کو شاید اس کی یہ جسارت اچھی نہیں لگی تھی۔ اس کی تیز گرم جھلسا دینے والی گرمی نے نفیسہ کو سر جھکا دینے پر مجبور کر دیا تھا۔

بھاری دل اور نم آنکھوں کے ساتھ وہ لکڑی کا بوسیدہ دروازہ کھول کر اندر آئی تو چھوٹے سے صحن میں جھاڑو لگاتی زہرا بیگم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''اے نفیسہ! تو اتنی جلدی واپس بھی آ گئی۔ اپنی باجی سے پیسے تو لے آئی ہے ناں۔ چل بچوں کے اسکول سے آنے سے پہلے ہم ان کی چیزیں لے آتے ہیں۔ عید میں تھوڑے ہی دن تو رہ گئے۔ منی کل بھی کتنی اداس ہو رہی تھی۔ آج اسکول سے آئے گی، اپنی چیزوں کو دیکھ کر خوش ہو جائے گی۔ چل اب رونے والی شکل کیا بنا کر بیٹھی ہے اٹھ بھی۔'' اس کی حالت سے بے خبر زہرا بیگم جوش سے بولتی جا رہی تھیں۔

''اماں۔'' نفیسہ کہہ کر خود پر قابو نہ رکھ سکی اور چارپائی پر بیٹھ کر تڑپ، تڑپ کر رونے لگی۔

''اے نفیسہ! دیکھ بتا کیا ہوا ہے، تو یوں کیوں رو رہی ہے؟'' زہرا بیگم نے استعجابیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''نفیسہ میرا دل ہول رہا ہے، بتا ناں کیا ہوا؟'' وہ اس کے قریب آ کر پریشانی سے کہہ رہی تھیں۔

گئے ہیں۔" چوکیدار نے کہا اور

www.pklibrary.com

لاؤں گی؟'' وہ زاروقطار روتے ہوئے ساس کو بتا رہی تھی۔

''ہائے ایسے کیسے چلی گئی، وہ بھی پیسے دیے بنا؟'' زہرا بیگم نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور نفیسہ کے قریب ہی ڈھے گئیں۔

''اور اگر جانا ہی تھا تو غریب کی مزدوری تو دے جاتیں۔'' اب کے زہرا بیگم غصے سے گویا ہوئیں۔

''اماں، اُن کے بھائی کا کل رات ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ سب رات ہی کراچی چلے گئے۔ ہائے اماں اگر وہ عید کے بعد آئے تو.....؟'' ایک انجانا سا اندیشہ اس کے لبوں پر آ کر دم توڑ گیا۔

''اللہ نہ کرے۔ تو اول فول نہ بک۔'' ساس نے خود کو سنبھالا۔ ''چل اب بس کر اللہ سے کرم کی امید رکھ۔ تیری باجی عید سے پہلے آ جائے گی۔ تو جا اندر جا کر لیٹ جا۔ تیرا روزہ ہے اور اتنی گرمی میں پیدل چل کر آئی ہے۔'' زہرا بیگم کہہ کر چادر ٹھیک کرتی اٹھ کر پھر سے جھاڑو دینے لگیں۔

نفیسہ وہیں بیٹھی بے دھیانی اور غائب دماغی سے انہیں جھاڑو دیتے دیکھنے لگی۔

☆☆☆

ایک کے بعد ایک دن گزرتا رہا۔ نفیسہ ہر روز اتنا لمبا سفر کر کے کوٹھی جاتی مگر ہر بار نامراد لوٹ آتی۔ ہر روز امید کا دامن لے کر وہ اس در پر جاتی مگر ہر بار خالی ہاتھ لوٹ آتی۔ آخر کار کوئی چارہ نہ پا کر اس نے اپنے اردگرد کے لوگوں سے ادھار مانگنا چاہا مگر وہ سب بھی اسی کی طرح زندگی کی گاڑی کو گھسیٹ رہے تھے اور پھر اوپر سے عید کی آمد۔ کوئی بھی اس کے خالی ہاتھ نہ بھر سکا۔

منی اور کاکا روز اس سے اپنی چیزوں کے بارے میں پوچھتے اور وہ انہیں کل کا کہہ کر ٹال دیتی۔ اماں نے شاہدہ سے پیسوں کی بات کی مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔

''اماں میرے پاس نہیں۔'' اس نے اپنا نوٹوں سے بھرا پرس ماں سے چھپاتے ہوئے کہا۔ زہرا بیگم تاسف اور دکھ سے گہری سانس لے کر رہ گئیں۔ زہرا بیگم کو خالی ہاتھ آتا دیکھ کر نفیسہ کی نئے کپڑوں اور

نذرانۂ عقیدت

مالک کیسی دنیا بنائی ہے
کسی کی عقل میں نہ آئی ہے
علم و عقل قلم کی تعلیم بڑھائی ہے
حرام و حلال کی تمیز سکھائی ہے
ایمان دین، عمل خیر کی روشنی پھیلائی ہے
کفر و شرک جہل و شر کی عقل بجھائی ہے
پر یہاں تو ہر رشتہ ہرجائی ہے
یا پُر ہر طرف کھائی ہے
دیکھو تو ہر طرف برائی ہے
ڈھونڈو تو کہاں بھلائی ہے
دو جہاں فقط برائی ہے
پریشان نہ ہو اے انساں
میرے رب نے رحمت برسائی ہے
شکر نے قوت جگائی ہے

کاوش: مشی علی، شاہ پور چاکر

چیزوں کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔

''چل نفیسہ جو کپڑے ہیں وہی نکال لے۔''

''اماں میں نے پرانے کپڑے نہیں پہننے۔'' منی رونے لگی۔ کاکا بھی منہ بنائے اس سے سخت ناراض ایک کونے میں بیٹھا تھا۔

''مجھے پرانے کپڑے نہیں پہننے اماں، میری ساری سہیلیاں اور پھوپی کی بیٹیاں نئے کپڑے اور جوتے پہنیں گی اور تمہیں پتا ہے ناں۔ وہ مجھے کتنا جلائیں گی۔ تو نے مجھے کہا تھا تو مجھے نئی چیزیں اور فراک لا کر دے گی اور اب.....'' منی روتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

''میں نے بہت کوشش کی تھی منی مگر کسی نے مجھے پیسے نہیں دیے اور نہ ہی باجی اپنے بھائی کے گھر سے واپس آئی۔'' نفیسہ کہہ کر دوپٹے سے اپنی آنسوؤں سے بھری آنکھوں کو صاف کرنے لگی۔

منی نے ناراضی سے ماں کو دیکھا اور وہیں سمٹ کر لیٹ گئی۔ کاکا بھی دادی کے پاس اداس بیٹھا ہوا وہیں سو گیا۔ زہرا بیگم اپنے آنسو چھپاتی اٹھ کر چھوٹی، چھوٹی چیزیں سمیٹنے لگیں۔

اور نفیسہ اٹھ کر صحن میں پڑی جھلنگا سی چارپائی پر آ کر لیٹ گئی۔

عید کا چاند نظر آ چکا تھا۔ اردگرد کے گھروں سے آوازیں نفیسہ کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ ''ارے جلدی چلو تمہیں چوڑیاں اور مہندی لگوا لاؤں۔'' ساتھ والے گھر میں ساجد نے اپنی بیوی اور بچیوں کو آواز لگائی۔

''ابا کل سب سے زیادہ پیاری میں لگوں گی تو عیدی بھی میں سب سے زیادہ لوں گی۔'' بارہ سالہ حرا نے مان سے باپ سے کہا۔

''نہیں ابا میں زیادہ پیاری لگوں گی، مجھے عیدی زیادہ ملے گی۔'' دس سالہ نمرہ کی آواز گونجی۔

نفیسہ نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر اٹھا کر کالی چادر اوڑھے آسمان کو دیکھا۔ جس کے سینے پر ان گنت چمکتے ستارے تھے۔

''کاش یہ ہیرے ہوتے اور میں یہ ہیرے توڑ سکتی اور انہیں بیچ کر اپنے بچوں کے لیے ڈھیروں خوشیاں خرید لاتی۔'' اس نے بڑبڑا کر کہا۔ آنکھیں بار، بار پانی کے سیلاب سے بھر جاتیں۔ وہ روکتی تھی اور رو رہی تھی۔

''یا اللہ تو ہی کوئی غیبی امداد بھیج دے۔'' وہ بار، بار سر اٹھا کر لکڑی کے بوسیدہ دروازے کو دیکھتی اور پھر اماں کو دیکھنے لگتی۔ دونوں کی نظریں ملتیں اور دونوں ہی ایک دوسرے سے نظریں چرا لیتیں۔

''اماں چل باجی شاہدہ کے پاس چلتے ہیں، کیا پتا وہ ہماری مدد کر دے۔ میں بعد میں اس کے سارے پیسے لوٹا دوں گی۔''

''تو کملی ہے، گئی تو تھی میں اس کے پاس۔ مدد کرنی ہوتی وہ اسی وقت کر دیتی۔ بڑی ہی کم ظرف ہے۔ بٹوے میں اتنے سرخ اور سبز نوٹ لیے بیٹھی تھی۔ جیسے ہی میں نے بات کی فوراً ہی بٹوا چھپا لیا۔'' زہرا بیگم نے افسردگی سے کہا اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگیں۔

جیسے اب آخری امید بس خدا کی ذات ہی بچی ہے۔

☆☆☆

نفیسہ صبح سے ہی کاکے اور منی کی منتیں کر رہی تھی کہ دو سال پہلے بنائے گئے کپڑے ہی زیب تن کر لو مگر آٹھ سالہ منی اور چھ سالہ کاکا خاموشی سے بیٹھے رہے۔

''اماں تو ہی ان کو سمجھا۔ عید کی نماز بھی ہو چکی۔ سارے بچے تیار ہوئے خوش، خوش پھر رہے ہیں۔ یہ دونوں بھی تیار ہو جائیں۔'' وہ بے بسی سے کہہ رہی تھی۔

''چل منی اس بار یہی کپڑے پہن لیتے ہیں۔ اماں اگلی عید پر ہمیں بہت اچھے کپڑے لے کر دیں گی۔'' آخر کاکا نے کہہ کر بہن کا ہاتھ تھاما۔ اس سے پہلے کہ منی کوئی جواب دیتی، دروازہ زور، زور سے بجنے لگا۔

''یہ کون آ گیا؟'' زہرا بیگم گھٹنوں پر دباؤ دے کر اٹھیں۔

''دادی تم بیٹھو، میں کھولتی ہوں۔'' منی کہہ کر چارپائی سے اتری اور بھاگ کر دروازہ کھول دیا۔ جہاں شاہدہ پھوپی، آصف کے ساتھ ہاتھوں میں ڈھیروں شاپر لیے کھڑی تھی۔

''اے منی پرے ہٹ یہیں کھڑی رہے گی۔'' شاہدہ نے منی کو دروازے کے عین سامنے کھڑا دیکھ کر ٹوکا۔

منی تیزی سے پیچھے ہٹی۔ شاہدہ سیدھا کمرے میں گئی اور ماں کی چارپائی پر بیٹھ کر اپنے اردگرد چیزوں سے بھرے شاپروں کو رکھ لیا۔

''جا آصف جا میرا بچہ، تو جا کر تیار ہو جا اور جیسا کہا ہے ویسا ہی کریو۔'' شاہدہ نے بیٹے سے کہا تو وہ تابعداری سے اثبات میں سر ہلا کر پلٹا۔

''نانی آ کر عید ملتا ہوں۔''... آصف نے کہا اور کمرے کا دروازہ پار کر گیا۔

''اے منی! اِدھر آ۔ وہاں دروازے کے پیچھے چھپی کیا کر رہی ہے؟'' شاہدہ نے باہر کھڑی منی کو آواز لگائی اور کاکے کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

کاکے نے استفہامیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ نفیسہ نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا اور خود باہر کی طرف بڑھ گئی۔

''لے کاکے یہ تیری نئی بوشرٹ اور پینٹ۔ یہ

لے اپنی گھڑی یہ بھی پکڑ اپنی عینک۔ چل میرا شہزادہ جلدی سے تیار ہوکر آ۔''

نفیسہ نے اپنی پشت پر آواز سنی تو حیرت سے پلٹ کر آنکھیں پھاڑ کر شاہدہ کو دیکھنے لگی۔

''منی یہ لے، یہ تیری فراک، پنیں، پرس اور یہ تیرے میچنگ سینڈل، چل تو بھی جلدی سے تیار ہو۔''

''اور کاکے یہ پکڑ اپنے جوتے بھی۔'' شاہدہ نے ایک شاپر کو کھول کر دیکھا اور کاکے کی سمت بڑھا دیا۔

''اور تو......'' اب کے وہ نفیسہ کی طرف مڑی۔ ''یہ پکڑ چاول، چکن، گھی، سویاں۔ آصف ابھی دودھ دے جاتا ہے۔ جلدی سے میٹھی سویاں بنا۔ ساجد اور بچیاں یہیں آنے والے ہیں اور ہاں دوپہر کا کھانا بھی ہم سب مل کر کھائیں گے۔ جلدی سے اٹھا یہ سب۔ اماں ایک تو تیری بہو کی یہ مراقبے والی حالت کبھی نہیں بدلنے والی۔ دنیا بدل جائے گی مگر یہ بی بنو ویسی کی ویسی رہے گی۔'' شاہدہ نے گردن موڑ کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جن کے چہرے پر تو خود حیرت و استعجاب بھرے تاثرات تھے۔ زہرا بیگم نے نفیسہ کو اشارہ کیا۔ تو وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آگے بڑھ کر شاہدہ کے پاس پڑے شاپروں کو اٹھانے لگی۔

''اور میری بات سن۔ یہ ذرا ابا ورچی خانے میں رکھ کر آ۔'' شاہدہ نے کہا اور ماں کی طرف متوجہ ہوئی۔

''لے اماں تو بھی کپڑے بدل لے۔ تیری نواسی نے صبح چار بجے بیٹھ کر تیرا سوٹ سلائی کیا ہے۔'' شاہدہ نے ہلکے سبز رنگ کا سوٹ زہرا کی طرف بڑھایا۔

''تو شاہدہ میرا نہ سلواتی۔ نفیسہ کے لیے......'' زہرا نے پکڑے بغیر کہا۔

''پتا تھا اماں مجھے۔ تجھے اپنی بہو کا سب سے پہلے خیال آنا تھا۔ لے پکڑ نفیسہ اپنا سوٹ۔ تو بھی جا تیار ہو۔'' شاہدہ نے کمرے میں آتی نفیسہ کے سامنے دوسرا شاپر بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپا!'' نفیسہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''اماں میں تیری بہو سے بڑی تنگ ہوں۔ ارے جلدی سے میٹھا تیار کر لے سب آنے والے ہوں گے۔ بت بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔'' شاہدہ نے کہا اور بات کے اختتام پر ہولے سے مسکرا دی۔ نفیسہ نے مسکرا کر شاہدہ کے ہاتھ سے وہ شاپر تھام لیا اور پلٹ کر منی اور کاکے کو دیکھا جو خوشی، خوشی ایک دوسرے کو اپنی چیزیں دکھا رہے تھے۔ نفیسہ نے تشکرانہ نظروں سے اوپر کی طرف دیکھا اور جلدی سے کچن میں آ گئی۔

''شاہدہ......'' نفیسہ کے جانے کے بعد زہرا بیگم نے کچھ کہنا چاہا۔

''اماں بس تو کچھ نہ کہنا۔ جب سے تو آئی تھی اور میں نے تجھے پیسے دینے سے انکار کیا تھا ضمیر پر عجیب سا بوجھ آن گرا تھا بار، بار بھائی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آتا رہا۔ یہ چند ہزار میں بچا بھی لیتی مگر ان پیسوں سے ایسی خوشی کہاں خرید سکتی تھی جو منی اور کاکے کے چہرے پر اب ہے۔ عید تو بچوں کی ہوتی ہے اپنوں کے ساتھ خوشیاں بڑھتی ہیں کبھی کم نہیں ہوتیں۔ دیر تو لگی مجھے یہ بات سمجھنے میں۔ مگر شکر ہے اتنی دیر نہیں ہوئی کہ مجھے پچھتانا پڑتا۔ بھائی ہوتا تو ان بچوں کی آنکھوں میں اتنی حسرتیں نہ ہوتیں۔ بار، بار منی اور کاکے کا چہرہ مجھے بے چین کرتا رہا۔ بس رات گیارہ بجے آصف کو ساتھ لیا میں نے اور لے آئی ساری چیزیں۔'' شاہدہ کے رندھے لہجے میں بھی خوشی چھلک رہی تھی۔

''دیکھ پھوپی میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' منی نے تیار ہوکر شاہدہ کے سامنے گھومتے ہوئے سوال کیا۔

''بہت سوہنی، بالکل پری جیسی۔'' شاہدہ نے کہہ کر منی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

واقعی عید کی خوشیاں تو ایک دوسرے کی خوشیوں میں ہوتی ہیں اور یہ خوشیاں اس وقت زیادہ ہو جاتی ہیں جب ہم اپنوں کا خیال کر کے انہیں بھی اپنی خوشیوں میں شامل کر لیتے ہیں۔

شاہدہ نے تو یہ بات سمجھ لی تھی۔ اب ہماری باری ہے۔ اگر ایسا کوئی ہے جس کی خوشیاں تھوڑے سے پیسوں سے مل سکتی ہیں تو دیر نہیں کرنی کیونکہ خوشی دیں گے تو بدلے میں قہقہوں کی صورت میں ہی خوشی مل سکتی ہے۔

❀❀❀

ناولٹ

بے درد

عفت گل اعزاز

ماجدہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ امی، ابو اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کی ہر فرمائش پوری کرتے تھے۔ اُن کے لاڈ پیار کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنی بات منوانے کی عادی ہوگئی تھی۔ اس روز ماجدہ کی سالگرہ تھی اس نے اپنی دوستوں کو دعوت دی تھی۔ گھر کو بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ اس کی سہیلیاں خوب اچھے، اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ وہ سب ماجدہ کے لیے خوب صورت تحائف لے کر آئی تھیں۔ جو اس نے مسکرا کے وصول کیے۔ اس نے کاسنی رنگ کا بے حد خوب صورت سوٹ پہنا تھا اور کانوں میں بڑے، بڑے بالے پہنے ہوئے تھے۔ وہ اپنی دوستوں

pklibrary.com

کے ساتھ گپ شپ میں لگی ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اس نے جا کر دروازہ کھولا تو وہاں اسد کھڑا تھا۔ جس کے ہاتھوں میں پھولوں کا خوب صورت گلدستہ تھا۔

''اسد..... تم..... اس وقت.....؟'' ماجدہ نے اسے دیکھ کر کہا..... اسد اس کا خالہ زاد بھائی تھا جو قریب ہی رہتا تھا۔

''ہاں، یہ گلدستہ تمہارے لیے لایا تھا۔ تمہاری سالگرہ ہے ناں.....'' اسد نے مسکرا کر کہا اور خوب صورت پھولوں کا گلدستہ اس کے سامنے کر دیا۔

کر لیے۔ ''اوہ شکریہ.....'' ماجدہ نے مسکرا کر پھول وصول

''میری فرینڈز آئی ہوئی ہیں؟'' ماجدہ نے بتایا۔

''اچھا، میں چلتا ہوں۔ پھر آؤں گا۔''

''ٹھیک! اللہ حافظ۔'' ماجدہ نے اتنا کہہ کر دروازہ بند کر کے پھولوں کو سونگھا ایک خوشگوار بھینی، بھینی خوشبو رگ و جاں میں اتر آئی۔ اس خوشبو میں اسد کی جانب سے الفت کا مہکتا ہوا احساس بھی شامل تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی اندر آئی۔ سب لڑکیوں نے اس کے ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ دیکھا تو طرح طرح کے سوالات کرنے لگیں۔

''اوہو، یہ کون لایا ہے؟''

''یہ پھول کہاں سے آئے؟''

''کتنے پیارے پھول ہیں یہ۔''

''یہ پھول میری خالہ نے بھجوائے ہیں۔'' ماجدہ نے کہا اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے اسد کا نام لے لیا تو یہ سب لڑکیاں اسے چھیڑنا شروع کر دیں گی۔

امی، ابو نے اس کی سالگرہ پر پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ سب لوگوں نے خوش ہو کر کھایا پیا، شام ہوئی تو وہ سب اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ کمرا خالی ہو چکا تھا، میز پر پھولوں کا گلدستہ اب بھی رکھا تھا اور خوشبو بکھیر رہا تھا۔ وہ میز کے پاس ہی بیٹھ گئی اور جھک کے خوشبو سونگھنے لگی۔

''بہت پسند آئے پھول؟'' اچانک کسی کی آواز

pklibrary.com

نے اسے چونکا دیا، اس نے دیکھا اسد وہاں کھڑا تھا۔

''ہاں، پھول مجھے بہت پسند ہیں۔'' ماجدہ نے جواب دیا۔ ''آؤ بیٹھو تم کب آئے؟''

''ابھی آیا ہوں..... ہوگئی تمہاری پارٹی؟ کیسی ہوئی؟'' اسد نے پوچھا۔

''ہاں، بہت اچھی.....'' ماجدہ نے کہا۔

''ماجو تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو.....'' اسد نے کہا۔ ماجدہ کو اس کی تعریف پر شرم آ گئی۔

''پتا ہے امی کیا کہہ رہی تھیں؟'' اسد نے کہا۔

''بھلا کیا کہہ رہی تھیں خالہ؟'' ماجدہ نے پوچھا۔

''وہ کہہ رہی تھیں کہ اسد کی شادی ماجدہ سے کروں گی۔'' اسد نے ہنس کر کہا تو وہ شرما گئی۔

''میں تمہیں پسند کرتا ہوں ماجو، کیا تم بھی مجھے پسند کرتی ہو؟'' اسد نے بلا جھجک اس سے فوراً پوچھا۔

''پتا نہیں؟'' ماجو نے ہنس کر کہا۔

''اتنے میں امی ٹرے میں کیک، مٹھائی اور دوسری چیزیں رکھ کر لے آئیں۔

''اسد، بیٹے یہ لو، مٹھائی کھاؤ.....'' انہوں نے بہت پیار سے کہا۔

''جی خالہ، ماجو کی سالگرہ مبارک ہو آپ کو.....'' اسد نے خالہ کو مبارک باد دی۔

''ہاں بیٹا، اللہ کا شکر ہے، اللہ اسے لمبی عمر دے۔ اسے ہمیشہ بہت خوشیاں دے۔'' امی نے بیٹی کو دیکھتے ہوئے پیار سے دعائیں دیں۔

''جی، آمین.....'' اسد نے کہا۔

''اور سناؤ، گھر میں سب خیریت ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

ابو بھی وہاں آ گئے تھے اور وہ اسد سے حال چال پوچھنے لگے۔ کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلا گیا تھا۔

☆☆☆

ماجدہ رات سونے لیٹی تو اسے دن بھر کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اسد کا تعریف کرنا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنا اس کے دل میں خوشیوں کے پھول کھلا رہا تھا۔ اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہو، صالحہ خالہ اس سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ان کا گھر قریب تھا۔ ماجدہ اور اسد بچپن سے ساتھ کھیلتے بڑے ہوئے تھے۔ اسے بھی اسد بہت پسند تھا۔ خالو اور ابو شراکت میں کاروبار بھی کرتے تھے۔ غرضیکہ دونوں گھرانوں میں کافی میل تھا۔ اسد اکثر ان کے گھر آتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہ ماجدہ کو موٹر بائیک پر اپنے ساتھ بٹھا کر سیر کرانے لے جاتا۔ ماجدہ اس کے ساتھ بہت خوش رہتی۔

لیکن پھر رفتہ رفتہ کاروبار میں ابو کو گھاٹا ہونے لگا۔ انہوں نے جمشید بھائی سے بات کی، بات اتنی بڑھی کہ دونوں کے درمیان اختلاف بڑھنے لگا اور تعلقات بگڑنے لگے۔ صفیہ اور صالحہ نے تہیہ کر لیا کہ ان کے شوہروں کے درمیان اختلاف ہو رہا ہے، تعلقات میں کھچاؤ بڑھ رہا ہے۔ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر ہم دونوں ہمیشہ ایک ہو کر رہیں گی اور ایک دوسرے سے ملتے رہیں گے کبھی جدا نہ ہوں گے۔

☆☆☆

ایک دن اسد نے ماجدہ کو بتایا کہ اس کی امی، ابا میں جھگڑا ہو گیا۔ امی نے اس بات پر اصرار کیا کہ وہ ماجدہ کو اپنی بہو بنائیں گی اور ابا یعنی ماجدہ کے خالو نے صاف انکار کر دیا۔

''میں صدیق سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا، اسد کی ان کے گھر میں شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اب بتاؤ میں کیا کروں.....؟ میں صرف تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں.....'' اسد نے پوچھا۔

''اسد..... میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔ تم کچھ کرو ناں؟'' ماجدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں کیا کر سکتا ہوں ماجو.....؟'' وہ افسردگی سے بولا۔ ''میں ابھی کوئی پکی نوکری کرتا ہوں نہ میرا کوئی اپنا کوئی گھر ہے..... بہتر ہے کہ ہم حالات سے سمجھوتا کر لیں؟''

''چلو ہم کہیں بھاگ جاتے ہیں۔'' ماجدہ نے چمک کر کہا۔

''بھاگ کے کہاں جائیں گے؟ میں تمہیں کہاں رکھوں گا؟ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔''

''تم پیسے کی فکر نہ کرو، میری امی کے پاس سونا بھی ہے اور پیسے بھی..... میں سونے کے زیورات اور رقم لے لوں گی..... ہمیں کہیں نہ کہیں رہنے کی جگہ مل جائے گی۔'' وہ عجیب منصوبے بنانے لگی، اسد اسے دیکھے جارہا تھا۔

''اسد میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی..... بس تم کچھ کرو.....'' اسد تو صاف ہچکچا رہا تھا مگر ماجدہ کے بے حد اصرار پر وہ کچھ سوچنے کی حد تک راضی ہو گیا۔

''ایک بات کا دھیان رکھو کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔'' اسد نے کہا۔

''تم فکر نہ کرو میں کافی ساری رقم اور سونا لے کر چلوں گی۔'' ماجدہ نے کہا۔

ایک ہفتے تک ماجدہ نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا بندوبست کیا اور پھر ایک رات جب امی، ابو سو گئے تو اس نے امی کی الماری جو اسٹور میں بنی ہوئی تھی سے زیورات کی پوٹلی نکالی اس کے خفیہ خانوں سے رقم ٹٹول کر نکالی اور جلدی، جلدی اسے ایک بیگ میں ڈالنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے اسٹور کا دروازہ بند کر دیا تھا مگر وہ اِدھ کھلا تھا جبھی اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے پہلے تو وہ اسے اپنا وہم سمجھی ذرا سی آہٹ پر اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو وہاں راشد کھڑا تھا۔ راشد اس کے تایا کا بیٹا تھا جو بچپن میں ہی یتیم ہو گیا تھا۔ ماجدہ کے والدین نے اسے پالا پوسا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے نوکر ہی سمجھتی آئی تھی اور اس سے ہمیشہ اکڑ کر بات کرتی تھی۔

''تم..... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ یہاں آئے کیوں؟ میری جاسوسی کر رہے ہو؟'' اس نے برہمی سے پوچھا۔

''گھبرا کیوں گئی ہو؟ یہ زیور کیوں بیگ میں ڈال رہی ہو؟ کیا گھر سے بھاگنے کا ارادہ ہے؟''

''میں زیور کہیں بھی رکھوں تمہیں کیا؟ جاؤ جا کر اپنا کام کرو.....'' ماجدہ نے اسے ڈانٹا۔

''اگر تمہارا ارادہ گھر سے بھاگنے کا ہے تو یاد رکھو میں تمہیں بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا اگر کوئی لڑکی گھر سے بھاگ جائے تو دنیا اسے کبھی عزت نہیں دیتی، اس کے ماں، باپ بھی رسوا ہو جاتے ہیں۔ کیا تم انہیں معاشرے میں بے عزت کرنا چاہتی ہو، انہیں بدنام کرنا چاہتی ہو؟ کچھ ان کی عزت کا خیال کرو.....'' اسے راشد اور اس کی نصیحتیں اس وقت بہت بری لگ رہی تھیں جبھی وہ اکڑ کر بولی۔

اصل میں راشد نے ان دونوں کی منصوبہ بندی کی سن گن پالی تھی۔

''بات سنو میں کچھ بھی کروں تم سے مطلب..... جاؤ یہاں سے ہر جگہ منہ اٹھائے چلے آتے ہو۔''

''ٹھیک ہے! میں چلا جاتا ہوں۔ مگر تم میرے چاچا کی بیٹی ہو اس لیے تمہیں بتا رہا ہوں۔'' راشد نے کہا اور باہر چلا گیا۔ ماجدہ نے زیور، نقدی اور دو تین جوڑے ایک بیگ میں ٹھونسے اور باہر نکل آئی۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی گیٹ تک آئی۔ باہر بہت کم روشنی تھی وہاں تالا پڑا دیکھ کر وہ پلٹنا گئی۔ کمرے سے آتی دھندلی روشنی میں اس نے دیکھ لیا کہ راشد ایک طرف کھڑا تھا۔

''تالا کھولو! مجھے باہر جانا ہے۔'' ماجدہ نے اشارے سے اسے بلا کر کہا۔

''کیا تم نے چاچا سے اجازت لی ہے؟'' راشد نے پوچھا۔ راشد کے سوال پر وہ جل بھن گئی۔

''تم ہو کون مجھ سے یہ پوچھنے والے؟'' ماجدہ نے تلخی سے پوچھا۔

''بیٹا ہوں چاچا کا۔'' راشد نے جواباً کہا۔

''تم ان کے بیٹے نہیں، نوکر ہو نوکر..... چلو تالا کھولو جلدی..... ہٹو میرے راستے سے مجھے خالہ کے گھر جانا ہے۔''

''تالا نہیں کھلے گا۔'' راشد نے دبنگ ہو کر کہا۔

ان کی تکرار کی آوازیں سن کر راشد کے چاچا یعنی ماجدہ کے ابو باہر آ گئے۔

''کیا ہو رہا ہے یہ؟'' انہوں نے راشد سے پوچھا۔ راشد نے بتایا تو ان کے قدموں تلے زمین نکل گئی۔ چاچی بھی سوتے سے اٹھ کر آ گئیں۔ اس کے بعد تو ماجدہ کے منہ سے گویا زبان ہی غائب ہوگئی۔ امی اسے گھسیٹتے ہوئی اندر لے گئیں۔ راشد نے پوری کہانی چاچا، چاچی کے گوش گزار کر دی تھی جس پر دونوں کافی چراغ پا تھے اور راشد کے سامنے شرمندہ الگ.....

''کیا تو پاگل ہوگئی ہے؟ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ہمارے لاڈ پیار کی وجہ سے تو اتنی بگڑ جائے گی اور آوارہ لڑکیوں کی طرح گھر سے بھاگ جائے گی؟ تجھے ہماری عزت کا ذرا بھی خیال نہیں.....'' امی نے اندر جا کر اسے خوب برا بھلا کہا۔

''میں اسد سے محبت کرتی ہوں، ہم دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' ماجدہ نے روتے ہوئے کہا۔

''شادی کا یہ طریقہ نہیں..... اسے اگر شادی کرنی ہے تو وہ اپنے ماں، باپ کو ہمارے گھر لائے۔ عزت سے تیرا ہاتھ مانگیں پھر ہم دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔'' ابو بھی وہیں آ گئے تھے۔

''آپ لوگوں کے لڑائی جھگڑے کی وجہ سے وہ اس گھر میں نہیں آئیں گے۔'' ماجدہ روتے ہوئے بولی۔

''وہ نہیں آئیں گے تو نہ آئیں..... ہمیں اور بہت رشتے مل جائیں گے۔'' وہ بولے۔

''بس کل سے تیرا کالج آنا جانا بند.....'' امی نے فوری فیصلہ سنا دیا۔

''بہت ہوگئی.....''

''اور خبردار جو اسد کا نام لیا تو.....'' امی بولیں۔

''جب وہ ہم سے ملنا نہیں چاہتے تو ہم بھی نہیں ملیں گے۔'' ماجدہ زور، زور سے رونے لگی۔ امی نے بیگ کھول کر تمام زیورات اور رقم نکال لی اور خوب غصہ کرنے لگیں۔

''حد ہوگئی تیری دیدہ دلیری کی..... شرم نہیں آتی تجھے ایسی نیچ حرکت کرتے ہوئے ٹھہر جا تو ذرا..... میں کرتی ہوں تیرا انتظام قبل اس کے کہ تو کوئی اور گل کھلائے اور ہماری عزت خاک میں ملائے۔'' ان کا غصے کے مارے خون کھول رہا تھا۔

ماجدہ کا صدمے اور غصے سے برا حال تھا۔ اسد نے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ چند دن بعد اسے معلوم ہوا کہ اس کی بات پکی کی جا رہی ہے۔

''بی بی، آپ کو مبارک ہو.....'' ماسی بشیراں نے ہنستے ہوئے اطلاع دی۔

''کس بات کی مبارک باد.....؟'' ماجدہ نے پوچھا۔

''آپ کی شادی ہونے والی ہے۔''

''میری شادی.....؟ کس سے؟'' وہ حیران ہوئی۔

''راشد سے۔''

''اس بدھو سے؟ ہرگز نہیں.....'' ماجدہ کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

''وہ بڑے شریف اور تمیزدار ہیں۔ سارے لوگ اُن کی بہت عزت کرتے ہیں۔''

''اچھا، بہت اچھے لگتے ہیں تجھے؟ تو پھر تو ہی کر لے شادی ان سے۔'' ماجدہ نے کہا۔

''توبہ بی بی، آپ کیسی باتیں کرتی ہیں؟ میں نے تو جو بات سنی، وہ آپ کو بتا دی۔'' بشیراں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے تیری مہربانی..... جا ذرا جلدی سے کھانا لا دے۔ سخت بھوک لگی ہے؟'' ماجدہ نے کہا..... اس نے سوچا کہ ایک بار اسد سے بات کر کے تو دیکھوں کہ وہ کیا کہتا ہے۔ اس نے کئی بار فون کیا مگر نہ ملا۔

اسی شام کو اس نے اپنی سہیلی فاخرہ سے ملنے کا بہانہ کیا اور پھر اسد کے گھر جا پہنچی۔ اسی نے دروازہ کھولا لیکن اسے دیکھتے ہی دروازہ بند کرنے لگا۔

''اسد، میری بات تو سنو.....'' ماجدہ نے کہا۔ اسد کے چہرے پر اجنبیت تھی۔

''مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی..... تم جا سکتی ہو۔'' اس نے دروازہ بند کر دیا اور ٹھنڈی سانس لی۔

''اگر تم بے وفا ہو تو مجھے بھی تمہاری کوئی پروا نہیں.....'' ماجدہ نے غصے سے کہا اور وہاں سے

گھر آ گئی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر گلی میں نظر ڈالی راشد بازار سے سودا لے کر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھیلے تھے۔ ''یہ انسان کہاں ہے؟ یہ تو نوکر ہے، بیوقوف، بدھو سا..... میں تو اس سے کبھی شادی نہ کروں..... یہ فیصلہ کیا کس نے ہے؟'' ماجدہ نے سوچا..... ''امی نے یا ابو جی نے؟ خیر جو بھی کرے..... مجھے اس سے کیا..... شادی تو میری ہے ناں..... میری مرضی، میں جس سے بھی کروں.....'' وہ یہی کچھ سوچ رہی تھی کہ امی کی آواز آئی۔

''ماجدہ..... آؤ کھانا کھالو.....''

''میں نہیں کھاتی..... بس آپ ہی کھائیں۔'' اس نے غصے سے جواب دیا۔

''کیوں.....؟ کیا بات ہے؟'' امی نے کمرے میں آ کر پوچھا تو وہ ناراض لہجے میں بولی۔

''کہہ دیا ناں کہ مجھے کھانا نہیں کھانا.....''

''بیٹی..... کوئی وجہ بھی تو ہو.....'' امی نے لاڈ سے پوچھا۔

''یہ جو آپ کا لاڈلا ہے ناں راشد..... کیا آپ اس سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں؟''

''ابھی شادی نہیں ہو رہی..... ابھی تو تمہارے ابو ذکر کر رہے تھے..... وہ کہہ رہے تھے کہ راشد ان کا سگا بھتیجا ہے..... بڑا نیک، شریف اور فرمانبردار لڑکا ہے..... اگر وہ راضی ہو جائے تو ماجدہ کی اس سے شادی ہو جائے۔ آخر کو تم ہماری لاڈلی بیٹی ہو، اکلوتی ہو..... اگر خاندان سے باہر کہیں شادی ہو گی تو تمہیں سسرال والوں کی خدمت کرنی پڑے گی..... اس گھر کو چھوڑ کر جانا پڑے گا..... راشد ہمارا گھر داماد بن کر یہیں رہے گا..... اس سے اچھا رشتہ تمہیں نہیں ملے گا..... اور تم فکر کیوں کرتی ہو..... ابھی نہیں ہو رہی شادی..... چار، پانچ سال بعد ہو گی..... چلو تم تو آ کے کھانا کھالو.....'' امی نے اسے سمجھایا۔

''ہائے اللہ..... امی کے حساب کتاب تو سب ٹھیک ہیں مگر میں کیا کروں..... مجھے تو وہ پسند ہی نہیں ہے..... اللہ میاں کی گائے جیسا..... بدھو، احمق، کاش اسد سے میری شادی ہو جاتی..... مگر وہ تو بڑا احمق بڑا بے وفا نکلا اس نے میرا حال بھی نہیں پوچھا۔''

☆☆☆

وقت پر لگا کر اڑا جا رہا تھا ماجدہ کے لیے کئی جگہوں سے شادی کے پیغامات آئے..... لیکن وہ اسے بالکل پسند نہ آئے۔ راشد نے بی اے پاس کر لیا تھا اور وہ بہت سمجھدار اور بردبار ہو گیا تھا۔ اسے سرکاری ملازمت بھی مل گئی تھی۔ چاچا جی اس سے بہت خوش تھے۔

اصل میں ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لیے اس نے ایک بیٹے کی طرح ان کی خدمت کی اور ان کی رائے کو ہمیشہ مقدم سمجھا..... ماجدہ اب بیس سال کی ہو چکی تھی چار سال پہلے جو نادانی وہ کچی عمر میں کرنے جا رہی تھی اس سے اسی راشد نے بچایا تھا اور وہ اب بیٹی کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ اسد والے واقعے کے بعد سے ماجدہ کافی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

''تم اگر پسند کرو تو تمہاری اور ماجدہ کی شادی کر دی جائے۔'' چاچا نے ایک روز راشد کو بلا کر اپنے دل کا مدعا بیان کیا۔

''جی.....'' وہ گھبرا گیا۔ ''میری اور ماجدہ کی شادی..... یہ، یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں.....''

''بیٹا پریشان نہ ہو..... میں جانتا ہوں کہ وہ مزاج کی تیز ہے، لیکن دل کی بری نہیں۔'' راشد کے لیے یہ بڑی غیر متوقع بات تھی۔ وہ ماجدہ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بڑی ہٹ دھرم اور ضدی لڑکی تھی۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے وہ صرف حکم دینا جانتی تھی۔ حکم ماننا اس کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔ راشد نے تو اپنے خوابوں میں ایک ایسی محبت کرنے والی، نرم مزاج اور وفا شعار لڑکی کو بسایا ہوا تھا جس کے دل میں اپنے شوہر کے لیے گہری چاہت ہو، احترام ہو اور جو اسے زندگی کا سکون دے سکے..... لیکن ماجدہ جیسی من مانی کرنے والی ضدی لڑکی کو وہ کیسے برداشت کر پائے گا..... اور

یہ تو عمر بھر کا معاملہ ہے۔ کیا ماجدہ اس کے لیے ایک محبت کرنے والی اور اس کی ذات کا احترام کرنے والی بیوی بن پائے گی؟ پھر اس کے دل میں تو پہلے ہی اسد بسا ہوا تھا، راشد یہ بات اچھی طرح جانتا تھا۔

''نہیں، نہیں..... کبھی بھی نہیں..... اس سے یہ توقع کرنا اول درجے کی حماقت ہوگی..... یہ لڑکی مجھے بالکل پسند نہیں..... یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہوگا..... یا اللہ..... ! میں کیا کروں.....؟'' وہ چند لمحوں میں ہی کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔

''چاچا جی..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' راشد کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ ''میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا۔''

''بیٹا..... اپنے چاچا کا بوجھ کم نہیں کرے گا.....؟'' ... چاچا اسے التجا بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ راشد کی زندگی ان کے احسانات کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ اس میں انکار کی جرأت نہیں تھی اور وہ تو ہمیشہ اپنے چاچا کو سکھ دینے کا خواہش مند تھا۔ اس شادی سے چاچا کو تو سکھ ضرور مل جائے گا مگر اس کی زندگی کا سکھ ختم ہو جائے گا۔

''جیسی آپ کی مرضی چاچا جی۔'' بالآخر اس نے کہا۔

''تو فکر نہ کرنا..... وہ میری بیٹی بعد میں ہے پہلے تو میرا بیٹا ہے..... یہ گھر، کھیت کھلیان، یہ روپیہ پیسہ سب کچھ تیرا ہے۔'' چاچا جی نے اسے اطمینان دلایا۔

''چاچا جی..... مجھے دفتر کی طرف سے تھوڑے دنوں میں گھر مل جائے گا.....'' اس نے بتایا۔ ''میں وہاں چلا جاؤں گا.....''

''نہیں بیٹا..... یہ گھر تیرا ہے..... تو یہاں سے کہیں نہیں جائے گا، کیا تو مجھے، اپنے چاچا اور چاچی کو بڑھاپے میں اکیلا چھوڑ دے گا۔ اگر ہمارا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ ہمیں کبھی چھوڑ کر نہیں جاتا.....'' وہ غمزدہ سے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ وہ چاچا کو اداس اور دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''چاچا..... آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی ہوگا.....'' سیدھے سادے راشد نے سعادت مندی سے کہا۔

''شاباش بیٹے..... مجھے تجھ سے یہی امید تھی، خوش رہ..... جیتا رہ۔'' چاچا نے اسے گلے لگا لیا اور وہ ماجدہ کو قبول کرنے کو تیار ہو گیا جیسے جانتے بوجھتے زہر کا پیالا پینے کو تیار ہو گیا۔

''صفیہ، صفیہ ادھر آؤ..... تمہیں مبارک ہو.....'' انہوں نے صفیہ بیگم کو آواز دی۔ وہ کمرے میں آئیں تو چاچا نے انہیں خوشخبری سنائی کہ راشد، ماجدہ سے شادی کے لیے راضی ہو گیا ہے۔ انہوں نے راشد کو محبت سے گلے لگا لیا۔ انہیں خوب اندازہ تھا کہ ماجدہ کا مزاج شاہانہ ہے۔ وہ بلا کی ضدی ہے، خود پسند ہے، ہٹ دھرم ہے۔ وہ من مانی کرنے کی عادی ہے۔ راشد سیدھا سادہ فرمانبردار لڑکا ہے۔ ان کی بدمزاج بیٹی کا تابعدار ملازم ثابت ہوگا۔ چاچی کو یہ خیال تھا کہ شاید راشد اس رشتے کو پسند نہ کرے جبھی انہوں نے اپنے میاں سے کہہ کر اسے جائداد کا لالچ بھی دیا۔ راشد اپنی کمزور مالی حیثیت سے واقف تھا۔ اس نے بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔ ماجدہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی یہ رشتہ قبول کرنا پڑا۔ اور پھر دونوں کی شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد ماجدہ مزید نڈر ہو گئی وہ کسی راجدھانی کی ملکہ کی طرح راشد پر حکم چلاتی مگر راشد کی جرأت نہ ہوتی کہ کسی معاملے میں انکار کرے۔ ایک بار راشد نے اس کے طرز تحکم پر اعتراض کیا۔

''ذرا آرام اور تمیز سے بات کیا کرو..... میں تمہارا شوہر ہوں کوئی غلام نہیں.....'' اس بات پر ماجدہ نے وہ شور مچایا اور راشد کے مظالم کی خود ساختہ کہانیاں اپنے ماں، باپ کو سنائیں کہ ان دونوں نے راشد کو وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ وہ بیچارہ دنگ رہ گیا۔

''چاچا جی ایسی کوئی بات نہیں..... میں تو اس کی ہر بات مانتا ہوں، آپ اسے سمجھائیں کہ یہ بھی تمیز سے بات کرے، میری بھی کچھ عزت ہے۔''

''راشد..... دیکھ وہ ہماری اکلوتی بیٹی ہے۔ مانا کہ مزاج کی ذرا تیز ہے مگر تجھے اس کا خیال رکھنا پڑے

گا۔ اسے خوش رکھنا اب تیرا کام ہے۔'' چاچی نے کہا۔
''یعنی وہ ظلم اور زیادتی کرتی رہے..... اور میں سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتا رہوں.....؟''
''تجھے ہم نے سب کچھ دیا ہے۔ یہ گھر، یہ آسائشیں، یہ دولت، یہ عیش و عشرت.....'' چاچا نے اپنے احسانات گنوانے شروع کردیے۔ ''تو کتنا چھوٹا تھا جب اس گھر میں آیا۔ ہم نے تجھے پالا پوسا، پڑھایا، لکھایا..... اور تجھ سے ہم کچھ نہیں مانگتے سوائے اس کے کہ ہماری لاڈلی بیٹی کو خوش رکھے.....'' راشد کا جی چاہا کہ رسی تڑوا کے یہاں سے بھاگ جائے اور کبھی مڑ کر اس گھر کی طرف رخ نہ کرے..... مگر اس کی ازلی شرافت آڑے آگئی وہ احسان فراموش نہیں ہوسکتا تھا۔ تھوڑی دیر ناراض رہنے کے بعد وہ خود بخود راضی ہوگیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ بس وہ ایک قیدی کی طرح ہر حکم بجالائے گا اور کبھی، چوں بھی نہیں کرے گا۔ ماجدہ کا کہنا یہ تھا کہ ''میرے ابا جی تمہیں پالا پوسا ہے اچھا کھاتے ہو، اچھا پہنتے ہو، اتنے عالی شان گھر میں رہتے ہو، تم جو کچھ بھی ہو میرے ماں، باپ کی بدولت ہو، سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے تمہیں اپنا داماد بنالیا..... تم عمر بھر کنوارے رہتے کوئی تمہیں رشتہ نہ دیتا۔ میری وجہ سے تمہارا گھر بسا ہے..... ہاں.....''
''دیکھو تم بھی کبھی میرا احساس کرو.....'' راشد نے کہا۔
''زیادہ بک، بک نہ کرو..... تم ناشکرے ہو۔'' ماجدہ نے تلخ لہجے میں کہا۔
''میں تمہارے احسان کے بغیر اچھا بھلا تھا۔ قسمت کی خرابی تھی جو تم سے شادی ہوئی۔''
''اچھا تو پھر چلے جاؤ اس گھر سے..... بلکہ ابھی چلے جاؤ..... مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں..... جاؤ دفع ہوجاؤ.....'' ماجدہ زور، زور سے چیخنے لگی۔
''مجھے تم سے نفرت ہے، شدید نفرت..... مجھے کوئی شوق نہیں ہے تمہارے ساتھ رہنے کا..... اور تم یہ بھی سن لو کہ تم ایک آوارہ اور بدکردار عورت ہو..... تم گھر سے بھاگ رہی تھیں۔ یاد ہے تمہیں؟ جاؤ اپنے یار اسد کو ڈھونڈو..... میں نہیں رہ سکتا تمہارے ساتھ۔''
اس نے بھی تڑ کی بہ تڑ کی جواب دیا۔ اسد کا نام سنتے ہی ماجدہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ گالی گلوچ اور کوسنوں پر اتر آئی۔ کافی دیر تک لڑائی ہوتی رہی۔
''بس میں جارہا ہوں ہمیشہ کے لیے.....'' راشد نے کہا۔ اور گھر سے نکل گیا۔ گھر سے باہر نکل کے وہ سوچنے لگا۔ ''اب کہاں جاؤں..... میرا تو کوئی دوست ہے نہ رشتے دار..... پیٹ کا دوزخ بھرنے کو زیادہ پیسے بھی پاس نہیں تھے..... شاید میں نے غلط کیا جو گھر چھوڑ کے آگیا۔'' وہ اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا۔ وہاں بمشکل دو دن ٹھہرا..... تیسرے دن واپس چاچا کے پاس چلا گیا۔ چاچا نے اسے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی اور بولے۔
''اچھا کیا تو نے جو گھر واپس آگیا۔ میں تجھے یاد کررہا تھا۔''
''جی..... ! میں بھی آپ کو یاد کررہا تھا چاچا۔''
وہ سوچتا کاش اس کی کوئی نیک، مہربان بیوی ہوتی جو اس سے محبت کرتی اس کی عزت کرتی مگر وہ ایسا حرماں نصیب انسان تھا جس کے دل میں ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں بھری تھیں، شکستہ آرزوئیں اور حسرتیں جمع تھیں۔ راشد کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔
''مان لو کہ تم مجبور ہو، پنجرے میں بند پنچھی کی طرح.....''
''چاچا نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا جو میری شادی ماجدہ سے کردی۔ کاش میں اس وقت ذرا ہمت سے کام لیتا اور صاف انکار کردیتا مگر انہیں بھلا کیسے منع کردیتا کہ مجھے ماجدہ پسند نہیں ہے۔ میں اس سے شادی نہیں کرسکتا۔''
مگر اب یہ شادی ہوچکی تھی اور اب اسے یہ رشتہ نبھانا تھا۔ اس بیچارے کو تو اپنی نوکری کی لائی ہوئی تنخواہ بھی ماجدہ کے ہاتھ میں رکھنی پڑتی اور پیسوں کا تو سوال ہی کیا تھا۔
وقت گزرتا جارہا تھا۔ قدرت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ اللہ نے انہیں اولاد کی نعمت سے نوازا تھا

مگر مزاج اب بھی ماجدہ کے بگڑے ہی ہوئے تھے۔ اس نے بچوں کو بھی اپنے مزاج کے مطابق پالا تھا۔ وہ باپ کو کسی معاملے میں خاطر میں نہ لاتے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ گھر میں صرف ماں کا حکم چلتا ہے۔ ابا نظریں ... بچی کیے ان کی ہاں میں ہاں ملائے جاتے۔ گھر میں اونچا بولنے کا حق صرف امی کو حاصل تھا۔ ہاں گھر میں ایک باپ کا ہونا ضروری ہے۔ سو ابا موجود تھے۔ راشد کے چاچا اب کافی کمزور ہو گئے تھے۔ آئے دن وہ بیمار رہتے تھے۔ وہ ان کی بہت خدمت کرتا تھا۔ کبھی، کبھی چاچا دل میں اپنے بھتیجے سے بہت شرمندہ ہوتے تھے۔ انہیں خوب اندازہ تھا کہ راشد کی شخصیت ماجدہ کے سامنے بالکل دب کر رہ گئی ہے۔ وہ اپنا اعتماد کھو چکا ہے، انہیں کبھی، کبھی اس پر بہت ترس آتا۔ کس قدر مسکین اور خاموش ہو کر رہ گیا تھا۔ راشد کی اس حالت کا ذمے دار وہ خود کو قرار دیتے تھے۔ انہوں نے کسی کو بتائے بغیر زمین کا ایک بڑا حصہ راشد کے نام کر دیا تھا۔

''بیٹا..... میں جانتا ہوں کہ ماجدہ تجھے وہ عزت نہیں دیتی جو تجھے ملنی چاہیے۔ مگر بیٹا تو مجھے معاف کر دینا..... شاید تیرے ساتھ میں نے زیادتی کر دی ہے۔''

''جانے دیں چاچا..... چھوڑیں سب ٹھیک ہے۔'' وہ نظریں جھکا کر بولا۔ ''اب کیا فائدہ ایسی باتوں کا۔''

''دیکھ..... میری طرف سے یہ ایک چھوٹا سا تحفہ ہے تیرے لیے..... اس کا کسی اور کو پتا نہیں ہے۔ یہ تیری ذاتی ملکیت ہے۔ اس کا اختیار صرف تجھے ہے۔'' انہوں نے راشد کو زمین کے کاغذات پکڑاتے ہوئے کہا۔

''چاچا آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر..... آپ نے جو کیا میرے بھلے کے لیے..... یہ زمین رہنے دیں..... مجھے آپ نے بہت کچھ دیا ہے، میرے لیے وہی کافی ہے مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔'' راشد نے جواباً کہا۔

''نہیں بیٹے..... یہ تو رکھ لے..... بس کسی اور سے ذکر نہ کرنا۔'' راشد نے کاغذات سنبھال کر ایک محفوظ جگہ رکھ دیے۔ کچھ دن بعد چاچا کا انتقال ہو گیا۔

اس کے چند ماہ بعد چاچی بھی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

بچے بڑے ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی تعلیم کے بارے میں ہر فیصلہ ماجدہ ہی کرتی تھی۔ بچوں کی شادی کا وقت آیا تو بھی تمام فیصلے ماجدہ ہی نے کیے۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی بیٹیاں بہت امیر گھرانوں میں بیاہ کر جائیں۔ اس نے بیٹیوں کو تربیت بھی یہی دی تھی کہ وہ ہر معاملے میں اپنا پلڑا بھاری رکھیں۔ شوہر سے اپنی بات منوائیں۔ اس کو اپنی مٹھی میں رکھیں۔ خیر شادیاں، بڑی دھوم دھام سے ہوئیں اور ماجدہ نے بیٹیوں کو اتنا بھاری جہیز دیا کہ سسرال والوں پر رعب پڑ جائے۔ مگر صورتِ حال یہ تھی کہ دونوں لڑکیوں کے شوہر ان کی من مانی کی وجہ سے اکثر ان سے نالاں رہتے اور گھر میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ معاملات پیچیدہ ہو جاتے، آئے دن لڑائی جھگڑے ہوتے۔ بڑی بیٹی صائمہ سمجھدار تھی۔ وہ اپنے شوہر اور ساس، سسر کی عزت کرتی۔ کبھی اس کا شوہر بے جا فرمائش نہ کرتا جبکہ منجھلی بیٹی عائکہ اپنی ماں کی طرح زبان کی تیز تھی۔ اس کی سسرال والوں کے ساتھ نہ بنتی۔ بالآخر اسے طلاق ہو گئی اور وہ ماں کے گھر آ کر بیٹھ گئی۔ سب سے چھوٹی بیٹی روبینہ بھی اکثر اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر ماں کے گھر آ جاتی تھی۔ بیٹی کے گھر بیٹھنے سے راشد کو بہت دکھ ہوا۔ ماجدہ نے شرمندہ ہونے کے بجائے اس کی خوب پیٹھ تھپکی اور کہا۔

''بہت اچھا کیا تو اسے چھوڑ کر آ گئی..... وہ تیرے لائق تھا ہی نہیں.....''

عائکہ کئی سال گھر بیٹھی رہی۔ ماجدہ کو اب اس کی فکر ہو گئی۔ ایک جگہ سے عائکہ کے لیے رشتہ آیا۔ یہ لوگ اس کی مرضی کے مطابق لکھ پتی تھے مگر ان کا نہ تعلیم سے واسطہ تھا نہ تہذیب سے۔ خاور بگڑے ہوئے مزاج کا جاہلانہ طور طریقے والا لڑکا تھا۔ تعلیم بھی اس کی واجبی سی تھی۔ اس کے والد کاروباری آدمی تھے۔ ان کا گھر بڑا شاندار تھا۔ وہ لوگ امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے رہتے تھے۔ ماجدہ نے یہی سوچا کہ بیٹی عیش کرے گی۔ شادی

کی تیاریاں ہونے لگیں۔ راشد نے خاور کو ناپسند کیا اور ماجدہ سے کہا۔

''خاور کا رشتہ ٹھیک نہیں لگتا۔ اسے منع کر دو۔''

ماجدہ نے یہ سن کر وہ شور مچایا کہ ''تم تو بیٹی کے دشمن ہو۔ طلاق والی لڑکی کو کوئی پوچھے گا نہیں..... جہاں سے رشتہ آیا ہے تو شادی ہو جانے دو..... لڑکی اپنے گھر کی ہو جائے گی تمہیں یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ تم چاہتے ہو کہ عاتکہ عمر بھر یہاں بیٹھی رہے اس کا گھر نہ بسے۔'' راشد حسب معمول اپنی بات نہ منوا سکا اور عاتکہ کی شادی خاور سے ہو گئی۔

شادی کے اگلے دن عاتکہ میکے آئی تو یہ خوشخبری لائی کہ خاور نے کہا ہے سلامی میں تمہاری ماں نے صرف پچاس ہزار روپے دیے۔ میں دو لاکھ روپے سلامی لوں گا..... اگر تم یہ رقم لے کر آؤ گی تو میرے گھر آنا۔ ورنہ وہیں رہو..... یہاں خالی ہاتھ آنے کی کوئی ضرورت نہیں.....''

ماجدہ یہ سن کر حیران رہ گئی۔ عاتکہ کو دیا گیا لاکھوں کا زیور..... فرنیچر، برتن اور کپڑے اس کی نظر میں کوئی وقعت نہ رکھتے تھے۔

''اس قدر لالچی ہے یہ خاور.....؟'' ماجدہ حیران تھی۔

''سنا تم نے..... خاور ڈیڑھ لاکھ روپیہ مانگ رہا ہے سلامی کے۔'' ماجدہ نے راشد سے کہا۔

''ہاں تو دے دو..... اس کی فرمائشیں تو تمہیں اب پوری کرنی ہی ہوں گی۔ ایسے جاہل اور بدنیت لڑکے کو تم نے داماد جو بنایا ہے۔'' راشد نے کہا۔

''اچھا تو تم کوئی اور اچھا رشتہ بیٹی کے لیے لے آتے۔ میں نے منع کیا تھا تمہیں.....؟'' وہ زور سے بولی۔

''ماجدہ میری بات چھوڑو۔ تم تو جو کچھ کرتی ہو اچھا ہی کرتی ہو ناں.....'' راشد نے آرام سے کہا۔ ماجدہ نے ڈیڑھ لاکھ کی رقم عاتکہ کو دی۔ عاتکہ خوش، خوش سسرال چلی گئی۔ خاور کو رقم مل گئی مگر اس کی لالچی فطرت نے یہ تاڑ لیا کہ طلاق یافتہ لڑکی سے شادی کر کے اس کے والدین کو بلیک میل کس طرح کیا جاتا ہے۔ وہ مہینے دو مہینے بعد بیوی سے بھاری رقم کا تقاضا کرتا کبھی کاروبار کے لیے پیسہ چاہیے۔ کبھی باہر کا چکر لگانے کے لیے..... حالانکہ اسے پیسہ صرف شراب اور جوئے میں اڑانے کے لیے درکار ہوتا تھا۔ اور عاتکہ کے لائے ہوئے پیسوں سے وہ یہ شوق خوب پورا کر رہا تھا۔

راشد کا چھوٹا بیٹا حبیب ابھی اسکول میں پڑھ رہا تھا اور بڑا بیٹا ندیم کالج میں تھا۔ بڑے بیٹے کو نئی، نئی گاڑیاں خریدنے کا شوق تھا۔ اس نے ماں سے گاڑی خریدنے کے لیے رقم طلب کی۔ ماجدہ کے پاس پیسوں کی کمی نہ تھی۔ وہ ندیم کو منہ مانگی رقم دیتی تھی وہ گاڑی خریدتا کچھ دنوں بعد اسے بیچ دیتا۔

ایک دن راشد دفتر میں اداس خاموش سا بیٹھا تھا کہ اس کے دوست جمیل نے اداسی کی وجہ دریافت کی۔ راشد اتنا دل گرفتہ تھا کہ اس کے آنسو نکل آئے۔

''پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' جمیل نے اسے تسلی دی۔

''کچھ ٹھیک نہیں ہوگا..... کبھی کچھ نہیں ہوگا..... میری تو عمر ہی گزر گئی خوشی کی تلاش میں..... کبھی ایک لمحے کا سکون اور خوشی نہ ملی مجھے میرے لیے زندگی قید خانہ ہے۔ میرے ساتھ اولاد ہے نہ بیوی..... عزت ہے نہ وقعت..... پالتو جانور جیسی زندگی ہے میری۔ گھر میرا ضرور ہے لیکن اختیار کسی شے پر نہیں۔''

''آخر کیا چاہتے ہو.....؟'' جمیل نے پوچھا۔

''عزت چاہتا ہوں..... اختیار چاہتا ہوں جیسا کہ ہر گھر کے سربراہ کو حاصل ہوتا ہے۔''

''تو تم رہتے تو بیوی کے گھر میں ہو..... تم اپنا ایک گھر بناؤ اور بیوی کو اس گھر میں رکھو..... تاکہ وہاں تمہارا حکم چلے..... بیوی کے گھر میں رہو گے تو اس سے دب کر ہی رہنا پڑے گا۔'' جمیل نے سمجھایا۔

''افوہ..... جمیل..... تم نہیں جانتے کہ وہ کس قدر ہٹ دھرم اور بدمزاج عورت ہے..... اس کی سرشت میں ہے ہی نہیں کہ وہ شوہر کی بات مانے اور

اس کی عزت کرے۔ وہ نہایت بدتہذیب لڑکی اور جھگڑالو عورت ہے۔''

''تو تم دوسری شادی کرلو۔ دنیا میں بہت عورتیں ہیں بڑی نیک اور وفا شعار.....''

''چھوڑو جمیل تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ مجھے بھلا کون ملے گی؟'' وہ مایوسی سے بولا۔

''ارے میں کراؤں گا تمہاری شادی..... میرے خاندان میں ایک نہیں کئی ایسی عورتیں ہیں جو پڑھی لکھی بھی ہیں اور بہت اچھے مزاج کی۔ تم کہو تو سہی..... مرد تو چار، چار شادیاں کرسکتا ہے تم حامی تو بھرو۔'' راشد اس کی بات پر سوچنے لگا کہ اگر ایسا ہو کہ ایک گھر ہو جو میرا اپنا ہو اس میں ایک محبت کرنے والی نرم دل بیوی ہو جو فرمانبردار بھی ہو اور دکھ سکھ کی ساتھی بھی ہو..... تب تو زندگی جنت بن جائے۔ اس نے جمیل سے اس معاملے پر سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے کچھ دن کی مہلت مانگی۔ جمیل نے اسے ہر ممکن مدد کا یقین دلایا۔

''تم کتنے اچھے دوست ہو جمیل، تم نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کردیا۔''

چند دن بعد اس نے جمیل سے کہا کہ وہ ایک گھر خریدنا چاہتا ہے۔

''مکان خریدنے کے لیے رقم ہے تمہارے پاس.....؟'' جمیل نے پوچھا۔

''ہاں..... میرے نام ایک پلاٹ ہے بس اسے فروخت کرنا ہے۔'' راشد نے بتایا۔ ''تم میری مدد کروگے ناں.....''

''ہاں، ہاں..... میں تمہیں پراپرٹی ڈیلر کے پاس لے چلوں گا۔''

وہ لوگ پلاٹ فروخت کرنے پراپرٹی ڈیلر کے پاس گئے۔ وہاں جو قیمت لگائی جارہی تھی۔ وہ جمیل کو کم لگی اس نے ایک اور پراپرٹی ڈیلر سے بات کی۔ معاملہ تقریباً طے ہوگیا۔

''بس جی کل آپ کاغذات لے آئیں اور رقم لے جائیں.....'' پراپرٹی ڈیلر نے کہا۔

اسی دن شام کے وقت پراپرٹی ڈیلر نے فون کر کے بتایا کہ آج رات کو ہی آجائیں بات ہوجائے گی۔

''ٹھیک ہے..... میں دیکھتا ہوں۔'' راشد نے کہا۔

''آپ آج ہی آجائیں کیونکہ دو دن کے لیے میں شہر سے باہر جارہا ہوں..... ایک اچھی پارٹی آئی ہوئی ہے۔ آپ کو پلاٹ کے اچھے پیسے مل جائیں گے۔'' ڈیلر نے بتایا۔

''پلاٹ بہت اچھی جگہ پر ہے..... دام اچھے ملنے چاہئیں۔'' راشد نے کہا۔

''ہاں، ہاں آپ فکر نہیں کریں.....'' راشد نے فون بند کر کے سامنے دیکھا تو ماجدہ کھڑی بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''یہ کس پلاٹ کو بیچنے کی بات کررہی ہے..... مجھ سے چھپ، چھپ کر ہیں.....؟'' اس نے بڑے رعب سے پوچھا۔ راشد کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی بات ماجدہ سن لے گی۔

''یہ تو بڑا غضب ہوگیا۔'' وہ گھبرا گیا۔

''پلاٹ..... پلاٹ کی بات کون کررہا ہے۔'' راشد بوکھلا کر بولا۔

''اچھا..... مجھے ایسا بیوقوف مت سمجھنا۔ صحیح، صحیح بتاؤ کیا معاملہ ہے؟'' وہ کسی تفتیشی افسر کی طرح پوچھ رہی تھی۔

''کچھ نہیں..... کچھ نہیں..... وہ میرا دوست ہے۔ اس کا کوئی پلاٹ ہے..... میرا تھوڑا ہی ہے.....'' اس نے مجرموں کی طرح اپنی صفائی پیش کی۔ ''وہ اپنا پلاٹ بیچ رہا ہے۔''

''تم میری اجازت کے بغیر کچھ خرید سکتے ہو نہ بیچ سکتے ہو۔'' وہ غصے اور رعب سے بولی۔ راشد خاموش رہا۔ وہ اونچی آواز میں اسے برا بھلا کہتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ راشد سخت خوفزدہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ماجدہ اس کے سارے منصوبے کو خاک میں ملاسکتی تھی۔

راشد اس وقت کہیں نہیں گیا۔ اگلے دن دفتر گیا تو جمیل سے بات چیت ہوئی۔

جمیل نے اس سے کہا کہ وہ محتاط رہے۔ اور فون پر کسی سے کوئی بات نہ کرے۔ ان دونوں نے مل کر کئی

مکانات دیکھے اور ایک مکان کو پسند کرلیا۔ اس کی قیمت کے بارے میں اندازہ کرلیا۔ جمیل نے اسے وہ خاتون بھی دکھادی جس سے راشد کی شادی کرائی جانی تھی۔ وہ جمیل کی خالہ زاد بہن زینب تھی۔ جس کے شوہر کا انتقال ہوچکا تھا اور جو اُن کے ساتھ رہتی تھی۔ راشد کو وہ سیدھی سادی اور خوش مزاج معلوم ہوئی۔ اسے اپنا مستقبل بڑا روشن اور خوشگوار معلوم ہورہا تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بچوں سے ملتا جلتا رہے گا۔ ان کا پورا خیال رکھے گا مگر ماجدہ..... ''بس بہت ہوگئی۔ اب ماجدہ کی کبھی شکل بھی نہیں دیکھوں گا۔ اُف زندگی کتنی آزاد اور خوب صورت ہوگی ماجدہ کے بغیر.....'' وہ سوچنے لگا۔ ''کتنی معصوم اور بھولی بھالی ہے..... میں اسے بہت خوش رکھوں گا..... اسے کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔ کتنا اچھا ہوگا کہ جب میں تھکا ہارا گھر میں داخل ہوں گا اور زینب مسکرا کر میرا استقبال کرے گی۔ ہم کہیں گھومنے پھرنے چلے جایا کریں گے۔'' راشد سہانے سپنوں میں گم تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی زندگی کی سیاہ رات اب ختم ہونے کو ہے اور ماجدہ کے گھر کی اس غلام گردش سے نکل کر وہ کھلی فضا میں سانس لے سکے گا۔

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس پلاٹ کی قیمت اب کروڑوں تک جا پہنچی ہے تو وہ بے حد خوش تھا۔ زندگی خوشحال ہو تو جینے کا مزہ ہے۔ اور ماجدہ کے عقوبت خانے سے باہر کی حسین زندگی..... اس کی منتظر تھی اور بس اب چند دنوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس کے دل میں خوشی کے پھول کھلے جارہے تھے۔

مکان کی خریداری کا وقت آیا تو راشد نے صندوق سے پلاٹ کے کاغذات نکالنے کا ارادہ کیا۔ وہ بڑے اطمینان سے نکلا تھا لیکن وہاں سے کاغذات غائب تھے۔ راشد کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کاغذات تو میں نے بہت سنبھال کر رکھے تھے۔ اور ان کاغذات کا کسی کو پتا نہیں تھا۔ صندوق سے کاغذات کس نے نکالے۔ اور اس کا تالا کس نے کھولا.....؟ کیا کوئی تالا بھی کھول سکتا ہے؟''

راشد کو یقین نہیں آرہا تھا..... اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ وہ جن کاغذات پر تکیہ کیے بیٹھا تھا اور جن کاغذات کی بدولت وہ اپنی خوشیوں کے محل تعمیر کررہا تھا وہ اچانک یوں غائب ہوجائیں گے..... اور اس کے خوابوں کے سارے محل دھڑام سے نیچے آگرے۔

''کیا ڈھونڈا جارہا ہے؟'' ماجدہ اس کے سامنے کھڑی ہوگئی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر اس سے مخاطب ہوئی۔

''ڈھونڈنا..... بس..... ہاں..... میرے کاغذات تھے یہاں! وہ پتا نہیں کہاں چلے گئے؟'' راشد نے معصومیت سے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔

''کیا تم نے دیکھے ہیں وہ کاغذات؟''

''میرے پاس ہیں وہ کاغذات۔'' ماجدہ نے اطلاع دی۔

''وہ زمین میری ہے..... میرے کاغذات ہیں وہ۔ تم نے کیوں لیے؟ تمہارا اس زمین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' راشد بے قرار ہوکر بولا۔

''اچھا تم اس زمین کے مالک کیسے ہوگئے؟ کیا تمہارے باپ نے تمہیں دی تھی وہ زمین؟ ان بیچاروں کے پاس بھلا تھا ہی کیا جو وہ تمہیں دیتے؟'' اس نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب کچھ میرے باپ کا ہے۔''

''تم میرے باپ کی بات مت کرو..... مجھے میرے کاغذات واپس کرو۔ وہ میرے کاغذات ہیں۔'' راشد نے کہا۔ ''چاچا نے وہ پلاٹ مجھے تحفے میں دیا تھا۔ اس پر صرف میرا حق ہے۔ مجھے میرے کاغذ فوراً واپس کرو۔''

''نہیں دوں گی وہ کاغذ۔ میرے باپ کی زمین ہے۔'' وہ اکڑ کر بولی۔ ''تمہاری نہیں ہے زمین۔''

''چاچا نے مجھے دی تھی وہ زمین، وہ تمہاری نہیں، میری زمین ہے۔'' راشد بولا۔

''ماجدہ، تمہارے پاس تو سب کچھ ہے یہ گھر، بچے، دولت، زیور، جائداد۔ اگر میرے پاس ایک چھوٹا سا پلاٹ ہے تو اس میں تمہارا کیا نقصان ہے؟'' راشد بولا۔ ''تم دولت کا اتنا لالچ نہ کرو، جس کا حق ہے، اسے ادا کرو۔ یہ لالچ تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔''

نایاب ہیں ہم..... ماہ نور عنصر مغل ، راول پنڈی

بیگم الفت نے اپنی گاڑی مخصوص جگہ پارک کی اور اتر کر وہ عالم بابا کی پھولوں کی مختصر سی دکان کی طرف بڑھیں۔ بابا نے ہمیشہ کی طرح ادب سے سر جھکا کر سلام کیا اور بغیر کہے ان کے لیے تازہ تازہ گلاب کی کلیاں اور پھول چھانٹ کر خوب صورت سا گلدستہ بنایا اور ان کی طرف بڑھا دیا بیگم صاحبہ نے پرس سے ہزار کا نوٹ نکال کر بابا کی جانب بڑھایا۔

بابا نے اپنی بوسیدہ سی جیب میں سے جلدی سے آٹھ سو نکال کر بیگم صاحبہ کے پیچھے لپک کر انہیں پکڑانے چاہے۔

''ارے کوئی بات نہیں بابا.....! اگلی بار کے لیے رکھ لیں میں تو آئے دن آپ سے پھول لیتی ہوں اس ٹاؤن میں ابھی کوئی خاص دکانیں بھی نہیں ہیں، آپ فائدہ اٹھائیں۔'' الفت بیگم نے مشورہ دیا۔

''نہ بیٹا! جتنا میرا حق ہے اس سے زیادہ ایک پیسہ نہیں لینا، کل کس نے دیکھا ہے مہلت ہی نہ ملے تو پھر کیا کروں گا۔''

الفت بیگم کا فون بجنے لگا انہوں نے گلدستہ اور پیسے لیے اور فون کان سے لگا کر گاڑی کی طرف بڑھ گئیں اور فون بند کر کے وہ گاڑی میں بڑبڑاتے ہوئے بیٹھیں۔ ''توبہ ان لوگوں کے خودداری کے ڈرامے پتا نہیں کب یہاں بھی مارکیٹ مکمل ہوگی۔ تو ہم بھی خوب سجے سجائے گلدستے لے کر پارٹیز میں جایا کریں گے۔''

☆☆☆

دیکھتے ہی دیکھتے ٹاؤن ترقی کر گیا تھا۔ ظاہر ہے بڑے، بڑے لوگوں کے بنگلے تھے اس ٹاؤن میں تو یہاں پر تو اشیا خوب مہنگے داموں بکتی تھیں۔

''بھول جاؤ اس پلاٹ کو، مجھ سے چھپ کے وہ پلاٹ بیچنے کی باتیں کر رہے تھے ناں، تم سمجھ رہے تھے کہ مجھے پتا نہیں چلے گا اور تم اس پلاٹ کو اکیلے ہڑپ کر جاؤ گے..... بڑے ہوشیار بن رہے تھے ناں؟ تم نہیں جانتے کہ میں کیا چیز ہوں؟ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہوں میں۔ بڑے خوش، خوش پھر رہے تھے کہ پلاٹ بیچ کر مزے کرو گے..... ہاہاہا، بیچ لو اب جا کر پلاٹ۔'' ماجدہ اس کا مذاق اڑانے لگی۔ اس کے قہقہے کی آواز سے راشد کا خون کھولنے لگا۔

''ماجدہ، تم عمر بھر اپنی من مانی کرتی آئی ہو..... یہ پلاٹ میں ہرگز تمہیں نہیں دوں گا، تم شرافت سے پلاٹ کے کاغذات میرے حوالے کر دو، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔'' راشد نے غصے سے کہا۔

''اچھا، ورنہ کیا کر لو گے تم؟'' ماجدہ اکڑ کے بولی۔

''یہ بے ایمانی ہے، بددیانتی ہے..... چوری ہے، دھوکا ہے، وہ کاغذات مجھے فوراً واپس کرو۔'' راشد کا غم اور غصے سے برا حال ہو گیا۔

''ارے واہ بددیانتی کیسی، وہ میرے باپ کی زمین ہے۔ میں ان کی واحد بیٹی ہوں..... میرا حق ہے اس زمین پر۔ تم کہاں سے حق دار بن گئے؟ جاؤ، جاؤ..... وہ کاغذ میرے ہیں، تمہارے نہیں۔'' ماجدہ چیخ کر بولی۔

راشد اس کی زیادتی اور دھونس دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا۔ بے اختیار اس نے ایک زوردار تھپڑ ماجدہ کو لگایا، وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گئی۔ راشد کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کا گلا گھونٹ ڈالے۔ جس عورت نے اس کی زندگی برباد کر دی، اسے جان سے مار ڈالے۔ شور کی آواز سن کر اس کا بیٹا ندیم دوڑا ہوا آیا اس نے باپ کو برا بھلا کہا اور زمین پر گری ہوئی ماں کو اٹھایا۔

''امی کہیں چوٹ تو نہیں لگی، امی آپ ٹھیک ہیں ناں؟''

ماجدہ زور، زور سے رونے لگی اور راشد کو برا بھلا کہنے لگی۔ ''اس کی اتنی جرأت کہ میرے اوپر ہاتھ اٹھائے۔'' ماجدہ نے غصے سے کہا۔

''ابا..... کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ یہ تم نے کیا، کیا؟'' ندیم نے اپنے ابا سے غصے سے پوچھا۔ صدمے اور

الفت بیگم ایک بے انتہا حسین گلدستے کا انتخاب کر کے دکان سے مسرور سی شیشے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تھیں کیا گلدستہ تھا، کیا سجاوٹ تھی دکاندار نے پوری گارنٹی دی تھی اور ایک ہفتے تک تو اس گلدستے نے تھوڑا سا بھی نہیں مرجھانا تھا پھول امپورٹڈ تھے اور ان کی پیکنگ غیر معمولی تھی کیمیکل سے پھولوں کو محفوظ کر دیا گیا تھا۔

☆☆☆

فون تھا کہ تواتر سے بجے جا رہا تھا الفت بیگم نے جلدی سے ریسیو کیا تین دن پہلے ہی وہ اپنے باس کے گھر پارٹی میں باس کی بیگم کو مہنگا اور حسین گلدستہ دے کر آئی تھیں۔ ''یقیناً میرے ذوق کی تعریف کرنا ہوگی۔'' وہ من ہی من مسکائی تھیں۔

''جی مسز باسط کیسی ہیں؟ کیسے یاد کیا؟''

''بس آپ سے پوچھنا تھا۔ آپ کے مالی نے کام چھوڑ دیا یا لان میں گلاب کے وہ خوشبودار پھول کھلنا بند ہو گئے جو آپ ہمیں یہ بنا خوشبو کے پھول دے گئی ہیں اوپر سے یقین جانیں اتنی بڑی غلاظت تھی آپ کے گلدستے کی پیکنگ میں کہ پھول تو اوپر سے سلامت لیکن اس کے نیچے سے عجیب و غریب کیڑے مکوڑے نکلے کہ مجھے تو پورے گھر میں اسپرے کروانا پڑا تو بہ اتنی کراہیت ہوئی۔''

''سوری میم، مجھے تو پتا ہی نہیں تھا ایسا ہوگا..... میں نے کہا نئے پھول ہیں نئی قسم ہے۔''

''نہیں الفت بیگم! نئی چیز ضروری نہیں پہلی کا متبادل بن سکے، بنا خوشبو کے پھول کبھی خوشبودار گلاب کا متبادل نہیں ہو سکتے۔ ریپنگ دیکھ کر چیز مت خریدا کریں۔''

وہ بول رہی تھیں اور الفت بیگم سوچ رہی تھیں اب وہ پرانے بابا کو کہاں ڈھونڈیں گی چمکتی دمکتی دکانوں کے بیچ بابا تو کب کے کہیں گم ہو گئے تھے۔

غصے سے راشد کا برا حال ہو گیا۔

''کوئی مجھ سے بھی تو پوچھو کہ مجھے کہاں چوٹ آئی ہے..... میرے دل پر چوٹ آئی ہے۔ میرے کاغذ چرائے ہیں اس نے۔ وہ میرے کاغذ تھے..... اس نے چوری کی ہے..... اس ظالم عورت کو ذرا نہ شرم آئی چوری کرتے ہوئے۔ بیویاں تو شوہر کی چیزوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ اس نے تالا توڑ کر کاغذات نکالے ہیں اور اس نے چوری کی ہے..... ڈاکا ڈالا ہے..... یہ مجرم ہے..... میں تھانے میں رپورٹ درج کراؤں گا۔'' راشد نے کہا۔ شکست خوردگی کے احساس سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔

''اچھا! تو تم میری رپورٹ کراؤ گے؟ میں پولیس کو بتا دوں گی کہ اس نے میرے ابو کے کاغذ چرائے ہیں..... الٹی سزا ملے گی تجھے..... جیل میں سڑاؤں گی تجھے..... جا..... جا کے پرچہ کٹوا میرے خلاف..... پھر دیکھنا تیرا انجام کیا ہوتا ہے۔''

راشد یہ دھمکی سن کر خوف زدہ ہو گیا۔ اس کا بیٹا بھی زور، زور سے بولنے لگا۔ ماجدہ بھی چیخ پکار کرتی رہی۔ راشد دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس وقت وہ بہت مایوس اور اداس تھا۔ اس نے کیا، کیا سوچا تھا، نیا گھر ہوگا، اس کا اپنا گھر..... جہاں وہ اپنی نئی بیوی کے ساتھ زندگی گزارے گا۔ اس کی محبت اس کے گھر کے درد بام پر روشنی بن کر جگمگا اٹھے گی۔ اس کی زندگی بھر کی محرومیاں اور اداسیاں ختم ہو جائیں گی۔ ایک نرم دل، محبت کرنے والی، اس کی فرمانبرداری کرنے والی بیوی اس کے ساتھ ہوگی۔ وہ محبت سے اپنی نئی دنیا آباد کرے گا۔ جہاں کرخت آواز والی، بدمزاج، خودغرض اور بے ادب ماجدہ نہ ہوگی مگر یہ کیا ہوا؟ اس کے سارے خواب بکھر گئے۔ ماجدہ نے اسے پھر شکست دے دی تھی اور آج تو بیٹے نے بھی اس پر غصہ کیا، اپنی ماں کا ہی ساتھ دیا۔ راشد تو اکیلا ہی تھا کوئی بھی اس کا ساتھ دینے والا نہیں تھا۔ وہ اتنا دلبرداشتہ ہوا کہ گھر سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد گھر میں خاموشی چھا گئی۔

ماجدہ سوچنے لگی کہ کہیں اس نے راشد کے ساتھ کوئی

زیادتی تو نہیں کردی؟

''وہ پلاٹ میرے ابا کا تھا۔ راشد نے وہ پلاٹ اپنی کمائی سے نہیں خریدا تھا..... ہاں اگر اس پلاٹ کے کاغذات راشد کے پاس ہیں تو ابا نے ضرور وہ کاغذات اسے دیے ہوں گے۔ کیونکہ راشد جیسے سیدھے سادے ایمان دار آدمی نے وہ کاغذات ہرگز نہیں چرائے ہوں گے؟'' وہ خوب جانتی تھی کہ راشد ایک ایمان دار آدمی تھا۔ وہ کبھی کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ اگر ابا نے اسے پلاٹ اور اس کے کاغذات تحفے کے طور پر دیے ہوں گے تو یقیناً یہ بات سچ ہوگی۔ ''مگر سیدھی سی بات تھی کہ گھر میں جو بھی نقدی، زیور، پلاٹ، جائدادیں تھیں ان پر صرف اور صرف میرا حق ہے۔ راشد کا ان پر کوئی حق نہیں ..... اور اسے کسی مکان، جائداد کا کرنا بھی کیا ہے..... اس کے ہاتھ خالی رہیں جبھی وہ میرا بن کے رہے گا۔ اگر اس کے پاس دولت اور جائداد آجائے تو اس کے تو پر نکل آئیں گے۔ یہ صاحب حیثیت ہوگا تو صاحب اختیار ہو جائے گا پھر یہ میرے حکم سے سرتابی کرے گا۔ میرے قابو سے نکل جائے گا۔ اس گھر کی بھلائی اسی میں ہے کہ سب کچھ میرے ہاتھ میں ہو۔ تمام دولت اور تمام اختیارات صرف میرے پاس ہوں اور اس کے لیے میرے حکم ماننا لازمی رہے..... ورنہ تو یہ مجھ پر حکم چلائے گا اور مجھے اس کی تابعداری کرنی پڑے گی جو میں کسی طرح برداشت نہیں کرسکتی۔''

راشد کو گئے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا بچوں کو اپنے باپ سے کوئی خاص محبت نہ تھی۔ ان کی نظر میں باپ کا وجود اس گھر میں ایک فالتو شے کی طرح تھا۔ راشد کے جانے کے بعد لوگ ماجدہ سے پوچھتے تھے۔

''تمہارے میاں کہاں ہیں؟ کہاں چلے گئے؟'' پڑوس کی عورتیں پوچھتیں۔

''وہ اپنی خالہ کے پاس گئے ہوئے ہیں اوکاڑہ میں۔'' ماجدہ انہیں ٹالنے کو کہتی۔ شوہر کے وجود کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی مگر اب جب راشد گھر میں نہیں تھا تو یہ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا..... تینوں لڑکیاں اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔ دونوں لڑکے اپنی پڑھائی میں لگے رہتے تھے اور وہ خاموش اپنی سوچوں میں کھوئی رہتی۔

''راشد..... گھر واپس آجاؤ..... راشد تم ناراض ہو گئے ہو..... دیکھو اپنوں سے روٹھا نہیں کرتے..... مجھ سے بہت غلطیاں ہوئی ہیں، تم مجھے معاف کردو..... یہ گھر تمہارے بغیر ویران ہے..... تم لوٹ آؤ۔ اس گھر کو آباد کردو، لوٹ آؤ۔'' ماجدہ سوچتی۔

ایک دن ماجدہ نے ندیم سے کہا کہ وہ اپنے ابا کو ڈھونڈے کہ وہ کہاں چلے گئے ہیں۔ ندیم نے دفتر جا کر معلومات کیں پہلے تو کچھ پتا نہ چلا پھر کسی نے بتایا کہ ان کے ایک دوست ہیں جمیل صاحب، ان سے معلوم کرو۔ وہ جمیل صاحب کے گھر جا پہنچا۔ جمیل صاحب نے ندیم کو اچھی طرح ڈانٹا۔

''تم ان کے بیٹے ہو، ان کا بالکل خیال نہیں رکھتے، ان کی عزت نہیں کرتے، ان کا احترام نہیں کرتے، تمہارا فرض ہے کہ اپنے ابا کا پورا خیال کرو، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھو۔ ان کی خدمت کرو۔ ان سے محبت کرو، ان کا ساتھ دو۔''

''انکل میں رکھتا ہوں ان کا خیال۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ لیکن وہ خوب جانتا تھا کہ وہ واقعی اپنے والد کو ایک اجنبی کی طرح ہی جانتا تھا۔ شاید اس کی والدہ نے ان سب بچوں کو باپ سے دور کرکے رکھا تھا۔ وہ انہیں باپ کے خلاف اکساتی رہتی تھی۔ ان کے دلوں میں باپ سے نفرت بھر دی تھی۔

''میرے ابو کہاں ہیں انکل..... مجھے بتائیں؟'' ندیم نے پوچھا۔

''چھوڑو بیٹا، تمہیں اس بات سے کیا مطلب کہ وہ کہاں ہیں؟ بس وہ جہاں ہیں بہت خوش ہیں۔'' جمیل صاحب نے کہا۔ ''تم اور تمہاری امی تو خوش ہیں ناں؟''

''میں ان کو گھر لے کر جاؤں گا..... بس میں انہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔'' ندیم نے کہا۔

''پھر سے بے عزتی کرنے کے لیے..... بس رہنے دو۔ اگر تم لوگوں کو اُن کی ضرورت نہیں تو وہ گھر

جا کر لیا کریں گے؟'' جمیل صاحب نے برہمی سے کہا۔ ''افسوس ہے ایسی اولاد پر۔ تمہیں تو اپنے باپ کا سہارا بننا چاہیے تھا۔''

''انکل مجھے اور شرمندہ نہ کریں۔ آپ بتا دیں کہ وہ کہاں ہیں؟'' ندیم شرمندگی سے بولا۔

''وہ مسجد میں ہیں۔'' جمیل صاحب نے بتایا۔

ندیم قریبی مسجد میں گیا۔ اس نے دیکھا اس کے والد زمین پر لیٹے سو رہے تھے۔ کوئی بستر تھا نہ بچھونا۔ ''کتنے معصوم ہیں ابا جی.....'' ندیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے پاس جا کر آہستہ سے آواز دی۔

''ابا جی..... اٹھیے..... گھر چلیے ابا جی..... میں آپ کو لینے آیا ہوں، اٹھیے۔'' ندیم نے ان کا بازو تھام لیا۔ راشد اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کون..... ندیم..... ندیم.....'' اس نے ندیم کے چہرے پر نظر ڈالی۔

''ابا جی..... مجھے معاف کر دیں۔'' اس نے باپ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میں آپ کو لینے کے لیے آیا ہوں آپ گھر چلیں۔''

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟ میں تمہارا کوئی نہیں لگتا..... جاؤ تم چلے جاؤ..... اپنی ماں کے پاس جاؤ، تم صرف اس کے بیٹے ہو..... میں تمہارا کچھ نہیں لگتا..... نہ تم میری اولاد ہو نہ میں تمہارا باپ ہوں۔'' اس کا دل دکھا ہوا تھا۔

وہ سخت ناراض تھا۔ ندیم کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ جمیل صاحب ان باپ، بیٹے کو چھوڑ کر باہر چلے گئے۔

''آپ چلیے ابا جی..... گھر چلیے۔'' راشد بہت اداس اور دل گرفتہ تھا۔ ''ہمیں معاف کر دیں۔''

''نہیں بیٹا، میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ نہ میرا کوئی اپنا ہے..... بس تھوڑی بہت جو زندگی رہ گئی ہے وہ گزر جائے گی ایسے ہی۔'' وہ مایوس لہجے میں بولا۔ ''یہ خدا کا گھر ہے یہاں مجھے جگہ ملی ہوئی ہے، یہ میرے لیے کافی ہے۔''

''ابا میں آپ کو لے کر ہی جاؤں گا۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' ندیم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں ٹھیک ہوں، مجھے نہیں لے جانا۔'' راشد نے اسے واپس بھیج دیا۔

اگلے دن ماجدہ اور اس کے سب بچے، بیٹی، داماد سب لوگ مسجد آ گئے اور منت سماجت کر کے اسے گھر لے گئے۔ گھر میں بچوں کی رونق دیکھ کر اس کا دل خوش ہوا۔ ماجدہ اب اس کے ساتھ کافی بہتر سلوک کرتی تھی۔ کچھ روپے پیسے کے معاملات ایسے تھے جن پر بات کرنا راشد کو اچھا نہیں لگتا تھا، مگر اس کے دل میں خلش سی لگی رہتی۔ ایک دن ماجدہ نے اسے دس لاکھ روپے دیے۔

''یہ کیا ہے؟'' راشد نے پوچھا۔ وہ بڑا حیران تھا۔ اسے ماجدہ سے اتنی سخاوت کی توقع نہ تھی۔

''بس یہ تم رکھ لو۔ ابا کا وہ پلاٹ میں نے بیچ دیا ہے۔''

''کتنے کا بکا؟'' راشد نے پوچھا۔

''بس جتنے کا بھی گیا، یہ تم رکھ لو۔ آخر مجھے بچوں کے خرچے کو بھی دیکھنا ہے۔ ندیم پڑھائی کے لیے امریکا جانے کو کہہ رہا ہے۔ لڑکیوں کو بھی دینا دلانا ہے۔ سو خرچے ہیں۔''

راشد نے سوچا۔ یہ بھی ماجدہ کی مہربانی ہے۔ ورنہ اس کے پاس میرے لیے کہاں گنجائش ہوتی ہے۔ روپے تو اس نے رکھ لیے مگر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ جب پیسے کی ضرورت تھی اس وقت کچھ نہ ملا۔ اس کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ ایک دن گھر میں چور آ گئے اور ماجدہ کے زیور، نقدی اور قیمتی اشیا لے گئے۔ ماجدہ نے اس چوری کا الزام راشد پر لگایا۔

''یہ چوری تم نے کرائی ہے..... تم چوروں سے ملے ہوئے ہو۔ تم نے سوچا کہ سب چیزوں پر تم اس طرح قبضہ کر لو گے..... یہ تمہاری بھول ہے..... میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتی تھی تم نے کیوں ہمیں برباد کرنے کی ٹھانی ہے؟'' وہ اس کے سر پر کھڑی ہوگئی اور زور، زور سے چیخنے لگی۔

''ندیم کی ماں، تم کیوں ایسے الزامات مجھ پر لگا رہی ہو۔ کچھ خدا کا خوف کرو، میں یہ سب کیوں کروں

گا؟'' راشد کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

''تمہارے دل میں یہ میری عزت ہے؟''

''اچھا تم نے یہ نہیں کیا تو پھر کس نے کیا ہے؟'' وہ زور سے چیخی۔

''مجھے کیا پتا کس نے کیا ہے؟ تمہیں شرم آنی چاہیے ایسی باتیں کرتے ہوئے۔'' راشد نے کہا۔

ماجدہ نے پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ لکھوائی اور اس میں اپنے ہی شوہر پر الزام لگایا کہ اسی نے چوری کرائی ہے۔

راشد کو تفتیش کے لیے تھانے بلایا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ پولیس افسر کو اس کے بے قصور ہونے کا یقین تھا۔ اس نے دو چار سوال پوچھ کر اس سے کہا کہ وہ گھر جا سکتا ہے۔

''آج کے زمانے کی عورتیں کس قدر چالباز ہو گئی ہیں کہ وہ اپنے ہی شوہر پر چوری کا الزام لگا رہی ہیں۔ اتنا سیدھا سادہ بندہ!'' لاحول ولاقوۃ؟'' پولیس افسر اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔

''بعض عورتیں تو واقعی ڈائن اور چڑیل کی طرح ہوتی ہیں اللہ بچائے ایسی عورتوں سے۔'' دوسرا بندہ بولا۔

چوری کا سامان تو واپس نہ ملا۔ لیکن راشد کو پھر اسی مشکل کا سامنا تھا۔ ماجدہ کا رویہ تلخ تر ہو گیا۔ آئے دن وہ راشد کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرتی۔ گھر میدانِ جنگ بنا رہتا اور راشد سب کچھ خاموشی سے برداشت کرتا رہتا۔

چند دن بعد عاتکہ آئی تو اس نے بتایا کہ ''خاور نے دو لاکھ روپے مانگے ہیں۔''

''کیوں مانگے ہیں؟ کیا ہم نے اس کی فضول خرچیوں کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔'' ماجدہ غصے سے بولی۔

''امی اگر پیسے نہ ملے تو میرا گھر برباد ہو جائے گا۔'' عاتکہ نے کہا۔ ''امی کچھ کریں۔''

''کہاں سے لاؤں پیسے؟ میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ ہے؟ چور کم بخت سب کچھ لے کے چلے گئے۔ اتفاق تو دیکھو کہ ساری نقد رقم گھر میں ہی پڑی تھی۔ اگر بینک میں ہوتی تو پیسے بچ جاتے۔ پتا نہیں کون کم بخت مخبر ہے جس نے چوروں کو مخبری کر دی۔'' ماجدہ نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ راشد نے اسے دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔

راشد کے پاس تھوڑے سے پیسے رکھے تھے۔ اس نے جمیل کے مشورے پر اپنی رقم سے ایک چھوٹا سا پلاٹ خرید لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''زمین کی قیمت بڑھتی رہتی ہے۔ جب تمہارا دل چاہے بیچ دینا۔'' راشد کو یہ مشورہ بہت بھایا۔ اس نے ایک پلاٹ خرید لیا۔ یہ بات اس نے ماجدہ کو بتا دی تھی۔

''اچھا اب تو تم بھی صاحبِ جائداد ہو گئے ہو؟'' ماجدہ نے بڑے طنز سے کہا۔

راشد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس کے دل کو اطمینان ملا کہ اب اس کا ہاتھ خالی نہ تھا۔ تھوڑا سا احساسِ تحفظ تھا اور اپنی وقعت بڑھنے کا احساس تھا۔

چند دن گزرے تو دوسری بیٹی روبینہ گھر آئی تو اس نے بتایا کہ خاور اس کے شوہر نصیر سے ملا تھا اور دونوں میں خوب گٹھ جوڑ ہو رہی ہے۔ نصیر نے بھی مطالبہ کر دیا ہے کہ گھر میں کمرا بنوانا ہے۔ ٹی وی اور فریج پرانے ہو گئے ہیں۔ نیا سامان لینا ہے تم اپنے ماں باپ سے پانچ لاکھ روپے لاؤ تاکہ یہ کام ہو سکیں۔ جب عاتکہ کو اتنے، اتنے روپے مل سکتے ہیں تو تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے۔ روبینہ نے اس کی بہت منت سماجت کی کہ وہ ان باتوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔ وہ اسے مجبور نہ کرے امی کے ہاں چوری ہو چکی ہے ان کے پاس اب کچھ نہیں رہا۔

''میں کچھ نہیں جانتا، مجھے رقم لا کر دو۔'' روبینہ کئی دن ٹالتی رہی مگر نصیر نہ مانا یہاں تک کہ وہ مجبور ہو کر ماں کے گھر آ گئی۔

ماجدہ بے حد پریشان تھی۔ اس نے راشد سے کہا کہ وہ دامادوں کو یہ رقم دے دے۔

''میرے پاس رقم نہیں ہے۔ میں کہاں سے لاؤں؟'' راشد نے کہا۔

''کہیں نہ کہیں سے رقم کا بندوبست کرو.....

ورنہ لڑکیاں میکے میں بیٹھ جائیں گی۔ ان کے گھر برباد ہو جائیں گے۔''

''ماجدہ، کاش تم نے دولت کو اتنی اہمیت نہ دی ہوتی۔ تم نے امیر گھرانے کے بجائے عام سادہ سے گھرانوں میں بیٹیوں کی شادی کی ہوتی مگر ان کی خاندانی شرافت اور دین داری کو دیکھا ہوتا۔'' راشد نے دردمندی سے کہا۔ ''لڑکیوں کی اور ہماری زندگی بھی چین سے گزر جاتی۔''

''بس، بس اپنے وعظ رہنے دو تم..... زندگی پیسے سے گزرتی ہے..... شرافت سے نہیں۔'' ماجدہ غصے سے بولی۔

''ہاں تو پھر بھگتو ان امیر زادوں کو..... جن کو بیوی سے مانگتے شرم نہیں آتی۔ یہ دولت کے لالچی ہیں..... بے غیرت لوگ ہیں۔ ان کو حیا نہیں آتی بھیک مانگتے ہوئے؟'' راشد نے بھی کہا۔ ''نیک اور ایمان دار لوگ جو کچھ اپنی محنت سے کماتے ہیں اس میں گزارہ کرتے ہیں، دوسروں کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔'' راشد نے کہا۔

''یہ بیکار کی باتیں ہیں۔ اب تم یہ بتاؤ کہ انہیں رقم کہاں سے دی جائے؟''

''مجھے کیا پتا۔'' راشد بولا۔

''تم باپ ہو تمہیں اس کا انتظام کرنا ہوگا۔ تم اپنا پلاٹ بیچ دو اور رقم کا انتظام کرو۔''

''اچھا، تمہاری نظر پھر میرے پلاٹ پر ہے۔ سن رکھو، میں پلاٹ ہرگز نہیں بیچوں گا۔'' کچھ دن گھر میں سکون کے گزرے تھے کہ پھر وہی سب شروع ہو گیا۔

راشد کے اعصاب بہت کمزور ہو چکے تھے۔ وہ چپ، چپ رہتا تھا۔ ماجدہ اس سے ہمیشہ اونچی اور تیز آواز میں بات کرتی جیسے وہ اس کا نوکر ہو۔ اس کے لہجے میں ہمیشہ تلخی ہوتی تھی۔ راشد جب اپنے بچوں سے کوئی بات کرتا تو ماجدہ فوراً اس بات کی مخالفت کرتی تھی اور بچوں کو یہی بتاتی کہ تمہارا باپ تو ہے ہی بیوقوف، اس کو کچھ نہیں پتا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے غلط کہہ رہا ہے۔ البتہ میری بات تمہیں ضرور ماننی ہے۔ اس لیے بچے بھی باپ کی باتوں کو نظر انداز کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔

ایک دن راشد اپنی زندگی کے حالات پر غور کر رہا تھا۔ ''ماجدہ! خدا تجھے غارت کرے، تو نے کبھی میری عزت نہ کی، کبھی مجھے سکھ نہ دیا۔ پتا نہیں میں کیوں اس کی باتوں کو برداشت کرتا رہا۔ یہ عورت ہرگز اس لائق نہ تھی کہ اس کا گھر بستا مگر یہ میری کم ہمتی تھی کہ میں اسے برداشت کرتا رہا۔ شاید یہ میرا صبر ہی ہے جو زندگی عزت سے گزر رہی ہے۔ کہنے کو اولاد بھی ہے، گھر بھی ہے۔ سب کچھ ہے میرے پاس۔ ہاں مگر دل میں جو خوشی ہوتی ہے وہ ناپید ہے۔ اولاد سیدھے منہ بات نہیں کرتی، بیوی ہر وقت غصہ کرتی ہے۔ اپنی دولت کی دھونس جماتی ہے مجھ پر۔'' اپنوں کے ہی ظلم و زیادتی کے احساس نے اس کی آنکھوں کو آنسوؤں سے نم کر دیا۔ وہ اپنے آنسو صاف کرنے لگا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری۔

وہ اپنی زندگی پر غور کرتا رہا آخر اس نے ایسا کیا، کیا جو ایسی بیوی ملی بس اس کی قسمت میں شاید یہی سب کچھ تھا۔ انسان اگر اپنی وقعت خود نہ پہچانے، اپنے آپ کو خود نہ گردانے، تو اس کے اپنے بھی اسے دو کوڑی کا سمجھنے لگے ہیں۔ راشد کو افسوس تو اس بات کا تھا کہ اس کی اولاد اسے باپ کا احترام نہیں دیتی تھی۔ یہ شاید ان اولادوں کی بدقسمتی تھی کہ جبھی تو پیسہ ہونے کے باوجود نہ لڑکیاں اپنے گھروں میں خوش تھیں، لالچی شوہروں نے زندگی عاجز کی ہوئی تھی اور لڑکے الگ خود غرضیوں کا شکار تھے۔

راشد نے اسی ذلت آمیز زندگی سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ ایک دفعہ گھر سے نکل کر مسجد میں رہنے لگا مگر دنیا دکھانے کے لیے اس کی بیوی اور بچے گھر لے آئے تھے کہ نام کا تو باپ گھر میں ہونا چاہیے۔ اب وہ ایک کونے کھدرے میں پڑا رہتا کہ یہ بے ضرر شخص ان کے گھرانے کے لیے آبرو تھا۔ ورنہ جیتے جی وہ کہیں غائب ہو جاتا تو بدنامی بھی بیوی، بچوں کی ہی تھی۔ کچھ لوگوں کی قسمت میں شاید اپنی بیوی اور سگی اولاد کے ہاتھوں بہت کچھ بھگتنا لکھا ہوتا ہے سو وہ بھی بھگت رہا تھا۔

❁❁❁

شاپنگ

فرحت جبین

سارا دن صدر کے مختلف پلازوں کی دکانوں میں خوار ہونے کے بعد رات گئے علینہ کی شاپنگ جا کر مکمل ہوئی تھی۔ نہ صرف وہ خود تھک گئی تھی چل، چل کر بلکہ اس نے اپنے ساتھ آئی رومی کو بھی تھکا دیا تھا۔ اب جب کہ شاپنگ مکمل ہوگئی تھی تو دونوں کو زوروں کی بھوک ستانے لگی تھی۔ ستا تو پہلے بھی رہی تھی لیکن پہلے شاپنگ پر اتنا دھیان تھا کہ کھانے کا ہوش ہی کہاں رہا تھا۔ اپنے سارے شاپنگ بیگ انہوں نے پارکنگ میں کھڑی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اوپر نیچے ڈالے اور اب کسی قریبی ریسٹورنٹ میں جانے کا قصد کرنے لگیں۔

''توبہ ہے علینہ تم سے۔ اتنا پھرانے کے بعد، ہزاروں لگا کر تم نے اتنی سی شاپنگ کی ہے۔ کوئی دیکھے تو یہی کہے کہ اتنی دیر لگا کر، اتنے پیسوں میں تو بندہ اپنی شادی کی آدھی شاپنگ کر لیتا ہے۔'' رومی نے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر اسے لتاڑا تھا۔

''ارے یار تمہیں تو پتا ہے کہ میں کتنی چوزی ہوں۔ برانڈ کانشس..... اتنی آسانی سے کوئی چیز تھوڑا ہی پسند آتی ہے جبکہ ہے بھی یہ میری شادی کی شاپنگ جو بندہ مزید دھیان سے کرتا ہے۔ ایک ... ایک چیز مجھے بیسٹ چاہیے اپنی شادی پر۔'' وہ اب کھانے کا آرڈر کرنے کے لیے مینو کارڈ دیکھ رہی تھی۔

''ایسے تو ہو گئی تمہاری شاپنگ کمپلیٹ۔'' رومی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''ہو جائے گی۔ ابھی تو اتنا ٹائم پڑا ہوا ہے شادی میں۔ پہلے میں پنڈی، اسلام آباد کے سارے مالز کھنگالوں گی پھر لاہور جاؤں گی اور کراچی جانا پڑے تو وہاں بھی ضرور جاؤں گی۔ لیکن ہر چیز مجھے یونیک اور بیسٹ چاہیے..... سمجھ آئی۔'' رومی مزید اس ٹاپک پر بات کرنے کے بجائے اس سے اپنی جاب کے بارے میں ڈسکس کرنے لگی تھی۔

وہ دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں حالانکہ ان کے اسٹیٹس میں بہت فرق تھا اور مزاج میں بھی لیکن بچپن سے لے کر اب تک دونوں کی اسکولنگ ایک رہی تھی اور پھر اب یونیورسٹی میں بھی ساتھ تھیں۔ رومی ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور حال ہی میں اپنا ماسٹرز مکمل کر کے اس نے جاب ڈھونڈنا شروع کی تھی جبکہ علینہ ایک بڑے بزنس مین کی بیٹی تھی۔ جس نے ماسٹرز تو رومی کے ساتھ ہی مکمل کیا تھا لیکن جاب کے بجائے سیدھا شادی کی تیاریاں کر رہی تھی کہ اسے جاب کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ وہ ایک بڑے بزنس مین کی اولاد تھی اور اس کی شادی بھی ایک بہت بڑے بزنس مین کے بیٹے سے ہی ہو رہی تھی جو اُن سے بھی زیادہ امیر تھے۔ رشتہ تو اس کا ماسٹرز کے دوران ہی طے ہو گیا تھا لیکن شادی امتحانوں کے بعد اٹھا رکھی تھی۔

''تم پاپا کے آفس میں کیوں جاب نہیں کر لیتیں.....؟'' علینہ نے کھانے کے دوران رومی سے کہا تھا۔

''میرے سبجیکٹ کا تمہارے پاپا کے بزنس سے دور، دور کا بھی تعلق نہیں ہے یار۔ میں نے کیمسٹری پڑھی ہے اور ان کا بزنس امپورٹ ایکسپورٹ کا ہے۔ کہیں سے کوئی جوڑ نہیں بنتا۔''

''تعلق کا کیا ہے، تعلقات ہوں تو تعلق بھی بن جاتا ہے۔ لوگ کیا، کیا پڑھ کر کہاں، کہاں کس سیٹ پر بیٹھے کام کر رہے ہوتے ہیں، بس تعلقات ہونے چاہئیں۔'' اس نے رومی کو آنکھ ماری تھی۔ لیکن رومی کو اپنی انا عزیز تھی اس لیے وہ اپنے بل بوتے پر نوکری ڈھونڈنا چاہتی تھی اور اسے اپنی فیلڈ میں ہی کام کرنے کا شوق تھا۔

کھانا ختم ہوا تو علینہ نے بل کی پے منٹ کی اور دونوں پارکنگ کی طرف بڑھنے لگیں۔ تبھی ایک طرف سے ایک خاتون گود میں بچہ اٹھائے اور دوسرے ہاتھ میں ہیر بینڈز، کیچرز کی ٹوکری اٹھائے ان کی طرف بڑھی تھی۔

''باجی لے لو کچھ..... صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ گھر پر اور بچے بھی ہیں جو بھوکے ہوں گے۔ جاتے ہوئے ان کے لیے کھانا لے جاؤں گی۔'' وہ منت کر رہی تھی۔

''کتنے کا دو گی یہ والا بینڈ.....؟'' علینہ نے سارے بینڈز پر ایک نظر ڈال کر ان میں سے ایک بینڈ نکالا۔ رومی نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا کہ برانڈز خریدنے والی لڑکی ایک چھابڑی والی سے کیسے کچھ لینے پر آمادہ ہو گئی۔

''باجی ایک سو تیس کا ہے۔ آپ ایک سو دس دے دیں۔''

''ہائیں ایک سو دس کیوں... میں تو ستر دوں گی۔''

''باجی ستر تو بہت کم ہیں۔ اچھا سو دے دو۔'' اس نے مسکین سی شکل بنائی۔

''ستر سے ایک روپیہ اوپر نہیں دوں گی۔'' علینہ بھی بضد تھی۔ رومی نے اس کا ارادہ بھانپ لیا کہ وہ لینے کے چکر میں نہیں بس محض اس غریب عورت کو ستا رہی ہے۔

اس سے پیسے کم کروا رہی ہے۔

''باجی میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ایسے مت کرو۔ سودے دو۔ مجھے بچوں کے لیے کھانا لے کر جانا ہے۔ مانگ تھوڑا رہی ہوں، کما رہی ہوں۔ اتنے اچھے گھر کی لگتی ہو، کچھ تو خیال کرو۔'' رومی نے جھٹ سے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اس عورت کی طرف بڑھایا۔

''یہ لو اور ایسے تین بینڈ مجھے دے دو اور باقی رقم رکھ لو۔'' اس عورت نے خوشی، خوشی تین بینڈ نکالے اور رومی کی طرف بڑھا دیے..... باقی کے پیسے رومی کو واپس کیے اور اسے چند دعائیں دیں اور آگے چل دی۔

''تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی ان بینڈز کی۔ تم تو یہ ہیر بینڈز لگاتی تک نہیں ہو اور وہ بھی اتنے مہنگے لے لیے۔'' علینہ مزے سے بولتے آگے بڑھی اور گاڑی کا لاک کھولنے لگی۔

''میں نے ایک بار کہیں پڑھا تھا علینہ کہ کسی محتاج سے مہنگے داموں کوئی شے خریدنا صدقے سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اس وقت اسے پیسوں کی ضرورت تھی تو میں نے یہی کیا۔ لیکن تم نہیں سمجھو گی کیونکہ تم ان لوگوں میں سے ہو جو برانڈڈ شاپس میں گھس کر منہ مانگی قیمت پر ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بنا ہزاروں کی خریداری کر لیتے ہیں لیکن سڑک پر گھوم پھر کر بیچنے والوں سے دس، دس روپے بھی کم کرواتے ہیں۔ تمہارے دس، بیس روپے کم کروانے سے تمہارے بینک بیلنس میں تو کوئی اضافہ ہو نہ ہو ان بیچاروں کے لیے یہی دس، بیس روپے بے انتہا قیمتی ہوتے ہیں۔ انہیں کون سی بلڈنگیں کھڑی کرنی ہیں یہ ہیئر بینڈز بیچ کر۔'' رومی نے طنزیہ انداز میں کہا تھا اور علینہ نے الجھی ہوئی نظروں سے رومی کو دیکھا جو اب گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ رہی تھی پھر مڑ کر اس عورت کو دیکھا جو اب اپنی ٹوکری میں مال ٹھیک کرتے ہوئے بچے کو زمین پر بٹھائے رقم اپنی قمیص کی جیب میں ڈالتی خوش ہو رہی تھی۔

❁❁❁

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 750 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

شمعِ ہدایت

اختر شجاعت

حقوق اولاد..... حکم الٰہی

تمام تر حمد و ثنا اللہ رب العزت کے لیے ہے جو ہمارا مالک و خالق اور رازق ہے۔ وہ ہے محیط بیکراں میں ہوں ذرا سی آب جُو..... اس بیکراں ہستی کے بارے میں اپنے احساسات کا اظہار بہت مشکل اور ناممکن ہے..... کیونکہ میرے قلم کی طاقت بہت کم..... صفحات بہت قلیل اور ذہن بہت محدود ہے۔

اس عظیم رب کی رحمتوں اور نعمتوں کی بارش ہر آن اپنی مخلوق پر برس رہی ہے۔ ہر ذرہ کائنات اس عظیم رب کی رحمتوں کے مقدس بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ کوئی شے ایسی نہیں جسے اس رب کی شانِ رحمت سے حصہ نہ ملا ہو۔

نعمتوں کا انبار ہے جو اس خالق نے ہمیں عطا کر رکھا ہے مگر افسوس ہم بہت ناشکرے لوگ ہیں۔ اس رب نے ہمیں اپنی نعمت وجود سے نوازا پھر اس نے ہمیں جانور نہیں بلکہ انسان بنایا، بہترین صورت عطا کی..... پھر نعمتِ ایمان سے نوازا۔

قرآن مجید جیسی نعمت ہمیں ہدایت کے لیے عطا کی پھر عظیم ترین نعمت جان نعمت حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مقدسہ ہے۔ یہ ایک ایسی نعمت ہے جس پر ساری دنیا دی نعمتیں قربان..... تو کروڑوں درود و سلام ہو سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کی آلؓ پر اور ان کے اصحابؓ پر..... آج ہمارا موضوع ''حقوقِ اولاد'' ہے۔ اولاد اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے سب سے اہم اور قیمتی نعمت ہے..... اولاد والدین کے لیے دل کا سکون ہے..... لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ اولاد چاہے بیٹے ہوں یا بیٹیاں والدین کے پاس اللہ کی امانت ہوتے ہیں۔ اس لیے بچوں کی تعلیم اور ان کی اخلاقی اور دینی تربیت والدین کا ہی ایک اہم فریضہ ہے۔ اس امانت کی حفاظت ضروری ہے۔ اس نعمت کو ضائع ہونے سے بچایا جائے..... اور نیک اولاد تو والدین کی زندگی کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے اولاد پر والدین کی خدمت کا فرض عائد کیا ہے۔ وہاں اولاد کے کچھ حقوق بھی والدین کے ذمے لگائے ہیں۔

اب انتہائی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ والدین کی کیا، کیا ذمے داریاں ہیں اور اولاد کے ان پر کیا حقوق ہیں جو اللہ رب العزت کی طرف سے ان پر لاگو ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کے کانوں میں سب سے پہلے اذان دی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں تکبیرِ اقامت پڑھنے کی تعلیم و ترغیب دی ہے۔

اذان کے بعد بچے کے منہ میں میٹھی چیز ڈالنا بھی سنت ہے جسے تحنیک کہا جاتا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں کھجور چبا کر بچے کے منہ میں لگا دی جاتی یا تالو پر مل دی جاتی۔ بچہ پیدا ہونے کے ساتویں روز بچے کے سر کے بال منڈوا کر

چاندی کے برابر تول کر اس چاندی کو صدقہ خیرات کرنا چاہیے۔ اس کے بعد بچے کی طرف سے عقیقہ کیا جائے۔ لڑکے کی طرف سے جانور کی قربانی دو اور سر کے بالوں کو منڈوا دو..... یعنی عقیقہ اس جانور کو کہتے ہیں جو نوزائیدہ بچے کی طرف سے خدا کے شکریے میں ذبح کیا جاتا ہے۔

اگر کسی وجہ سے ساتویں دن عقیقہ نہ ہو سکے تو چودھویں یا اکیس تاریخ یا جب ممکن ہو ضرور کر دینا چاہیے۔

بچے کا اچھا سا نام رکھنا بھی والدین کا فرض ہے۔ کیونکہ فرمان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ آدمی سب سے پہلے اپنی اولاد کو جو تحفہ دیتا ہے وہ اس کا نام ہے۔ لہٰذا اچھا اور بامعنی نام رکھنا چاہیے۔

تعلیم و تربیت..... اولاد کی صالح خطوط پر پرورش کے ساتھ انہیں تعلیم سے آراستہ کرنا بھی والدین کا فرض ہے..... کیونکہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد عورت پر فرض ہے۔ آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اچھی تعلیم و تربیت سے زیادہ ایک باپ کا اپنی اولاد کے لیے کوئی عطیہ نہیں ہے۔''

لہٰذا والدین کا یہ فرض ہے کہ وہ خود علم حاصل کریں اور اپنی اولاد کو بھی دولتِ علم سے مالا مال کریں۔ ماں کی گود بچے کی پہلی اور بہترین درس گاہ ہے جہاں انسانی سیرت سنورتی ہے کیونکہ بچے کا سب سے زیادہ رابطہ ماں کے ساتھ ہوتا ہے۔ لہٰذا ماں کو بچے کی ابتدائی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

اسلام میں علم کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ تعلیم کی اہمیت کا اندازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ بدر کے قیدیوں کا فدیہ مقرر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''جو قیدی پڑھے لکھے ہیں وہ مسلمانوں کے دس، دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو انہیں آزاد کر دیا جائے گا۔''

تو بچے کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیں کیونکہ بچے سادہ ورق کے مانند ہوتے ہیں۔ سادے کاغذ پر جو بھی نقش و نگار بنائے جائیں وہ بن جاتے ہیں تو پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان ماں کا فرض منصبی ہے کہ بچوں کو اسلامی تہذیب و تمدن کے سانچے میں ڈھال کر ان کی بہترین تربیت کرے۔ کیونکہ اگر ماں اپنے اس فرض کو ادا نہیں کرے گی تو یقیناً گناہ گار ہوگی۔

بچے جب کچھ بولنے لگیں تو ماں کو چاہیے کہ ان کو لا الہ الا اللہ سکھائیں..... عقائد سکھائیں۔ اسلام کے بنیادی تین عقیدے، اول، عقیدۂ توحید یعنی اللہ کو وحدہ لاشریک ماننا، دوئم، عقیدۂ رسالت یعنی سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا آخری نبی ماننا اور ان کے لائے ہوئے دین کو سچے دل سے تسلیم کرنا..... سوئم، عقیدۂ آخرت..... یعنی موت کے بعد زندہ ہونے کا عقیدہ..... قیامت، اعمال کا حساب سزا و جزا..... دوزخ و جنت ان عقائد کا ماننا..... ماں، باپ بچوں کو اسلامی عقائد نہیں سکھاتے ہیں۔ خود بھی کچھ نہیں جانتے..... دنیاوی طور پر گریجویٹ ہو جاتے ہیں، پی ایچ ڈی کر لیتے ہیں لیکن توحید، رسالت اور آخرت کے بارے میں جو عقائد ہیں ان سے ناواقف ہیں۔

☆☆☆

اسلام سراپا عمل کا نام ہے اور ہر انسان کی زندگی سے متعلق اسلام نے احکام بتائے ہیں۔ مرد ہو یا عورت ان احکام پر عمل کرنے سے ہی صحیح مسلمان بنتا ہے۔ وہ تمام احکام جو سب پر فرض ہیں جیسے نماز، روزہ، وغیرہ ان سب کا سیکھنا اور جاننا تو ہر ایک پر فرض ہے ایک دوسرے کے حقوق پہچانیں۔ ماں، باپ، اولاد کے حقوق اور اولاد، ماں، باپ کے حقوق جانیں۔

آج کل غفلت کا دور دورہ ہے۔ بے راہ روی کا عالم ہے بہت سے مرد اور عورتوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کے ذمے اسلام کے کیا، کیا احکام عائد ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنی طبیعت، مزاج کا پابند اور خواہش کا بندہ نظر آتا ہے۔ یہ بہت افسوسناک صورتِ حال ہے۔

مسلمان دین سے جاہل اور غافل ہو یہ اس کے لیے بڑے شرم کی بات ہے، غفلت اور جہالت کو دور کرنا فرض ہے۔

نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، آپس کے معاملات، رہن، سہن اور کھانے پینے، اٹھنے، بیٹھنے، سونے، جاگنے اور ان کے علاوہ زندگی کی تمام حالتوں کے احکامات ہیں۔ جن سے آگاہی ضرور حاصل کرو جو قرآن اور حدیث میں بتائے گئے ہیں۔ بہت سے مرد اور عورتیں بچپن میں دین سیکھتے ہیں اور بڑے ہو کر لحاظ کی وجہ سے نہیں پوچھتے اور عمر بھر جاہل ہی رہتے ہیں..... اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف چلتے ہیں، یہ بڑی محرومی کی بات ہے۔

بچوں اور بچیوں کو دیندار استادوں اور استانیوں سے دین پڑھواؤ اور جو عورتیں بڑی ہو چکی ہیں مگر دین سے لاعلم ہیں ان کو دین کی ضروری باتیں بتانے اور نماز یاد کرانے کا اہتمام کرو..... جس کی ترکیب یہ ہے کہ روزانہ یا کم از کم ہفتے میں ایک روز مقرر کر کے کسی طے شدہ جگہ جمع ہو جائیں اور ایک دوسرے کو سیکھنے سکھانے میں لگ جایا کریں۔ زبانی تعلیم بھی کریں اور کتابی تعلیم بھی.....

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''اپنے بچوں کو نماز سکھاؤ جبکہ وہ سات سال کے ہوں اور نماز نہ پڑھیں تو ان کی پٹائی کرو جبکہ وہ دس سال کے ہوں۔''

یہ ماں، باپ کا فریضہ ہے۔ کسی نے کہا تھا ناں کہ ''تم مجھے اچھی مائیں دو، میں تمہیں اچھی قوم دوں گا۔'' تو ماں کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے بچے کی تربیت پر خاص توجہ دے۔

☆☆☆

قرسم خاتون اپنے وقت کی بڑی عابدہ تھیں..... حضرت بابا فرید الدین مسعودؒ آپ کے صاحبزادے تھے۔ ابھی آپ کی عمر پانچ سال کی ہوگی کہ آپ کے مہربان والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

حضرت فرید الدین مسعودؒ کا دور یتیمی دیگر اہلِ خاندان کی نظر میں آفات و مصائب کا زمانہ تھا لیکن آپ کی والدہ قرسم خاتونؒ اپنے اللہ کے فیصلے پر راضی بہ رضا تھیں۔ جب رشتے دار خواتین نے گریہ و زاری کرتے ہوئے قرسم خاتونؒ سے یہ سوال کیا کہ ان بچوں کا کیا ہوگا تو حوصلہ مند ماں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''بے شک ان بچوں کا باپ اس وقت دنیا سے رخصت ہو گیا لیکن اس محرومی کے باوجود میں اپنے آپ کو لاوارث نہیں سمجھتی اور نہ میرے بچے بے سہارا ہیں۔ میں جس اللہ کی پرستش کرتی ہوں وہ اول و آخر بھی ہے ظاہر و باطن بھی ہے اور حیُ و قیوم بھی.....'' یہ پاکباز سیرت خاتون اپنے بچوں کی تربیت میں مشغول ہو گئیں..... جب پہلی بار قرسم خاتون نے اپنے بیٹے کو نماز کی تلقین کی تو فرمایا۔ ''فرزند.....! نماز ادا کیا کرو..... اس سے اللہ راضی ہوتا ہے اور اپنے عبادت گزار بندوں کو بے شمار انعامات سے نوازتا ہے۔''

حضرت فرید الدین مسعودؒ اس وقت بہت کم سن تھے۔ اس لیے والدہ سے پوچھنے لگے۔ ''جو بچے نماز پڑھتے ہیں انہیں اللہ کی طرف سے کیا انعام ملتا ہے؟'' والدہ نے فرمایا۔ ''نمازی بچوں کو پہلے شکر ملتی ہے پھر جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں تو اللہ انہیں دوسرے انعامات سے نوازتا ہے۔'' حضرت فرید الدین مسعودؒ والدہ کی بات سن کر مطمئن ہو گئے پھر جب وہ اِدھر اُدھر چلے جاتے تو قرسم خاتون خاموشی سے مصلے کے نیچے شکر کی پڑیا رکھ دیتیں۔ حضرت فریدؒ نماز ادا کرتے اور شکر کی صورت میں اپنا انعام پا لیتے..... یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا پھر ایک روز قرسم خاتون گھریلو مصروفیات میں اپنا یہ روزانہ کا عمل بھول گئیں..... دوسرے دن یاد آیا تو اپنے فرزند کو بلا کر پوچھا۔

''فرید! کیا کل تمہیں مصلے کے نیچے سے شکر ملی تھی؟'' قرسم خاتون کے لہجے میں اضطراب تھا۔

''جی ہاں..... مجھے ہر نماز کے بعد شکر مل جاتی

ہے....." حضرت بابا فریدؒ نے بہت احترام سے عرض کیا..... بیٹے کی یہ بات سنتے ہی قرسم خاتون کی آنکھوں میں آنسو آ گئے..... وہ دل ہی دل میں اپنے اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں۔ "اے میرے رب.....! تو نے مجھے فرید کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچالیا۔ اگر تیرا دستِ غیب اسے شکر نہ فراہم کرتا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچتا؟" پھر قرسم خاتون نے بابا فریدؒ کو گلے سے لگایا۔ اور نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا..... "میرا بیٹا فرید الدین مسعود گنج شکر ہے....." پھر اس دن سے آپ کا یہ لقب گنج شکر مشہور ہوا۔

غرضیکہ یہ ایک والدہ کی ہی تربیت تھی کہ بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ اس عظیم مقام تک پہنچے۔

دوسری ایک اور عظیم ماں کا ذکر کروں گی یہ والدہ ہیں حضرت نظام الدین اولیاؒ کی حضرت بی بی زلیخا ایک امیر و کبیر بزرگ حضرت خواجہ عربؒ کی صاحبزادی تھیں لیکن آپ نے اپنے والد کی دولت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد حضرت بی بی زلیخا کے بھائیوں نے ان کی مالی امداد کرنا چاہی مگر آپ ایک غیور خاتون تھیں، آپ نے اپنے بھائیوں کا شکریہ ادا کیا اور خود محنت و مزدوری کر کے اپنی زندگی کے تکلیف دہ لمحات گزارنے لگیں۔ اس وقت آپ کے گھر میں کھانے والے چار افراد تھے۔ ایک خود آپ کی ذات..... دوسرے نظام الدین اولیا کی، تیسرے آپ کی چھوٹی بہن اور چوتھے گھر کی ایک ملازمہ..... ان سب کی کفالت کی ذمے داری تنہا حضرت بی بی زلیخاؒ پر تھی۔ آپ دن رات سوت کاتتیں اور پھر اسے ملازمہ کے ہاتھ بازار میں فروخت کرا دیتیں اس طرح جو رقم حاصل ہوتی اس سے گزر اوقات کرتیں۔ یہ آمدنی اتنی قلیل ہوتی کہ معمولی غذا کے سوا کچھ نہ ہاتھ آتا۔ تنگ دستی کا یہ حال تھا کہ شدید محنت کے باوجود بھی ہفتے میں ایک فاقہ ضرور ہو جاتا۔ جس روز فاقہ ہوتا اور حضرت نظام الدین اولیا کی والدہ سے کھانا مانگتے تو حضرت بی بی زلیخاؒ بڑے خوشگوار انداز میں فرماتیں۔

"بابا نظام! آج ہم سب اللہ کے مہمان ہیں....." بی بی زلیخا فرماتی ہیں کہ میں جس روز نظام سے یہ بات کہتی کہ آج ہم سب اللہ کے مہمان ہیں تو وہ بہت خوش ہوتے، سارا دن فاقے کی حالت میں گزر جاتا مگر وہ ایک بار بھی کھانے کی کوئی چیز طلب نہ کرتے اور مطمئن رہتے جیسے اللہ کی مہمانی کا ذکر سن کر انہیں دنیا کی ہر نعمت میسر آ گئی ہو..... پھر جب دوسرے دن کھانے کا انتظام ہو جاتا تو وہ معصومیت سے اپنی والدہ سے پوچھتے کہ "مادرِ گرامی! اب ہم کس روز اللہ کے مہمان بنیں گے؟" والدہ جواب دیتیں۔ "دنیا کی ہر شے اس کی دستِ نگر ہے۔ اللہ رب العزت جب بھی چاہے گا تمہیں اپنا مہمان بنا لے گا۔"

اس عظیم رب نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کو پانچ سال کی عمر میں ہی یہ ذوق بخشا تھا کہ آپ اللہ کا مہمان بننے کی آرزو کرتے تھے۔ دس سال کی عمر میں آپؒ نے قرآن پاک حفظ کر لیا تھا..... اور یہ ان کی والدہ کی بہترین تربیت کا نتیجہ تھا۔

☆☆☆

حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا۔ "کہ انسان اپنے بچے کو ادب سکھائے تو یہ بلاشبہ اس سے بہتر ہے کہ ایک صاع غلہ وغیرہ صدقہ کرے۔" نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اولاد کی طرف خصوصی توجہ دلائی ہے۔ بچے بالکل سادہ لوح ہوتے ہیں۔ اگر ان کی تربیت نہ کی جائے اور علم و عمل سے آراستہ نہ کیا جائے تو دیکھنے میں تو ضرور انسان نظر آتے ہیں مگر ان کے اخلاق و عادات وحشیانہ ہو جاتے ہیں۔ بچے کا دل صاف ستھرا، عیوب سے پاک سادہ و معصوم ہوتا ہے اس کی سطح پر جو نقش بھی کر دیا جائے تو وہ اسے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ "اگر اسے خیر کی تعلیم دی جائے اور نیک اعمال کا عادی بنایا جائے تو اس کی نشوونما خیر اور نیک اعمال پر ہوگی اگر اسے برائی کا عادی بنایا جائے اور جانوروں کی طرح اس سے بے پروائی برتی جائے۔ نہ اسے کوئی اچھی بات بتائی جائے نہ کسی خیر کی طرف

رہنمائی کی جائے تو وہ شر کا عادی ہوجائے گا۔ اور والدین بھی اس کی غفلت کی سزا بھگتیں گے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ..... ''اے ایمان والو! تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔''

جب ماں، باپ اپنے بچوں کو دنیا کی آگ بچاتے ہیں۔ تو آخرت کی آگ سے بچانا بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بچے کو ادب سکھایا جائے اس کے اخلاق کی تربیت کی جائے اسے بری صحبت سے دور رکھا جائے۔ لذت کوشی، آرام طلبی اور تزئین و آرائش کی خواہش کو اس کی نظر میں حقیر بنایا جائے۔ بچے میں حیا کا ظہور ایک بڑی نعمت ہے۔ بچے کو کھانے کے آداب سکھائے جائیں۔ بتایا جائے کہ کھانا دائیں ہاتھ سے کھائے، کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ کہے..... اپنے سامنے سے کھائے اگر کچھ لوگ ایک ساتھ کھا رہے ہوں تو ان سے پہلے کھانا شروع نہ کرے۔ کھانے کو گھور کر نہ دیکھے۔ کھانے میں جلدی نہ کرے، اچھی طرح چبا کر کھائے۔ اپنے ہاتھ ضرورت سے زیادہ نہ بھرے۔ کپڑے نہ خراب کرے..... بچے کو کبھی کبھی روکھی روٹی بھی کھلانی چاہیے۔ تاکہ اگر کسی وقت سالن موجود نہ ہو تو پریشانی نہ ہو۔ بسیار خوری سے بچانا چاہیے..... کھانے کے معاملے میں ایثار سے کام لینا چاہیے۔

بچے کی تربیت پر خاص توجہ کی ضرورت اس لیے بھی ہوتی ہے کہ اگر غفلت برتی جائے تو بچے میں.... بے شمار برائیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ جھوٹ، حسد، جلن، چوری، چغل خوری، بیہودہ ہنسی مذاق اور لڑنے جھگڑنے کی عادتیں اپنا قبضہ جمالیتی ہیں..... تو ابتدائی تربیت کا تعلق گھر سے ہے اور ماں اس کا پہلا مدرسہ ہے..... بچے کو قرآن اور حدیث کی تعلیم کے لیے مدرسۂ مکتب بھیجا جائے..... اکابر اولیا اللہ کے واقعات، احوال اور حکایات کا علم حاصل کرے..... تاکہ اس کے دل میں صلحا کی محبت پیدا ہوجائے۔

بچے کے قابلِ تعریف کام پر اسے انعام دینا چاہیے، انعام کے ساتھ بچے کی تعریف بھی کرنی چاہیے اس لیے ان میں مزید اچھا کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

بچے کو دن میں کھیل کود ہلکی پھلکی ورزش کے لیے بھی وقت دینا چاہیے۔ بچے کو ماں، باپ، اساتذہ اور بڑوں کی اطاعت اور تعلیم کا عادی بھی بنانا چاہیے۔ آخرت کے حوالے سے ہر بات کی اسے تلقین کی جائے، توجہ دلائی جائے۔ آخرت میں جزا و سزا کا علم دیا جائے..... غرضیکہ تمام چھوٹی، چھوٹی باتوں کو بچے کی تربیت میں نظر انداز نہ کیا جائے۔

والدین کو تربیت کے ساتھ، ساتھ بچوں کے ساتھ انتہائی شفقت سے پیش آنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا احترام نہ کرے وہ ہم سے نہیں ہے۔

ایک دن ایک دیہاتی (بدو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بچوں کو پیار کرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچوں کو چومتے اور پیار کرتے ہیں، ہم تو ایسا نہیں کرتے..... تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''کیا میں اس پر قادر ہوں کہ تیرے دل کو اللہ تعالیٰ نے پتھر بنا دیا ہے۔'' بچہ اگر چھوٹا ہو تو اسے بوسہ دینا سنت ہے۔

☆☆☆

اولاد کو کچھ دیتے وقت یا سلوک کرتے وقت بھی والدین کو چاہیے کہ عدل و انصاف کو مدِنظر رکھیں۔ اسلام میں چھوٹے، بڑے لڑکے اور لڑکی کے یکساں حقوق ہیں۔ اسلام لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کے مقابلے میں ترجیحی سلوک کو روا نہیں رکھتا۔ لڑکے اور لڑکی کا جو حصہ وراثت میں مقرر ہے انہیں دینا چاہیے کیونکہ اسی سے انصاف کا تقاضا پورا ہوتا ہے۔ اولاد میں سے کسی کو کوئی چیز دے دینا اور دوسرے کو محروم رکھنا جائز نہیں۔ بلکہ ایسا کرنا ظلم ہوگا جو خلافِ اسلام ہے۔

ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے اپنے ایک بیٹے کو ایک غلام دیا اور حضور اکرمؐ سے آکر عرض کرنے لگے آپؐ اس کی گواہی دیں..... آپؐ نے پوچھا۔ ''کیا دوسرے بچوں کو بھی ایک، ایک غلام دیا ہے؟'' انہوں نے عرض کیا نہیں تو آپؐ نے فرمایا..... ''میں اس ظلم کا گواہ نہیں بننا چاہتا۔'' اولاد کے ساتھ ناانصافی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بہن، بھائیوں میں عداوت اور دشمنی کے جذبات پیدا ہوجاتے ہیں جس سے سکون ختم ہوجاتا ہے۔

والدین کا یہ بھی فرض ہے کہ جب بچے جوان ہوجائیں تو ان کی شادی کردیں..... لیکن شادی میں لڑکے اور لڑکی کا رضامند ہونا ضروری ہے کیونکہ اسلام میں جبر یا زبردستی نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس گھر میں بچہ پیدا ہو۔ وہ اسے اچھا نام دے۔ اس کی تربیت کرے جب بالغ ہوجائے اس کی شادی کرے..... اگر بالغ ہونے پر اس کی شادی نہ کی اور وہ گناہ میں پڑ گیا تو اس گناہ میں اس کا باپ بھی شریک ہوگا۔'' یہی صورت حال لڑکی کے ساتھ بھی ہے۔

غرضیکہ والدین پر اولاد کے یہ سارے حقوق ہیں اور اب غور طلب بات یہ ہے کہ ہم اپنے موجودہ معاشرے پر نظر ڈالیں اور اکثریت کو دیکھیں تو احساس ہوتا ہے کہ کیا ان والدین نے اپنے بچوں کی تربیت درست خطوط پر کی ہے؟

یہ آج کل لڑکے اور لڑکیوں میں ادب کا فقدان..... قوتِ برداشت کی حد درجہ کمی..... بدتمیزی... بدتہذیبی، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے شفقت کا سلوک ناپید ہے۔ آرام طلبی کا عنصر حد درجہ بڑھا ہوا ہے۔

سب سے بڑی بات کہ اپنی دینی تعلیم سے بہت دور..... قرآن اور حدیث کی تعلیم نہ ہونے کے برابر.....

جب آج کی ماں اپنے چھوٹے، چھوٹے بچوں کو موبائل فون دے کر اپنی توجہ ان سے ہٹالیں گی تو بچے کیا تربیت پائیں گے؟

کبھی یہ غور کیا ہے کہ وہ بچے جو ذہنی طور پر معذور ہیں یا وہ بچے جو کسی جسمانی کمزوری کا شکار ہیں۔ (مثلاً خواجہ سرا مخنث) تو والدین اپنی شرمندگی کا احساس ختم کرنے کے لیے انہیں دوسروں کو سونپ دیتے ہیں کتنے ایسے ادارے ہیں جہاں یہ بچے اپنے والدین کی توجہ اور پیار بھری الفت کا انتظار کرتے ہیں۔

اگر یہ مائیں محبت اور محنت سے ان بچوں کی تربیت پر توجہ دیں تو انہیں ایک بہتر مقام دلواسکتی ہیں اس معاشرے میں کہ انہیں بھی جینے کا حق ہے..... وہ ایک فعال شہری بن سکتے ہیں۔

بہت تکلیف دہ جملہ ہے کہ ایک خسرے نے کہا کہ ''کاش میں ایک کتا ہوتا مگر اپنی ماں کے ساتھ تو ہوتا۔''

کیسی مائیں ہیں جو اپنے بچوں کی طرف سے آنکھیں بند کرلیتی ہیں۔ خدارا مائیں اپنی ذمے داری سمجھیں اور جانیں کہ یہ بچے ان کے پاس امانت ہیں۔ آپ کو اللہ کو جواب دینا ہے۔ اور ان کی درست معنوں میں تربیت کرکے ہی آپ سرخرو ہوسکتی ہیں۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ کی ہمیں اپنے بچوں کی درست خطوط پر تربیت کرنے کی توفیق عطا فرمائے..... تاکہ ہمارے بچے معاشرے میں فخر کے ساتھ چل سکیں۔

حرفِ آخر:

اس مضمون کے اختتام پر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ اس تحریر میں کہیں کوئی غلطی دانستہ یا نادانستہ یا پیارے آقا کے فرمودات میں کہیں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو اسے مہربانی رب غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف کرنے والے عظیم پروردگار میری ان کوتاہیوں کو معاف فرمادے..... اور اس کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے..... الٰہی آمین۔

مذاق میں بیوقوف بنانے کا عمل

شائستہ زریں

مذاق کے لغوی معنی دل لگی، ظرافت، رجحان، ہنسی اور شوق ہیں لغت کی رو سے بیوقوف، احمق، سادہ لوح، سادہ دل، ناسمجھ اور نادان کو کہتے ہیں۔ مذاق کرنا بری بات نہیں لیکن عمدہ مذاق حسنِ نظر کے ساتھ لطیف پیرائے میں کیے جانے والے مذاق نہ صرف یادگار رہ جاتے ہیں بلکہ ماضی کا حصہ بن کر کبھی، کبھی حال کو بھی پُر لطف بنا دیتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ مذاق میں اوروں کو بیوقوف بنا کر مذاق کرنے والا خود تو خوب ہی لطف اندوز ہوتا ہے مگر مذاق کا نشانہ بننے والا اگر ناسمجھ اور سادہ دل بھی ہو تو وہ مذاق کرنے والے کے ساتھ، ساتھ وہاں موجود دیگر افراد کے تمسخر کا نشانہ بھی بنتا ہے..... انجام کار اس کی عزتِ نفس بُری طرح متاثر ہوتی ہے۔ تب یہی مذاق دلآزاری کے گناہ کا باعث بن جاتا ہے۔

فی زمانہ مذاق میں بیوقوف بنانے کا رواج عام ہوتا جارہا ہے۔ اسی کے پیشِ نظر ہم نے ایک سروے رپورٹ کا اہتمام کر کے شرکا سے معلوم کیا کہ

سوال 1:: آپ کے خیال میں مذاق میں دوسروں کو بیوقوف بنانے کا عمل کیسا ہے؟

سوال 2:: کیا آپ نے کبھی ایسی کوشش کی یا خود اس کا نشانہ بنیں؟

صدف آصف
(قلمکار)

۱: یہ انتہائی تکلیف دہ حرکت ہے۔ خاص طور پر ان کے لیے جن کے جذبات سے کھیلا گیا ہو..... وہ اس بات کو بھول نہیں پاتے، اگر کوئی اس کی صفائی دینا بھی چاہے تو وہی مثال صادق آتی ہے کہ آنکھوں میں دھول جھونکنے کی

کوشش کی جارہی ہے۔

۲: جان بوجھ کر تو ہم نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ہاں جب ہم میلبورن (آسٹریلیا) میں نئے، نئے تھے تو ہمیں ایک گوری نے بیوقوف بنایا تھا۔ بڑی شرمندگی ہوئی۔ آج بھی خود پر ہنسی آتی ہے، اُس نے جذباتی کر دیا اور بہانے سے پیسے لے اُڑی اور ہم اُسے مظلوم سمجھتے رہے۔ بعد میں پتا چلا اُس کی یہ عادت تھی وہ spoiled child تھی۔

گلشاد نذیر
(گھریلو خاتون)

۱: میرے خیال میں تو یہ بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ جب ہم دوسروں کو بیوقوف بناتے یا سمجھتے ہیں تو مطلب کہ ہم خود کو دوسروں سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں اور یہ اللہ کو پسند نہیں۔ اللہ دلآزاری کے گناہ سے بچائے۔ آمین!

۲: میں نے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ میں کسی کی دلآزاری نہیں کر سکتی۔ رہ گئی بات خود بیوقوف بننے کی تو جس کو جب بھی موقع ملا بنا دیا۔ ابھی دو ماہ پہلے ہی فیس بک پر اشتہار آرہا تھا کسی کلینزر کا کہ اس کے استعمال سے کس طرح آسانی سے ہر چیز کو صاف کیا جا سکتا ہے۔ خاص کر داغ دھبے۔ فوراً آرڈر کیا۔ گھر والوں کے سامنے خوب قصیدے پڑھے کہ واہ جی واہ کیا پروڈکٹ

ہے۔تین دن بعد ۱۵۰۰ کی ڈیلیوری موصول ہوئی۔پیسے دے کر پارسل وصول کیا،جلدی، جلدی کھولا کہ صفائی شروع کریں۔ارے یہ کیا؟ اس میں تو ۸۰ روپے والا ٹالکم پاؤڈر نکل آیا۔ آگے آپ خود سمجھدار ہیں۔

فریدہ خانم
(شاعرہ، سماجی کارکن)

ا:اپنی خوشی یا لطف کے لیے کسی بے قصور انسان کو بیوقوف بنانا یا دھوکا دینا ہرگز مناسب نہیں۔دوستوں میں ہنسی مذاق تو چلتا ہے لیکن کوشش کرنی چاہیے کہ یہ مذاق کوئی سنگین صورتِ حال نہ پیدا کردے۔

۲:یاد نہیں پڑتا کبھی کسی کو سنجیدگی سے بیوقوف بنایا ہو۔مذاق میں بھی اخلاقیات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔مجھے کئی بار بیوقوف بنانے کی کوشش کی گئی، پر اللہ ہے ناں۔دراصل دنیا میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو دوسروں کو دھوکا دے کر یا بیوقوف بنا کر خود لطف اندوز ہوتے ہیں۔پر انہیں بھی کوئی نہ کوئی نشانہ بنا ہی رہا ہوتا ہے۔

آسیہ عامر
(مستقل قاری، قلمکار)

ا:بات اگر مذاق کی حد تک ہو تو ٹھیک ہے، جیسے ہم اکثر دوستوں کو وقتی طور پر بیوقوف بناتے ہیں لیکن اگر کسی کو بیوقوف بنا کر اپنا مقصد پورا کرنا ہے تو یہ اکثر غلطی سے گناہ کی طرف چلا جاتا ہے۔مذہبی اور اخلاقی دونوں طرح سے یہ فعل برا ہے کہ بیوقوف بنانے والا دراصل خود کو بیوقوف بنا رہا ہوتا ہے۔

۲:ایک مرتبہ میں لینڈ لائن فون کے پاس بیٹھی تھی کہ اچانک شرارت سوجھی پھپو کے گھر فون کیا۔ہونی شامت، انکل نے فون اُٹھایا۔میں نے رو،رو اُن کو گوجرانوالہ میں مقیم ان کی بزرگ پھپو کے انتقال کی خبر سُنائی۔اُس روز بہت تیز طوفان اور بارش ہوئی تھی لیکن انکل نے بھی لاہور سے گوجرانوالہ جا کر ہی دم لیا۔وہاں پہنچے تو سامنے ہی صوفے پر بیٹھی تسبیح پڑھتی پھپو پر نظر پڑی۔گھر آ کر اُنہوں نے جب نمبر چیک کیا تو سمجھ گئے پھر عرصے تک مجھ پر لینڈ لائن کے دروازے بند کردیے گئے۔کافی پہلے کی بات ہے۔

حمیرا انجم وحید
(گھریلو خاتون پاکیزہ قاری)

ا:دوسروں کو بیوقوف بنانے کا عمل انتہائی ناپسندیدہ ہے۔اس سے دوسروں کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے۔ خاص طور پر بچوں اور بوڑھوں کو بیوقوف بنانا انتہائی افسوسناک اور تکلیف دہ ہے۔بعض وقت کمزور دل افراد تاب نہ لاتے ہوئے جان سے بھی چلے جاتے ہیں،اعتماد کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔قریبی رشتوں میں دراڑ پڑ سکتی ہے۔جس سے دوریاں پیدا ہوتی ہیں.....

۲:کیونکہ میں سنجیدہ مزاج ہوں اس لیے ایسی کسی کوشش کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔اوروں کو بیوقوف بنانے والے اپنی احمقانہ حرکتوں سے دوسروں کو ناقابلِ تلافی نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔میرے ساتھ اسکول کے زمانے میں ایک واقعہ ہوا۔جب میں آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی اور کلاس میں ایک بھی غیر حاضری نہیں

تھی، میری ٹیچر نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اگر سارا سال آپ کی کوئی غیر حاضری نہ ہوئی تو سالانہ رزلٹ کے وقت آپ کو سو فیصد حاضری پر خصوصی انعام دیا جائے گا۔ کلاس مانیٹر کے علم میں یہ بات تھی۔ سالانہ امتحان سے چند روز قبل چھٹی کے بعد میری مانیٹر نے کہا کہ ٹیچر نے کل ہماری کلاس کو پرچے کی تیاری کے لیے چھٹی دی ہے میں نے دوسرے دن کی چھٹی کر لی۔ اگلے دن اسکول گئی تو ٹیچر اور ساتھی طالبات نے چھٹی کا سبب معلوم کیا میرے وجہ بتانے پر سب نے مانیٹر کو لعن طعن کی۔ مانیٹر کے اس احمقانہ مذاق کی وجہ سے میں اس انعام سے محروم رہ گئی جس کا ٹیچر نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اور جو میرا حق بنتا تھا۔

دانیہ احمد
(لائبریرین)

ا: یہ کوئی اچھی بات نہیں اس سے کوئی بھی انسان ڈسٹرب اور مایوس ہو سکتا ہے۔ وہ جانتے ہوئے بھی مایوسی کا شکار ہو سکتا ہے لیکن کسی کو نقصان نہ پہنچے تو حرج بھی نہیں۔

۲: زمانہ طالب علمی میں یہ کام بہت شوق سے کیا جاتا ہے۔ خواہ سبب کچھ بھی ہو میں نے بھی کئی بار کیا۔

میری امی کا کوچنگ سینٹر ہے اس میں میٹرک کا ایک بچہ ہر بات پر روتا تھا۔ کسی کی بھی کوئی چیز پسند آجاتی تو وہ اس کو چاہیے ہوتی تھی۔ اس وقت میں فرسٹ ائیر میں تھی۔ اور سب بچوں کے ساتھ پڑھتی تھی۔ ہم بچوں نے مل کر فیصلہ کیا یہ خود کو بہت عقلمند سمجھتا ہے تو اس کو بیوقوف بنایا جائے۔ ہم نے ایک سم خریدی اور اس سے باتیں کرنی شروع کر دیں۔ میرا بھائی بھی میرے ساتھ شامل تھا۔ ہم نے امتحان تک ٹیچر بن کر اس کو بیوقوف بنایا اور وہ بنا بھی۔ بعد میں ہم نے سم بند کروادی اور پھر وہ کھو بھی گئی تھی۔ ہم کو بہت مزہ آیا لیکن اس کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔

فریحہ عاقب
(کوآرڈینیٹر رشین کلچر سینٹر برائے سائنس)

ا: میرے خیال میں یہ نہایت ہی احمقانہ فعل ہے۔

احمق انسان ہی اوروں کو بیوقوف بنانے کا تکلیف دہ اور احمقانہ کام کر سکتا ہے۔

۲: اللہ نہ کرے کہ کبھی میں ایسی احمقانہ حرکت کروں۔ خیر لوگ مجھے احمق تو کہتے ہیں... کہ کئی بار احمقانہ حرکتیں کر جاتی ہوں۔ لیکن کبھی کوشش نہیں کی کسی کو بیوقوف بنانے کی، آج کل ہر کوئی بہت زیادہ عقلمند ہے۔ پہلے زمانے میں کہا جاتا تھا کہ فلاں ذات والے بہت زیادہ کم عقل ہوتے ہیں، بیوقوف بن جاتے ہیں۔ آج کل تو وہ خود بیوقوف بنا دیتے ہیں۔

شہلا نواز
(قاری و تبصرہ نگار، پاکیزہ)

ا: کسی کو بیوقوف بنا کے اس کے جذبات سے کھیلنا اچھی بات نہیں۔

۲: میرا بی اے کا رزلٹ آیا تھا تو بھائی نے کہا تمہاری دو میں سپلی آئی ہے۔ میرے دھواں دھار رونے سے گھبرا کے بھائی نے بتایا کہ مذاق کر رہا تھا تم نے تو ہائی سیکنڈ پوزیشن لی ہے۔

نے اپنی کزن کے ساتھ مل کر اپنی دوسری کزن ماہ نور کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ میں اپنی کزن کے ساتھ مل کر دروازہ بند کر کے ماہ نور کی سالگرہ کی سجاوٹ کا اہتمام کر رہی تھی۔ ماہ نور ہمارے گھر آئی تو میرے کہنے پر مما نے اس سے کہہ دیا کہ ایمن اپنی خالہ کے گھر گئی ہے ایک دو گھنٹے تک آجائے گی۔ ماہ نور ناراض ہو کر بیٹھ گئی کہ جب ایمن کو معلوم تھا میں آؤں گی تو وہ کیوں گئی؟ جب ہم نے کمرا سجا لیا اور دوسری کزن بھی کیک لے کر آگئی تو میں نے مما سے کہا کہ ماہ نور کو بھیج دیں، جیسے ہی وہ کمرے میں آئی ہم نے اُس پر اسپرے کر دیا ماہ نور یہ اہتمام دیکھ کر حیران ہی نہیں بہت خوش بھی ہوئی۔ اُس کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنی دیر سے گھر میں موجود ہے اور کیسی بیوقوف بنی بیٹھی ہے کہ ایمن تو گھر میں ہی نہیں ہے۔ میرے خیال میں مذاق میں ایسے بیوقوف بنانے میں کوئی حرج نہیں۔

☆☆☆

معزز قارئین!

آپ نے اوروں کو مذاق میں بیوقوف بنانے کے فعل اور خود بیوقوف بننے اور بنانے کے حوالے سے سروے میں شریک خواتین کی آرا پڑھیں۔ بہت دل خوش کُن امر یہ ہے کہ تقریباً تمام شرکا نے اس فعل کی مذمت کی ہے اس صورت میں جب یہ عمل متعلقہ ہستی کے لیے ضرر رساں ہو۔ بلاشبہ مذاق میں بیوقوف بنانے کا عمل حد سے بڑھ کر اخلاقی و سماجی بُرائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اس ضمن میں محتاط رویہ اختیار کیا جائے محض اپنی تسکین کی خاطر سادہ لوح انسانوں کے جذبات سے کھیل کر خود لطف اندوز ہونا انتہائی درجے کی حقیر حرکت ہے۔ ایسا مذاق جس سے نشانہ بننے والا کسی بھی قسم کی روحانی اور ذہنی اذیت سے نہ گزرے اور اس کے دل کو ٹھیس نہ پہنچے گراں نہیں گزرتا ورنہ بصورتِ دیگر کبھی، کبھی بہت بھاری نقصان بھی اُٹھانا پڑتا ہے اور مکافاتِ عمل کے طور پر خود اس سے بڑا خسارہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اللہ ہم سب کو اس علت سے محفوظ رکھے، آمین۔

☆☆☆

ثمن امجد
(ماڈل)

۱: کسی کو بیوقوف بنانا برا نہیں لیکن اگر اس سے اُن کی دلآزاری ہو رہی ہے تو وہ بُرا ہے۔ زندگی ہے مذاق نہیں کریں گے تو جئیں گے کیسے؟

۲: بالکل میں نے بنایا ہے اور خود بھی بنی ہوں۔

ثوبیہ صابر
(ہیڈ آف ہیومن ریسورسز
USA verge mobile LLC)

۱: ہنسی مذاق میں، آپس میں اگر دوستی یاری میں یہ عمل کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں البتہ کسی کی دلآزاری یا نقصان پہنچانے کے مقصد سے کیا جائے تو میری نظر میں یہ ایک غلط عمل ہے۔

۲: جی بہت بار گھر میں بہن بھائیوں کے ساتھ، کزنز نے ہنسی مذاق کے طور پر نشانہ بنایا بھی ہے اور بنی بھی ہوں۔

ایمن سلیم
(طالبہ)

۱: میرے خیال میں بیوقوف بنانا اچھی بات نہیں ہے۔ اس سے آپ پر سے اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی کو خوشی مل رہی ہے تو ہلکا پھلکا چل سکتا ہے۔

۲: میں بھی اکثر بن جاتی ہوں۔ لیکن پچھلے سال میں

گوشۂ ظرافت

ادارہ

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں..... مگر ایسی نشتر زنی بخاطر اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

اس ماہ اپنے خوش ذوق پڑھنے والوں کے لیے معروف مزاح نگار کرنل محمد خان کی کتاب بسلامت روی سے اقتباس حاضر ہے جسے پڑھ کر یقیناً آپ لطف اندوز ہوں گے۔

بالم آؤ بسو میرے من میں
اور اسٹون ہنج دیکھو

دوسرے روز ہمیں مسز بالم کے سپرد کیا گیا یعنی اس خاتون کے سپرد جس کے دہن میں قدرت نے شہد و شکر کی سلسبیل رکھ دی تھی۔ مسز بالم نے بھی قبل دوپہر تک ہمیں انتخابِ کتب کے رموز پر درس دیا۔ ان رموز سے تو ہم پہلے ہی آشنا تھے سو یہ سبق ہمارے لیے آسان ہونا چاہیے تھا لیکن اس جادوگر بالم کی تقریر کی لذت کا یہ عالم تھا کہ کتب شناسی سے پہلے خود فراموشی کی منزل تک پہنچ گئے اور خبر اس وقت ہوئی جب مسز بالم نے درس ختم کر کے ہمیں دعوتِ طعام دی۔ لنچ سے فارغ ہوئے تو مسز بالم نے بھی آرنلڈ کی طرح ہمیں سیر مضافات کو لے جانا چاہا اور ہمارے لیے بھی مسز بالم کی صحبت کے بعد ولٹ شائر کے باغ و راغ کی صحبت سے گوارا تر کوئی چیز نہ تھی۔ آج ہمیں دونوں صحبتیں میسر ہو رہی تھیں۔ چنانچہ جب مسز بالم ہمیں اپنی کار کے پہلو میں بٹھا کر شہر سے نکلیں تو یوں محسوس ہوا جیسے دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں..... کار سبزہ و گل کے ہجوم کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی تو یوں لگا جیسے فطرت نے ہمیں کار سے نکال کر اپنی آغوش میں لے لیا ہے اور ہمارے ہاتھ میں شرابِ بے خودی کا ساغر تھما دیا ہے لیکن پیشتر اس کے سر اٹھا کر ساغر لبوں تک لاتے، اچانک آواز آئی۔

''مسٹر خان، دیکھو ہم اسٹون ہنج (stone Henge) پہنچ گئے ہیں۔'' (جنوبی برطانیہ میں پندرھویں صدی قبل مسیح کی ایک قربان گاہ کے کھنڈر جو گنتی کے چند پتھروں کی شکل میں ملتے ہیں)

ہم چونک کر جہانِ بے خودی سے کار کی دنیا میں لوٹ آئے۔ یہ آواز مسز بالم کی تھی جو آہستہ آہستہ کار روک رہی تھی۔ سامنے کوئی سو دو سو موٹے، موٹے، بھدے، بھدے، کالے، کالے پتھر نظر آئے جو سبزے کے مخملیں فرش پر اس بے ترتیبی اور بے ادبی سے بکھرے پڑے تھے جیسے گینڈوں کی لاشیں پڑی ہوں۔ یہ غیر متبرک پتھر کہاں سے آئے تھے؟ یہ اس زمین کا حصہ تو نہ لگتے تھے۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ اڑتی ہوئی ارواحِ خبیثہ کی ٹکڑی مل گئی ہو اور یہ بے ڈول، دیو پیکر کنکر گر کر بکھر گئے ہوں، ہم نے دل میں کہا۔

''کیا یہی اسٹون ہنج ہے جس کے دیکھنے کی مس پارس تاکید کر رہی تھی اور جس کا ہر انگریزی گائڈ بک میں قصیدہ لکھا ہے؟'' ہمیں انگریزوں کی بدمذاقی پر رحم اور رونا آیا۔ کیا انہیں سابسری کے وہ شاداب سبزہ زار نظر نہیں آتے جن بے روح پتھروں، ان بدوضع عفریتوں کے اردگرد حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے ہیں؟ کیا وہ بجھے، بجھے جامد پتھر دیکھ سکتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھ سکتے کہ دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام.....؟ ہم نے مسز بالم سے کہا۔

''اگر یہی اسٹون ہنج ہے تو براہ کرم اس کی صرف ایک خوبی بتائیں جس کے لیے آپ ٹھہر گئی ہیں؟''

مسز بالم نے ذرا چونک کر ہمیں دیکھا اور .... بے پروائی سے کہا۔

''کیا یہ کافی نہیں کہ یہ اسٹون ہنج ہے۔''

''میری پیاری مسز بالم۔ یہ بہت ناکافی ہے۔'' ہم نے فی البدیہہ جواب دیا۔

اب کے مسز بالم نے اپنی شرابی آنکھوں کے علاوہ اپنے گلابی وجود کا بھرپور رخ بھی ہماری طرف موڑا اور اپنے لہجے کی شیرینی میں حسن کا رعب شامل کرتے ہوئے بولی۔

''تو پھر کیا چاہیے آپ کو؟''

''بس کچھ سبزہ بیگانہ، کچھ گلہائے ترلیکن پتھر نہیں چاہئیں کہ میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے۔''

''میں آپ کی بات نہیں سمجھی.....''

ہمارے پاس اس کے سوا کچھ جواب نہ تھا کہ چچا غالب کا مشہور شعر الاپنا شروع کر دیتے اور الاپنے لگے۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دل اور دے ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

مسز بالم کہ انگریزی شاعری کی رسیا تھی، شعر کے ترجمے کا مطالبہ کرنے لگی۔ ہم نے بخوشی لیکن بمشکل اس کی انگریزی بنائی لیکن جونہی چچا کا مطلب مسز بالم پر کھلا، ہمیں چھوڑ کر چچا پر فدا ہونے لگی اور مزید اشعار کا مطالبہ کیا۔ ہمیں اس غزل کے چند شعر یاد تھے پڑھنے لگے لیکن ہمیں معلوم نہ تھا کہ اسی غزل میں چچا نے ایک شعر اسٹون ہنج پر بھی کہا ہے جو بالکل ہمارے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ جونہی یہ شعر لاشعور سے ابھر کر ہماری زبان سے نکلا، ہم خود دم بخود رہ گئے، شعر تھا۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

مسز بالم نے معنی سنے تو کار چلا کر اسٹون ہنج سے بھاگ نکلی اور کہنے لگی۔

''ہم سے شاید یہ سنگ ہائے راہ تو نہ ہٹ سکیں لیکن ہم تو اس راہ سے ہٹ سکتے ہیں۔''

ہم نے مسز بالم کو سخن شناسی اور ہم نوائی پر مبارک باد دی اور جب دیکھا کہ چچا کے عنایانہ ہاتھ پر پوری طرح بیعت ہوگئی ہے تو اسے مرشد غالب کے کلام کا چغتائی ایڈیشن بھیجنے کا وعدہ کیا۔

میمیں سید ضمیر جعفری سے تعویذ لیتی ہیں

ہمارے اگلے دو دن نینا اور پیگی کے ساتھ گزرے..... جی ہاں، یہ وہی دراز مو اور تنگ قبا ملنگنیاں تھیں جن کے ساتھ آرنلڈ نے ہمارا بصد احترام ایک سطحی تعارف کرایا تھا۔ اب گہرے تعارف کی باری تھی اور گہرائی میں گئے تو معلوم ہوا آرنلڈ سچا تھا۔ یہ باہر سے بے پروا اور قلندر مزاج فقیر نیاں اندر سے بڑی کاریگر اور محتاط دنیا دارنیاں تھیں اور یہ کہ ہیر لڈ ولسن کو اپنی وزارت عظمیٰ کا اتنا علم یا فکر نہ ہوگی جتنی انہیں اپنی لائبریری کی تھی۔ ان لڑکیوں کی فرض شناسی دیکھ کر ہمیں اپنے پاکستان کے عزیز بھی یاد آئے اور ساتھ ہی سید ضمیر جعفری کا شعر.....

کچھ ہنر، کچھ سعی و کاوش، اے مرے نور نظر
صرف اک پتلون کس لینے سے کام آتا نہیں

ان لڑکیوں کے ساتھ ہماری سرکاری اٹیچمنٹ (attachment) ختم ہوئی تو ایک پرائیویٹ اٹیچمنٹ کا احساس ہونے لگا جس کی وجہ ان کی جسمانی نمائش نہ تھی بلکہ ذہنی آرائش جس میں بلاشبہ کچھ سعی و کاوش سے کام لیا گیا تھا۔ نینا اور پیگی نے یقیناً سید ضمیر جعفری سے تعویذ لیا تھا۔

موٹی محبوبہ ایک طرح کا بونس ہے

اگلے اور آخری دن کے لیے ہمیں کراچی نژاد ٹام کالسن آفیسر انتظامیہ کے ساتھ نتھی کیا گیا۔ ٹام خلاف توقع نینا اور پیگی کی ضد تھا۔ نہ صرف جنس کے لحاظ سے بلکہ مزاج کے اعتبار سے بھی۔ جہاں تک جنس کا تعلق ہے اگر وہ ہلکی پھلکی لڑکیاں جنس لطیف کا دلربا نمونہ تھیں تو یہ ٹوٹ بٹوٹ بھینسا صنف کثیف کا بڑا دلخراش نمائندہ تھا۔ یعنی مرد اور موٹا ہونے کے علاوہ اور موٹا تھا۔ گردن یوں تو اصلی تھی لیکن معلوم ہوتا تھا گلے میں ٹائر پہن رکھا ہے۔ اگر یہ شخص وزن کرنے کی مشین پر ایک پاؤں رکھتا تو یقیناً دوسرا پاؤں رکھنے سے پہلے مشین کا دم ہمیشہ کے لیے گھٹ جاتا۔ باتیں کرتے ہوئے بازو بلند کرتا تو معلوم ہوتا، دونوں ہاتھوں سے کیلے کے گچھے لہرا رہا ہے۔ شکل صورت کے اس

برتے پر آپ کی عاشق مزاجی کے تتے پانی کا یہ عالم تھا کہ ہمیں حسنِ انتظام کے رموز سمجھاتے، سمجھاتے حسنِ خوباں کی گتھیاں سلجھانے پر اتر آیا۔ حالانکہ خوباں اور ٹائم کے درمیان وہی رشتہ تھا جو گلاب کی کلی اور کیلے کی پھلی میں ہوتا ہے۔ بے شک اس کی پیدائش اور پرورش میں کراچی کا ہاتھ تھا تاہم اس تن و توش کے ساتھ اس بات کا امکان نہ تھا کہ ٹام کو کسی ذاتی رومان میں حصہ لینے کا اتفاق ہوا ہو، چنانچہ کچھ دیر تو اس کی عاشقانہ موشگافیاں سنتے رہے لیکن ایک جگہ روک کر کہا۔

''مسٹر کالسن، آپ کا مزاج بڑا عاشقانہ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بتائیں کہ آپ کی بناوٹ آپ کو عملی عشق کی اجازت بھی دیتی ہے؟''

ٹھٹک کر بولا۔ ''عملی عشق سے آپ کی کیا مراد ہے شادی؟''

''شادی تو عشق کا خاتمہ ہے۔ عملی عشق سے مراد وہ مرحلے ہیں جو شادی پر جا ختم ہوتے ہیں۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً حسینوں کے پیچھے بھاگنا، ان کے آگے ہاتھ جوڑنا، ان کے ستم سہنا حتیٰ کہ ایک دن کہہ دیں..... منظور ہے؟''

''ہاتھ تو میں جوڑ سکتا ہوں۔ بیٹھے، بیٹھے ستم بھی سہہ سکتا ہوں لیکن اٹھ کر پیچھے بھاگنا ذرا پرابلم ہے۔''

''گویا آپ صرف اسی صورت میں عشق کر سکتے ہیں کہ کوئی عشق کرانے کو حاضر خدمت ہو.....''

''اس میں حرج ہی کیا ہے؟ بڑا باوقار طریقہ ہے۔''

''یہ تو بتائیں اس باوقار طریقے سے آج تک آپ کے کان میں کبھی ''منظور'' کی آواز بھی آئی ہے؟''

''ایک دفعہ آئی تو تھی مگر میں نے ارادہ بدل لیا۔''

''کیوں.....؟''

''وہ مجھ سے بھی موٹی تھی۔''

جو خاتون ٹام کو بھی موٹی نظر آسکتی ہو اس کے حجم میں ضرور کوئی بات ہوگی۔ بہرحال ہم نے دل میں محترمہ کی مہم جوئی کی داد دی کہ ایک تو اس نے راہِ عشق میں بھاگنا پرابلم نہ سمجھا اور دوسرے ٹام کو دیکھ لینے کے بعد اسے قبول کرنے کا حوصلہ بھی دکھایا۔

ٹام سے گفتگو جاری تھی۔ پوچھا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''اس کے بعد آج تک کچھ نہیں ہوا لیکن دنیا بہ امید قائم.....''

ہمیں ٹام سے ہمدردی پیدا ہونے لگی کہ اس متلاطم چربی کی تہ میں ایک محروم النسا انسان بھی تھا اور جس امید پر غریب کی دنیا قائم تھی اس کے برآنے کے آثار ناپید تھے کہ اسے پتلی میسر نہ تھی اور موٹی موافق نہ تھی۔ اب خدا جانے قارئین کا اس ضمن میں کیا خیال ہے لیکن ہمارے یار آغا کی فلاسفی یہ ہے کہ بہت موٹے آدمی کے لیے بہت موٹی محبوبہ بھی ایک بونس ہے بلکہ ایک خدائی عطیہ ہے جسے وزن کیے بغیر قبول کر لینا چاہیے۔ لیکن افسوس کہ ٹام رحمتِ خداوندی کا اشارہ نہ پہچان سکا اور نتیجہ یہ کہ اب اسے ایک مستقل ازدواجی فاقے کا سامنا تھا جس کی ناکام تلافی کبھی ذکرِ دلبراں سے کرتا اور کبھی امیدِ رخاں سے۔ خدا جانے اس کی سمجھ میں یہ بنیادی بات کیوں نہیں آتی تھی کہ پتلی کی امید کی نسبت موٹی کی موجودگی کہیں زیادہ نفع بخش ہے ورنہ اس چار دن کی زندگی کا وہی حشر ہوتا ہے کہ دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں۔

ٹام سے ملاقات کے بعد ہماری ولٹ شائر کی آخری مصروفیت آرنلڈ اور اس کی خوب صورت بیوی کے ساتھ لنچ تھا۔ اس کھانے پر آرنلڈ نے اپنے بانکے اور کنوارے ہمسایے جیک کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ کھانا لذیذ تھا جس کا جیک نے ہر لقمے پر اقرار کیا۔ ہم نے اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہ سب آرنلڈ کی ہمسائیگی کا فیض تھا، جیک سے کہا۔

''جیک..... داناؤں کا قول ہے کہ اچھا ہمسایہ بہت بڑی نعمت ہے۔''

جیک بولا۔ ''بے شک..... اور ہمسائے کی بیوی بھی۔''

اور ساتھ ہی کم بخت نے مسز آرنلڈ کی طرف کافی آنکھ سے دیکھا..... اگر آرنلڈ کی جگہ لالہ محراب گل خان ہوتا تو جیک کی آنکھ نکال لیتا لیکن مہذب آرنلڈ فقط یہ کہہ کر رہ گیا۔

''شریر کہیں کا.....''

☆☆☆

بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

03316266612,021.35386783.021.35802552.Ext:110

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!

تمام حمد وستائش اس ذات والا صفات کو زیبا جو کُل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکتا و وحدہ لاشریک ہے اور کروڑوں درود وسلام حبیب خدا رحمۃ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر جو وجہ تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اپنے خزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ نہ صرف ہمارے وطن پاکستان بلکہ پوری دنیا سے اس وبا کا خاتمہ کردے، انسانیت کو امان ہو اور ہم بحیثیت مسلمان اپنے رب کی بارگاہ میں حقیقی معنوں میں بخشش وعنایات پائیں۔ (الٰہی آمین)

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری بہنو! سلام اور خلوص بھری دعائیں لیے محفل میں حاضر ہوں۔ آپ کے تعریف وتنقید بھرے تبصرے موصول ہوتے رہتے ہیں جو رائٹرز کو بہتر سے بہتر لکھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں اور ہمارے لیے بھی قابلِ غور ہوتے ہیں۔

بہنو! آج نہایت ضروری امر پر بات کرنا چاہوں گی..... وہ یہ ہے کہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے اس جدید دور میں جہاں بہت سے اچھے کاموں کی تشہیر ہوتی ہے اور مسلسل ترغیب بھی دی جاتی ہے وہاں برائیوں کی تشہیر بھی اپنے عروج پر ہے جو یقیناً ہم سب کے لیے انتہائی خطرے کی گھنٹی ہے۔

لکھاری بہنوں سے امید کرتی ہوں کہ اس سلسلے میں اپنے قلم کی طاقت کو استعمال میں لاتے ہوئے برائیوں کے خوفناک انجام سے ضرور آگاہ کریں ساتھ ہی اچھی باتوں اور بھلائی کے کاموں کی طرف نوجوانوں کو راغب کریں تاکہ آپ کی تحریر کا حق ادا ہو سکے۔ اگرچہ پاکیزہ میں ہماری رائٹرز مسلسل ایسی سبق آموز اور اصلاحی کہانیاں دے رہی ہیں مگر آپ بھی ان تکلیف دہ خبروں سے ضرور آگاہ ہوں گی جو آج کل تواتر سے آرہی ہیں۔ جوان لڑکے لڑکیوں کی بے راہ روی اور اس کا عبرت ناک انجام بالآخر موت پر ہی ختم ہوتا ہے۔ یہ پورے معاشرے کے لیے انتہائی تباہ کُن ہے۔ آج ہر بچے، بچی کے ہاتھ میں موبائل ہے اور اس کے ذریعے لوگ اچھائیوں کی طرف تو کم راغب ہو رہے ہیں بلکہ گناہ کی طرف جا رہے ہیں..... آپ تمام لکھنے والیاں اپنی مؤثر تحریروں کے ذریعے ان برائیوں کی نشاندہی کر کے اپنا فرض ضرور ادا کریں۔ یہ صورتِ حال ہر حساس شہری کے لیے بہت تکلیف کا باعث ہے۔

الحمدللہ ہماری تمام رائٹرز بہت اچھا لکھ رہی ہیں..... ماہ جون کی تحریریں بھی بہت عمدہ رہیں..... نئی رائٹرز بھی کافی پختہ تحریریں دے رہی ہیں جو کہ بہت خوش آئند بات ہے۔ ان شاء اللہ..... آپ کے تعاون سے آپ کا پاکیزہ اسی طرح روز افزوں ترقی کرتا رہے گا۔

اب اجازت چاہوں گی..... اللہ پاک آپ سب کو صحت وسلامتی سے شاد وآباد رکھے۔ بشرطِ صحت وزندگی اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گی۔

اللہ نگہبان، دعا گو عذرا رسول

☆☆☆

عزیز بہنو! آپ کی عذرا آپی تو ہر ماہ چاہتی ہیں کہ سب بہنوں کی تحریروں پر بات ہو..... سب کی خیریت دریافت کریں اور احوال پُرسی بھی کریں..... مجموعی طور پر وہ آپ سب کے لیے دعا گو رہتی ہیں فرداً فرداً نام لینا مشکل بلکہ کبھی، کبھی تو ناممکن ہو جاتا ہے۔ کبھی کسی بہن کو مخاطب کر لیا تو کبھی کسی کو، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کے پیغام سلام ان تک پہنچائے نہیں جاتے۔ وہ ہر پاکیزہ بہن سے واقف ہیں، میں یعنی آپ کی نزہت آپی..... تمام خطوط، فون کالز اور پیغامات کے متن ان تک ضرور پہنچاتی ہوں، اپنے ریگولر کالرز اور تبصرہ نگار دل کے ساتھ، ساتھ تمام خاموش قارئین کی رائے، خیالات اور پاکیزہ کے لیے پسندیدگی کی ہم سب نہایت قدر کرتے ہیں بلکہ نئی اور پرانی مطلب سینئر رائٹرز کی خیر خیریت کے لیے تو وہ ضرور فکر مند رہتی ہیں۔ جو بہنیں چند ماہ غیر حاضر ہو جائیں تو بھی فکر ہو جاتی ہے۔ یہ سطریں لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم آپ کو ہرگز نہیں بھولتے..... کسی کا تذکرہ کبھی ہونے سے رہ جائے تو آپ ناراض نہ ہوا کریں۔ جیسے ہماری پیاری امینہ عندلیب سلانوالی اب باقاعدگی سے حاضری نہیں دیتیں مگر ان کی دعائیں تو پاکیزہ کے ساتھ رہتی ہیں۔ اور ہم بھی انہیں دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں۔ اسی طرح سب بہنیں ہماری دعاؤں میں ہیں۔

بہنوں اگلے ماہ افشاں آفریدی کے ناول کی آخری قسط آئے گی، ان شاء اللہ۔ آپ لوگوں کی دلچسپی کے لیے دلشاد نسیم کے نئے ناول صراط عشق کی پہلی قسط اس ماہ شائع ہوئی ہے۔ یہ تحریر بھی آپ کو یقیناً پسند آئے گی۔ دلشاد نسیم جو ایک معروف ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈراما نگار ہیں اب پاکیزہ کے لیے خاص طور پر ناول لے کر آئی ہیں۔ جی پہلے اسی ناول کا عنوان دیں جنوں تھا جس کا اشتہار ماہ جون کے پاکیزہ میں لگایا تھا اب بوجوہ اسی ناول کا نام صراط عشق رکھا گیا ہے۔ پہلی قسط سے ہی یہ ناول آپ کی بھرپور توجہ حاصل کر لے گا۔ ان شاء اللہ.....

نایاب جیلانی کا ناول بھی اختتام پزیر ہے۔ چند ماہ میں ایک اور سینئر رائٹر اپنے تازہ ترین ناول کے ساتھ جلوہ افروز ہوں گی۔ نام صیغۂ راز میں ہے..... ٹھیک ہے ناں بہنو! اس کے ساتھ، ساتھ ہماری ہونہار، مشاق قلم کار اپنی مؤثر تحریروں سے مسلسل پاکیزہ کو نواز رہی ہیں اور قارئین محظوظ بھی ہو رہے ہیں۔ اچھا بہنو..... اب آپ کے پیارے، پیارے خطوط اور سرگرمیاں حاضر ہیں۔ حسب روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوصِ دل سے درود ابراہیمیؑ اور تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری و تبصرہ نگار، ثمینہ کوکب، جہلم کے بیٹے حافظ محمد سید حسن نے اس ماہ رمضان چوتھی دفعہ تراویح پڑھانے کی سعادت حاصل کی ہے۔ (بہت، بہت مبارک ہو اللہ پاک اس کے کار خیر میں بے پناہ اضافہ فرمائے، آمین)

☆ مستقل قاری و تبصرہ نگار نازنین آفریدی، پشاور کو اپنی سالگرہ کی بہت، بہت مبارک ہو۔ اللہ صحت و سلامتی سے رکھے۔ آمین!

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری تبصرہ نگار حدیث اختر، حاصل پور جو اب بہاول پور شفٹ ہو چکی ہیں کی پیاری بیٹی کی شادی کی سولھویں سالگرہ پر انہیں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اللہ پاک سب کی بچیوں کو شاد و آباد رکھے، آمین۔ حدیث اختر کے حوالے سے دوسری خوش خبری یہ ہے کہ ان کے پیارے بیٹے نیب کی سالگرہ بھی اسی ماہ ہے۔ نیب بے حد فرمانبردار ہے، ماشاء اللہ ہر ماہ ماں کو باقاعدگی سے خود ہی پاکیزہ لا کر دے دیتا ہے۔ (بہت خوب)

☆ معروف ادبی شخصیت، شاعرہ، کالم نگار، مصنفہ، قانون دان محترمہ سعدیہ ہما شیخ جو عرصہ دراز سے مختلف سماجی مسائل پر کھل کر کالم لکھ رہی ہیں اور جیل میں قید خواتین قیدیوں کے لیے اصلاحی کام بھی کر رہی ہیں اور انہیں باقاعدہ ہر ہفتہ تفسیر قرآن کا لیکچر بھی دیتی ہیں کو اب باضابطہ طور پر پنجاب بار کونسل جو وکلا کا آئینی ادارہ ہے کی جانب سے ڈسٹرکٹ سرگودھا کا جیل ریفارمز کمیٹی کا چیئرپرسن مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس پر تمام ادبی حلقے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سعدیہ ہما شیخ کو مبارک باد دیتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ اسی جوش و ولولے کے ساتھ نہ صرف قلم سے بلکہ عملی طور پر اصلاحی پروگرامز کو آگے بڑھائیں گی۔ (بہت مبارک ہو سعدیہ)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پاکیزہ کی سینئر رائٹر عنیزہ سید کے والد کی طبیعت بہت خراب ہے ان کے لیے دعائے صحت کی اپیل ہے۔

☆ پاکیزہ کی دیرینہ پرستار، شاعرہ، مصنفہ، مستقل تبصرہ نگار فریدہ جاوید فری، لاہور کے چھوٹے بھائی کی طبیعت ان دنوں

کافی ناساز ہے اور فریدہ کے شوہر کے لیے بھی ضرور دعائے صحت کریں۔
☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار فرخندہ جعفری، گجرات کی مکمل صحت یابی کے لیے ضرور دعا کیجیے۔
☆ نادیہ، راول پنڈی کے بیٹے کو بہنیں دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں..... وہ پیدائشی چھوٹی آنت کا مریض ہے جس کا آپریشن ہونا ہے۔ نادیہ اس سلسلے میں کافی پریشان رہتی ہیں۔
☆ جاسوسی ڈائجسٹ کی مدیرہ لبنیٰ خیال کی بڑی بہن ان دنوں کافی علیل ہیں ان کے لیے خصوصی دعائے صحت کی گزارش ہے۔
☆ سینئر رائٹر عذرا آفتاب، کراچی کے لیے مکمل صحت یابی کی دعا کی درخواست ہے۔
☆ ماہنامہ پاکیزہ کی دیرینہ پرستار روحانہ اقبال جو بھابیز بیوٹی سیلون کی سرپرست بھی ہیں ان دنوں شدید بیمار ہیں ان کے لیے خصوصی دعائے صحت کی التماس ہے۔
☆ رائٹر، شاعرہ، براڈ کاسٹر اور پاکیزہ کی پرستار سیما رضا کی بڑی بھابی کی طبیعت ان دنوں ناساز ہے۔
☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور قلم کار جیبنا کی والدہ محترمہ کی مکمل صحت یابی کے لیے بہنیں ضرور دعا کریں۔
☆ ہماری پیاری لاڈلی ہنس مکھ دوست، شاعرہ اور پاکیزہ کی مستقل قاری شگفتہ صفیق کو بہنیں اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھا کریں۔

انتقالِ پُرملال

☆ جاسوسی ڈائجسٹ کی مدیرہ لبنیٰ خیال کے بڑے بہنوئی محمد یونس مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔
☆ مستقل تبصرہ نگار اور مراسلہ نگار حدیث اختر، بہاول پور کے شوہر منیر احمد کی اس ماہ برسی ہے۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے، آمین!
☆ ماہر بیوٹیشن روحانہ اقبال کے شوہر مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے، پاکیزہ بہنوں سے دعائے مغفرت کی استدعا ہے۔
☆ پاکیزہ کی قاری معلمہ ناز ظفر کی بہترین دوست اور پڑوسن زرین حسنین ہارٹ فیل کے باعث انتقال کر گئیں۔
☆ مصنفہ عذرا آفتاب کی کزن سسٹر بدر ضائے ربی انتقال کر گئیں۔
☆ پچھلے دنوں عظمیٰ مشتاق، ناروال کو کئی صدمات جھیلنے پڑے پہلے ان کے بڑے جیٹھ کا انتقال ہو گیا پھر شفیق ماموں نے داعیِ اجل کو لبیک کہہ دیا..... بہنوں سے دعائے مغفرت کی استدعا ہے۔

☆☆☆

اب بہنوں آتے ہیں آپ کے پیارے، پیارے خطوط کی طرف۔

بعد شفا سعید، کوئٹہ سے۔ ''مئی کا شمارہ ہاتھ میں ہے، بہت خوب صورت ٹائٹل سے مزین پاکیزہ جگمگا رہا ہے۔ نزہت میم ایک زمانے میں پاکیزہ کے ٹائٹل پر موجود ماڈل شروع کے اندرونی صفحات پر بھی موجود ہوتی تھی، خوب صورت پوز کے ساتھ..... اب بھی کسی خاص نمبر کے موقع پر ماڈل اندرونی صفحات پر بھی ہو دلکش پوز کے ساتھ تو کیا بات ہوگی..... (تجویز پر غور کریں گے) اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف..... سب سے پہلے افشاں آفریدی کو پڑھا۔ افشاں آپی آپ کی تحریر کے لیے جتنی تعریف کروں کم ہے..... آپ نے دُرِ مکنون کا جو کردار لکھا ہے یہ بہت خاص ہے۔ میرے بہت قریبی مشاہدے میں ایک ایسی لڑکی موجود ہے جو اس طرح جنسی زیادتی کا شکار تو نہیں ہوئی پر محبت میں بہت بڑی ناکامی کے بعد وہ بالکل ایسی ہی بن گئی جیسی آپ نے دُرِ مکنون دکھائی ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے افشاں آپی کہ دُرِ مکنون کو آپ نے اس کمزور حالت سے طاقتور حالت میں بدلتے دکھانا ہے بے شک وہ عکرمہ کی محبت کی وجہ سے ہو لیکن آپ نے دُرِ مکنون کو اپنی پہلی حالت میں واپس پہنچانا ہے تاکہ ہمارے معاشرے میں کوئی بھی ایسی لڑکی جو کسی بھی وجہ سے نفسیاتی مسئلے کا شکار ہو وہ رہنمائی حاصل کر سکے اور آپی مجھے پچھلی اقساط تک دُرِ مکنون کی زاویار کے ساتھ جوڑی پسند تھی اور عکرمہ کے ساتھ نکاح کے بعد میری اس کہانی میں دلچسپی کچھ کم ہو گئی تھی پھر مئی کے شمارے میں آپ نے جو قسط لکھی ہے مجھے پہلی بار عکرمہ اور دُرِ مکنون کی جوڑی بے حد اچھی لگی ہے کیپ اٹ اپ..... (یہی تو اچھے رائٹر کی خوبی ہوتی ہے کہ قارئین کی نفسیات بھی پہچانتا ہے) دوسری تحریر جو میں نے پڑھی وہ ''میں عشق ہوں'' اُف نایاب جی آپ کیسے اتنا خوب صورت اور پیچیدہ لکھتی ہیں۔ مجھے ہمیشہ سے وہ تحریر بہت پسند آئی ہے جس میں کچھ پیچیدگی ہو۔ سیدھی، سیدھی تحریریں عموماً میری توجہ حاصل نہیں

کر پاتیں...... آپ کی تحریر یقیناً مدتوں یاد رہنے والی ہے۔ (جی درست کہا) افسانوں میں خوشبو اور بن اپنا چراغ تو پسند آئی۔ عنیزہ سید کی تحریر جب پڑھنا اسٹارٹ کی تو جانے کیوں ذہن میں یہ خیال آیا۔ ”بھلا اس تحریر میں خاص کیا ہوگا۔“ مگر پڑھتے، پڑھتے ایسا سحر طاری ہوا کہ اسے ایک ہی نشست میں ختم کرلیا۔ یہ ایک بڑی رائٹر کا ہی کمال ہوسکتا ہے کہ وہ ایک ماسی کے کردار کو بھی باقی ہر کردار پر حاوی دکھائے۔ کہانی کا سبق یقیناً یہ تھا کہ انسان اپنی حیثیت سے بڑے خواب نہ دیکھے۔ بڑے خواب بعض اوقات زندگی بہت مشکل بنا دیتے ہیں۔ عنیزہ سید یو آر گریٹ...... کچھ ماہ پہلے پریوں کا دیس...... مدیحہ شاہد کی پڑھی تھی اور اب تک کہانی کا مزیدار ٹیسٹ اپنے منہ میں محسوس کرتی ہوں (ہاہاہا) مدیحہ شاہد ویل ڈن...... نزہت میم میں نے اس پر بار تعریف ہی کی ہے پر یہ نہ سمجھیے گا کہ میں صرف تعریف ہی کر سکتی ہوں...... تنقید کی جہاں ضرورت ہوگی وہاں تعمیری تنقید بھی ضرور کروں گی۔ (جی بالکل تنقید تو بہتری کی طرف رہنمائی کرتی ہے) لیکن جائز تعریف بھی جائز ہے۔ بہت خوب صورت تحریریں منتخب کر کے پاکیزہ میں لگانا آپ کی اور آپ کی ٹیم کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہیں لہٰذا لکھاریوں کے ساتھ آپ کا اور آپ کی ٹیم کا بھی بہت شکریہ جو ہمیں گھر بیٹھے تفریح فراہم کرتے ہیں۔“ (آپ لوگوں کی ہر قسم کی رائے ہمارے لیے اہم ہے، بہت شکریہ شفا)

☜ ثمینہ کوکب، جہلم سے۔ ”مئی کا پاکیزہ اپنے خوب صورت سے ٹائٹل کے ساتھ تھوڑی تاخیر سے موصول ہوا۔ مجھے کچھ کہنا ہے، نزہت اصغر صاحبہ کی خوب صورت باتوں اور ماہ رمضان المبارک کی برکتوں، رحمتوں، فضیلتوں اور استغفار کی قبولیت کے ذکر کے ساتھ بہت اچھا لگا...... نزہت اصغر صاحبہ آپ کی ہر دعا پڑھ کر دل سے آمین ثم آمین کی آواز آئی۔ دین کی باتیں اور اسمائے گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایمان کو تر و تازہ اور روح کو سرشار کیا۔ شمع ہدایت میں اختر شجاعت صاحبہ کی تحریر بخل...... مذمت الٰہی ہمیشہ کی طرح دل میں گھر کر گئی۔ ہمیشہ ہی اختر شجاعت صاحبہ منفرد موضوع کا انتخاب کرتی ہیں۔ اللہ پاک ہمیں ہمیشہ بخل جیسی بیماری سے بچائے رکھے۔ آمین یارب العالمین...... بنت زیب ”انداز نو، میں عروج فاطمہ زہرا زیدی سے ملاقات اور ان کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ اظہار تعزیت، سیمار ضا ردا کا کنول نصیر صاحبہ اور حسینہ معین صاحبہ کے بارے میں پڑھ کر دل بہت غمزدہ ہوا۔ اللہ پاک ان دونوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ شائستہ زریں صاحبہ نا قابل فراموش سالگرہ اور سالگرہ کے پیغامات میں تمام مصنفات بہنوں کی عید لاک ڈاؤن کی یادیں بہت پسند آئیں۔ گوشہ ظرافت عطاالحق قاسمی صاحب کی تصنیف سے انتخاب بہت اچھا لگا۔ افشاں آفریدی اور نایاب جیلانی دونوں کے ناول بہت بہترین انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ دونوں ناولٹ عالیہ حرا، تیری زلف کے سر ہونے تک اور فوزیہ سرور صاحبہ کا غصیلی اور شرمیلی پسند آئے۔ عنیزہ سید صاحبہ کا مکمل ناول سانجھ بھئی چودیس بھی بہت اچھا لگا۔ مہکتی عید، قرۃ العین سکندر، کعبہ میرے پیچھے عائشہ تنویر، خوشبو انعم جمیل، وبا کے دن قرۃ العین خرم ہاشمی عید سرپرائز، اُم ارسلان، تعزیر وحد سعدیہ ہما شیخ، ایک دن کی دلہن' غزل مستوئی بن اپنا چراغ تو رو بینہ شاہین اور بلاعنوان فریحہ ماپارا صاحبہ غرض کے تمام افسانے اپنے، اپنے مقام پر بہترین تھے۔ اور ع عورت وو ہم...... میں فرحین اظفر صاحبہ نے عورت کہانی میں بہت اچھا لکھا۔ تازہ بہ تازہ سرگرمیوں میں تمام بہنوں کو ان کی خوشیوں پر مبارک باد...... عذرا آپی کی باتیں اپنی بہنوں سے بہت اچھی لگتی ہیں۔ بزم پاکیزہ میں انعام دینے کا شکریہ مگر ابھی تک انعام ملا نہیں ہے۔“ (جی آپ کو کتاب روانہ کردی گئی ہے۔ تبصرے کا شکریہ)

☜ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ”سرورق پر ہما خان بہت ہی پیارے حجاب میں بہت ہی پیاری لگ رہی تھیں۔ باجی، آپ نے اداریے میں درست فرمایا ہے کہ گزشتہ برس سے کورونا وائرس کے نتیجے میں جو بھی حالات پیدا ہوئے اس نے انسانی طرز فکر و نظر میں یقیناً ایک بڑا انقلاب برپا کیا۔ اس وبا نے ہمیں بہت کچھ سیکھنے پر مجبور کردیا ہے۔ اللہ اس وبا سے ساری دنیا کو چھٹکارا دے۔ دین کی باتیں اور شمع ہدایت پڑھ کر روح سرشار ہو جاتی ہے۔ پاکیزہ کے مہمان میں اس بار انعم فیاض اور اسد انور تھے ان کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ عذرا آپی نے اس بار کچھ باتیں اپنی بہنوں سے جو فرمایا۔ جی آپی جی! ہم آپ کی ہدایت پر عمل کر رہے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ فریدہ جاوید فری ان کے شوہر زاہدہ پروین کے شوہر کو تندرستی عطا فرمائے۔ غزالہ حیدر کو جنت میں جگہ دے۔“ (آمین)

☜ فرخندہ جعفری، گجرات سے۔ ”مئی کا پاکیزہ بہت عمدہ اور سبق آموز کہانیوں سے سجا عید کے حوالے سے کافی اچھی کہانیاں اور دیگر مواد پڑھنے کو ملا۔ تمام رائٹرز نے بہت محنت اور لگن سے کہانیاں پاکیزہ میں ڈال دیں اور پاکیزہ سج گیا۔ مہکتی عید قرۃ العین سکندر...... بیٹی جب کسی کے نام کردی جاتی ہے تو والدین اس وقت تک پریشان ہی رہتے ہیں جب تک وہ اپنے گھر کی نہیں

ہوجاتی۔ اس کہانی میں بھی لڑکی اور والدین اتنے عرصے تک پریشان ہی رہے جب تک بیٹی رخصت نہیں ہوئی مگر لڑکے کی اپنی مجبوریاں تھیں۔ بہنوں کو بیاہنے کا بوجھ تھا اس طرح بھی غلط فہمیاں ہوجاتی ہیں۔ آخر ارسل آہی گیا اور رضیہ کا گھر بس گیا۔ عید کی خوشیاں دوبالا ہوگئیں۔ خوشبو، انعم جمیل، انسان آخر ادھورا ہے، دولت مل گئی ہر طرف خوشیوں کا راج ہوا مگر ایک ایسی کمی رہ گئی جسے خدا کے علاوہ کوئی پورا نہ کرسکا۔ تمام کہانیاں اچھی سبق آموز اور نصیحت پکڑنے والی ہیں مگر تقریباً ہر کہانی میں کسی نہ کسی صورت میں عورت کو مجبور اور کم تر ہی دکھایا گیا ہے۔ آخر، ایسا کیوں ہے۔ عورت کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکے گی...... تاریخ بہادر اور زمانے سے مقابلہ کرنے والی عورتوں سے بھری پڑی ہے۔ کبھی ان کا ذکر بھی پاکیزہ میں کیا جائے تاکہ عورت کو کچھ ڈھارس ہی ملے۔ ہر طرف والدین کی مجبوری اور عورت اور بہن، بیٹی کو مظلوم ہی کردیا جاتا ہے۔ دل دُکھی ہوجاتا ہے۔ (بات تو آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں انہی مجبوریوں سے نمٹ کر عورت سرخرو ہوجاتی ہے آج کل معاشرے میں یہی سب پھیلا ہوا ہے اور زیادہ تر عورتیں خود اس کی ذمے دار ہیں۔) وبا کے دن، قرۃ العین خرم ہاشمی، اس وبا نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس وائرس نے ہمارے ذہنوں پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ مستحق لوگ تو سائڈ پر ہوگئے ہیں۔ فقیروں نے گھروں پر ڈاکا ڈالنا شروع کردیا ہے۔ روزانہ جوان عورتیں چھوٹے، چھوٹے بچوں کو لے کر گھر کے گیٹ پر بیٹھ جاتی ہیں اور اگر ایک کو پچاس یا سو دے دیں تو دوسری لڑنے مرنے پر تیار رہتی ہے۔ آج کل تو لاک ڈاؤن سے اتنا خوف طاری ہوگیا ہے کہ دروازہ کھولنے سے بھی خوف آتا ہے۔ غریبوں کے روزگار رکے ہوئے ہیں۔ تعلیم کا 100 فیصد حرج ہو رہا ہے، مہنگائی روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ شادیاں رکی ہوئی ہیں۔ عجیب افراتفری کا عالم ہے۔'' (یہ سب تو گزشتہ ڈیڑھ سال سے چل رہا ہے۔ مگر اسی میں تمام امور بھی انجام پارہے ہیں۔ اچھا ہے ناں ذرا سادگی بھی اپنائیں۔)

✍ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ''اس بار چمکتا دمکتا مہکتا پاکیزہ 30 تاریخ کو ملا اور دل کو خوش باش کر گیا۔ عید کی مناسبت سے سجے افسانے شاندار لگے۔ جیسے حمیرا شفیع کی عیدی بہترین تھی تو رعنا کوثر کا یہ پھیکا چاند بھی کسی سے کم نہیں لگا۔ اور خولہ سعید جاوید کے مدد کے فرشتے کے کیا کہنے اور جناب زرتاشیہ نعمان کا تیرے آنے سے معصوم سا افسانہ اچھا لگا۔ فرحین اظفر کی عورت کہانی کا تو جواب نہیں۔ ماشاء اللہ ان کی تو ہر کہانی خوب سے خوب تر ہوتی جارہی ہے۔ ان کا انٹرویو تو اب ضروری ہوگیا ہے کیا خیال ہے آپ کا (جی ہاں بالکل) اور ناولٹ میں ایلیا علی غفار کا ناول بچھڑے ہم سفر کی اسٹوری تو اچھی تھی مگر اس میں وہ بات نہیں تھی یعنی ایک چھوٹی سی بات کو کچھ زیادہ ہی بڑھا کر اتنے سال گنوا کر پھر ایک ہوجانا بس یہ سمجھیے کہ ان کے ناول نے کوئی خاص تاثر نہیں دیا۔ اور بھئی میں عشق ہوں تو سو پر ڈو پر جارہا ہے مگر اب بھی ہم ان کی اسٹوری کے پیچ وخم میں الجھے ہی رہتے ہیں۔ (دو زمانوں کی کہانی ہے، غور تو کرنا پڑے گا) میرا اسارا زنگ اتار دو کی کیا بات کریں۔ افشاں آفریدی سے عرض ہے پلیز دُرِمکنون کو بااعتماد اور بہادر بنائیں بیچارے عکرمہ پر رحم کریں مگر حقیقت میں بلاشبہ یہ دلکش ناول ہے اور فرح بھٹو کا حسین ناولٹ چاہ کی راہ میں دل کو بھا گیا۔ اگلی قسط کا نہایت بے چینی سے انتظار ہے۔ اس بار بھی بزم پاکیزہ میں پروین افضل شاہین کے سوالات مزیدار لگے۔ بھئی بہت خوب آپ کے پیا کی نجریا پڑوس کی چھوکریا پر اٹک گئی ہے اور محترمہ آپ خوش ہیں بھئی اپنے پیا کو راستہ نہ دکھائیں...... میں اکثر گنگناتی ہوں کہ اشعار خوب صورت ہوتے ہیں اور گوشۂ ظرافت ایک اچھا سلسلہ ہے مگر کبھی، کبھی انجم باجی کے جلترنگ بھی لگادیا کریں (جی ضرور مع معذرت کے) ساتھ خوش ذائقہ کے پکوان ہمیں ادھورے سے لگتے ہیں۔ (کیوں بھئی بڑی تفصیل سے تو سب کچھ بتاتے ہیں) ایک واقعہ بتاؤں گزشتہ ہفتہ ہم لوگ ناظم آباد والی بچوں کی معروف برانڈ کی شاپ گئے تھے مگر ہوا یوں کہ گاڑی سے اترتے ہی گن پوائنٹ پر کورونا ماسک ڈاکو بائیک پر آئے اور موبائل، والٹ وغیرہ چھین لیا۔ بیٹے سے گاڑی کی چابی بھی لے لی تھی مگر پھر پھینک کر دفع ہوگئے۔ میرا پرس تو محفوظ رہا مگر میرے بیٹے سے سب لے لیا۔ بس سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوگیا ہے اللہ تعالیٰ سب کو اپنی حفاظت میں رکھے اور ڈاکوؤں کو بھی ہدایت دے، آمین۔'' (اوہو بڑا افسوس ہوا...... شکر ہے اللہ نے جانیں بچائیں، اللہ پاک ان نوجوانوں کو ہدایت دے جو یہ فعل کررہے ہیں)

✍ سیدہ عیوق بخاری، فتح پور سے۔ ''میں آرٹیکل رائٹر اور شاعرہ ہوں۔ اب رسالوں کے لیے لکھنا چاہتی ہوں۔ میری کہانی سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہوچکی ہے۔ اب پاکیزہ کے لیے ایک انتہائی اہم موضوع پر کہانی لکھ کر بھجوا رہی ہوں اس اسٹوری میں ہلکے پھلکے انداز میں بتایا گیا ہے کہ کیسے لوگ کسی کے معمولی سے جسمانی نقص کی بنا پر اسے نظر انداز کرتے، اذیت

پہنچاتے ہیں اور اس کی اصل خوبیاں بھول جاتے ہیں۔ اپنے اردگرد چند واقعات دیکھ کر یہ کہانی لکھی ہے۔ یقین ہے کہ آپ اسے پاکیزہ میں ضرور شائع فرمائیں گے۔ آپ کی حوصلہ افزائی مجھے مزید لکھنے کی جرات دے گی۔'' (خوش آمدید، جی کہانی قابلِ اشاعت ہوئی تو ضرور لگے گی۔ تحریریں رائٹر کا تعارف ہوتی ہیں۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ)

❁ فریدہ افتخار، اسلام آباد سے۔ ''اس بار رسالہ عید کی چھٹیوں کے بعد ہی ملا۔ آہستہ، آہستہ مطالعہ کر رہی ہوں۔ الحمدللہ ..... کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مسلمان پیدا کیا ہے اور ہم اپنے پیارے حبیبؐ خدا کے اُمتی ہیں۔ جتنا شکر کیا جائے کم ہے..... رمضان شریف کی بابرکت سعادتیں تمام ہوئیں۔ شوال کے مہینے کے چھ روزوں میں بڑی برکت و ثواب ہے۔ امید ہے کہ خیرات و صدقات کا سلسلہ جو سارے رمضان جاری رہتا ہے۔ سارا سال جاری رہے گا۔ (جی بالکل) دل دکھی ہے، غمگین ہے، فلسطین کے باسیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ قبلۂ اول پر اغیار کی گندی نظریں ہیں۔ اللہ اس سخت امتحان میں مسلم امہ کو سرخرو کرے، آمین۔ (اللہ پاک تمام مسلمانوں کو متحد کرے، آمین) میرا سارا رنگ اتار دو اب ذرا شہرین اور زاویار کی زندگی کی گاڑی پٹری پر چل پڑی ہے اب مزید اسے امتحان میں نہ ڈالیں۔ میں عشق ہوں کو اب ختم کریں..... اس قدر طوالت کہ پہلے گزشتہ قسط کو دیکھنا پڑتا ہے۔ انتہائی بے تکی رفتار سے یہ ناول چل رہا ہے، اب میں نے اسے پڑھنا چھوڑ دیا ہے وقت کا زیاں ہی ہے۔ کم لکھا جائے اچھا اور دلچسپ لکھا جائے۔ (اصل میں ماضی و حال کی کہانیاں ہیں آپ تواتر سے پڑھتیں تو دلچسپی برقرار رہتی۔ خیر اپنی، اپنی پسند ہے) چھوٹے اور مختصر افسانے سارے ہی اچھے ہیں۔ تعزیر و حد سعدیہ ہما شیخ کی کہانی پسند آئی۔ شمیم فضل خالق ہمیشہ نیا موضوع لے کر آتی ہیں اور چھا جاتی ہیں۔ وہم پسند آیا..... وہم کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا..... اللہ پر توکل، بھروسا اور ایمان کی پختگی ہو تو وہم نہیں پالے جاتے بلکہ اللہ سے رجوع کر کے مدد مانگی جاتی ہے۔ نا کہ بابوں کے پاس جا، جا کر اپنا ایمان خراب کرنا..... کلام پاک میں ہر مشکل کا حل ہے۔ عید کے حساب سے مختصر افسانے اچھے لگے۔ عالیہ حرا کا ناولٹ تری زلف کے سر ہونے تک، آج کل کی میں ہر مشکل کا حل ہے۔ عید کے حساب سے مختصر افسانے اچھے لگے۔ عالیہ حرا کا ناولٹ تری زلف کے سر ہونے تک، آج کل کی بچیوں کے لیے ایک اچھا سبق ہے۔ آئیڈیل اور خوب تر کی تلاش بعض اوقات برباد کر دیتی ہے..... دور کے ڈھول سہانے والی بات ہے..... سچے رشتوں اور ہوائی رشتوں میں بڑا فرق ہے۔ مستقل عنوانات میں دین کی باتیں، پاکیزہ ڈائری اور بہنوں کی محفل میرے پسندیدہ کالم ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ..... خوش رہیں، خوش رکھیں۔'' (بہت نوازش تبصرے کے لیے ویسے دونوں ناول اب اختتام پزیر ہیں)

❁ آسیہ عامر، کراچی سے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ سمندر کو کوزے میں بند کر دیتی ہیں۔ ساری دنیا کی معلومات پر یشانیاں، دعائیں ایک صفحے پر سمیٹ کر سلیقے سے ہمیں پیش کر دیتی ہیں۔ اختر شجاعت صاحبہ کا مضمون عورت اس دفعہ پڑھ کر اپنے آپ میں شرمندگی محسوس ہوئی کہ جب ہم بازاروں میں جاتے ہیں تو مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں اور کچھ خواتین کا دوپٹا ہی غائب ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مضمون پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ (الٰہی آمین) میں نے اختر شجاعت صاحبہ کے مضامین سے بہت کچھ سیکھا ہے..... حمیرا اشفیع کا افسانہ عیدی پہلا افسانہ بے اختیار دل چاہا تبصرہ کرنے کو..... حمیرا آپ نے بہت اچھا لکھا ہے لگ نہیں رہا کہ پہلا افسانہ ہے۔ فرحین اظفر کا وہم اکثر ساسیں اس حالت میں بہوؤں سے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے وہم کا نام دے کر خوب پابندیاں لگاتی ہیں۔ زرتاشیہ نعمان کا تیرے آنے سے شاید ان کا دوسرا افسانہ ہے انہوں نے بھی بہت جاندار لکھا ہے۔ ہماری نئی رائٹرز بھی ماشاء اللہ بہت عمدگی سے شوق پورا کر رہی ہیں۔ بزم پاکیزہ میں شہلا نواز کے سوالوں سے بہت محظوظ ہوئے۔ اسما شاہد اور سلمٰی غزل صاحبہ کی بہنوں کی محفل میں بہت کمی محسوس ہوئی۔ (سلمٰی غزل آج کل امریکا کی سیریں کر رہی ہیں خیر سے) سعدیہ رئیس آپ کو نیا گھر بہت مبارک ہو اللہ تعالیٰ رحمتوں برکتوں والا کرے آپ کے لیے رہنا نصیب ہو، آمین۔ ذاتی طور پر پاکیزہ سے وابستہ رائٹرز کا انٹرویو بے حد پسند ہے۔ شائستہ زریں کے سروے میں ہماری فرح بھٹو اور ہما علی بہت کیوٹ لگ رہی ہیں اگر زندگی رہی تو اگلے ماہ ملاقات ہوگی۔'' (ان شاء اللہ)

❁ حدیث اختر، بہاول پور سے۔ ''کیسی ہیں آپ اور ہماری پاکیزہ ٹیم..... عذرا آپی اور ذکیہ آپا سب کو سلام کہیے گا۔ (جی سب کی طرف سے وعلیکم السلام اور احوال پرسی برابر ہے۔) 20 جولائی تک عید متوقع ہے تو سب کو عید قرباں مبارک..... اب تبصرہ او کھلے پینڈے لسیاں نے راہواں عشق دیاں..... پسندیدہ ترین..... مجھے کچھ..... میرے دل کی آواز..... شکر کی فریکوئنسی..... خوش

رہیں۔ نین عباس بہت اعلیٰ..... روحانی کی دعائیں فوٹو کاپی بانٹ دی ہیں۔ (جزاک اللہ) گوشۂ ظرافت، ابن انشا..... کیا کہنے..... بہنوں کی محفل، بہنوں نے خوب رنگ جمایا۔ قسط وار رسالے کی جان ہیں، کہانیاں اس بار سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ماں کے لیے گویا میرے جذبات تمثیلہ لطیف نے لفظوں میں پرو دیے۔ ثنائے خواجہ..... سباس گل نے ثنا کا حق ادا کر دیا..... سلامت رہو..... غزلیات خوب بہترین..... نرگس نسیم کلر نکی کا پودا اپنے بچپن کی روداد لگی..... اب تو عجب افراتفری مچی ہے ہر سو۔ آج ٹماٹو کیچپ بنایا ساتھ، ساتھ رسالہ بھی پڑھا کبھی ایسا کمبینیشن دیکھا؟'' (ارے یہ کمبی نیشن تو حدیث اختر کا ہی کمال ہے بس ایسی ہی تو باصلاحیت ہیں ہماری پاکیزہ بہنیں، مختصر تبصرے کا شکریہ۔)

✉ بینش ملک، مقام نامعلوم..... کہانی بھیج کر دو ماہ بعد اس کے بارے میں پوچھیں۔ صبح 11 سے پانچ کے درمیان فون کر لیا کریں۔ نمبر انہی صفحات پر دیے جاتے ہیں۔ پاکیزہ پر بھی اپنی رائے دیں۔

✉ عائشہ یوسف..... راول پنڈی..... پیاری بہنو آپ پاکیزہ پر تبصرہ بھی کیا کریں۔ آپ کی تحریر کا موضوع اچھا ہے مگر اندازِ بیاں رواں نہیں..... کہاں ڈائیلاگ ہے کہاں پیرا ہے۔ کہاں دوسرے کا مکالمہ ہے۔ اپنی لکھائی کی ٹیکنیکل خرابیوں کی طرف دھیان دیں اور تمام نئی لکھنے والیوں سے یہی گزارش ہے کہ صرف کہانی کا خلاصہ اچھا ہونا ضروری نہیں انداز تحریر اور بُنت بھی ہو۔

✉ دعا وسیم، مقام نامعلوم۔ آپ ایک ادھورا میسج کر کے پھر جوابی میسج ارسال نہیں کرتیں۔ پاکیزہ پڑھتی ہیں تو رائے بھی ضرور دیں۔ اور پیغام مکمل ارسال کیا کریں۔ اپنے نام اور شہر کے ساتھ۔

✉ عنبر وسیم، گوجرانوالہ۔ تمہاری مبارک بادیں پاکیزہ سالگرہ کے لیے مل گئیں۔ کافی عرصے بعد تم نے رابطہ کیا عید کی مبارک باد کا شکریہ..... اب تم باقاعدگی سے تبصرہ لکھو۔

✉ تہمینہ عباسی، بہاول پور۔ پاکیزہ پسند کرنے کا شکریہ، آپ کی کہانی جلد ہی شائع ہوگی۔ ان شاء اللہ قابلِ اشاعت ہے تو ضرور لگے گی۔

✉ انیسہ زینب، شیخوپورہ سے۔ ''میں بارہ سال سے لکھ رہی ہوں۔ مضامین اور مختصر کہانیاں وغیرہ میں کچھ مزاحیہ لکھنا چاہ رہی ہوں (جی ضرور لکھیں) کیا میں ای میل کر سکتی ہوں (جی بالکل کر سکتی ہیں۔ ایڈریس تو رسالے میں لکھا ہوتا ہے پھر بھی بتا دیتی ہوں jdpgroup@hotmail.com پاکیزہ کے لیے لکھ دیجیے گا۔) آج کل میرے پاس ٹائم بھی ہے اور آئیڈیاز بھی۔'' (ہاں تو فرصت کا فائدہ اٹھائیں اور لکھ ڈالیں۔ پاکیزہ پر رائے بھی دیں۔)

✉ گلشن، صوابی سے۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ آپ 11 بجے سے 6 بجے تک رسالے میں دیے گئے نمبروں پر بات کر سکتی ہیں۔ موبائل بھی لکھا ہے اور لینڈ لائن بھی..... میسج بھی کر سکتی ہیں۔

✉ مسرت عزت، شبقدر سے۔ ''آپ کے رسالے کی جتنی بھی تحاریر ہوتی ہیں وہ سب اس معاشرے کی اصلاح کرتی ہیں۔ آج کل زمانہ جس ڈگر پر چل نکلا ہے اس کے لیے یہ تحاریر کسی ٹانک کی طرح ہیں خاص طور پر ہماری خواتین اور جوان ہوتی بچیوں کے لیے..... اگر کسی تحریر سے کسی کو صحیح راستہ مل جائے کسی کی سوچ بدل جائے اور کوئی غلط راستے پر چلنے سے رک جائے منع ہو جائے تو یہ بہت بڑا کارِ خیر ہے۔ اب آتی ہوں تبصرے کی طرف۔ میرا سارا زنگ اتار دو، بہت زبردست جا رہا ہے سب سے پہلے پڑھا۔ افشاں آفریدی صاحبہ کو مشورہ ہے کہ زاویہ اور درمکنون کو آپس میں ملانے کی غلطی نہ کریں ورنہ ناول کا سارا رنگ، زنگ ہو جائے گا۔ اس کے بعد میں عشق ہوں بھی اچھی جا رہی ہے مگر عمامہ کا اتنا واویلا مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا اتنے بھرے پُرے گھر میں خود کو تماشا بنا دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ (آگے تو پڑھو دیکھو کیا ہوتا ہے) ع عورت دو ہم، بہت پُراثر تحریر رہی عورتوں کے وہم کے متعلق، واقعی بعض عورتوں میں یہ مرض بہت زیادہ ہوتا ہے مصنفہ نے بہت خوب صورت الفاظ میں سمجھایا ہے بے شک اللہ کی ذات حفاظت کرتی ہے اپنے بندوں کی پھر فضول وہم اور وسوسے کیوں کرتے ہیں لوگ؟ (درست کہا) تعزیر وحد، دل کو چھو لینے والی تحریر تھی، ساری باتیں سچی اور صحیح مگر ان سب باتوں کے باوجود ایک عورت اور وہ بھی بچوں والی عورت کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے زندگی گزارنا..... شوہر جیسا بھی ہو مگر عورت کے لیے سائبان ہوتا ہے۔ عورت مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ (رائٹر ایک سوچ دیتی ہے) سعدیہ جی معذرت، اپنی، اپنی سوچ کی بات ہے۔ سانجھ بھئی چودیس کے بارے میں یہی کہوں گی کہ انوکھا لاڈلا کھیلن کو

مانگے چاند، ہاجرہ بیچاری سادہ اور معصوم تھی مگر دانیال حسن کی بہن نے بہت چھوٹی ذہنیت کا ثبوت دیا۔ بہت دلچسپ تحریر تھی۔ شروع سے لے کر آخر تک اپنی گرفت میں رکھا۔ غصیلی اور شرمیلی...... بہت اچھی تحریر تھی۔ ہنسی بھی بہت آئی اور غصہ بھی بہت آیا کہ بعض لوگ اپنے نوکروں، خانساماؤں اور چوکیداروں پر اتنا آنکھ بند کر کے اعتماد کیوں کرتے ہیں۔ اور پھر بچوں کی بات پر توجہ بھی نہیں دیتے یقین بھی نہیں کرتے عجیب مائیں ہوتی ہیں بہر حال ہونے کو کیا نہیں ہوتا اس دنیا میں...... بلاعنوان...... بہت اچھی اور آنکھیں کھلواتی تحریر تھی۔ بعض اوقات والدین اپنے بچوں کے ساتھ اچھا کرنے کی کوشش میں برا کر جاتے ہیں۔ ویلڈن بہت اچھا لکھا۔ تیری زلف کے سر ہونے تک...... عالیہ حرا صاحبہ نے خاصے پرانے موضوع پر لکھا مگر بہت اچھا لکھا اور بہت اثر بھی کیا مجھ پر...... عالیہ حرا صاحبہ کی ہر تحریر زبردست ہوتی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو...... کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے والدین کے لیے ایک سبق آموز تحریر رہی بہت خوب صورت موضوع چنا عائشہ تنویر صاحبہ نے ویلڈن...... باقی سب تحاریر بھی بہت اچھی اور سبق آموز تھیں۔ عروج فاطمہ صاحبہ کا انٹرویو پڑھا اچھا لگا۔ شمع ہدایت کو دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ جزاک اللہ...... باقی سب سلسلے بھی زبردست رہے۔ حسن نکھار یے میں اس دفعہ بہت کام کی ٹپس تھیں۔“ (بہت شکریہ تفصیلی تبصرے کا۔)

✉ جبینا، کراچی سے۔”اللہ کے بعد آپ کا شکریہ، نوازش کرم، مہربانی کہ آپ نے مجھ ناچیز کو بہنوں کی محفل میں سب سے پہلے آنے کی اجازت دی۔ (یعنی پہلے نمبر کی بہن ہاہاہا بہت خوشی ہوئی۔ (سب بہنیں ہماری نمبر 1 ہیں آپ خوش ہو گئیں اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو گی۔) محفل میں اس بار خطوط کچھ کم لگے۔ (کبھی، کبھی صفحات کی تنگی آ جاتی ہے) بیماروں کو صحت ملے۔ پریشان حال لوگوں کی پریشانیاں دور ہوں اور خوشیاں ملنے والوں کو اللہ اور بھی خوشیاں اور مبارک باد قبول ہو۔ (الٰہی آمین) پھر آگے بڑھے پاکیزہ ڈائری کھولی بہت پسند آئی۔ حمد اور نعت کے علاوہ صبا نور، افتخار شوق اور شگفتہ شفیق کی شاعری اچھی لگی۔ میں اکثر گنگناتی ہوں میں کمال کا انتخاب تھا۔ ماشاء اللہ...... خوش ذائقہ میں چپلی کباب اور تندوری نان مزے دار رہے۔ اکٹھے ایک ہی جگہ جو مل گئے۔ (چلو اچھا ہوا تمہیں بھوک بھی تو لگ رہی تھی) انعم فیاض سے مل کر اچھا لگا بہت آئیڈیل کپل ہے۔ ان کا شہزادہ بھی بہت پیارا ہے ماشاء اللہ...... اللہ اس جوڑے کو حاسدوں کے شر سے بچائے اور خوشیاں سلامت رکھے آمین۔ اختر شجاعت صاحبہ کا مضمون بہت پُر اثر اور لاجواب رہا ہمیشہ کی طرح...... پڑھتے، پڑھتے وہ ساری عورتیں نظروں میں گھومتی رہیں جنہوں نے خاص طور پر اس کورونا کے ڈیڑھ سالہ خطرناک دور میں گھر کے اندر رہ کر اپنے گھر کی خوشحالی اور آسودگی میں اضافہ کیا اور تصویر کا دوسرا رخ وہ عورتیں بھی جو اس سارے وقت کو صرف عورت کے مقام کو تاریک بنانے پر تلی رہیں اور عورتوں کے ہاتھوں ہی کئی گھر بربادی کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ افسانوں میں چونکہ عیدی پہلے نمبر پر تھا تو وہی پڑھا۔ مزہ آ گیا۔ اگر بیٹیوں کے اس احساس کی ہی قدر کر لی جائے تو معاشرے میں فرسٹریشن بہت کم ہو جائے گی۔ جہاں بیٹے کہہ سن کر بھی نہیں سمجھ پاتے وہیں بیٹیاں بن کہے سمجھ جاتی ہیں۔ یہ پھیکا چاند میں بہت اچھا پیغام تھا، یہ شجاعت ہی تھا جسے بیوی ہر روپ میں اچھی لگتی رہی ورنہ تو اکثریت ایسے مردوں کی بھی ہے جو بیویوں کو گھر کی باسی دال کا نام دیتے ہیں۔ چاہ کی راہ میں چونکہ اینڈ میں باقی آئندہ تھا لہٰذا پورا بعد کے لیے رکھ دیا۔ مدو کے فرشتے عورت کہانی، اک تیرے آنے سے بہترین رہیں۔ شور اور آگہی سو، سو رہیں۔ تو تاج محبت کا...... جہاں نام ہی سپر رائٹر کا ہو تو اس کہانی کے کیا کہنے...... تعریف کے ڈھیر سارے الفاظ اس کہانی کے لیے لو جی رسالہ ہی ٹک گیا۔ اب لکھنے کو کچھ نہیں بچا۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔“ (بہت پیارے گہرے تبصرے کا شکریہ، اللہ تمہارے مسائل بھی حل کرے، الٰہی آمین)

✉ سیدہ صائمہ کاظمی، آپ سے عرض ہے شہر کا نام بھی ضرور لکھا کریں۔ پہلے چھوٹی کہانیاں ارسال کریں تا کہ آپ کا طرزِ تحریر دیکھا جا سکے۔

✉ روبینہ شاہین، مقام نامعلوم۔”امید ہے کہ آپ سب صحت اور ایمان کی بہترین حالت میں ہوں گے۔ میرا افسانہ بن اپنا چراغ تو مٹی کے پاکیزہ ڈائجسٹ میں لگا۔ جس کے لیے آپ سب کی تہہ دل سے ممنون ہو۔ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا اور اپنے موقر جریدے میں جگہ دی...... شکریہ......“ (اس شکریے کے ساتھ پاکیزہ پر بھی رائے دیں۔ تحریر اچھی اور مختصر ہو تو فوراً ہی لگتی ہے)

✉ نیر تحیم خان، کراچی سے۔”میں بہت خوش ہوں اتنی کہ بتا نہیں سکتی...... آپ نے میرے خط کا جواب اتنے پیار اور اپنائیت سے دیا کہ روح تک سرشار ہو گئی۔ دل میں اتنی توانائی بھر گئی کہ وہ تو بھاگنے لگا۔ مجھے بہت زیادہ اچھا لگا۔ میری تحریر زیرِ

pklibrary.com

مطالعہ ہے یہ بات کافی ہے۔ باقی انتظار ہم کرلیں گے۔ اور پھر سونے پر سہاگا یہ کہ دنی کوڈ میں لکھ کر دے سکتی ہوں مثال کے طور پر جیسے یہ خط ہے۔ کیا اس طرح لکھ کر بھیج دوں..... جواب ضرور دیجیے گا۔" (جی ضرور بھیجیں ای میل ایڈریس تو مسلسل دیا جاتا ہے)

بھ مسکان نور، لاڑکانہ سے۔ "السلام علیکم نزہت آپی..... میرا سارا رنگ اتار دو ماشاء اللہ افشاں آفریدی آپی بہت زبردست لکھ رہی ہے۔ اس کی ہر قسط لاجواب ہوتی ہے۔ میں پاکیزہ پڑھتی ہی اس کہانی کی وجہ سے ہوں..... یہ سب سے بیسٹ اسٹوری ہے۔ اور ہاں میری بہن کو آپ کے پاکیزہ کی کہانیاں بہت پسند آرہی ہیں۔" (بہت شکریہ پیاری بیٹی، آپ کی دو کہانیاں قابلِ اشاعت ہیں جو سال چھ ماہ میں ان شاء اللہ لگ جائیں گی۔ امید پر دنیا قائم ہے ٹھیک ہے ناں)

بھ سمارا انعم بھٹی، ڈیرہ غازی خان سے "آپی جون کا شمارہ خلافِ توقع جلد ملا جبھی پڑھ کر تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ آگے بڑھے مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ ہمیشہ کی طرح پُراثر انداز میں نظر آئیں خاص طور پر آخر میں شعر کا انتخاب لاجواب تھا۔ (بہت نوازش) دین کی باتیں اور قیصرہ حیات کی کتاب سے اقتباس بہت انمول ہوتا ہے۔ بہنوں کی محفل میں اپنی کمی بے حد محسوس ہوئی۔ حمیرا شفیع کو افسانہ شائع ہونے پر بہت، بہت مبارک باد۔ باقی کہانیوں میں مکمل ناول شبینہ گل کا گریٹ تھا۔ عورت کہانی میں کیا کہوں فرحین اظفر سے ایمپریس ہوں۔ سلسلے وار ناول بہتر جارہے ہیں لیکن اب ہمیں افشاں آفریدی صاحبہ کا ناول محظوظ نہیں کر پاتا بہرکیف اس مرتبہ ناولٹس میں فرح بھٹو چھائی ہوئی تھیں۔ ماشاء اللہ..... (اب تو ناول اختتام پر ہے یہی تو کلائمکس کی قسطیں ہیں) افسانے اکثر عید کے حوالے سے تھے جبکہ عید گزرے کافی دن ہوگئے ہیں خیر پھر بھی اچھے تھے۔ (عید کی تحریریں دو ماہ چلتی ہیں) مستقل سلسلوں میں شمع ہدایت پڑھتے عورت مارچ ذہن میں گردش کرتا رہا۔ انٹرویو انعم اور اسد کا بہت پسند آیا۔ بہت پیاری جوڑی ہے ماشاء اللہ.....! گوشہ ظرافت میں آل ون انشا جی موجود تھے بے ساختہ دل سے دعا نکلی..... ماشاء اللہ.....!" (تبصرے کا شکریہ، دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

بھ محل سعدی آرائیں، گولارچی سے۔ "دعا گوں ہوں کہ اللہ رب العزت سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھتے ہوئے ناگہانی مصیبتوں کورونا کی تباہ کاریوں اور لاک ڈاؤن کی خجل خواریوں سے محفوظ رکھے..... (آمین) تین نٹ کھٹ بچوں کی ماں، اپنی لکھائی کا خواب بالائے طاق رکھ کر ان میں مصروف ہوجاتی ہے، بڑی محنت مشقت سے طاق سے اتار کر عید نمبر کے لیے کہانیاں لکھیں اور تب تک رمضان آچکا تھا۔ سو اگلے عید نمبر کے لیے پھر سے طاق پر رکھ دی ہیں۔ اب یہ چند تحریریں معرکہ سر کر کے لکھ کر بھیج رہی ہوں....." (ضرور بھیجیں آپ نے تو لکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ان شاء اللہ کہانیاں قابلِ اشاعت ہوئیں تو ضرور لگیں گی۔ تھوڑا انتظار تو کرنا پڑتا ہے)

بھ وردہ بخاری، اسلام آباد سے۔ "سب پاکیزہ بہنوں کو سلام اور دعائیں..... سب سے پہلے میں پاکیزہ اور ان تمام بہنوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے میرے مختصر سے افسانے کو قبولیت کی سند بخشی۔ خطوط میں اپنا ذکر پڑھ کر سیروں خون بڑھ گیا۔ (جی ایسا ہی ہوتا ہے وردہ، ہمارے قارئین اچھی تحریر سراہتے ہیں) اب آتے ہیں اپریل کے شمارے کی طرف تو خوب صورت ٹائٹل بہار کے رنگوں سے مزین تھا۔ سب سے پہلے افسانے پڑھے ... ہمیشہ کی طرح شاہدہ ذاکر، طاہرہ بختیار، عائشہ خان نے اچھا لکھا۔ پھانس، شمیم فضل خالق نے بہت مضبوط عورت دکھائی۔ عورتوں کو ایسے ہی سمجھ دار اور معاملہ فہم ہونا چاہیے۔ وہ ہجر جو ہم کو لازم تھا، شیریں حیدر نے بہت کمال کا لکھا اور اختتام بھی بہترین....." (آپ کی کہانیاں موصول ہوچکی ہیں بس آپ اسی طرح تحریر کرتی رہیں اور رائے بھی ضرور دیں)

بھ فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی سے۔ "جون کا اداریہ بے حد پسند آیا۔ آپ نے بہت حقیقت پسندانہ باتیں کی ہیں۔ بہن اختر شجاعت تو ہمیشہ ہی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اس بار عورت پر لکھا مقالہ بہت عمدہ تھا۔ ہمارا معاشرہ جس طرف جارہا ہے ضروری ہے کہ اس بارے میں سوچا جائے اور عمل کیا جائے۔ (بے شک) اختر بہن کے لیے خصوصی شکریہ..... ناول دونوں اچھے جارہے ہیں۔ خاص کر نایاب جیلانی کے ناول میں اس بار بہت لطف آیا۔ بہت سے رازوں سے پردہ اٹھ گیا۔ نرگس نسیم نے نیکی کا پودا لکھ کر ہم کو نیکی کرنے اور نیکی کی ترغیب کرنے کی یاددہانی کی ہے۔ بہت اچھا لکھا ہے۔ جزاک اللہ..... فرحین اظفر کی عورت کہانی پسند آئی۔ خولہ سعید کی کہانی مدد کے فرشتے بہت اچھی لگی۔ بہت سبق آموز کہانی ہے..... سچ ہے دوسروں کی مدد کرنے پر خدا ضرور ہماری مدد کرتا ہے۔

بچھڑے، ہم سفر ناولٹ اچھا تھا کہ انا کے چکر میں پڑ کر انسان اپنوں کو کھو دیتا ہے۔ نشا وقار اور عروج لبنیٰ قدیر دونوں نئے نام ہیں مگر دونوں کی مختصر کہانیاں پسند آئیں۔ بہت سبق آموز ہیں۔ شگر کی فریکوئنسی پڑھ کر بڑا لطف آیا۔ بہت سی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ کتنی آسانی سے ہم اپنی زندگی میں خوشیاں لا سکتے ہیں۔ (بالکل ٹھیک کہا) خاص کر اقتباسات میں نگینہ ضیا بنگش، زرینہ خانم لغاری، فصیحہ آصف خان اور پروین افضل شاہین کی چیزیں بہت پسند آئیں۔ نظموں میں صبا نور، افتخار شوق کی کاوشیں پسند آئیں۔ روحانی ڈاک بہت پُر اثر معلوم ہوئی۔ عمل کرنا شرط ہے۔ گوشۂ ظرافت میں انشا کی باتوں نے خوب لطف دیا۔" (فریدہ آپا مختصر تبصرے کا شکریہ...... آپ کی شاعری وقتاً فوقتاً لگتی رہتی ہے)

✉ صبا بٹ، لاہور سے۔ "خط آپ کو میل کر رہی ہوں بھائی پوسٹ آفس جا کے پوسٹ نہیں کرواتا اس لیے پلیز شامل کر کے شکریہ کا موقع دیجیے گا، میں کم و بیش بیس سال سے پاکیزہ کی مستقل قاری ہوں اور اپنی پیدائش سے بھی پہلے کی تحاریر بھی پڑھ چکی ہوں، اللہ پاک آپ کو سلامت رکھے اور آپ کے ادارے کو مزید ترقی دے، آمین کوئی تحریر کبھی مس نہیں کی شاعری کے عروض کی کلاس لے چکی ہوں۔ میری یہ دونوں غزلیں انعام یافتہ قرار پائی ہیں سوچا اپنے پسندیدہ ماہنامے میں بھی ارسال کروں اور اس خوشی کو یادگار بناؤں امید ہے کہ آپ مایوس نہیں کریں گی۔" (خوش آمدید پیاری صبا، آپ پورے رسالے پر تبصرہ بھی بھیجیں، یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ باقاعدگی سے پاکیزہ پڑھتی ہیں آپ کی شاعری بھی چھپ جائے گی ان شاء اللہ)

✉ شاہدہ تحقین مقام نامعلوم میسج کرتے ہوئے اپنا نام اور شہر کا نام ضرور لکھا کریں...... آپ پاکیزہ پڑھتی ہیں اور اسی میں لکھنا بھی چاہتی ہیں تو آپ کو اندازہ تو ہوگا کہ کس طرح کی کہانیاں، افسانے چھپتے ہیں اور رائٹر کیسی متاثر کن تحریریں دیتی ہیں۔ کوشش کریں مختصر کہانی لکھ کر ارسال کر دیں...... رسالے پر اپنی رائے بھی ضرور دیں۔

✉ آسیہ پری وش، مقام نامعلوم۔ آپ جگہ کا نام بھی لکھا کریں...... کہانی اردو ان پیج میں کمپوز کر کے بھیجیں۔ ایم ایس آفس پر بھی بھیج سکتی ہیں۔ ہو سکے تو صاف لکھائی میں مسودہ بھیج دیں کہانی کی ایک کاپی اپنے پاس بھی ضرور رکھیں۔ ناقابلِ اشاعت تحریریں واپس نہیں کی جاتیں...... پاکیزہ پر رائے بھی ضرور دیں۔

☆☆☆

اجازت لینے سے پہلے ایک گزارش کر دیں کہ ماہِ اگست میں یوم آزادی اور ساون کے لحاظ سے نگارشات شامل ہوں گی۔ ماہِ ستمبر میں بھی یوم دفاع پاکستان ہے اور پھر ماہ نومبر میں آپ کا پسندیدہ دلہن نمبر آرہا ہے۔ جو بہنیں، بیٹیاں اپنے بڑوں سے اجازت لے کر اپنی شادی کی تصاویر شائع کروانا چاہتی ہیں وہ ہمیں بھیج دیں۔ شادی یا منگنی وغیرہ کے احوال بھی بھیجیں اور دیگر نگارشات، مراسلات، شاعری وغیرہ بھی...... چیزیں کئی ماہ پہلے بھیج دیا کریں...... ایک بات کی وضاحت اور کر دیں کہ ہر موقع پر ہر ایک کی تحریر نہیں لگ سکتی سب کو موقع دینا ہوتا ہے۔ اگر عید پر فلاں بہن کی کہانی لگتی رہی تو بہت سی بہنیں خفا ہو سکتی ہیں لہٰذا سارا سال کہانیاں بھیجتی رہیں کبھی نہ کبھی لگ ہی جائیں گی آپ کی تحریروں سے ہی ان صفحات کی زینت ہے۔

بہت ساری دعاؤں کے ساتھ اب اس ماہ کے لیے محفل برخاست کرتے ہیں۔ اللہ پاک ہم سب پر اپنا لطف و کرم، جود و سخا، عنایات و فضل جاری و ساری رکھے۔ ہمارے پیارے وطن کو اس بلائے ناگہانی سے نجات دلا دے۔ تمام اُمت مسلمہ اور پوری دنیا میں امن و سکون کا دور دورہ ہو، ہم سب کا خاتمہ ایمانِ کامل پر فرما، الٰہی آمین...... یارب العالمین......!

خیر اندیش،

نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783, 021-35802552 EXT 110

پاکیزہ ڈائری

آمنہ حماد

حمدِ ربِ ذوالجلال والاکرام

اک نگاہِ لطف پُر تاثیر کر
عشق میں اپنے مجھے نخچیر کر
نام لکھ اپنے غلاموں میں مرا
یوں مجھے بھی صاحبِ توقیر کر
تیری رحمت دیکھ کر دیکھے ہیں خواب
ان حسیں خوابوں کی کچھ تعبیر کر
موت سے بدتر ہوئی ہے زندگی
زندہ رہنے کی کوئی تدبیر کر
اسم ہو رطب اللسان مالک ترا
ذکر کو اپنے مری جاگیر کر
دیکھتے رہ جائیں جو دیکھیں مجھے
اپنی رحمت یوں مری تقدیر کر
پُر خطا تہذیب ہے بندہ ترا
در گزر اس کی اب ہر اک تقصیر کر

کلام: راؤ تہذیب حسین تہذیب
پسند: سباس گل، رحیم یار خان

نعت رسول مقبولؐ

کس بات کی کمی ہے مولا تیری گلی میں
دنیا تری گلی میں عقبیٰ تیری گلی میں
جامِ سفال اس کا تاجِ کہنشہی ہے
آجائے جو بھکاری داتا تیری گلی میں
دیوانگی پہ میری ہنستے ہیں عقل والے
تیری گلی کا رستہ پوچھا تری گلی میں
سورج تجلیوں کا ہر دم چمک رہا ہے
دیکھا نہیں کسی دن سایہ تری گلی میں
موت اور حیات میری دونوں ترے لیے ہیں
مرنا تری گلی میں جینا تری گلی میں
امجد کو آج تک ہم ادنیٰ سمجھ رہے تھے
لیکن مقام اس کا پایا تری گلی میں

انتخاب: ماہ نور، بہارہ کہو

عقیدت نامہ

تیرا نام لیا میں نے جب بھی لیا
روشنی ہو گئی..... ہر جگہ روشنی
گھپ اندھیروں میں تھی یہ میری زندگی
چاندنی ہو گئی..... ہر جگہ چاندنی
اتنے سجدے کیے ہر کنجر نے کیے
جگ منور ہوا..... ہر جگہ روشنی
یوں مزمل ہوا یوں مدثر ہوا
چاند تارا ہوا..... ہر جگہ روشنی
کہیں غارِ حرا میں ہیں خیر الوراؐ
فرش پہ ہو گئی ہر جگہ روشنی

عقیدت گزار: جینا، کراچی

مفہوم حدیث

نیکی کے علاوہ کوئی چیز بھی عمر میں اضافہ نہیں کرتی۔ اور دعا کے سوا کوئی چیز تقدیر نہیں بدل سکتی۔ اور انسان کو رزق سے محروم کرنے والی چیز ناشکرا پن اور اس کی بداعمالی ہے۔

(سنن ابن ماجہ، حدیث ۹۰)

سنہری کرنیں

☆ منزلیں چاہے کتنی ہی اونچی کیوں نہ ہوں راستے ہمیشہ پیروں کے نیچے ہوتے ہیں۔

pklibrary.com

☆ جہاں پانی بہتا ہے وہاں سبزہ اگتا ہے اور جہاں اشکِ ندامت بہتے ہیں وہاں رحمتِ الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔

☆ سننے کی بہترین آوازوں میں ایک بہترین آواز ''انسانی ضمیر'' کی بھی ہے۔

☆ جو ظلم کے ذریعے عزت چاہتا ہے اللہ اسے انصاف کے ذریعے ذلیل کرتا ہے۔ (قول حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

☆ نیک اعمال کا ایک ذرہ بھی ضائع نہیں جائے گا حتیٰ کہ راستے سے پتھر اور کانٹے صاف کرنا یا چیونٹیوں کو غذا دینا، یا چاہے زبانی کلامی مخلصانہ مشورہ ہی دے دینا۔ یہاں تک کہ دل میں نیکی کا صرف ارادہ ہی باندھ لینا۔

مرسلہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

قابل غور

☆ مخلص تعلق تو چھتری ہے جو ذہنی جسمانی جذباتی غم کے آگے شیشہ بن کر ڈھال کا کام کرتا ہے۔

☆ اکثر اوقات سچ کڑوا نہیں بلکہ سچ بولنے کا انداز کڑوا ہوتا ہے۔

☆ ہماری آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب ہماری آنکھیں طبعی طور پر بند ہونے والی ہوتی ہیں۔

☆ ندامت دل کا درد ہے اور پاک و صاف زندگی کی صبح.....

☆ منفی انسان کو ہر موقع میں مشکل نظر آتی ہے اور مثبت انسان ہر مشکل میں ایک موقع دیکھتا ہے۔

☆ کامیابی یہ ہے کہ لوگ اچھے الفاظ میں یاد کریں چاہے وہ موت سے پہلے ہو یا بعد میں۔

☆ سنجیدگی اتنی بھی نہیں ہو کہ وہ بداخلاقی یا تکبر میں شمار ہو جائے۔

از: فرخندہ، ملتان

حج ایک اہم رکن اسلام

حج کے لفظی معنی قصد وارادہ کے ہیں۔ دین اسلام میں اور اصلاح شریعت میں حج سے مراد عبادت کی نیت سے ایام حج میں بیت اللہ کی زیارت کو جانا اور مناسک حج ادا کرنا ہے۔

حج کی اہمیت

حج دین اسلام کا اہم ترین رکن ہے، حج کی فرضیت کا اعلان قرآن پاک میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ:

''اور لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ ہر وہ شخص بیت اللہ کا حج کرے جو زادِ راہ کی طاقت رکھتا ہو اور جس نے (اللہ کی دی ہوئی استطاعت کے باوجود حج نہ کیا اور) کفر کیا تو یقیناً اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔'' (سورۂ آل عمران، آیت 97)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

''جو زادِ راہ پر قدرت رکھتا ہو، بیت اللہ تک پہنچنے کی سواری بھی اسے میسر ہو اور اس کے باوجود حج نہ کرے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔''

حج ایک ایسی عبادت ہے جس میں تمام عبادات کی حقیقت کی بھرپور جھلک نظر آتی ہے۔ ہر عبادت کا جوہر اور روح اس میں زندہ و تابندہ نظر آتی ہے اس میں نماز بھی ہے، روزے کا مجاہدہ اور مشقت بھی ہے۔ زکوٰۃ سے بدرجہا زائد مثالی ایثار بھی ہے اور جہاد کی طرح ایک سپاہیانہ زندگی کی جھلک بھی ہے۔

حج ذریعہ مغفرت و نجات:

حج کا اہم ترین فائدہ اور برکت گناہوں کی آلودگی سے نجات ہے۔ بشرطیکہ کسی کو حج کامل نصیب ہو جائے جسے اصطلاح حدیث میں ''حج مبرور'' کہتے ہیں۔

از: شازیہ ہاشم میوانی، ضلع قصور

مسلمان عورت

آنکھوں میں بندگی سے نگاہیں جھکا کے چل
شانوں سے گر گیا دوپٹا اٹھا کے چل
قوموں کی زندگی تیری آغوش میں پلی

قوموں کی زندگی کا مقدر جگا کے چل
آنکھوں کے تیر تیرے بدن سے پرے رہیں
شرم و حیا کو اپنا لبادہ بنا کے چل
گر ہو سکے تو سیرتِ زہراؓ پہ کر عمل
اس زندگی کو یوں نہ تماشا بنا کے چل
بن جا شعارِ عظمت اسلاف کا نشاں
ہر اک گناہ سے دامنِ عصمت بچا کے چل
مانا ہوا خراب ہے ماحول تجھی غلیظ
گر ہو سکے تو ساتھ نہ اس ہوا کے چل

کاوش: زرینہ خانم لغاری، مظفر گڑھ

پار جانا

مجھے کنارے کی کب ہے تمنا
تجھے ہے دریا کے پار جانا
بپھرتے دریا کی بپھری موجیں
بتا رہی ہیں
خراج مانگے گا تم سے دریا
جو میری مانو تو ایسا کر لو
مجھے شریکِ سفر بنا لو
خراج مانگے گا جو تم سے دریا
مجھے بھنور میں اتار جانا
کہ
تیرا ضروری ہے پار جانا

کاوش: فرخندہ جعفری، گجرات

پریشانی

ایک دفعہ جہاں نہ زیب صاحب اپنے دوست خرم سے ملنے ان کے دفتر گئے۔ ابھی خرم نے ان کے لیے چائے منگوائی ہی تھی کہ بارش شروع ہوگئی۔ جہاں زیب بڑے مضطرب سے نظر آئے۔ خرم کے پلے کچھ نہ پڑا کہ بارش ہونے سے جہاں زیب اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ بالآخر خرم نے پوچھ ہی لیا۔

جہاں زیب صاحب نے کہا۔ ”آپ کی بھابی صدر گئی ہوئی ہیں اور بارش شروع ہوگئی۔“

”تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے..... وہ کوئی بچی تو نہیں ہیں کہ بارش میں بھیگ جائیں گی، بارش سے بچنے کے لیے کسی نہ کسی شاپنگ مال میں چلی جائیں گی۔“ خرم نے تسلی دی۔

”یہ ہی تو پریشانی کی بات ہے۔“ جہاں زیب صاحب نے جیب پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ساجدہ ظفر، کمالیہ

گھر کا راستہ

بڑے میاں کی وفات کے بعد بڑھیا کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے..... سب ہی محلے داروں، ہمسایوں نے بہت تسلی دی۔ ایک نے پوچھ لیا کہ اتنا غم کس بات کا..... بڑھیا روتے ہوئے بولی۔

”اے میری بہنو! میں کیا کروں..... میں تو اس لیے رو رہی ہوں کہ موت نے اب گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے۔“

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

وجہ

عروبہ، احمد سے۔ ”آپ کب مجھ سے شادی کریں گے؟“

احمد نے کہا۔ ”میں جلد ہی تم سے شادی کرلوں گا بس ذرا اپنے گھر والوں کو راضی کرلوں.....“

عروبہ نے شرماتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کے گھر میں کون، کون ہے؟“

احمد نے سادگی سے کہا۔ ”اور کوئی نہیں بس میری بیوی، ساس اور پانچ بچے ہیں۔“

☆☆☆

میرے شہر کے لوگ

جھوٹ کا لبادہ اوڑھے چھپتے پھرتے ہیں میرے شہر کے لوگ
واسطے روٹی کے لباسِ انا کو چیرتے پھرتے ہیں میرے شہر کے لوگ
نہیں مطمئن، نہ آسودہ کوئی اپنے خیالات سے
ہوسِ زر میں بکتے پھرتے ہیں میرے شہر کے لوگ

نفسا نفسی میں کٹ رہی ہے حیاتِ نا پائدار
کُو بکو خاک چھانتے پھرتے ہیں، میرے شہر کے لوگ
تلاشِ رزقِ حلال عین عبادت ہے مگر
کالا دھن کھوجتے رلتے پھرتے ہیں میرے شہر کے لوگ
الوداع کہا پچھلے برس ماں نے بوقتِ سحر جسے
بھکاری بن گیا تو اسے تکتے پھرتے ہیں میرے شہر کے لوگ
نہ ہوگا انجام بخیر، سب جانتے ہیں وہ.....
بے نشاں راہوں پر چلتے پھرتے ہیں میرے شہر کے لوگ
ہیں تنہا ہم اور ملتا کوئی ہمنوا نہیں عظمیٰ
حادثے، آہیں بیچارگی یوں مرتے پھرتے ہیں میرے شہر کے لوگ

از: عظمیٰ مشتاق، نارووال

دعا

ایک شخص دعا مانگ رہا تھا۔ ''یا اللہ! کھانے کو روٹی دے، پہننے کو کپڑا دے، رہنے کو مکان دے، عزت اور آسودگی کی زندگی دے۔''

یہ دعا سن کر ایک بزرگ بولے۔ ''میاں! یہ بھی کوئی مانگنے کی چیزیں ہیں کچھ اور مانگا کر۔''

''بابا جی! آپ کیا مانگتے ہیں؟''

''میں؟ میں یہ چیزیں نہیں مانگتا، میں تو کہتا ہوں اللہ! مجھے ایمان دے نیک عمل کی توفیق دے۔''

بابا جی.....! آپ ٹھیک دعا مانگتے ہیں، انسان وہی چیز تو مانگتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی۔''

مرسلہ: سیدہ اریبہ، کراچی

مطالعے کے فوائد

۱۔ وقت اچھا بسر ہوتا ہے۔ اداسی، بے چینی اور تنہائی کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔ دین و دنیا کی باتوں، نئی ایجادات و ضروریات سے واقفیت مل جاتی ہے۔

۳۔ ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ بول چال میں اعتماد اور پختگی آجاتی ہے۔

۵۔ بات نہایت پُراثر بن جاتی ہے، علم میں اضافہ ہو جاتا ہے اور طبیعت میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

۶۔ قاری مستقل مزاج بن جاتا ہے۔ قوت فیصلہ میں پختگی آجاتی ہے۔

۷۔ دھوکا نہیں کھا سکتا، ہر بات مثالوں اور دلیلوں سے سمجھا سکتا ہے اور انسان کے نظریات میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور انسان روشن خیال بن جاتا ہے۔

۸۔ اللہ پاک کی قدرت اور فطرت کے نئے، نئے راز کھلتے ہیں۔

۹۔ آنے والے امتحانات اور انٹرویوز کی اچھی طرح تیاری ہو جاتی ہے۔

۱۰۔ محنت کا جذبہ اجاگر ہوتا رہتا ہے۔

مرسلہ: حورا فاطمہ، کراچی

ہائے بے اعتماد

ایک ہاتھی روزانہ جنگل کے اس حصے سے گزرتا جس حصے میں چیونٹیاں رہتی تھیں۔ وہ چیونٹیاں اس ہاتھی کی وجہ سے بہت پریشان تھیں کیونکہ ہاتھی کے گزرنے کی وجہ سے ان کا بہت نقصان ہو جاتا تھا۔

ایک دن دو چیونٹیوں نے اس سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک تجویز سوچی۔ وہ دونوں ایک درخت پر چڑھ گئیں اور ہاتھی کا انتظار کرنے لگیں۔ جیسے ہی ہاتھی درخت کے نیچے سے گزرا تو ایک چیونٹی نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ دوسری نے اوپر سے کہا۔

''مسل دے کہیں بھاگ ہی نہ جائے۔''

مرسلہ: عظمیٰ ناز، کراچی

معصومیت

گپو میاں سے کسی نے سوال کیا۔ ''بیٹے تمہیں کون سے پرندے پسند ہیں؟''

گپو میاں نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ ''جی بھنے ہوئے تیتر بٹیر۔''

مرسلہ: علی رضا، لاہور

بقرہ عید آئی ہے

رویت والوں نے نوید سنائی ہے
بقرہ عید آئی ہے بقرہ عید آئی ہے

منڈی میں جب جھانک کے دیکھا
بکروں کی قطار نظر آئی ہے
غربا بھی گوشت کھائیں گے
سب نے دل میں آس لگائی ہے
جن بچوں کا نہیں سہارا اس دنیا میں
ان کے سنگ ہم نے عید منائی ہے
سب مل جل کر عید مناؤ
روٹھے ہوؤں کو بھی مناؤ دل سے یہ آواز آئی ہے
کاوش: حمیرا انجم وحید، واہ کینٹ

اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اے عشق ہمیں برباد نہ کر، ہم بھولے ہوؤں کو یاد نہ کر
پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم، تو اور ہمیں ناشاد نہ کر
قسمت کا ستم ہی کم تو نہیں، یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر
یوں ظلم نہ کر بیدار نہ کر اے عشق ہمیں برباد نہ کر
جس دن سے ملے ہیں دونوں کا سب چین گیا آرام گیا
چہروں سے بہار صبح گئی آنکھوں سے فروغ شام گیا
ہاتھوں سے خوشی کا جام چھٹا، ہونٹوں سے ہنسی کا نام گیا
غمگیں نہ بنا ناشاد نہ کر اے عشق ہمیں برباد نہ کر
وہ راز ہے یہ غم، آہ جسے پا جائے کوئی تو خیر نہیں
آنکھوں سے جب آنسو بہتے ہیں آ جائے کوئی تو خیر نہیں
ظالم ہے یہ دنیا دل کو یہاں بھا جائے کوئی تو خیر نہیں
ہے ظلم مگر فریاد نہ کر اے عشق ہمیں برباد نہ کر
مرسلہ: شبنم میر، سیالکوٹ

غزل

ہے دلِ مضطرب کی حالت بیان سے باہر
جیسے ہے زمین کا ملن آسمان سے باہر
تیرے حسن کا قصیدہ ہو کس طرح مکمل
چاند رہ نہیں سکتا کہکشاں سے باہر
ڈال دیے تم نے در دل پہ قفل
مکیں کس طرح جائے اب مکان سے باہر
تیری کج ادائی کا فقط شکوہ کیا تھا
پچھتا رہے ہیں حرف وہ زباں سے باہر
فیصل درد کی پیمائش کب ہوسکی؟
فاصلہ اس قدر کہ میرے گماں سے باہر
نقصاں جو بھی ہو احساس غم نہیں
دلوں کے سودے ہیں سود و زیاں سے باہر
جستجو اسی کی ہے قلب و نظر کو
رہتا ہے جو میرے دل ناداں سے باہر
کاوش: فصیحہ آصف خان، ملتان

کرکٹ اور مشاعرہ

مشاعرہ کا بھی تفریح ”ایم“ ہوتا ہے
مشاعرہ بھی تو کرکٹ کا گیم ہوتا ہے
وہاں جو لوگ کھلاڑی ہیں، وہ یہاں شاعر
یہاں جو صدر نشیں ہے، وہاں ہے ایمپائر
وہاں ریاضِ مسلسل سے کام چلتا ہے
یہاں گلے کے سہارے کلام چلتا ہے
وہاں بھی کھیل میں ”نو بال“ ہو تو فاؤل ہے
یہاں بھی شعر میں ”اہمال“ ہو تو فاؤل ہے
وہاں سے ”ایل بی ڈبلیو“ یہاں یہ چکر ہے
کہ عندلیب مونث ہے یا مذکر ہے
وہاں بھی صرف مقدر کا کھیل ہوتا ہے
جو ”ان لکی“ ہے یہاں وہ بھی فیل ہوتا ہے
وہاں ہے ایک ہی کپتان پوری ٹیم کی جان
یہاں ہر ایک پلیئر بجائے خود کپتان
شاعر: دلاور فگار
انتخاب: ثوبیہ راجپوت، سیالکوٹ

قرض

اب مجھ کو تم سے شکوہ نہیں
تمہاری سرد نگاہوں کا
بے وجہ کی جفاؤں
کیونکہ چکا ڈالا قرضہ
تم نے سب خطاؤں کا
چاندرات میری پلکوں پہ اپنے لب رکھ کے
کاوش: ہما علی...... اسلام آباد

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆جبینا ..... کراچی
مرے سرکار کے نقشِ قدم شمع ہدایت ہیں
یہ وہ منزل ہے جس کو مغفرت کا راستہ کہیے
جب انؐ کا ذکر ہو دنیا سراپا گوش بن جائے
جب انؐ کا نام آئے مرحبا صل علیٰ کہیے

☆سپاس گل ..... رحیم یار خان
زندگی بھر دکھ اٹھائے آخرش
موت سر پہ رقص فرمانے لگی
زندگی اس وقت چھینی موت نے
جب ہمیں اس کی سمجھ آنے لگی

☆ثمینہ کوکب ..... جہلم
وہی محفوظ رکھے گا زمانے کی بلاؤں سے
جو بارش میں شجر سے گھونسلے گرنے نہیں دیتا

☆ماہین مسعود ..... کمالیہ
وقت رہتا نہیں کہیں ٹک کر
اس کی عادت بھی آدمی سی ہے

☆زرینہ خانم لغاری ..... مظفر گڑھ
بنیاد تک رہی نہ خدایانِ وقت کی
فرعون سا بھی نیل میں غرقاب ہوگیا

☆فاطمہ ..... پنجاب
جھیل سی اپنی طبیعت ہے ذرا سی بات پر
ذہن میں الفاظ جم جاتے ہیں کائی کی طرح

☆ریحانہ سعدیہ ڈوگر ..... ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ
ایک ہی شہر میں اتنی بارش ٹھیک نہیں
آؤ ہم تم بانٹ لیں آنکھوں کی برسات

☆فردوس رشید ..... لاہور
سب فسانے ہیں دنیا داری کے
کس نے کس کا سکون لوٹا ہے
سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں
میں بھی جھوٹا ہوں تو بھی جھوٹا ہے

☆ایمن زرناب ..... کمالیہ
دھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے، کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

☆ایمن فاطمہ ..... رائے ونڈ
تم بہت جاذب و جمیل سہی
زندگی جاذب و جمیل نہیں
مت کرو بحث ہار جاؤ گی
حسن اتنی بڑی دلیل نہیں

☆زرینہ خان ..... بہارہ کہو
شاہ کے نام پر کھیلے ہے پیادہ بازی
یہ تماشا سرِ دربار بہت ہوتا ہے

☆ثوبیہ راجپوت ..... سیالکوٹ
رکھ دیے سرکارؐ کے قدموں میں سلطانوں نے سر
سرورِ کون و مکاں کی سادگی اچھی لگی

☆مسعودہ حمید ..... لاہور
دھجیاں دامن کی پہلے ہی نمایاں تھیں عارفؔ
کچھ نئے الزام بھی اب مرے سر آنے لگے

☆ساجدہ ظفر ..... کمالیہ
گونگے بنے رہے تو سب ہی مانتے تھے بات
بولے تو ہم کسی کو بھی قائل نہ کر سکے

☆کرن ناز ..... فیصل آباد
مر رہے ہیں یہاں وہاں انساں
آدمی کا ضمیر سوتا ہے
ظالموں کی دراز رسی ہے
حق کا پھر امتحان ہوتا ہے

☆شفا سعید ..... کوئٹہ
تم ہر وقت اس طرح میرے دل میں رہتے ہو
دنیا کہتی ہے مجھ پر آسیب ہے کوئی

pklibrary.com

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆جبینا......کراچی
مرے سرکار کے نقشِ قدم شمعِ ہدایت ہیں
یہ وہ منزل ہے جس کو مغفرت کا راستہ کہیے
جب انؐ کا ذکر ہو دنیا سراپا گوش بن جائے
جب انؐ کا نام آئے مرحبا صلِ علیٰ کہیے

☆سپاس گل......رحیم یار خان
زندگی بھر دکھ اٹھائے آخرش
موت سر پہ رقص فرمانے لگی
زندگی اس وقت چھینی موت نے
جب ہمیں اس کی سمجھ آنے لگی

☆ثمینہ کوکب......جہلم
وہی محفوظ رکھے گا زمانے کی بلاؤں سے
جو بارش میں شجر سے گھونسلے گرنے نہیں دیتا

☆ماہین مسعود......کمالیہ
وقت رہتا نہیں کہیں ٹک کر
اس کی عادت بھی آدمی سی ہے

☆زرینہ خانم لغاری......مظفر گڑھ
بنیاد تک رہی نہ خدایانِ وقت کی
فرعون سا بھی نیل میں غرقاب ہوگیا

☆فاطمہ......پنجاب
جھیل سی اپنی طبیعت ہے ذرا سی بات پر
ذہن میں الفاظ جم جاتے ہیں کائی کی طرح

☆ریحانہ سعدیہ ڈوگر......ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ
ایک ہی شہر میں اتنی بارش ٹھیک نہیں
آؤ ہم تم بانٹ لیں آنکھوں کی برسات

☆فردوس رشید......لاہور
سب فسانے ہیں دنیا داری کے
کس نے کس کا سکون لوٹا ہے
سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں
میں بھی جھوٹا ہوں تو بھی جھوٹا ہے

☆ایمن زرتاب......کمالیہ
دھوپ میں نکلو، گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے، کتابوں کو ہٹا کر دیکھو

☆ایمن فاطمہ......رائے ونڈ
تم بہت جاذب و جمیل سہی
زندگی جاذب و جمیل نہیں
مت کرو بحث ہار جاؤ گی
حسن اتنی بڑی دلیل نہیں

☆زرینہ خان......بہارہ کہو
شاہ کے نام پر کھیلے ہے پیادہ بازی
یہ تماشا سرِ دربار بہت ہوتا ہے

☆ثوبیہ راجپوت......سیالکوٹ
رکھ دیے سرکارؐ کے قدموں میں سلطانوں نے سر
سرورِ کون و مکاں کی سادگی اچھی لگی

☆مسعودہ حمید......لاہور
دھجیاں دامن کی پہلے ہی نمایاں تھیں عارف
کچھ نئے الزام بھی اب مرے سر آنے لگے

☆ساجدہ ظفر......کمالیہ
گونگے بنے رہے تو سب ہی مانتے تھے بات
بولے تو ہم کسی کو بھی قائل نہ کر سکے

☆کرن ناز......فیصل آباد
مر رہے ہیں یہاں وہاں انساں
آدمی کا ضمیر سوتا ہے
ظالموں کی دراز رسی ہے
حق کا پھر امتحان ہوتا ہے

☆شفا سعید......کوئٹہ
تم ہر وقت اس طرح میرے دل میں رہتے ہو
دنیا کہتی ہے مجھ پر آسیب ہے کوئی

pklibrary.com

☆عرشیہ جنید......کراچی
عجب اصول ہیں اس کاروبارِ دنیا کے
کسی کا قرض کسی اور نے اتارا ہے
نہ جانے کب تھا کہاں تھا مگر یہ لگتا ہے
یہ وقت پہلے بھی ہم نے کبھی گزارا ہے
☆مریم بنت کاشف......حیدرآباد
ہر دم دنیا کے ہنگامے گھیرے رکھتے تھے
جب سے تیرے دھیان لگے ہیں فرصت رہتی ہے
بنتے بنتے ڈھے جاتی ہے دل کی ہر تعمیر
خواہش کے بہروپ میں شاید قسمت رہتی ہے
☆صبا نور......لیہ
جس طرح لکھی گئی اپنے لہو میں ڈوب کر
عہدِ حاضر میں کوئی بھی داستاں ایسی نہیں
جس نے اپنے لاڈلے وارے نہ ہوں کشمیر پہ
وادیٔ کشمیر میں کوئی بھی ماں ایسی نہیں
☆مہرین کنول......کراچی
اس بحرِ حوادث میں اے دل ساحل کی تمنا کیا معنی
جس موج سے کشتی ٹکرادوں وہ موج ہی ساحل ہوجائے
☆ثمینہ......پنجاب
ہر گام پہ منزل کا پتا دینے لگے ہیں
دھوکے مجھے نقشِ کفِ پا دینے لگے ہیں
اے موت نہ پونچھ اب میرے ماتھے کا پسینہ
وہ خود مجھے دامن کی ہوا دینے لگے ہیں
☆فرخندہ جعفری......گجرات
اپنی تنہائی مرے نام پہ آباد کرے
کون ہوگا جو مجھے اس کی طرح یاد کرے
دل عجب شہر کہ جس پہ بھی کھلا در اس کا
وہ مسافر اسے ہر سمت سے برباد کرے
☆نگینہ ضیا......کراچی
کسے خبر ہے کہ کیا رنج و غم اٹھاتے ہیں
تراش کر جو زباں کو قلم اٹھاتے ہیں
قرار داد محبت کو کب کی فتح ہوئی
فریق آج یہ کیسی قسم اٹھاتے ہیں

☆صائمہ سجاد بنگش......کوہاٹ
یہ ابرِ کرم دھوئیں گے اب کیا مرے آنسو
دھبا کوئی اب دامنِ عصیاں میں رہا بھی
☆فصیحہ آصف خان......ملتان
یہی تو ہوگا کہ طرزِ جفا بدل جائے
اگر وہ راہ پہ آبھی گیا تو کیا ہوگا
وہ حال پوچھ تو لے تم بھی کہہ سکوگے تقی
زباں پہ آنہ سکا مدعا تو کیا ہو گا
☆رعنا مشتاق......سرگودھا
مہرباں ہو کے سنو تم تو بڑی بات نہیں
مختصر سا تو محبت کا بیاں ہوتا ہے
☆شبانہ نواز......لیہ
نوائے عشق پہ پابندیاں ہیں کچھ لازم
زباں پہ بات کوئی دل کی لا نہیں سکتا
بدل چکے ہیں قوانین بزم یوں کوئی
شکایتیں تو کجا لب ہلا نہیں سکتا
☆نادیہ......راول پنڈی
پتھر ہو کہیں تم تو کہیں خار بہت ہو
جس روپ میں ہو باعثِ آزار بہت ہو
غیروں کا بھی غم رکھتے ہو تم دل میں ہمیشہ
کہنے کو تو تم میرے وفادار بہت ہو
☆فریدہ افتخار......اسلام آباد
وہ راستہ ہی کیا کہ جو ہموار ہی رہے
لطفِ سفر کبھی، کبھی دشوار بھی رہے
مانا کہ ایک وقت مقرر ہے موت کا
لیکن جو باشعور ہے تیار ہی رہے
☆ثوبیہ ظہور......ضلع اٹک
خدا کرے کہ بہت جلد ختم ہوجائے
یہ اک حجاب جو دونوں کے درمیاں ہے ابھی
☆ماہین......ٹوبہ ٹیک سنگھ
تو اپنی شیشہ گری کا ہنر نہ کر ضائع
میں آئینہ ہوں مجھے ٹوٹنے کی عادت ہے
☆☆☆

منتخب غزلیں

قتیل شفائی شاعری کی دنیا کا ایک بڑا مقبول و معروف نام... اس ماہ اسی شاعر کے یومِ وفات کی مناسبت سے ان کا منتخب کلام حاضر ہے۔

وہ شخص کہ میں جس سے محبت نہیں کرتا
ہنستا ہے مجھے دیکھ کے نفرت نہیں کرتا

پکڑا ہی گیا ہوں تو مجھے دار پہ کھینچو
سچا ہوں مگر اپنی وکالت نہیں کرتا

کیوں بخش دیا مجھ سے گنہ گار کو مولا
منصف تو کسی سے بھی رعایت نہیں کرتا

گھر والوں کو غفلت پہ سبھی کوس رہے ہیں
چوروں کو مگر کوئی ملامت نہیں کرتا

کس قوم کے دل میں نہیں جذباتِ براہیم
کس ملک پہ نمرود حکومت نہیں کرتا

دیتے ہیں اجالے مرے سجدوں کی گواہی
میں چھپ کے اندھیرے میں عبادت نہیں کرتا

بھولا نہیں میں آج بھی آدابِ جوانی
میں آج بھی اوروں کو نصیحت نہیں کرتا

انسان یہ سمجھیں کہ یہاں دفن خدا ہے
میں ایسے مزاروں کی زیارت نہیں کرتا

دنیا میں قتیلؔ اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی جو تارا تو زمیں پر نہیں گرتا

گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا
لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گرتا

سمجھو وہاں پھل دار شجر کوئی نہیں ہے
وہ صحن کہ جس میں کوئی پتھر نہیں گرتا

اتنا تو ہوا فائدہ بارش کی کمی کا
اس شہر میں اب کوئی پھسل کر نہیں گرتا

انعام کے لالچ میں لکھے مدح کسی کی
اتنا تو کبھی کوئی سخن ور نہیں گرتا

حیراں ہے کئی روز سے ٹھہرا ہوا پانی
تالاب میں اب کیوں کوئی کنکر نہیں گرتا

اس بندۂ خوددار پہ نبیوںؑ کا ہے سایہ
جو بھوک میں بھی لقمۂ تر پر نہیں گرتا

کرنا ہے جو سر معرکۂ زیست تو سن لے
بے بازوئے حیدرؓ درِ خیبر نہیں گرتا

قائم ہے قتیلؔ اب یہ مرے سر کے ستوں پر
بھونچال بھی آئے تو مرا گھر نہیں گرتا

24 دسمبر 1919ء تا 11 جولائی 2001ء

pklibrary.com

خوش ذائقہ

شگفتہ یاسمین

پیاری بہنو! خوش ذائقہ کے ان صفحات میں ہم آپ کے لیے معروف میزبان اور شیف شگفتہ یاسمین کے تیار کردہ کھانوں کی تراکیب بعنوان امی کی ریسیپی لے کر آئے ہیں۔ اس عید پر یہ خصوصی پکوان ضرور تیار کریں (مدیرہ)

اسپیشل بہاری کباب

اشیا: پسندے کا گوشت، ایک کلو۔ پیاز، (کچی پسی ہوئی) ایک عدد (چھوٹی) نمک، حسبِ ذائقہ۔ لال مرچ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ گرم مسالا پاؤڈر، ڈیڑھ کھانے کا چمچ۔ (گرم مسالے بنانے کے لیے دار چینی، کالی مرچ، سفید زیرہ، کالا زیرہ، چھوٹی اور بڑی الائچی ملا کر بھون لیں اور پیس لیں۔ بہاری کباب کے لیے یہ مسالا خاص اسی ترکیب سے بنتا ہے۔)

سرسوں کا تیل، ایک کپ۔ دہی، آدھا کپ۔ ادرک پیسٹ، آدھا چائے کا چمچ۔ پپیتا، (پسا ہوا) ایک چائے کا چمچ۔

ترکیب: پسندوں کو دھو کر اچھی طرح خشک کر لیں۔ سب سے پہلے اس پر نمک، ادرک، پپیتا اور دہی لگا کر برتن کو ڈھک کر رکھ دیں۔ اس کے بعد پیاز، گرم مسالا، پاؤڈر لگا کر رکھیں۔ اس میں سرسوں کا تیل، لال مرچ پاؤڈر لگا کر رکھ دیں۔ سیخوں پر پسندے لگائیں (رولنگ شکل میں) اور کوئلے پر سینک لیں یا گرل کر لیں۔ پیاز اور سلاد کے ساتھ گرم، گرم سرو کریں۔

سوئٹ اینڈ ساور چکن بالز

اشیا: چکن قیمہ، ایک کلو۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ ادرک، ایک ٹکڑا۔ لہسن کے جوے، تین عدد۔ بریڈ سلائس، دو عدد۔ ہری مرچیں، تین عدد۔ ہرا دھنیا، آدھی گڈی۔ سفید زیرہ (کٹا ہوا)، ایک چائے کا چمچ۔ انڈا، ایک عدد۔ (پھینٹا ہوا) پیاز (چوپڈ) ایک عدد۔ سویا سوس، ایک کھانے کا چمچ۔ پیپریکا پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ تیل، فرائنگ کے لیے۔

سوئیٹ ساس بنانے کے لیے ضروری اشیا

چلی گارلک ساس، ایک چوتھائی کپ۔ شہد آدھا کپ۔ لہسن ادرک کا پیسٹ، ایک چائے کا چمچ۔ سرکہ، آدھا کپ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ سفید مرچ، آدھا چائے کا چمچ۔ لیموں کا رس، ایک چوتھائی کپ۔ تیل، تین کھانے کے چمچ۔

ترکیب: چکن قیمے میں نمک، ادرک، لہسن، بریڈ سلائس، ہری مرچیں، ہرا دھنیا، زیرہ، پیاز اور پیپریکا پاؤڈر مکس کر کے چوپر میں ڈال کر پیس لیں۔ پیالے میں نکال کر اس میں انڈا اور سویا ساس مکس کر کے بالز بنا لیں۔ گرم تیل میں فرائی کر کے پلیٹ میں نکال کر رکھیں۔ اب سوئٹ ساس بنانے کے لیے پین میں تیل گرم کر کے لہسن، ادرک، چلی گارلک، شہد، نمک، سفید مرچ، سرکہ، لیموں اور چکن بالز ڈال کر ایک منٹ پکائیں اور سرو کریں۔

شاہی ٹماٹر گوشت

اشیا: گوشت، آدھا کلو۔ پیاز، (باریک کاٹ لیں) ایک عدد۔ تیل، آدھا کپ۔ ثابت زیرہ، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ زیرہ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ سرخ مرچ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ ہری مرچ، چھ عدد۔ ہلدی پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ ٹماٹر، کٹے ہوئے ڈیڑھ پاؤ۔ ادرک، پیسٹ، ایک چائے کا چمچ۔ لہسن پیسٹ، ایک چائے کا چمچ۔ ہرا دھنیا کے پتے، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: تیل گرم کریں اور پیاز فرائی کر لیں۔ ثابت زیرہ ڈال کر فرائی کر لیں۔ اس کے بعد نمک، سرخ مرچ، ہلدی، ادرک، لہسن شامل کر کے اچھی طرح فرائی کر لیں۔ کچھ دیر بعد گوشت ڈال کر اچھی طرح فرائی کر لیں۔ پھر ٹماٹر ڈال کر بھونیں۔ پانی ڈال کر اس وقت تک پکائیں کہ گوشت آدھا گل جائے۔ آخر میں ہرا دھنیا اور ہری مرچ شامل کر دیں۔ نان کے ساتھ سرو کریں۔

ہمیشہ یاد رکھیں امی کی ریسیپی کیونکہ یہی ہے راز ہوم

pklibrary.com

شیف بننے کا۔

کشمیری چانپ

اشیا: چانپ، چھ عدد۔ سونٹھ، ایک چائے کا چمچ۔ لہسن، چار سے پانچ جوے۔ دار چینی، دو سے تین ٹکڑے۔ بیسن، ایک کپ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ جاوتری، ایک ٹکڑا۔ سرخ مرچ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ سونف، ایک چائے کا چمچ۔ الائچی، تین عدد۔ دہی، ایک کپ۔ دودھ، دو کپ۔ تیل، تلنے کے لیے۔ لونگ، تیز پات، زیرہ حسبِ ضرورت۔

ترکیب: چانپ کو بھیگے ہوئے کپڑے سے صاف کر کے ہلکا سا چھیل کر رکھ لیں۔ باریک کپڑے میں سونٹھ، سونف، دار چینی، الائچی، لونگ، تیز پات، زیرہ، جاوتری ڈال کر پوٹلی بنالیں۔ ایک دیگچی میں چانپ، دودھ، نمک اور مسالے کی پوٹلی ڈال کر دھیمی آنچ پر پکائیں۔ چانپیں گل جائیں اور دودھ خشک ہوجائے تو مسالے کی پوٹلی نکال لیں بصورتِ دیگر تھوڑا سا دودھ اور ڈال دیں۔ لہسن پیس کر چانپوں کو لگادیں۔ دہی میں نمک، سرخ مرچ ڈال کر پھینٹیں اس کے بعد بیسن بھی ڈال دیں اور اچھی طرح پھینٹ لیں۔ فرائی پین میں تیل گرم کریں چانپ بیسن کے آمیزے میں ڈبو کر فرائی کریں۔ دونوں طرف سے سرخ ہوجائے تو نکال لیں اور سرو کریں۔

از: زرینہ خان، بھارہ کہو

کوفتہ بریانی

اشیا: قیمہ، آدھا کلو۔ پیاز، ایک عدد۔ لہسن، ادرک پیسٹ، آدھا چائے کا چمچ۔ بیسن، ایک کھانے کا چمچ۔ لال مرچ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ گرم مسالا پاؤڈر، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ ہری مرچیں، دو عدد۔ ہرا دھنیا، آدھی گٹھی۔ تیل، حسبِ ضرورت۔

چاول کے لیے

چاول (ابال لیں)، آدھا کلو۔ پیاز، دو عدد۔ (باریک سلائس کاٹ لیں) لہسن، ادرک پیسٹ، آدھا چائے کا چمچ۔ زرد رنگ، حسبِ ضرورت۔ بریانی ایسنس، حسبِ ضرورت۔ ٹماٹو پیسٹ، آدھا کپ۔ تیل، حسبِ ضرورت۔ ہری مرچیں، پانچ، چھ عدد۔ (موٹی، موٹی کاٹ لیں)

ترکیب: چوپر میں قیمہ، پیاز، ہرا دھنیا، ہری مرچیں اور لہسن ادرک کا پیسٹ ڈال کر اچھی طرح باریک پیس لیں۔ اس میں بیسن، نمک، لال مرچ پاؤڈر اور گرم مسالا پاؤڈر شامل کر کے بالز بنالیں فرائی پین میں تیل گرم کر کے کوفتے فرائی کر کے ٹشو پیپر پر نکال لیں۔ ایک پتیلی میں تیل گرم کر کے پیاز ساتے فرائی کریں۔ لہسن، ادرک کا پیسٹ ڈال کر فرائی کریں۔ کوفتہ اور ٹماٹو پیسٹ ڈال کر چھ سے آٹھ منٹ تک پکائیں۔ علیحدہ دیگچی میں چاول اور کوفتے کی لیئر لگا کر اس میں زرد رنگ، بریانی ایسنس اور ہری مرچیں چھڑک کر دم پر رکھ دیں، سرونگ ڈش میں نکال کر ہری مرچ اور ٹماٹر سے گارنش کر کے سلاد اور رائتے کے ساتھ سرو کریں۔

از: سنبل ملک، شاہدرہ

تکونے پسندے

پسندے، آدھا کلو۔ تیل، حسبِ ضرورت۔ پیاز، دو عدد۔ لہسن، ایک پوتھی۔ لال مرچ، تین چائے کے چمچ۔ خشک دھنیا، تین چٹکی۔ گرم مسالا (پسا ہوا)، دو چائے کے چمچ۔ ہرا دھنیا، ایک گڈی۔ دہی، آدھا پاؤ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: آدھی پیاز، لہسن، دھنیا اور نمک یہ مسالا پانی کے ساتھ پیس کر رکھ لیجیے...... پھر تیل کو پتیلی میں ڈال کر...کڑکڑائیں اور اس میں آدھی پیاز کے لچھے ڈال کر انہیں سرخ کرنے کے بعد پتیلی سے نکال کر الگ رکھ لیں۔ اب پسا ہوا گرم مسالا تیل میں ڈالیں اور اسے بھوننا شروع کردیں تا کہ مسالا جلنے نہ پائے ورنہ سالن کا شوربہ کڑوا ہوجائے گا جب مسالا سرخ ہوجائے اور تیل چھوڑنے لگے جس میں مرچوں کے رنگ جیسی سرخی آ گئی ہو تو اس میں گوشت کے پارچے ڈال کر۔ ان میں دہی ڈال کر خوب اچھی طرح بھونیے...... بعض خواتین صرف مسالا بھوننے پر اکتفا کرتی ہیں اور اس میں گوشت ڈال کر گلنے کے لیے پانی ڈال دیتی ہیں۔ یہ طریقہ بھی غلط نہیں مگر اس طرح سالن کی لذت کچھ کم ہوجاتی ہے جب پارچے سرخ ہوجائیں تو انہیں ایک بار بھونیں اگر شوربہ رکھنا ہو تو شوربے کا پانی ڈال کر چند منٹ دم پر رکھنے کے بعد پتیلی چولھے سے اتار کر اس میں پسا گرم مسالا کترا ہوا ہرا دھنیا اور تلی ہوئی پیاز پیس کر ڈال دیجیے۔

مزیدار پسندے تیار ہیں۔

از: آسیہ عامر، کراچی

بزمِ پاکیزہ

پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ میمونہ اشرف......فیصل آباد

سوال: عشق جیومیٹری ہے یا الجبرا؟

جواب: عشق تو عرفانِ الٰہی ہے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ جینا......کراچی

سوال: زمین پر گھر نہیں چاند پر بھی لینڈ مافیا ہے کہاں جاؤں؟

جواب: مریخ پر ٹرائی کرو۔

☆ سدرہ فریال......فیصل آباد

سوال: سویا ہوا انسان پانی سے جگایا جاسکتا ہے، سویا ہوا ضمیر کیسے جگایا جاسکتا ہے؟

جواب: اللہ ہی چاہے تو جاگتا ہے۔

سوال: منافق دوست اور سائے میں کیا فرق ہے؟

جواب: سایہ تو پھر بھی ساتھ ہی رہتا ہے۔

☆ فرخندہ......ملتان

سوال: وہ دن کب آئے گا جب میں رائٹر بنوں گی؟

جواب: جب تم لکھنا شروع کرو گی......اور کیا۔

سوال: کراچی کے لنڈا بازار میں کل تمہیں دیکھا تھا زہت؟

جواب: تمہارے لیے کوئی تحفہ تو لینا تھا نا تم آفس ملنے بھی آجاتیں۔

سوال: نوجوان نسل کو کتابوں کی طرف راغب کرنے کا طریقہ بتائیں؟

جواب: بچوں کے ساتھ پہلے خود کتابیں خریدیں اور پڑھیں۔

☆ فرخندہ جعفری......گجرات

سوال: پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پہ نہیں آتی......کیوں؟

جواب: کیا دانت ٹوٹ گئے ہیں جو چھپا کر رکھنا چاہتی ہو۔

سوال: دھند میں نظر کیوں دھندلا جاتی ہے؟

جواب: دل کی آنکھ سے دیکھا کرو۔

سوال: مطلع صاف ہو تو شام کو آسمان پر چیلیں کیوں چکر لگاتی ہیں؟

جواب: تمہارے لیے کوئی سندیسہ لاتی ہوں گی اب کے ذرا غور کرنا۔

☆ زریں علی......کوٹری

سوال: موسم آج کل اتنی جلدی کیوں بدل رہے ہیں؟

جواب: موسم تو اللہ کے حکم سے ہی بدلتے ہیں لیکن تم دل کے موسم کی بات کر رہی ہو شاید۔

سوال: قربانی کے جانور کو نمائش کیوں بنا دیا جاتا ہے؟

جواب: صرف جہالت کی وجہ سے اور کچھ نہیں۔

☆ نسرین یاسین......حیدرآباد

سوال: عید قرباں پر میری ساس بد مزہ کھانا کیوں پکاتی ہیں؟

جواب: ان بیچاری کو اس عمر میں کیوں زحمت دیتی ہو۔

pklibrary.com

سوال: عید پر عیدی کیوں دی جاتی ہے؟
جواب: آئندہ سے تمہاری عیدی بند۔
سوال: دل پر رکھنے والا پتھر کہاں ملے گا؟
جواب: جہاں سے صبر کا میٹھا پھل ملتا ہے اسی درخت کے نیچے سے۔
سوال: روٹی، کپڑا، مکان کے بعد آج کے انسان کی چوتھی بنیادی ضرورت کیا ہے؟
جواب: موبائل۔
☆ مریم بنت کاشف...... حیدرآباد
سوال: بقر عید کا گوشت لوگ کب تک کھاتے ہیں؟
جواب: جب تک پیٹ نہ بھرے۔
سوال: عیدی بچانے کا طریقہ بتائیں؟
جواب: اُف کنجوسی کی بھی حد ہے بھئی۔
سوال: بقر عید پر کون سی بات سننے کو کان ترستے ہیں؟
جواب: اب ہمیں کیا پتا تمہارے کان کیا، کیا سننے کو ترستے ہیں۔
سوال: ہاتھ میں فون ہو تو کھانا کھانے میں ایک گھنٹا لگتا ہے اور اگر یہی فون کسی اور کے ہاتھ میں ہو تو صرف دو منٹ لگتے ہیں ایسا کیوں......؟
جواب: کس چیز میں؟ چھیننے میں یا کھانا کھانے میں۔
☆ راحت صبور...... رسال پور
سوال: شوہر کی ساری غلطیاں معاف کرنے والی بیوی ڈراموں کے علاوہ اور کہاں پائی جاتی ہے؟
جواب: اپنی برائی کیوں سننا چاہ رہی ہو۔
سوال: ایمبولینس زندگی کی جنگ لڑنے جارہی ہوتی ہے اور بارات کا بھی یہی معاملہ ہوتا ہے تو کس کو جلدی راستہ دینا چاہیے ایمبولینس کو یا بارات کو؟
جواب: دونوں کو...... پھر تم بھی چاہے جس کے پیچھے ہو لو۔
☆ آسیہ عامر...... کراچی
سوال: زندگی زیادہ دغا باز ہے یا انسان؟
جواب: انسان ہی تو ہے جو زندگی میں دغا بازی کرتا ہے۔
سوال: محبتیں ادھار کیوں نہیں ملتیں؟
جواب: ادھار محبت کی قینچی ہے۔ تم نے ہر دکان پر لکھا نہیں پڑھا کیا۔
☆ فرخندہ...... دینہ سیداں
سوال: کریلا اگر کڑوا نہ ہوتا تو نیم پر کیسے چڑھتا؟
جواب: ہاں یہی تو بات ہے جو آج تک نادانوں کی سمجھ میں نہ آسکی۔
سوال: انسان ظاہری خوب صورتی کے لیے سو جتن کرتا ہے مگر باطنی خوب صورتی کے لیے اپنے اعمال ٹھیک کیوں نہیں کرتا؟
جواب: نادان جو ٹھہرا بیچارہ۔
☆ ثمینہ کوکب...... جہلم
سوال: سیدھی آنکھ پھڑکے تو غم اور الٹی آنکھ پھڑکے تو خوشی ملتی ہے مگر اگر دونوں آنکھیں پھڑکیں تو پھر؟
جواب: ماہر امراضِ چشم بلا رہا ہے۔
☆ جیننا...... کراچی
سوال: اب کب میرا سوال انعام یافتہ ہوگا؟
جواب: چلو شرما حضوری میں انعام تمہیں ہی دے دیتے ہیں خوش۔
☆ ماہین مسعود...... کمالیہ
سوال: سانس کے سفر اور آس کے سفر میں کیا فرق ہے؟
جواب: دونوں ہموار رہنے چاہئیں۔
☆ میمونہ اشرف...... فیصل آباد
سوال: یہ کیا شوہر کی محبت صرف تاج محل بنا کر ہی ظاہر ہوتی ہے یا پھر مٹر چھیلنا اور چائے بنانا بھی محبت کی نشانی ہے؟
جواب: ہاں برتن دھونا اور مل کر کپڑے بھی دھونے میں صاف ظاہر ہے۔
سوال: کہتے ہیں جس کا آج، کل سے بہتر نہیں وہ خسارے میں رہا...... تو آج کو کل سے بہتر کیسے بنایا جاسکتا ہے؟
جواب: پاکیزہ پڑھو اور مزے، مزے کے سوال کرو بس۔

☆☆☆

pklibrary.com

رُوحانی مشورے

ادارہ

آیات سلام کے خواص و فوائد

قرآن مجید میں سلام کا لفظ بیالیس (۴۲) مرتبہ آیا ہے یہاں ہم صرف آٹھ (۸) آیاتِ سلام مبارکہ سے استفادہ کررہے ہیں۔

۱۔سلام قولا من ربٍ رحیم
(یسین، آیت ۵۸، پارہ ۲۳، اعداد ۸۱۸)

۲۔سلام علی نوح فی العالمین
(الصفت، آیت ۷۹، پارہ ۲۳، اعداد ۶۲۷)

۳۔سلام علی ابراهیم
(الصفت، آیت ۱۰۹، پارہ ۲۳، اعداد ۵۰۰)

۴۔سلام علی موسیٰ و هارون
(الصفت، آیت ۱۲۰، پارہ ۲۳، اعداد ۶۲۵)

۵۔سلام علی آل یاسین
(الصفت، آیت ۱۳۰، پارہ ۲۳، اعداد ۴۰۳)

۶۔سلام علی المرسلین
(الصفت، آیت ۱۸۱، پارہ ۲۳، اعداد ۶۶۲)

۷۔سلام علیکم طبتم فاد خلوھا خالدین
(سورۂ زمر، آیت ۷۳، پارہ ۲۴، اعداد ۴۲۱۷)

۸۔سلام ھی حتّٰی مَطلع الفجر
(القدر، آیت ۵، پارہ ۳۰، اعداد ۱۰۲۷)

کل اعداد ۶۸۳۶

۱۔جو شر دشمن سے محفوظ رہنا چاہے تو روزانہ ۳۱۳ بار یہ آیات سلام پڑھے۔ انشاء اللہ دشمن کے شر سے محفوظ رہے گا۔ کسی بھی فرض نماز کے بعد۔

۲۔زہریلا جانور کاٹے تو اس کا اثر نہ ہوگا۔

۳۔شادی کا نہ ہونا، بندش، رکاوٹ، بانجھ پن، ملازمت کا نہ ملنا، سحر و جادو اس کے لیے روزانہ ایک سو ایک بار ۴۱ یوم پڑھیں۔

۴۔عزت و وقار اور ترقی مراتب کے لیے روزانہ گیارہ مرتبہ آیاتِ سلام پڑھے۔

۵۔تمام مشکلات، مہمات اور جملہ دشواریوں کے حل کے لیے آیات سلام ۲۰۲ مرتبہ ورد بے حد موثر ہے۔

قرض سے نجات:

قضائے حوائج اور ادائیگی قرض کے لیے جمعۃ المبارک کے دن غسل کرکے قبل از طلوع شمس دو رکعت نماز بطریق نماز فجر ادا کرے اور بعد از نماز ایک ہزار پینتالیس (1045) مرتبہ پڑھے ماشاء اللہ لاحول ولاقوۃ الاباللہ العلی العظیم۔ اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگے۔

اسمائے حسنیٰ

تزکیۂ نفس اور طمانیت قلب کا مستند اور محفوظ ذریعہ یہ ہے کہ آپ ذکر الٰہی سے اپنی زبان تر رکھیں۔ اس کی صفات کا ورد کریں ان صفات کے تقاضوں پر غور کریں اور ایمان و شعور کے ساتھ ان صفات کو دل و دماغ پر طاری رکھنے کی عادت ڈالیں، قرآن میں ارشاد ہے۔

''ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو اور صبح شام اس کی تسبیح میں لگے رہو۔'' (سورۂ احزاب آیت ۴۲) اور سورۂ اعراف میں ہے۔

''اور اللہ کے اچھے، اچھے نام ہیں پس ان اچھے ناموں سے اس کو پکارتے رہو۔''

ان ناموں کی تفصیل اور اس کے وسیع تقاضے قرآن میں بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان صفات کی تعداد، تفصیل اور ان کو محفوظ کرنے کا عظیم صلہ بتاتے ہوئے ان کے ورد کی ترغیب دی ہے، آپ کا ارشاد ہے۔

''خدا کے ننانوے...... ایک کم...... پورے سو نام ہیں جو شخص ان کو محفوظ کرلے گا جنت میں داخل ہوگا۔'' (بخاری)

صفاتِ الٰہی کو محفوظ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کو سمجھیں، ان کو جذب کریں، ان کے تقاضوں پر عمل کریں اور ان کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کریں...... اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ ذوق وشوق کے

pklibrary.com

ساتھ تلاوت کیجیے...... قرآن پاک کو پڑھنے کی عادت ڈالیے اور پابندی کے ساتھ اس میں غور وتدبر کو اپنے اوپر لازم کر لیجیے پھر ان مستند احادیث کا مطالعہ بھی توجہ اور انہماک کے ساتھ کیجیے جن میں ان صفات الٰہی کا مفہوم اور تقاضے ذہن نشین کرائے گئے ہیں۔ نیز ان مسنون اذکار اور دعاؤں کو بھی طبیعت کی حاضری اور یکسوئی کے ساتھ پڑھنے کا التزام کیجیے جو بالعموم ان صفات الٰہی پر مشتمل ہوتی ہیں۔ قرآن پر نظر رکھنے والے علما نے قرآن ہی سے ان ننانوے اسمائے الحسنیٰ کو جمع کیا ہے۔

ا۔ اللہ...... یہ خالق کائنات کی ذات کا نام ہے جو تمام اعلیٰ صفات اور خیر و برکت کا سرچشمہ ہے، یہ نام اس کے سوا نہ کبھی کسی کے لیے بولا گیا اور نہ بولنا صحیح ہے۔ اللہ ہی آپ کی محبتوں کا حقیقی مرکز ہے، وہی آپ کی عبادت و قربانی کا تنہا مستحق ہے اور وہی تمام خطرات سے حفاظت کی واحد پناہ گاہ ہے، پس اسی کی محبت سے دل کو آباد رکھیے، اسی کی مخلصانہ عبادت کیجیے اور اسی پر اعتماد اور بھروسا کیجیے۔

لا الہ الا اللہ کا ورد آپ کو اللہ پاک سے قریب کر دے گا اور جس نے قرب الٰہی پالیا اس نے مقصد حیات جان لیا۔ الحمدللہ

چند اعمال جن پر عمل کرنے سے گھر میں بڑی خیرو برکت ہوتی ہے

ا۔ گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا

چنانچہ ابو داؤد میں ہے کہ جب آدمی گھر میں داخل ہو تو یہ دعا پڑھے۔

اللّٰھم اِنّی اسئلک خیرَ المَولجُ وخیر المَخرج، بسم اللّٰہ وَلَجنا وَبسم اللّٰہ خَرَجنا وَعلیَ اللّٰہِ رَبّنَا توکلنا (ابو دائود ص: ۳۳۹، ج: ۲ باب مایقول الرجل اذ دخل بیتہ)

''اے اللہ میں آپ سے اندر جانے کی بھلائی مانگتا ہوں اور باہر نکلنے کی بھلائی مانگتا ہوں۔ اللہ کے نام کے ساتھ ہم اندر جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ہم باہر نکلتے ہیں اور ہم نے اپنے رب پر بھروسا کیا۔''

۲۔ گھر میں داخل ہو کر گھر والوں کو سلام کرنا۔

سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

''جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کیا کرو...... کہ یہ ملاقات کی وہ بابرکت پاکیزہ دعا ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہے۔'' (سورۂ نور آیت: ۶۱ پ: ۱۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت انسؓ سے فرمایا۔

''اے میرے بیٹے جب تم اپنے گھر میں داخل ہو تو سلام کرو...... یہ تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے لیے باعث برکت ہے۔'' (ترمذی ص: ۹۹، جلد: ۲۔ باب ماجانت فی التسلیم اذا دخل بیتہ) ابوداؤد میں ہے کہ تین شخص اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور ضمانت میں ہوتے ہیں ان میں سے ایک شخص وہ ہے جو گھر میں داخل ہوتا ہے تو سلام کر کے داخل ہوتا ہے۔

۳۔ گھر میں قرآن کریم کی تلاوت کا معمول بنایا جائے۔

گھر میں روزانہ قرآن کریم کی تلاوت کی جائے، تلاوت قرآن کی وجہ سے گھر معطر اور پاکیزہ ہوتے ہیں اور جنات اور شیاطین وہاں سے بھاگ جاتے ہیں، ایسے گھروں میں فرشتوں کا نزول ہوتا ہے۔

۴۔ شیطانی آوازوں سے اپنے گھر کو پاک رکھنا۔

حدیث میں ہے دو آوازیں دنیا و آخرت میں ملعون ہیں، خوشی کے وقت گانے کی آواز اور مصیبت کے وقت نوحے کی آواز۔ (کنز العمال)

جس گھر میں گانا بجانا اور موسیقی ہوتی ہے وہاں ابلیس کا لشکر پہنچ جاتا ہے اور پھر اس گھر میں فتنہ و فساد، لڑائی جھگڑے اور بغض و حسد پھیلاتا ہے۔ موسیقی کی محفل کو شیاطین ڈھانپ لیتے ہیں موسیقی اور باجے گاجے کے حرام ہونے پر سورۂ لقمان کی آیت نمبر 6، پ: ۲۱ اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۶۴، پ: ۱۵ واضح ہے۔

حدیث میں ہے کہ گانا دل میں نفاق کو اس طرح اگاتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو اگاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''الجرس مزا میر الشیطان'' گھنٹیاں شیطان کے باجے ہیں (مشکوٰۃ ص: ۳۳۸)

جانور کے گلے میں بجنے والے گھنٹے کو شیطان کا باجا کہا، اس کے پاؤں میں آواز دینے والے گھنگرو کو ناپسند فرمایا۔

☆☆☆

بھوؤں کو گھنا بنانے کے لیے نسخے

پیاری بہنو! آج ہم آپ کے چہرے کی نہایت اہم رونق بھوؤں کے بارے میں کچھ حیرت انگیز باتیں کریں گے۔

جناب باریک بھوؤں کا فیشن کب کا ختم ہوا اور اب فیشن کی دنیا میں گھنی بھوؤں کا راج ہے۔ دراصل مغرب میں گھنی بھوؤں والی ماڈلز کے آنے کے بعد پوری دنیا میں گھنی بھوؤں کے جس ٹرینڈ کا آغاز ہوا ہے اس نے پاکستان کی ماڈلز اور اداکاراؤں کو بھی متاثر کیا ہے۔ اگر آپ کی بھویں گھنی نہیں تو آپ آسان قدرتی طریقوں پر عمل کر کے اپنی مہین بھوؤں کو گھنا بنا سکتی ہیں۔

ناریل کا تیل

اس میں وٹامن E کے علاوہ پروٹین اور فولا دبھی پایا جاتا ہے۔ جو گھنے اور صحت مند بالوں کے لیے نہایت مفید ہیں۔ یہ تیل بالوں کو عمومی طور پر گہری رنگت عطا کرتا ہے۔ آپ ناریل کے تیل کو روئی میں لگا کر بھوؤں پر ملیں۔ اس جگہ پر ہلکے ہاتھ سے مساج کریں پھر رات بھر کے لیے یونہی رہنے دیں۔ صبح نیم گرم پانی سے دھولیں۔ دو ماہ تک روزانہ یہ عمل کریں۔ آپ خود تبدیلی محسوس کریں گی۔ اس تیل کی خوشبو سے نہ صرف نیند اچھی آتی ہے بلکہ یہ نہایت سستا اور ہر گھر میں پایا جانے والا تیل ہے۔

زیتون کا تیل

یہ تیل بھی بھوؤں کو گھنا اور گہری رنگت کا کرنے میں نہایت مفید ہے۔ اس میں موجود وٹامن E سے بال بہت جلد گھنے ہو جاتے ہیں اور تیزی سے بڑھتے ہیں۔ روزانہ بھوؤں پر تیل لگا کر پانچ منٹ مساج کر کے سو جائیں۔ اگلے دن پانی سے منہ دھولیں مطلوبہ نتائج آنے تک یہ عمل جاری رکھیں۔

ویسلین

آپ کے ہونٹوں اور جلد کو شگفتہ رکھنے کے علاوہ بھی ویسلین بہت سے کام انجام دیتی ہے۔ بھوؤں اور پلکوں پر ویسلین لگانے سے نہ صرف ان کی شیپ بہترین ہوتی ہے بلکہ گھنے پن اور لمبائی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ویسلین میں پایا جانے والا موسچرائزر بالوں کو گھنا کرتا ہے اور بھوؤں کے اوپر والی جلد کو شگفتہ رکھتا ہے۔ ویسلین لگانے کے لیے چہرے کو میک اپ سے صاف کر کے نیم گرم پانی سے دھولیں اور تھپتھپا کر خشک کر لیں۔ روئی کی مدد سے ویسلین کو اوپر کی جانب کرتے ہوئے بھوؤں پر لگالیں۔ رات بھر کے لیے لگا رہنے دیں۔ دن میں دو بار یہ عمل کریں۔ ویسلین میں موجود پٹرولیم نمی کو جلد کے اندر داخل کر دے گا۔ جلد کو غذائیت ملنے سے جلد کھل اٹھے گی اور بھویں بھی گھنی ہو جائیں گی۔

انڈے کی زردی

بالوں کا بنیادی جز کیراٹن ہے۔ یہ پروٹین کی ایسی قسم ہے جو انڈے میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ بالوں کی عمومی صحت بہتر بناتا ہے۔ انڈے کی زردی کو بھوؤں پر لگانے کے بھی بعینہ وہی فوائد ہیں جو بالوں کے لیے ہیں۔ یہ بھوؤں کو گھنا بناتی ہے۔ ایک انڈے کو توڑ کر زردی علیحدہ کر لیں۔ زردی کو اتنا پھینٹیں کہ گاڑھی ہو جائے پھر روئی کی مدد سے زردی کو بھوؤں پر لگالیں۔ پندرہ منٹ کے بعد روئی کے پھائے کو گیلا کر کے صاف کر لیں۔ ہفتے میں دو مرتبہ یہ عمل دہرائیں۔ جب توقع کے مطابق نتائج حاصل ہو جائیں تو اس طریقے پر عمل درآمد روک دیں۔

ارنڈی کا تیل

بالوں کی نشوونما کے لیے جمیکا کی سیاہ ارنڈی کا تیل بہت مشہور ہے۔ اس تیل میں وٹامنز، پروٹین اور فیٹی ایسڈ پائے جاتے ہیں اور یہ سب بالوں کی خوراک ہیں۔ یہ بالوں کی عمدہ نشوونما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بھوؤں پر آہستہ سے ملیں تین منٹ تک بھوؤں پر تیل سے مساج کریں۔ رات بھر کے لیے تیل بھوؤں میں لگا رہنے دیں۔ صبح نیم گرم پانی سے چہرہ دھولیں۔

دودھ

پروٹین سے بھرپور دودھ بالوں کی جڑوں کو مضبوط بناتا ہے۔ ایک برتن میں تھوڑا سا دودھ لے کر اس میں روئی کا پھایہ بھگولیں اور بھوؤں پر اچھی طرح لگا کر خشک ہونے دیں اور پھر دھولیں۔ روزانہ ایک مرتبہ یہ عمل کریں۔

Dr. Willmar Schwabe
Germany
From Nature. For Health.
SCHWABE
برسوں سے قائم، اعلیٰ ترین معیار---
شوابے ہومیوپیتھی
میں بے مثل
شوابے ہومیوپیتھک سنگل ریمیڈیز
ہومیوپیتھی میں بہترین
ہومیوپیتھی میں دوا کا مستقل اعلیٰ معیار ان کی غیر معمولی افادیت کا سبب بنتا ہے۔
ڈاکٹر ولمار شوابے، جرمنی کے برسوں سے قائم اعلیٰ ترین معیار کی وجہ سے اس کے قائدانہ مقام کا دنیا میں کوئی مقابلہ نہیں۔
شوابے اپنے تمام ادویاتی پودے جرمنی میں واقع اپنے نباتاتی باغات میں 100% قدرتی طریقے سے کاشت کرتا ہے۔ اعلیٰ ترین معیار یقینی بنانے کے لیے غیر معمولی تحقیق کی بنیاد پر جدید طریقہ کار کے ذریعے دنیا کی بہترین ہومیوپیتھک دوائیں تیار کی جاتی ہیں۔
دواسازی کا تمام تر عمل جی ایم پی معیارات اور ہانیمن کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق انجام دیا جاتا ہے اور اس طرح تیار کردہ دوائیں جرمنی سے تمام دنیا بشمول پاکستان کو برآمد کی جاتی ہیں۔
Tablets
Dilutions
Mother Tinctures
German Imported in Origianal Pack
Importer:
Dr. Hamid
General Homoeo (Pvt.) Ltd.
Karachi, Phone: 021-32211895
www.drhamid-schwabe.com
Lahore, Phone: 042-36291603

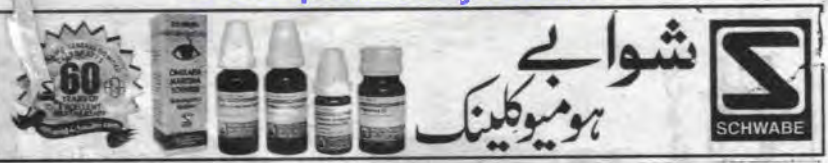

شوابے ہومیو کلینک

SCHWABE

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

یاد نہیں رہتا

رباب، اسلام آباد

میں طالبہ ہوں۔ مجھے پڑھا ہوا یاد نہیں رہتا۔ اور پیپر والے دن تو گھبراہٹ میں سب بھول جاتی ہوں۔ ماہنامہ پاکیزہ میں کریٹکس (Cratex) کے بارے میں پڑھا۔ مہربانی فرما کر میری راہنمائی فرمائیں۔

۱) اس دوا کے کوئی منفی اثرات تو نہیں؟
۲) ماہواری کے دنوں میں استعمال کر سکتی ہوں؟
۳) ماہواری پر تو کوئی منفی اثرات نہیں ہوں گے؟
۴) کریٹکس کب سے شروع کروں اور کب تک کھاؤں؟

جواب: بی بی دماغی صلاحیت اور جسمانی نشوونما کو بڑھانے کے لیے کریٹکس ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ایک بے مثال دوا ہے۔ اس کے اب تک کوئی منفی اثرات مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ ماہواری کے دنوں میں بھی اس کو لیا جا سکتا ہے اس سے کوئی خراب اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ قوت اور توانائی برقرار رہتی ہے۔ اس کو کم از کم ایک ماہ تک استعمال کریں۔ صبح اور شام ایک ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ نگلیں۔ اس کے علاوہ Ancardium 30 شوابے جرمنی کے 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

لیکوریا

رقیہ، مغلپورہ

میرا یہ مسئلہ تقریباً 14 سال سے ہے۔ ماہواری ویسے تو ٹائم پر ہوتی ہے مگر ایک ہی دن کھل کر بلیڈنگ

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

اگست 2021ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________________

پتا: ____________________

____

pklibrary.com

ہوتی ہے اور باقی دن معمولی سی ہوتی ہے۔ میرا پیٹ اسی وجہ سے بڑھ گیا ہے۔ میں نے لیکوریا اور پیٹ کے لیے کافی دفعہ لیڈی ڈاکٹر سے بھی رابطہ کیا مگر دوائیوں سے وقتی طور پر افاقہ ہوتا ہے پھر بعد میں پہلے سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

جواب: ہمیں لگتا ہے کہ آپ لگ کر علاج نہیں کراتیں فائدہ نہیں افاقہ ہونے پر علاج چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسا نہ کریں بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ علاج کریں ورنہ مسئلہ پیچیدہ ہو جائے گا۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Magnesium Phos. Ptk 60 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ لیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

چہرے پر دانے

سحرش، مومن آباد

میرے چہرے پر دانے نکل رہے ہیں جو کہ سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ یہ خود نکلتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں۔ مگر بعض اوقات اتنے نکلتے ہیں کہ چہرہ عجیب سا لگتا ہے۔ برائے مہربانی کوئی دوا تجویز فرمائیں۔ میری عمر 16 سال ہے۔

جواب: سحرش! آپ اپنے کھانے میں موسمی پھلوں اور سبزیوں کا اضافہ کیجیے۔ کولڈ ڈرنک بالکل استعمال نہ کریں۔ چہرے پر کسی قسم کی کوئی کریم نہ لگائیں۔ دن میں پانچ سے چھ مرتبہ پانی سے دھویا کریں۔ صبح سویرے کی دھوپ یا شام کو سورج غروب ہونے سے پہلے کی دھوپ میں 15 منٹ تک روزانہ بیٹھیں۔ Juglans Regia 30 روزانہ ایک خوراک پانچ قطرے لیں اور Gun Powder 3X دن میں تین مرتبہ لیں۔

آنکھوں کی کمزوری

فیصل، لاہور

میری کزن کی بیٹی کی عمر ساڑھے چھ سال ہے، اسے ایک سال سے عینک لگی ہے۔ کیونکہ اس کے سر میں شدید درد ہوتا تھا اور متلی کی کیفیت بھی ..... رہتی تھی۔ بائیں آنکھ کو ٹیڑھا کر کے دیکھتی تھی۔ اب یہ صورتِ حال ہے کہ ہر چھ ماہ بعد نظر چیک کروانے پر پہلے سے کمزور ہی نکلتی ہے۔ عام بچوں کی طرح وہ کھیلتی کودتی نہیں۔ برائے کرم ایسی دوا تجویز کریں جو نہ صرف نظر کو ٹھہرنے میں مدد دے بلکہ اس کو بہتر بھی کرے شکریہ!

جواب: بچی کو صبح سویرے سورج نکلتے ہوئے باغ کی سیر کرائیں ..... سونف، مصری، بادام سب کو ہم وزن لے کر پیس لیں۔ ہمارا منہ روزانہ ایک کھانے کا چمچہ کھلا کر دودھ ایک پیالی پلا دیں۔ گاجر کا استعمال خوب کرائیں جب موسم ہو۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات تین ماہ تک استعمال کرائیں Physostigma 30, Calc Phos 30, Calc.Flour 30 کے 5،5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔

گردے کی پتھری

نائزہ، مظفر گڑھ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے 2 سال سے گردے میں بار بار پتھری بن جاتی ہے۔ پہلی مرتبہ تو ہومیوپیتھک ڈاکٹر سے دوا لی جس سے پتھری نکل گئی۔ سال کے بعد پھر بن گئی، علاج کرایا پھر نکل گئی۔ پتھری تقریباً ہر سال ہو جاتی ہے۔ آخری مرتبہ جب پتھری ہوئی تو الٹراساؤنڈ کرایا اس وقت تقریباً 5cm کی پتھری تھی دائیں گردے میں۔ اس وقت ڈاکٹر نے کہا کہ اب صرف آپریشن ہوگا۔ آخر تنگ ہو کر آپریشن کرایا۔ تقریباً دو سال ہو گئے ہیں آپریشن کو اب دونوں گردوں میں درد اور کھنچاؤ رہتا ہے۔ بائیں گردے میں تقریباً چنے کے برابر پتھری ہے۔ برائے مہربانی کوئی اچھی سی دوا تجویز کر دیں تا کہ پھر آپریشن نہ کرانا پڑے۔

جواب: لگتا ہے کہ آپ بھی علاج بے قاعدگی سے

pklibrary.com

کراتی ہیں جبھی تو یہ بار بار بن رہی ہے۔ کیلشیم کی گولی یا اس کے مرکبات کے استعمال سے بھی پتھری بننے کے چانس بڑھتے ہیں۔ پیشاب آنے پر اس کو روکنے سے بھی پتھری بنتی ہے۔ پانی کا کم استعمال کیا جائے تو بھی پتھری بنتی ہے۔ کیلشیم کی گولیاں استعمال نہ کریں۔ پانی کم از کم 15 گلاس روزانہ پئیں۔ پیشاب جیسے ہی آئے ویسے ہی کریں روکنے کی عادت ترک کر دیں۔ کیلا، پالک، ٹماٹر، دودھ، دہی کا استعمال فی الحال نہ کریں۔ وزن نہ اٹھائیں۔ البتہ چلتی پھرتی ضرور رہیں بلکہ سیڑھیاں اترنے چڑھنے کی ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کریں پھر کیفیت سے مطلع کریں۔ Calc. carb-30 کے 7-7 قطرے ایک گلاس پانی میں جبکہ Berberis Pentarkan 15 کی 1 ایک گولی تھوڑے پانی سے دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

بال گر رہے ہیں

یاسمین، لاہور

کافی عرصے سے میرے سر کے بال گر رہے ہیں اور سر میں خشکی اور کائی بھی ہے۔ مختلف قسم کے تیل اور شیمپو استعمال کیے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آپ کوئی اچھا سا نسخہ تجویز فرما دیں۔

جواب: اپنے بالوں کی صفائی کا خیال رکھیں۔ اچھی اور متوازن غذا کا استعمال کریں۔ خوشبو والے صابن اور تیل کا استعمال ترک کر دیں۔ صبح ناشتے کے بعد AcidFlour 30 دوپہر کو کھانے کے بعد Vinca Minor 30 اور Acid Phos Q کے پانچ قطرے ایک گلاس پانی میں رات کو سوتے وقت استعمال کریں۔ ایک مہینے بعد اپنی پوری کیفیت سے تفصیل کے ساتھ آگاہ کریں۔

ماہانہ ایام کے مسائل

نورین، قیوم آباد

مجھے جب ماہواری آتی ہے الٹیاں آنا شروع ہو جاتی ہیں اور کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔ یوں لگتا ہے کہ جان نکل جائے گی۔ انگریزی دوا کھانے سے ماہواری آتی ہے۔ میری کمر کے نچلے حصے اور پٹھوں اور پنڈلیوں میں بھی درد ہوتا ہے۔ سر کے بال بھی گرتے ہیں۔ جسم پر بھی سرخ دانے نکل رہے ہیں اور کبھی کبھی ہاتھ بھی کانپتے ہیں۔ پیٹ اور کولھے پھیلتے جا رہے ہیں۔ رنگ بھی خراب ہو گیا ہے۔ کبھی صاف لگتا ہے اور کبھی کالا۔ صرف چہرے اور ہاتھوں کا رنگ خراب ہوتا ہے۔ پانی پینے سے مجھے اپھارا ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی ہیں۔ چہرے پر بال نکل آئے ہیں جو پہلے نہیں تھے۔

جواب: پانچ وقت نماز کی پابندی کریں۔ صبح چہل قدمی کیا کریں۔ پانی کا استعمال کم از کم 12 گلاس روز کریں۔ متوازن غذا لیں۔ دودھ، گوشت، سبزیاں اور پھلوں کا استعمال بڑھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر اپنا حال تفصیل سے لکھیں۔ Sulphur-200 کی ایک خوراک سب سے پہلے لیں۔ صبح نہار منہ 5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر ہر 3 ہفتے بعد لیں۔ اس سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی اور دوا نہیں لیں۔ پھر ایک دن بعد Magnesium Phos Pentarkan Ptk 60 کی ایک ایک گولی دن میں 3 مرتبہ چوس لیں۔

معدے کی جلن

ارتضا، رحیم یار خان

میرا مسئلہ معدے کا ہے اور یہ تقریباً 4 سال سے ہے۔ معدے میں درد ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد کبھی فوراً اور کبھی کچھ دیر بعد جلن کی شکایت ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ معدے کا السر ہے۔ برائے مہربانی میرا کوئی اچھا سا علاج تجویز کریں۔

جواب: کھانے کے ساتھ اور فوراً بعد پانی نہ پئیں۔ کھانا اچھی طرح چبا کر کھائیں۔ مرغن اور بھاری کھانے سے پرہیز کریں۔ میٹھی چیزیں، مرچیں، تلی ہوئی، بھنی ہوئی چیزیں اور ترش پھل بھی تیزابیت پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے چیک کریں کہ کس چیز سے تیزابیت پیدا ہوتی ہے؟ غم، فکر بھی تیزابیت کا باعث بنتے ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Nux vomica Pentarkan Ptk 63 کے 10 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

سفید بال

ارحم، راولپنڈی

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر کے تقریباً 80% بال سفید ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ آپ پلیز کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں کہ میرے بال کالے ہو جائیں۔

جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی غیر معیاری، شیمپو، تیل اور کچھ جسمانی تبدیلیاں جو وقت و عمر کے ساتھ ہوتی ہیں بالوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ آپ لگ کر علاج کرائیں انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Acid Phos Q کے 5 قطرے ایک کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں اور Lycopodium 30 کے 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں اور دو ماہ بعد اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔

جوڑوں میں سے آوازیں

عبدالقیوم، سکھر

ڈاکٹر صاحب مجھے بچپن سے ہی گھٹنوں کے جوڑوں میں تکلیف رہتی ہے۔ مجھے درد تو نہیں ہوتا البتہ اٹھتے بیٹھتے وقت گھٹنوں کے جوڑوں سے ٹک ٹک کی آوازیں آتی ہیں جیسے جوڑ کی دونوں ہڈیاں آپس میں رگڑ رہی ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے وقت ایسا ہوتا ہے۔

جواب: قرآن و حدیث کا مطالعہ کیجیے۔ نماز کی پابندی کیجیے۔ اللہ سے توبہ اور اپنے گناہوں کی معافی مانگیے اور پھر اپنی صحت کے لیے دعا کیجیے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر تمام حالت تفصیل سے لکھیں۔ Calc. phos-30 Staphisagria-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

نسوانی مسائل

کومل، سکھر

کافی عرصے سے پاکیزہ میں آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں۔ آپ بہت اچھے طریقے سے جواب دیتے ہیں۔ میں اپنے مسئلوں کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ چہرے کے دانے اور داغ دھبے، چہرے اور سینے پر بالوں کا آنا، پیٹھ پر بھی دانے ہیں جن کی وجہ سے زیادہ بیٹھنے سے جلن ہونا شروع ہو جاتی ہے، معدے کا مسئلہ، بالوں کا گرنا، سفید ہونا، دبلا پتلا جسم، بالکل ہڈیاں ہیں گوشت بالکل بھی نہیں، نسوانی حسن بھی بالکل نہیں۔ خون کی کمی اور کیلشیم کی بہت کمی ہے۔ بلڈ ٹیسٹ، الٹرا ساؤنڈ، پیشاب ٹیسٹ رپورٹس بھیج رہی ہوں۔ میرے چہرے اور جسم کے لیے بھی دوا تجویز کر دیں۔ آپ کی بہت نوازش ہوگی اور آپ کی احسان مند رہوں گی۔

جواب: اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہم صحیح تشخیص کر کے صحیح قسم کا علاج کریں (ہومیوپیتھک) تو کوئی وجہ نہیں کہ مرض سے نجات نہ ملے۔ متوازن غذا کا استعمال کریں۔ لال گوشت (بکرا، گائے) ٹماٹر، پالک، سلاد، کدو، چھولے، اور جو بھی موسم کے پھل ہوں ان کا بھرپور استعمال کریں۔ صبح سویرے اٹھیں۔ نمازوں کی پابندی کریں۔ کوشش کریں کہ صبح کی نماز کے بعد کسی باغ میں

چہل قدمی کریں۔ پانی کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں کم از کم 12 گلاس روزانہ پئیں۔ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد پانی نہ پئیں۔ شربت اور کولڈ ڈرنکس بالکل استعمال نہ کریں ان سے بھی دانے نکلتے ہیں۔ البتہ ستو، لسی اور تازہ پھلوں کے جوس مفید ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Calc. sulph-30 Ferrum met 30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ جبکہ Alfalfa-Ø کے 11 قطرے ہر کھانے کے بعد آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ Aesa foetida Petarkan Ptk 12,Nux vomica Pentarkan Ptk 63 کے 10 قطرے تھوڑے سے پانی میں ڈال کر استعمال کریں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

بیٹی کے مسائل

رضیہ خاتون.....ساہیوال

محترم ڈاکٹر صاحب میری بیٹی پیدائشی صحت مند تھی لیکن 21 سال کی عمر سے اس کو مسئلوں نے گھیر لیا۔ پہلے اس کے پیریڈ بند ہو گئے پھر چہرے پر بال نکل آئے۔ حکیموں سے علاج کرایا کبھی فرق پڑا ابھی نہیں پھر لیڈی ڈاکٹر سے علاج کرایا وہ چکر والی گولیوں کا پتا دیتی تھیں جس سے پیریڈ آتے پھر جیسے ہی چھوڑتی مسئلہ شروع۔ پھر ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے علاج کروایا لیکن بے سود۔ اس کے جسم میں درد رہتا ہے سوئے تو کروٹ بدل سکتی نہ ہی کروٹ کے بل سو سکتی ہے الٹی سوتی ہے۔ پاؤں بہت سوج گئے ہیں بلکہ پورا جسم ہی پھول گیا ہے، درد رہتا ہے۔ بال ایک دم سفید ہو گئے ہیں۔ سانس پھول جاتی ہے۔ مہربانی فرما کر دوا تجویز کریں بہت امید سے خط لکھ رہی ہوں پرہیز بھی بتائیے گا نوازش ہوگی۔

جواب: 21 ویں سال ایسی کیا بات ہوئی کہ یہ سارے مسئلے یکدم پیدا ہو گئے اس وجہ کو جاننا ضروری ہے ادوم اس کے کچھ ٹیسٹ کرا کر رپورٹس بھیجیں Blood CBC + ESR Profile, U/S Whole abdomen, Thyroid Profile, Urea, Creatinine, Prolactin, TSH, FSH دوا کی تجویز مکمل تشخیص کے بعد ہو سکے گی۔ لہٰذا جلد از جلد یہ ٹیسٹ کرا کر رپورٹس بھیجیں۔

قد نہیں بڑھ رہا

فیضان، اسلام آباد

میری عمر 17 سال ہے اور وزن 110 پونڈ ہے۔ میرا قد 5 فٹ 2 انچ ہے۔ کئی سالوں سے میرا قد نہیں بڑھ رہا ہے۔ برائے کرم قد بڑھانے کی کوئی دوا تجویز کریں۔

جواب:۔ 17 سال کے بعد قد کم ہی بڑھتا ہے۔ بہر حال کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ اچھی متوازن غذا استعمال کریں۔ متوازن غذا سے مراد انڈا، دودھ، مکھن، گھی، گوشت (گائے، بکرا، مچھلی) دالیں، پھل و سبزیاں لیں۔ صبح سویرے ورزش کا اہتمام کریں خصوصاً لٹکنے والی ورزش آپ کے لیے مفید ہے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Thyroidinum30 صبح و شام کھائیے اور Ferrum Phos 30 + Calc Phos 30 دوپہر اور رات کھانے کے بعد پانچ پانچ قطرے استعمال کیجیے 6 ماہ بعد اپنے احوال سے آگاہ کریں۔

☆☆☆

وائرل بیماریوں کا ہومیو پیتھی میں
فوری، کامیاب، مؤثر علاج ہے
جیسے کورونا، ڈینگیو وغیرہ

Dr.Willmar Schwabe Germany
Available at All Medical & Homoeopathic Stores
شوابے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیو پیتھی